بسم الله الرحمن الرحيم

انتخاب
تفسیر المیزان
(جلد: 2)

تالیف و تصنیف:
علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

☆☆☆☆☆

مترجم:
علامہ سید افتخار حسین نقوی النجفی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں!

تعارف

نام کتاب:	انتخاب تفسیر المیزان
تالیف:	علامہ محمد حسین طباطبائیؒ
ترجمہ و حاشیہ:	سید افتخار حسین نقوی النجفی
معاونت:	مولانا محمد نقی
کمپوزنگ و فارمیٹنگ:	شاہد علی جعفری
فنی معاونت:	قرآن سنٹر، لاہور
جلد:	دوم
ناشر:	مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر لاہور: 042-37211214

معراج کمپنی لاہور: 042-37361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد: 0333-5234311

فہرست

سورۃ المائدۃ 37

سورہ کے مطالب: 37

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو 38

حلال و حرام گوشت جانور 39

اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں 40

حرام چیزیں 44

اکمال دین پر کافروں کی مایوسی 45

غدیر خم کا واقعہ 46

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام 47

حرام چیزوں سے استثناء 48

کھانے پینے کی حلال چیزیں 50

پاکیزہ چیزوں کا حلال ہونا 51

مولا علیؑ کا ایک نام ایمان ہے 54

نماز کے لیے طہارت کا حکم اور وضو کا طریقہ 55

غسل جنابت اور تیمّم کے بارے بیان 57

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو 60

گواہی دینے میں ظلم نہ کرو 61

نیک مومنین کے لیے اجر عظیم کا وعدہ 62
آیات الٰہی کو جھٹلانے والے دوزخی 62
ایمان والو! اللہ کا احسان یاد کرو 63
بنی اسرائیل سے لیا گیا عہد 65
بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور اس کا انجام 67
نصاریٰ کی عہد فراموشی 69
اللہ کی جانب سے رسول اور روشن کتاب 70
رضای الٰہی کے تابع کے لیے سلامتی کی راہیں 71
عیسیٰؑ کے متعلق مسیحیوں کا باطل عقیدہ 73
یہود و نصاریٰ کے جھوٹے دعوے 76
اہل کتاب کے اعتراضات کا جواب 77
قوم موسیٰؑ پر اللہ کے احسانات 79
بنی اسرائیل کو مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم 80
بنی اسرائیل کا مقدس سرزمین میں داخل نہ ہونا 81
صاحبان ایمان کا بیان 82
بنی اسرائیل کی گستاخی 83
موسیٰؑ کی اپنی قوم سے مایوسی 84
بنی اسرائیل کی نافرمانی کی سزا 86
آدمؑ کے بیٹوں کی داستان 87
ہابیل کا قابیل کو جواب 88

قابیل کو قتل کرنے کی سزا کی اطلاع 89
قابیل کا اقدام قتل 90
کوے کی لاش دفنانے کی رہنمائی 91
ایک انسان کا قتل سارے انسانوں کے قتل کے مترادف 93
محاربین اور فساد پھیلانے والوں کی سزا 95
مجرم کی توبہ 96
قرب الٰہی کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کا حکم 97
کفار کے لیے قیامت کا حتمی عذاب 98
کفار کے عذاب کا دائمی ہونا 99
چوری کی شرعی حد 100
توبہ کی قبولیت 101
اللہ کا مطلق اختیار 101
منافقوں کا رویہ اور یہودیوں کی سازشیں 103
قوم یہود کی دیگر خصوصیات 108
یہودیوں کا رویہ 109
تورات کا وصف 110
تورات میں قصاص کا قانون 113
حضرت عیسیٰؑ اور کتابِ انجیل 114
اہل انجیل، انجیل کے مطابق فیصلہ دیں 116
قرآن کی سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود اصول کی تائید 119

اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے دو.......................... 121
دور جاہلیت کے فیصلوں کے طلبگار.......................... 122
یہود و نصاریٰ سے دوستی ممنوع.......................... 124
دل کی بیماری میں مبتلاء لوگوں کی خصوصیات 126
یہود و نصاریٰ کسی کی مدد نہیں کر سکیں گے.......................... 128
اللہ کو چاہنے والے مومنین 129
مومنین کا ولی اللہ، رسول اور زکوۃ دینے والے مومنین.......................... 132
علیؑ، مومنین کے ولی 133
دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی نہ کرو.......................... 136
نماز کے بلاوے پر مذاق اڑانے والے 137
اہل کتاب کی عیب جوئی کی وجہ.......................... 138
بری جزاء والے بدتر لوگ.......................... 139
منافقین کا اندرونی نفاق.......................... 140
منافقوں کی گناہوں کے لیے دوڑ.......................... 141
اہل کتاب عالموں کی سرزنش 142
یہودیوں کے اعتراضات اور اللہ کا جواب.......................... 143
ایمان کے بعد تقویٰ 146
توریت اور انجیل کے بیانات پر عمل نہ کرنا.......................... 147
وصایت اور جانشینی کے اعلان کا حکم.......................... 148
غدیر خم میں ولایت علیؑ کا اعلان 150

آیہ "ابلاغ" کے بارے چند نکات.......................... 151
اہل کتاب کو ستون دین قائم کرنے کی نصیحت.......................... 153
سعادت کا تعلق اسماء والقاب سے نہیں.......................... 154
نبیوں کے ساتھ بنی اسرائیل کا سلوک.......................... 155
بنی اسرائیل کی بعض خصوصیات کا تذکرہ.......................... 156
نصرانیوں کے باطل عقائد.......................... 158
اقانیم ثلاثہ کا نظریہ.......................... 159
توبہ نہ کرنے والوں سے سوال.......................... 161
مسیح کے متعلق صحیح عقیدہ.......................... 162
ایسے کی عبادت کیوں جو نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان؟!.......................... 163
دین میں غلو نہ کرو.......................... 164
کفار بنی اسرائیل پر لعنت.......................... 165
منکرات سے نہ روکنا.......................... 166
اپنے لیے بُرا سامان آگے بھیجنا.......................... 166
اللہ اور پیغمبروں پر ایمان لانے کا تقاضا.......................... 167
مسلمانوں سے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا تعلق.......................... 168
مومنوں سے نصاریٰ کی قربت کی علامتیں.......................... 169
ایمان لانے والے نصرانیوں کی دعاء.......................... 170
دعاء کی قبولیت.......................... 171
آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کی سزا.......................... 172

حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو.. 172
حلال کا استعمال اور خدا خوفی.. 174
قَسم کے احکام.. 175
قسم توڑنے کا کفارہ.. 176
شراب، جوا، بت اور فال کے تیر شیطانی کام.. 177
شیطان کی انسان سے دشمنی.. 178
اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت.. 180
گناہ کے بعد نیک عمل.. 181
حج کے دوران شکار کے ذریعے لوگوں کا امتحان.. 183
احرام کی حالت میں شکار کرنا.. 185
احرام کی حالت میں حلال شکار.. 186
کعبہ بزرگی والا گھر.. 187
اللہ کی صفات.. 188
رسول کی ذمہ داری.. 189
پاک اور ناپاک برابر نہیں.. 190
بعض چیزوں کے متعلق سوال کرنے سے منع.. 191
یہودیوں کے بے ہدف سوالات.. 193
زمانہ جاہلیت کے مقدس حیوانات.. 194
جاہلوں کی تقلید قبیح عمل.. 196
اے اہل ایمان! اپنے بارے مراقب رہو.. 197

وصیت کے متعلق سچی گواہی دینے کا حکم.. 200
گواہی کے غلط ہونے کا علم.. 201
صحیح گواہی دینے کا اہتمام.. 202
قیامت کے دن اللہ کا پیغمبروں سے سوال.. 203
حضرت عیسیٰؑ کے معجزے.. 206
بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی.. 207
عیسیٰؑ پر اللہ کے دیگر احسانات.. 208
حواریوں کا عیسیٰؑ سے معجزات کا تقاضا.. 209
اپنے مطالبہ بارے حواریوں کا عذر.. 210
عیسیٰؑ کا حواریوں کی درخواست اللہ کے حضور پیش کرنا.. 212
حواریوں کے لیے مائدہ آسمانی کا اترنا.. 213
اللہ کا عیسیٰؑ سے سوال.. 215
عیسیٰؑ کا ناروا نسبتوں کا جواب.. 216
عیسیٰؑ کی اللہ سے درخواست.. 217
عیسیٰؑ کی باتوں کی تصدیق.. 218
اللہ کی سلطنت اور اقتدار.. 220

سورۃ الانعام.. 221
سورہ کے مطالب.. 221
نظام کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حمد.. 221

خلقت عالم صغیر............................ 223
آسمانوں اور زمین پر اللہ کا اختیار............................ 226
کفار کا مستکبرانہ مزاج............................ 227
حق کو جھٹلانا اور اس کا مذاق اڑانا............................ 228
سابقہ اُمتوں میں عبرت کا سامان............................ 229
ایمان نہ لانے کے لیے کفار کے بہانے............................ 230
فرشتے کا نہ اُتارا جانا............................ 231
کفار کے بہانوں کا جواب............................ 232
اللہ تعالیٰ کی پیغمبر اکرمؐ کو تسلی............................ 235
عبرت کے لیے سابقہ اقوام کے حالات کا مطالعہ............................ 236
معاد کے بارے ثبوت............................ 236
رات اور دن میں موجود سب اللہ ہی کا ہے............................ 238
اللہ کی وحدانیت پر دلائل............................ 241
رب کی نافرمانی عذاب آخرت کا سبب............................ 243
عذاب آخرت کا ٹل جانا ہی بڑی کامیابی............................ 244
عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی نہیں............................ 245
اللہ حکمت اور قدرت والا ہے............................ 246
اللہ کی وحدانیت پر دلیل............................ 248
آسمانی کتب میں پیغمبرؐ کی نبوت کی گواہی............................ 251
بدترین ظلم............................ 252

قیامت میں مشرکین کا اپنے شرکاء کا انکار........................ 254
قیامت میں کوئی عذر یا بہانہ کام نہ آئے گا........................ 255
اپنے خلاف جھوٹ بولنا........................ 255
مشرکین کے شرک کی وجہ........................ 257
ناسمجھی کی انتہاء........................ 258
جہنم میں مشرکین کی بری حالت........................ 258
قیامت کے دن مشرکین کی حالت........................ 259
معاد کا انکار........................ 261
کفار کے اعتراض کا جواب........................ 262
رب کی ملاقات کو جھٹلانے والوں کا انجام........................ 263
دنیا کی زندگی کھیل، تماشہ ہے........................ 264
پیغمبر اکرمؐ کو تسلی........................ 265
سابقہ اقوام اور انبیاءؑ کی تکذیب........................ 266
راہ ہدایت اختیار کرنے پر انسان کا مختار ہونا........................ 268
کفار زندہ لاشیں........................ 269
معجزہ اُتارنے پر اللہ کی قدرت........................ 270
پیغمبرؐ کا مشرکین کو جواب........................ 272
انسانوں کی مانند حیوانات کی اُمتیں........................ 272
آیات الٰہی کو جھٹلانے والے گونگے اور بہرے........................ 274
مشکلات میں مدد کرنے والی اللہ کی ذات........................ 275

مصیبت میں مدد کرنے والا 276

مشکلات کے ذریعے اُمتوں کا امتحان........................ 278

اللہ کی طرف رجوع نہ کرنا........................ 279

اللہ کے عذاب کی اچانک پکڑ........................ 279

ظالموں کا خاتمہ........................ 280

اللہ نعمتیں چھین لے تو کوئی عطا نہیں کر سکتا........................ 281

عذاب الٰہی سے ظالمین کی ہلاکت........................ 283

صالح مومنین کے لیے نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ غم 284

آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والے کے لیے عذاب........................ 284

پیغمبرؐ کی ذمہ داری 285

قیامت کا خوف کھانے کا حکم........................ 288

اللہ کو پکارنے والوں کو اپنے سے دُور نہ کرو 290

انسانوں کا دوسرے انسانوں کے ذریعے امتحان 291

آیات الٰہی پر ایمان لانے والوں کو سلام 293

معارف الٰہی کی شرح 295

بتوں کی پرستش سے منع........................ 296

رسول خداؐ کے پاس رب کی دلیل 297

ہر بات کا اختیار اللہ کے پاس ہے 298

غیب کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں........................ 299

موت اور نیند کی حالت میں روح کا قبض کیا جانا 301

انسان کی روح قبض کرنے والے فرشتے 302
ملک الموت کے اعوان و انصار 304
سب کی بازگشت اللہ کی طرف 305
خشکی اور دریا کے اندھیروں سے بچانے والی ذات 306
اللہ کی مہربانیاں 308
اللہ تم پر عذاب اتارنے پر قادر ہے 309
قریش کا حق کو جھٹلانا 311
ہر خبر کا مقرر وقت 312
آیات الٰہی میں جھگڑنے والوں سے دوری 313
نصیحت اور یاد دہانی 314
دین کو کھیل تماشا بنانے والوں سے قطع تعلق 316
سعادت کا حامل، الٰہی نظام 317
اللہ کے حضور تسلیم ہونا 319
آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے اختیار میں 320
حضرت ابراہیمؑ کا استدلال 321
ابراہیمؑ کو ملکوت آسمان و زمین کا دکھایا جانا 323
غائب ہونے والی شئی رب نہیں ہو سکتی 324
ہدایت الٰہی ہی گمراہی سے بچاتی ہے 326
مشرکین کے اعمال سے بیزاری کا اعلان 327
ابراہیمؑ کا توحید پرست ہونے کا اعلان 329

ابراہیمؑ کا اپنی قوم کو جواب 330
مشرکین کے عقیدے کی رد میں دوسری دلیل 333
مومنین ہی کے لیے امن ہے 335
ابراہیمؑ کے لیے اللہ کی دلیل 337
انبیاءؑ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں 339
پیغمبروںؑ کی توصیف 340
لوگوں پر انبیاءؑ کی فضیلت 340
انسان کی ہدایت کا مسلسل انتظام 341
اللہ جسے چاہے اپنی ہدایت سے نوازتا ہے 343
انبیاءؑ کے لیے اللہ کی خاص ہدایت 344
انبیاءؑ کے راستے پر چلنے کا حکم 346
لوگوں کو اللہ کی صحیح معرفت نہیں 347
قرآن اللہ کی برکت والی کتاب 351
سب سے بڑے ظلم کے مصادیق 353
اللہ کے حضور انسان کی عاجزانہ حاضری 355
قادر مطلق خدا کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ 356
دن رات، سورج چاند، الٰہی نظام کا منہ بولتا ثبوت 357
دریا اور خشکی میں ہدایت کے لیے ستاروں کی آفرینش 358
انسانوں کی خلقت، اللہ کی وحدانیت کی دلیل 359
پانی اور نباتات کا نظام اللہ کی وحدانیت کی دلیل 360

الٰہی صفات میں مخلوق، خالق کے برابر نہیں.......... 362
مشرکین کے باطل عقیدے کا جواب.......... 362
اللہ تعالیٰ کی صفات جمالیہ.......... 363
اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا.......... 364
اللہ کی واضح نشانیوں سے عبرت لینا.......... 366
آیات الٰہی پر مشرکین کی حیرانگی.......... 367
پیغمبرؐ کو وحی کی پیروی کا حکم.......... 368
رسول خدا مشرکین کے اعمال کے ذمہ دار نہیں.......... 369
مشرکوں کے جعلی خداؤں کو برا نہ کہو.......... 370
مشرکین کی معجزہ لانے کی بے جا درخواست.......... 372
مشرکین کی سرکشی.......... 373
اللہ کی مشیت کے بغیر ایمان لانا ممکن نہیں.......... 374
انبیاء کے شرپسند دشمن.......... 375
مشرکین کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم.......... 377
فقط اللہ تعالیٰ ہی حَکم ہے.......... 378
دین اسلام اللہ کی کامل شریعت.......... 380
گمان کی پیروی الٰہی راستے سے ہٹانے کا سبب.......... 381
ہدایت یافتہ اور گمراہ کے متعلق اللہ کا علم.......... 382
اللہ کا نام لے کر ذبح کئے جانور کا گوشت ہی حلال ہے.......... 383
پاک ذبیحہ نہ کھانے پر تعجب!.......... 384

ظاہری اور باطنی گناہ سے منع......................385
ذبح شرعی نہ کیۓ گۓ جانور کے گوشت کا حکم......................386
گمراہ لوگ چلتی پھرتی لاشیں......................387
گناہگاروں کے سرداروں کے مکر وفریب......................388
ہادیوں کا انتخاب اللہ کا اختیار ہے......................389
ہدایت دینا اور گمراہ کرنا اللہ کا اختیار ہے......................391
اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ......................393
مومنین کے لیے اللہ کی ہدایت کا نور......................393
قیامت میں جن وانس کی گفتگو......................395
ظالموں کی پیروی کی سزا......................396
جنات اور انسانوں کا اپنی کوتاہیوں کا اقرار......................397
اللہ بے خبری کے عالم میں بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا......................398
انسان اور جنات کے درجات......................399
اللہ کی ذات ظلم سے پاک ہے......................400
الٰہی وعدہ کا حتمی تحقق......................401
اہل ایمان ہی حقیقی سعادت والے ہیں......................402
مشرکین کے غلط عقیدے کی سرزنش......................403
مشرکین کی کارستانیاں اور اس کا انجام......................404
مشرکین کے غلط اقدامات......................404
مشرکین کی اپنے اوپر حرام کی گئی چیزیں......................405

جہالت کی بنا پر اولاد کا قتل بڑا خسارہ........ 406
مختلف قسم کے درخت قدرت الٰہی کی نشانی........ 407
اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام نہ کرو........ 409
حلال جانور........ 410
سب سے بڑے ظالم........ 411
مفید جانور حلال ہیں........ 412
یہودیوں پر مفید جانور حرام کرنے کی وجہ........ 413
رسولؐ کو جھٹلانے والوں کے لیے واضح بیان........ 414
مشرکین کی دلیل کا جواب........ 415
اللہ تعالیٰ کی حجت کاملہ........ 416
مشرکین سے گواہ لانے کا مطالبہ........ 417
شرائع الٰہی میں حرام چیزیں........ 418
الٰہی ادیان میں دیگر حرام شدہ اعمال........ 420
الٰہی راستے کی پیروی........ 423
ادیان الٰہی میں مشترک امور........ 424
قرآن کریم برکت والی آسمانی کتاب........ 425
سابقہ امتوں پر کتاب نازل ہونے کی بات........ 426
آیات الٰہی سے منہ موڑنے والے........ 427
حق واضح ہونے کے بعد ایمان لانا بے سود عمل........ 427
دین میں اختلاف کرنے والوں سے بیزاری........ 429

نیکی کا دس گنا بدلہ.......................................430
دین حنیف کی پیروی.......................................431
جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے.......................................431
اللہ کا کوئی شریک نہیں.......................................432
توحید پر تین استدلال.......................................433
انسانوں کے مراتب آزمائش کا وسیلہ.......................................434
سورۃ الاعراف.......................................436
سورہ کے مطالب.......................................436
قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب.......................................437
کتاب ہدایت قرآن کی پیروی.......................................438
الٰہی قانون.......................................439
مجرموں کا اعتراف.......................................440
اللہ کی بازپرس.......................................440
علم الٰہی کا تقاضا.......................................441
اعمال کے مطابق کامیابی یا ناکامی.......................................442
ہلکے پلڑے والے.......................................444
ناشکرا انسان.......................................444
انسان کے لیے فرشتوں کا سجدہ.......................................445
ابلیس کا سجدہ نہ کرنا.......................................446

ابلیس کی جنس 446
ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کا جواز 447
ابلیس کا قدسیوں سے ہبوط 449
شیطان کا مہلت مانگنا 450
ابلیس کی درخواست کی قبولیت 450
ابلیس کا گستاخانہ اعلان 451
ابلیس کا طریقہ واردات 452
شیطان کا مقام قرب سے نکالا جانا 455
جنت میں حضرت آدمؑ وحوا کی سکونت 456
شیطان کا بہکاوا 457
ابلیس کا آدمؑ وحوا کو دھوکہ دینے کا طریقہ 459
ابلیس کی دھوکہ دہی میں کامیابی 460
آدمؑ وحوا کو اللہ کی نداء 460
آدمؑ اور حوا کی اللہ سے معافی کی درخواست 461
اللہ کا آدمؑ وحوا کے لیے نیا فرمان 462
زمین پر رہنے کی تفصیل 463
انسانوں پر اللہ کا احسان 464
تقویٰ کا لباس 465
شیطان کے دھوکے کا خطرہ 466
آدمؑ وحوا کے لباس اُتارے جانے کا مطلب 466

شیطان اور اس کے اعوان و انصار 467
انسان کی اپنے جرائم کے لیے عذر تراشیاں 468
ایک شبہ کا ازالہ 469
عدل پر مبنی اللہ کے احکام 470
آخرت میں انسانوں کے دو گروہ 471
غیر ہدایت یافتہ کا خود کو ہدایت یافتہ خیال کرنا 472
مساجد میں اچھا لباس پہننا اور اسراف سے منع 473
ایمان لانے والوں کا اعزاز 474
مومن اور کافر کا امتیاز 475
اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزیں 476
دینی محرمات کا حکم 477
ہر شخص کی موت کا مقررہ وقت 478
رسولوں کا بھیجا جانا 478
آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا انجام 480
کافروں کا انجام 480
گمراہوں کا ایک دوسرے سے اعلان بیزاری 482
بعد والوں کے ساتھ پہلے والوں کی گفتگو 483
آیات الٰہی کو جھٹلانے والے بہشت سے محروم 484
گناہگاروں کیلئے جہنم 485
نیک عمل انجام دینے والے بہشتی مومنین 486

اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت کا تذکرہ 487
قیامت کے دن مومنوں کا مقام 487
جنتیوں کا جہنمیوں سے مکالمہ 490
خصوصی سزائیں 491
مومنین کی گفتگو کا انداز 491
فطری دین کا انکار 493
مقام اعراف 494
اصحاب اعراف کی دعا 496
دوزخیوں سے اصحاب اعراف کی گفتگو 497
اہل جنت کی شان 498
جہنمیوں کا بہشتیوں سے سوال 499
دین کو کھیل تماشا قرار دینے والے 500
کتاب مبین کی حقانیت 501
قرآن میں بیان شدہ مطالب کی تصدیق 502
خلقت کائنات اور اقتدار الٰہی 504
اللہ کو پکارنے کا طریقہ 508
زمین میں فساد پھیلانے سے منع 509
اللہ سے انسان کا رابطہ 509
اللہ کی ربوبیت پر دلیل 511
زرخیز اور بنجر زمین میں فرق 513

حضرت نوحؑ کی دعوت.......................................514
قومِ نوحؑ کے بڑوں کا جواب.......................................514
نوحؑ کا اپنی قوم کو جواب.......................................515
نوحؑ کا اپنی قوم کو بات سمجھانا.......................................517
نوحؑ کی دعوت کو جھٹلانے کا انجام.......................................518
ھودؑ کا اپنی قوم میں پیغام الٰہی پہنچانا.......................................519
ھودؑ کی دعوت کا جھٹلایا جانا.......................................520
ھودؑ کا اپنی قوم کے بڑوں کو جواب.......................................521
ھودؑ کا اپنی رسالت کا اعلان.......................................522
ھودؑ کا اپنی قوم کی حیرانگی کا جواب.......................................523
قومِ ھودؑ کا مطالبہ.......................................524
اپنی قوم کے مطالبے پر ھودؑ کا جواب.......................................524
قومِ ھودؑ پر عذاب الٰہی.......................................525
قومِ ثمود کا تذکرہ.......................................527
اپنی قوم کو صالحؑ کا تذکر.......................................528
قوم کے بڑوں کی بات.......................................529
متکبروں کا کمزور طبقہ کو جواب.......................................530
قوم صالحؑ کا الٰہی امر کی مخالفت.......................................530
مجرموں پر عذاب.......................................531
قومِ صالحؑ پر عذاب کے وقت اعلان.......................................532

لوطؑ کا اپنی قوم میں تبلیغ کرنا 532
اہل سدوم کی برائی بارے تفصیل 533
قومِ لوط کا جواب 535
لوطؑ کے گھرانے کا عذاب سے محفوظ رہنا 535
قوم لوط پر عذاب الٰہی 536
اہل مدین کے لیے شعیبؑ کی بعثت 537
شعیبؑ کا اپنی قوم کو برے اعمال سے روکنا 539
شعیبؑ کا فیصلہ کن اعلان 540
قومِ شعیبؑ کے بڑوں کا اعلان 542
کفار کو مومنین کا جواب 543
مومنین کو منکرین کی دھمکی 545
شعیبؑ کو جھٹلانے والوں پر عذاب الٰہی 546
شعیبؑ کا کافروں کی ہلاکت پر تبصرہ 547
الٰہی آزمائش کا قانون 548
ظالموں کا اللہ کی گرفت آجانا 549
ایمان اور تقویٰ کے ثمرات 550
برکات کا معنی 550
عذاب الٰہی سے خود کو محفوظ سمجھنے والے 552
اللہ کے عذاب کا خوف 552
اللہ کی پکڑ سے خود کو محفوظ نہ سمجھو 553

ہلاک ہونیوالوں کے جانشینوں کے لیے بیان 554

ہلاک شدگان کے حالات بیان کرنے کا فلسفہ 555

عہد شکنی کرنے والے 555

موسیٰؑ کی بعثت 556

موسیٰؑ فرعون کے دربار میں 557

موسیٰؑ کا فرعون سے دوٹوک مطالبہ 558

فرعون کا موسیٰؑ سے معجزہ کا مطالبہ 559

موسیٰؑ کا معجزہ عصاء 559

ید بیضاء 560

فرعون کے درباریوں کا ردعمل 560

فرعونیوں کا موسیٰؑ کو جھٹلانا 561

موسیٰؑ کے متعلق فرعون کا فیصلہ 561

مقابلے کے لیے جادوگر لانے کا مشورہ 562

جادوگروں کا فرعون کے پاس آجانا 563

جادوگروں کے لیے کامیابی پر انعام کا اعلان 563

موسیٰؑ اور جادوگر مقابلے کے میدان میں 564

جادوگروں کو میدان میں اُترنے کی دعوت 564

مقابلے کا انجام 565

جادوگروں کا اللہ پر ایمان لانے کا اعلان 566

جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کا ردعمل 567

مومن جادوگروں کا فرعون کی سزا پر ردعمل........ 568
مشیروں کا فرعون کو اشتعال دلانا........ 570
موسیٰؑ کا اپنی قوم سے خطاب........ 571
بنی اسرائیل کا موسیٰؑ کے پاس شکوہ........ 572
فرعونیوں کے لیے قحط کا عذاب........ 574
فرعونیوں کا ایمان لانے سے انکار........ 575
فرعونیوں پر مختلف قسم کے عذاب........ 576
فرعونیوں کی موسیٰؑ سے مدد کی درخواست........ 577
فرعونیوں کی پیمان شکنی........ 577
فرعونیوں کا غرقِ آب ہونا........ 578
بنی اسرائیل کی کامیابی اور فرعونیوں کی بربادی........ 579
بنی اسرائیل کی جاہلانہ خواہش کا جواب........ 581
بنی اسرائیل پر اللہ کا احسان........ 582
موسیٰؑ کا اللہ کی خاص عبادت میں مصروف رہنا........ 583
حضرت موسیٰؑ کا خلیفہ........ 584
رب تعالیٰ کے دیدار کی خواہش........ 585
موسیٰؑ کے نزدیک رویئت الٰہی کا معنی........ 586
موسیٰؑ کے لیے اللہ کا خصوصی انعام........ 588
موسیٰؑ کو دی جانے والی الواح........ 589
متکبرین کی سزا........ 590

مستکبرین کے حالات 591

مستکبرین کا انجام 591

عمل کی جزاء 592

قوم موسیٰؑ کی گوسالہ پرستی کا واقعہ 593

بنی اسرائیل کی پشیمانی 594

گوسالہ پرستی پر موسیٰؑ کا ردعمل 595

حضرت موسیٰؑ کی دعا 597

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی سزا 598

گناہوں کے بعد توبہ کا اثر 599

توبہ کی قبولیت 600

موسیٰؑ کے پاس ہدایت کے نسخے 600

موسیٰؑ منتخب افراد کے ہمراہ وعدہ گاہ پر 602

بہترین اخروی مقام کی خواہش 604

آیات الٰہی پر ایمان 605

آیات الٰہیہ کا بیان 606

رسول اللہؐ کی پیروی 607

رسول اسلامؐ کی عالمی رسالت 608

دین اسلام کی عمومیت 610

بنی اسرائیل کے نیک لوگ 610

بنی اسرائیل کی نافرمانی 611

سرزمین عمالقہ میں داخلے کا حکم 614
کلمہ الٰہی کو بدل دینا 615
بنی اسرائیل کا امتحان 616
وعظ و نصیحت کی بات 617
نہی عن المنکر کا فریضہ 618
نافرمانوں کے لئے عذاب 618
نافرمانوں کا بندر ہو جانا 620
نیک اور صالح افراد 621
بنی اسرائیل میں نیک لوگوں کے جانشین 622
کتاب کو تھامنا اور نماز قائم کرنا 624
بنی اسرائیل کے لیے پہاڑ کا اٹھ جانا 626
روز الست کا میثاق 627
اجداد کے عقائد اور عمل کا بہانہ 629
آیات کی تفصیل کی غرض 630
بلعم باعور کا واقعہ 631
خواہشات کی پیروی کرنے والے 632
آیات کو جھٹلانے والے 633
ہدایت اور گمراہی اللہ کی جانب سے ہے 634
جن و انس کیلئے جہنم 635
اللہ کے اسماء الحسنٰی 637

ہدایت دینے والی اُمت.. 638
آیات کو جھٹلانے والے.. 639
منکروں کو مہلت دینا.. 640
ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں.. 641
آسمانوں اور زمین کے ملکوت.. 642
قرآن سے ہدایت نہ لینے کے بارے.. 643
قیامت کا علم.. 644
رسول اللہؐ اور علم غیب.. 646
انسان کی خلقت.. 647
نیک اولاد.. 648
نوع انسانی کی کیفیت.. 649
اللہ کے شریک بنانے کی نفی.. 650
جھوٹے معبود.. 650
بتوں کی حالت.. 651
اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی مثال.. 651
بتوں کی حالت.. 652
پیغمبرؐ کی سرپرستی.. 653
بتوں کی کیفیت.. 654
عفو ودرگزر اور نیکی کرنے کا حکم.. 654
شیطان سے پناہ.. 656

شیطان سے بچنے والے..657
گمراہ ساتھی..658
ہدایت کا انتظام..659
قرآن کو توجہ سے سننا..660
مقربین درگاہ رب تعالیٰ..661

سورۃ الانفال..664
سورہ کے مطالب..665
انفال کے بارے میں..665
مومن کا تعارف..666
نماز اور انفاق..668
حق کا تعارف..669
قریش کے دو گروہوں کا جھگڑا..670
حق کا اثبات..672
فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد..673
مومنین کے لیے بشارت..674
اللہ کی مہربانیاں..675
کافروں کی سزا..677
میدان جنگ سے بھاگنے سے منع..678
جنگ سے فرار کرنے کا نتیجہ..678

جنگ بدر میں اللہ کی مدد 680
کافروں کی ذلت 682
مشرکوں سے خطاب 683
اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت 684
مومنوں کے لئے خطاب 685
کافروں کی مذمت 686
کافروں کی حالت 686
مومنوں کو اطاعت کی دعوت 687
حیات کا آخری مرحلہ اور نعمت کا کمال 688
ظالموں کا انجام 690
اللہ کے احسان کا شکر 693
امانت داری 694
اموال اور اولاد کی بات 696
حق و باطل میں امتیاز کی قوت 697
کافروں کی سازشیں 698
آیات الٰہی کی تلاوت پر کافروں کا ردعمل 699
عذاب اُتارنے کی درخواست 700
عذاب الٰہی کے بارے 701
مسجد الحرام سے روکنا 703
بیت اللہ کے سامنے کفار کی نماز 704

کافروں کا انجام 705
خبیث اور طیب کی جدائی 706
کفر سے نہ رُکنے والوں کا انجام 707
جنگ کا حکم 708
اللہ کی ولایت 709
خمس کا حکم 710
اللہ کی مشیت اور اس کا فیصلہ 712
پیغمبرؐ کے لیے حوصلہ افزائی 715
مومنین کی امداد کا انداز 716
دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ہدایات 717
اوامر الٰہی کی اطاعت 718
عمل میں دکھاوا اور غرور کا نقصان 720
شیطان کی کارروائی 722
منافقوں کی چال 723
فرشتوں کا کافروں پر قہر 725
آل فرعون کی مثال 726
نعمت الٰہی کی برقراری اور تبدیلی 727
فرعونیوں کی ہلاکت 728
بدترین جانور 729
معاہدہ شکن لوگ 730

یہودیوں کے ساتھ رویہ.................................731
عہد شکنوں کے ساتھ رویہ.................................731
کافروں کا رویہ.................................732
دشمن کے خلاف جنگ کی تیاری.................................733
معاشرے میں صلح کی اہمیت.................................736
اللہ کی مدد کافی ہے.................................738
اللہ کی تائید و نصرت.................................738
اللہ کا مومنوں کے دلوں کو جوڑنا.................................739
پیغمبرؐ کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی.................................742
جہاد کی تشویق.................................743
صبر کرنے والوں کے بارے میں.................................745
دنیا اور آخرت کا تقابل.................................747
اللہ کا فیصلہ.................................749
جنگی غنائم اور فدیہ.................................749
کافر اسیروں کے بارے میں.................................750
اسیروں کی خیانت.................................751
مومنین کی ایک دوسرے پر ولایت.................................752
کافروں کی ایک دوسرے پر ولایت.................................753
مہاجرین اور انصار کے بارے میں.................................754
پہلے مہاجرین کے بعد والے مہاجر.................................755

سورۃ المائدۃ

(مدنی۔ کل آیات 120)

سورہ کے مطالب:

اس سورہ میں عہد و پیمان کی وفاداری، عہد و پیمان توڑنے کے خطرات، متقین کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت اور انعام، ایمان اور نیکی کی دعوت اور احکام الٰہی کی مخالفت پر سزا، ظلم و زیادتی اور نافرمانی سے خبردار کرنا اور شرعی حدود، قصاص اور بنی اسرائیل کے مظالم اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے دین کے کمال کا تذکرہ اور دین اسلام کے مستقبل کا بیان۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ درج ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ﴿۱﴾

”اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو، تمہارے لیے چوپائے مویشی حلال ہیں سوائے ان کے جو تمہیں آگے سنائے جائیں گے مگر شکار کو احرام کی حالت میں حلال نہ جانو، اللہ جو چاہے حکم دیتا ہے۔“

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو

''عقد'' ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ باندھ دینے کو کہتے ہیں۔ جب تک وہ گرہ نہ کھلے تو جن دو میں گرہ باندھی گئی وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گے۔ یہ لفظ محسوسات اور معنویات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کاروباری اور تجارت کے معاملات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اسے معاہدہ کہتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اپنے بندوں سے جو معاہدے ہیں تو وہ اس کا دین ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ دین کے ارکان جن میں توحید، نبوت اور معاد ہے ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح عبادات اور معاملات سے متعلق احکام چاہے وہ آغاز ہی سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہو یا پہلے سے موجود قانون کی اللہ تعالیٰ نے تائید کی ہو سب کو شامل ہے۔

یہ امور جن کی وفاداری کا کہا جا رہا ہے یہ انسان کی پوری زندگی سے عبارت ہیں، یہ کبھی بھی انسان اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ فرد ہو یا سوسائٹی دونوں پر معاہدہ اور عہد کی پابندی ضروری ہے، جتنی بھی بڑی طاقتیں ہیں وہ جب عہد کو توڑتی ہیں تو اس عمل سے عدالت کا نقصان ہوتا ہے۔ اگر اجتماع اور سوسائٹی میں عدالت کے اس بنیادی رکن کی رعایت کی جائے تو یہ انسان کو بندگی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ دینِ حق کی منطق یہی ہے کہ اجتماعی حقوق کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے اور ہر لحاظ سے عدالت قائم کی جائے کیونکہ اجتماع اور سوسائٹی کے منافع عدل کے قیام سے وابستہ ہیں۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک اور مستکبرین جو خود کو جمہوریت کا چیمپئن سمجھتے ہیں، سوشلسٹ ہیں، مادہ پرست ہیں وہ ہمیشہ اپنی قوم کے منافع کو مدنظر رکھتے ہیں اُن کی حفاظت کرتے ہیں دوسروں کے ساتھ اگر معاہدہ کر بھی لیں تو معاہدہ توڑ دیتے ہیں اور اپنی سوسائٹی کی اُنہیں فکر ہوتی ہے کسی اور کی فکر نہیں ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طاقتور ممالک کمزور ممالک کے ساتھ جو عہد و پیمان باندھتے ہیں اُس کو پامال کرتے ہیں فقط اتنی

پابندی کرتے ہیں جتنی ان کے اپنے ملک کے مفاد میں ہو اور اس کے لیے اگر انہیں چھوٹی قوموں کو کمزور کرنا پڑے اور انہیں ضعف کے گڑھے میں پھینکنا پڑے تو اسکی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

حلال وحرام گوشت جانور

اس کے بعد چار پاؤں کے گوشت کے متعلق بیان کیا گیا ہے ان میں سے جن کو استثناء کیا گیا ہے ان کا گوشت کھانا حرام ہے باقی تمہارے لیے حلال ہیں۔ جس نے عمرے کا احرام باندھا ہوا ہے اور جو احرام کی حالت میں ہے اس پر شکار کھیلنا ممنوع ہے، اگر احرام کھل جائے تو شکار کرنا جائز ہے۔

یہ جان لو اللہ تعالیٰ کا حکم وہی ہے جو وہ صادر کرتا ہے۔ کہا گیا کہ حلال جانور کا گوشت آپ کے لیے مباح اور حلال ہے مگر وہ جانور جن کی حرمت کو بیان کیا گیا ہے اسی طرح حلال گوشت جانور کا گوشت احرام کی حالت میں حرام ہو جاتا ہے۔ جیسے ہرن، گائے اور دوسرے جانور ہیں۔ اس صورت میں ان کا گوشت کھانا تمہارے لیے حلال نہیں ہے، جو بھی حکم اللہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے اس میں تمہاری مصلحت اور منفعت مد نظر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ

التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

"اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کو (بے حرمتی والے کاموں کے لیے) حلال نہ سمجھو اور نہ حرمت والے مہینے کو اور نہ حرم میں قربان ہونے والے جانور کو اور نہ ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کی طرف آنے والوں کو جو اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشی ڈھونڈتے ہیں، اور جب تم احرام کھول دو پھر شکار کرو، اور تمہیں اس قوم کی دشمنی جو کہ تمہیں حرمت والی مسجد سے روکتی تھی اس بات کا باعث نہ بنے کہ زیادتی کرنے لگو، اور آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مومنین سے گفتگو کی ہے اور تاکید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اللہ کی جانب سے حرام شدہ چیزوں کو مومنین تک پہنچایا جائے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو حرمات ہیں، جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاں محترم ہیں اُن کی ہتک حرمت مت کرو، ان کا احترام کرو۔" شعائر" نشانی کے معنی میں ہے،"شعائر اللہ" وہ چیزیں جو اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ بنتی ہیں اور وہ اللہ کے ہاں محترم ہیں۔ کعبۃ اللہ، احرام کی حدود، خود احرام باندھنا، حج کے جتنے بھی مقامات ہیں مکہ، عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور مسجد الحرام، صفا و مروہ سب شعائر اللہ ہیں، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کے وسائل ہیں۔ اس

طرح شعائر، شعیرہ کی جمع ہے جسے علامت کے معنی میں لیا جاتا ہے لیکن یہاں پر شعائر سے حج کے مناسک مراد ہیں، حج کے جو اعمال بجالائے جاتے ہیں اُن کو شعائر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

''الشَّهْرَ الْحَرَامَ'' حرام مہینے یعنی جن مہینوں میں جنگ و جدل کرنا حرام ہے، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور ماہ رجب ہیں۔ ''الْهَدْيَ''وہ جانور جسے انسان اپنے شہر سے قربانی کے لیے مکہ کی طرف لے آتا ہے، ''الْقَلَآئِدَ'' کلادہ کی جمع ہے جس کا معنی ہے گردن بند۔اس جگہ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو نشانی کے طور پر حیوان کی گردن میں ڈال دی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو یہ حیوان قربانی والا ہے جیسے جوتا یا جوتے کی مانند ہر وہ چیز جو حیوان کی گردن میں ڈالی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ حیوان قربانی والا ہے تاکہ اُس حیوان سے کوئی متعرض نہ ہو۔پھر فرمایا کہ جب تم احرام کی حالت سے نکل آؤ تو پھر تمہارے لیے شکار کرنا جائز ہے اور اس کا بڑا اخروی اجر ہے ۔ بعد والی نہی سے اباحت استفادہ ہوتی ہے نہ کہ وجوب۔احرام سے نکلنے کے بعد یہ شکار واجب نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا''

آپ کے ساتھ ایک قوم کی دشمنی اور یہ کہ انہوں نے تمہیں مسجد الحرام میں داخل نہیں ہونے دیا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے دے کہ تم اُن پر زیادتی کرو۔ جو خانہ خدا کی طرف آرہا ہے خواہ وہ مادی فوائد لینے کے لیے آرہا ہو یا اخروی فوائد لینے کے لیے تو اس کے بارے میں کہا ہے کہ بیت الحرام میں اُس کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے، اُس کے لیے رکاوٹ نہیں کھڑی کرنی چاہیے، اُس کو امن ملنا چاہیے۔اب جب خدا نے تمہیں اُن پر غلبہ دیا ہے تو متوجہ رہو، ظلم اور زیادتی کے مرتکب نہ ہو۔

''الْبِرِّ''یعنی نیکی اور اچھائی، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے کہ خدا اور روز جزاء پر ایمان ''بر'' نیکی کے معنی میں ہے (سورہ البقرہ آیت ۱۷۷) تقویٰ کا معنی ہے اپنے

آپ کو بچائے رکھنا، اپنے اوپر نظر رکھنا اللہ کے اوامر اور نواہی کی پابندی کرنا۔ نیکی اور تقویٰ کے لیے تعاون کی بازگشت اس چیز کی طرف ہے کہ اُمت اسلامی کے ایمان لانے اور عمل صالح انجام دینے سے ساری چیزیں پھوٹتی ہیں، اس سے اجتماعی تقویٰ اور اجتماعی اصلاح مد نظر ہے۔ اس کے مد مقابل گناہ پر تعاون کرنا ہے۔ برا عمل جو سعادت مند زندگی اور ترقی میں رکاوٹ بنتا ہے اور عدوان پر تعاون دوسروں کا حق پامال کرنے اور اُن کے ساتھ زیادتی کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دینا، اُن کے امن کو خراب کرنے اور ان کے سکون کو تباہ کرنے اور اُن کی آبروریزی کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنا۔ اللہ تعالیٰ ایسے اعمال سے منع فرماتا ہے اور بار بار اس کی تاکید کرتا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ کی پرواہ کرو، اللہ سے ڈرتے رہو، اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے دل سے پوچھو، اپنے باطن میں جستجو کرو جو عمل تمہارے اندر سکون کا باعث بنے، جس سے آپ کا نفس مطمئن ہو تو وہ نیکی ہے اور جس سے تمہارا دل گریزاں ہو اور تمہارا باطن اسے ناپسند کر رہا ہو یا اس کے بارے شک میں پڑ جاؤ تو جان لو کہ وہ گناہ ہے۔ اگرچہ لوگ تمہیں اس عمل کو انجام دینے کا آرڈر ہی کیوں نہ دیں اور فتویٰ ہی جاری کیوں نہ ہو۔ نیز حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ وہ چیز جس سے آپ کا نفس گریزاں ہے اسے چھوڑ دو۔ دوسری حدیث میں آیا ہے۔ برے عمل کے انجام دینے سے اندر سے غمگین ہو جانا اور نیک عمل انجام دے کر خوشحال ہو جانا اور باطنی مسرت محسوس ہونا مومن کی علامات میں سے ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے نیکی، حُسن خلق اور گناہ وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق تیرا نفس گریزاں ہے اور تم نہیں چاہتے ہو کہ لوگوں کو تمہارے اس عمل کے بارے میں علم ہو۔

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ‌ ذٰ لِكُمۡ فِسۡقٌ‌ اَلۡيَوۡمَ يَـئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡـنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ‌ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِىۡ مَخۡمَصَةٍ غَيۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ‌ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۳

”تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو گلا دبا کر یا چوٹ سے یا بلندی سے گر کر یا سینگ مارنے سے مر گیا ہو اور وہ جسے کسی درندے نے پھاڑ ڈالا ہو مگر جسے تم نے ذبح کر لیا ہو، اور وہ جو کسی تھان (پرستش گاہوں) پر ذبح کیا جائے اور وہ (جن کے حصے) جوئے کے تیروں سے تقسیم کرو، یہ (سب کچھ) گناہ ہے، آج تمہارے دین سے کافر نا اُمید ہو گئے سو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے، پھر جو کوئی بھوک سے بے تاب ہو جائے لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے“۔

حرام چیزیں

اس آیت کے ایک حصہ میں حرام چیزیں بیان کی گئی ہیں کہ کون کون سی چیزیں حرام ہیں۔ آیت میں بیان شدہ حرام چیزیں درج ذیل ہیں: مردار وہ جانور جو ذبح کے بغیر مر جائے، خون، خنزیر یہ خود نجس ہے اور ایسا حیوان جسے ذبح تو کیا گیا ہو لیکن اس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یہ سب حرام ہیں۔ بعد والے پانچ مورد جو بیان ہوئے ہیں ان میں وہ حیوان جس کو گلا دبا کر مارا گیا ہو یا اس کے جسم کے کسی حصے پر ضرب لگانے سے مر گیا ہو یا بلندی سے نیچے گرنے سے مر گیا ہو یا حیوانات کے سینگ لڑنے سے مر گیا ہو یا پرندوں کا شکار کرتے وقت اور وہ مر گیا ہو، یہ سب حرام کے مصداق ہیں۔ آخر میں ایک استثناء کیا گیا ہے اگر ان حیوانوں میں سے کسی کو زندہ پاؤ اور ان کو اللہ کا نام پڑھ کر ذبح کرو تو یہ تمہارے لیے حلال ہوں گے۔ اگر زندگی کی چار رگیں کاٹی جائیں تو اس صورت میں حلال ہیں اگر چھری سے چار رگیں کاٹی جائیں اور اللہ کا نام لیا جائے اور ذبح کرتے وقت حیوان کو قبلہ رُخ لٹایا جائے اس طرح کہ اس کا اگلا حصہ منہ اور ٹانگیں پیٹ قبلہ کی جانب ہوں تو اس صورت میں وہ حلال ہے۔

''نصب'' کسی چیز کو بلند جگہ پر رکھنا اور ''نُصُب'' ''نصیب'' کی جمع ہے جس کا معنی ہے حصہ، یہ زمانہ جاہلیت میں ایک پتھر ہوتا تھا جس کی لوگ پوجا کرتے تھے اور کعبہ کے گرد ان بتوں کو رکھا ہوا تھا اور اپنے حیوانات کو اُن کے پاس لے آتے تھے اور اُن کے اوپر ان کو ذبح کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کام سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس طرح ذبح شدہ حیوان کا گوشت کھانا حرام ہے۔ ''اَزْلَام'' خاص قسم کی لکڑیوں کو کہتے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں بنائی جاتی تھی اور جن کے ذریعے جوا کھیلا جاتا تھا اور جوا کے حصے کو آپس میں تقسیم کرنے کے لیے اس لکڑی کو استعمال کیا جاتا تھا، وہ حیوان کے حصے بناتے تھے اور ان حصوں میں سے کس کا کتنا حصہ ہے اس کو تشخیص دینے کے لیے لکڑیوں کو ایک دوسرے کے

اوپر رکھتے پھر ان کو باہر نکالتے تھے اور اس طرح اس گوشت کو تقسیم کرتے تھے۔ اللہ فرمارہا ہے کہ اس طرح کی تقسیم جائز نہیں ہے، یہ گناہ ہے۔

'' ذٰلِكُمْ فِسْقٌ '' کے بارے دو احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ سابقہ تمام فقروں کو شامل ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ آخری دو فقروں کو شامل ہے، دوسرے احتمال کی دلیل یہ ہے کہ '' اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ '' والے جملے نے پیچھے بیان کی ہوئی چیزوں کو علیحدہ کر دیا ہے، دوسرا احتمال زیادہ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ بیان ہوا ہے تمہارے لیے آسان کیا ہے۔ اگر جانور زندہ مل جائے اور تم اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرو جس طرح تمہیں اللہ کی طرف سے ہدایت دی گئی ہے تو پھر وہ تمہارے لیے حلال ہو گا۔

اکمال دین پر کافروں کی مایوسی

'' اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ '' اس آیت کے شروع میں حرام غذاؤں کا ذکر ہوا ہے اور آیت کے آخری حصے میں ایک استثناء ہوا ہے کہ اگر کوئی مجبوری کے تحت ان میں سے کچھ کھا لیتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، یہ عبارتیں کامل اور پوری ہیں لہٰذا درمیان میں جو جملہ آرہا ہے وہ جملہ معترضہ ہے اس کا آیت کے شروع اور پایان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ اس جملہ کو دوسرے دو جملوں کے ساتھ قرار دیں یا وحی لکھنے والوں نے ایسا کیا۔ ہر صورت اس کا تعلق ہماری بحث سے نہیں ہے کہ جن حیوانات کا گوشت کھانا حرام ہے اس کا پہلی سورتوں میں بھی ذکر ہوا ہے، یہ ایسا امر نہیں ہے کہ جس سے دین کامل ہو گیا ہو اور کافر اس کی وجہ سے مایوس ہو گئے ہوں۔ حیوانات کے گوشت کا جائز یا حرام ہونا اس بات کا سبب نہیں ہوا کہ کفار اپنے مقاصد سے مایوس ہو گئے ہوں۔

غدیر خم کا واقعہ

اس پر تقریباً اتفاق ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ یہ آیت اٹھارہ ذوالحجہ 10 ہجری کو اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس جا رہے تھے اور غدیر خم پر حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کیا تھا۔ غدیر خم کی روایت متواتر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا دن تھا جس میں بہت بڑی خبر تھی اور بے حساب فائدے تھے، اس دن کفار کا دین کے زائل ہونے کے متعلق مایوس ہونا بنتا ہے کیونکہ کفار کی آرزو تھی کہ جب تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود رہیں گے یہ دین رہے گا لیکن جیسے ہی وہ مریں گے تو یہ دین زوال پذیر ہو جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انکے ولی، جانشین اور امام منصوب کر کے اس دین کے آخری زمانے تک باقی رہنے اور اس کے تسلسل اور حفاظت کے اسباب فراہم کر دیئے۔ یقینی امر ہے کہ یہ ایک ایسی بات تھی کہ جس سے کافر مایوس ہو گئے۔ یہ جو اللہ نے فرمایا ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ'' یہ ایک نہی ارشادی ہے کہ اللہ تعالیٰ راہنمائی فرما رہا ہے کہ اب تم کفار سے نہیں ڈرو کیونکہ وہ مایوس ہو گئے ہیں انہیں سمجھ آ گئی ہے کہ یہ دین ختم ہونے والا نہیں ہے اس کی حفاظت کرنے والوں کا تقرر ہو گیا ہے اور ایک ادارہ بنا دیا گیا ہے جس کے سربراہ اور امام کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے اور آخری امام کے بارے میں بھی بتا دیا گیا کہ ان کی آمد سے پوری زمین پر اسلام کا نفاذ ہو گا۔ لہٰذا اب تمہیں اگر کسی چیز کا ڈر ہونا چاہیے تو اللہ سے ڈرو، کوئی ایسی غلطی نہ کرو جس سے ذلت و خوارگی کا سامان مہیا ہو جائے اور کفار تمہارے اوپر مسلط ہو جائیں۔ اس جملے میں خاص ڈر سے دین کے نور کے خاموش ہو جانے کا ڈر مراد ہے، اس بات سے ڈرو کہ اللہ کی یہ نعمت چھن جائے اور کفار کے ہاتھوں میں آ جائے۔ خدا کسی بھی وجہ سے اس نعمت کو زائل نہیں کرے گا مگر یہ کہ تم خود نعمت کا کفران کرو۔

اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلنے کے اسباب مہیا نہ کریں، مسلمانوں کی عزت اور عظمت اسی میں ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کے جانشین اور اُن کے بنائے ہوئے قائم مقام جو اللہ کے حکم سے آپ کے جانشین بنے ہیں، کی اطاعت میں آجائیں تاکہ ان کی عزت وآبرو ہمیشہ باقی رہے۔

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام

''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ'' یہ جملہ پہلے جملے سے متصل ہے اور اسی کے ساتھ ہی اس کا تعلق ہے یہ جملہ اسی جملہ معترضہ کا تتمہ ہے۔ اتمام اور اکمال معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں، کسی چیز کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اُس کے وجود میں آنے کی غرض حاصل ہو جائے اور تمام کا معنی یہ ہے کہ جس چیز کے بہت سارے اجزاء ہوں اس کے سب اجزاء مکمل ہو جائیں اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہے۔ دین کے کامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی احکام اور معارف ہیں وہ سب کامل اور پورے بتا دیے گئے ہیں اور اتمام حجت یعنی ولایت علیؑ کا اعلان بھی ہو گیا تو یہ ایک معنوی نعمت ہے۔ کسی چیز کے لیے ''نعمت'' وہ امور ہوتے ہیں جو اس کی طبیعت کے مناسب اور موافق ہوں اور ان امور کو اس سے روکا نہ جائے۔

انسان کے لیے وہ ساری چیزیں نعمت ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے جو اسے اللہ کے قریب کرتی ہیں۔ دین اس حوالے سے نعمت ہے کہ یہ انسان کو اللہ کے قریب کرتا ہے۔ دین میں رسول پاک ﷺ کی نبوت و رسالت کے خاتمے کے بعد امامت کا سلسلہ باقی رہنا اسلام کے لیے خیر وبرکت کا ذریعہ ہے۔ نعمت کے مقابلے میں نقمت ہوتی ہے، اگر انسان اپنے وسائل کو اللہ کے قرب اور عبودیت کے لیے استفادہ نہ کرے اور نعمت کو غلط طریقے پر استعمال کرے اور خدا سے جدائی اختیار کرلے تو یہ پھر امر عذاب اور نقمت کا سبب ہو

گا لہذا انسان کو چاہیے کہ نعمت کو اللہ کی بندگی کے راستے میں خرچ کرے اور اس میں عبودیت کی رُوح ڈالے اور اللہ کی ولایت کے تحت جو کہ رب تعالیٰ کی تدبیر ہے اپنے بندوں کے تمام معاملات کے لیے یہ اسی وقت نعمت ہو گی جب یہ اس پر عمل کرے گا۔

اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کی حقیقی نعمت ولایت الٰہی ہی ہے۔ پس دین اسلام ولایت اللہ، ولایت رسول اور ولایت صاحبان امر پر مشتمل ہے اور یہ اللہ کی طرف سے نعمت ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے جس کا دوسری نعمتوں کے ساتھ تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے فرمایا نعمت کو ہم نے پورا کر دیا کیونکہ اپنے بندوں پر اللہ کی ولایت، رسول اللہ ﷺ کی ولایت کے بغیر پوری نہیں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ کی ولایت، اولوالامر کی ولایت کے بغیر کامل نہیں ہوتی یعنی اولوالامر کی ولایت تمہیں رسول ﷺ تک پہنچائے گی اور ولایت رسول ولایت خدا تک پہنچائے گی۔ ولی کے انتخاب کے بعد جب آنحضرت کی رحلت ہو گی تو اللہ کے حکم سے تمام امور کی باگ ڈور اولوالامر کے ہاتھ میں ہو گی۔ سورہ النساء کی 59 آیت میں گزر چکا ہے اور اسی سورہ کی آیت 55 میں توضیح آئی ہے کہ آسمان امامت کے تابناک تارے بارہ ہیں جس کے بارے میں آپ کو بعد میں بھی بتائیں گے۔

حرام چیزوں سے استثناء

'' فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ '' پھر یہاں پر کہا کہ جو موارد ہم نے تم پر حرام کئے تھے اضطرار کی صورت میں ان میں سے اتنی مقدار میں کھا سکتے ہیں جس سے بھوک مٹ جائے، البتہ اس میں گناہ اور اللہ کے حکم کی مخالفت کا ارادہ نہ ہو تو حرج نہیں ہے۔ '' مَخْمَصَةٍ '' قحط اور بھوک کو کہتے ہیں۔ '' تَجَانِفٍ '' جنف سے لیا گیا ہے جو آدمی کے پاؤں کا باہر کی طرف نکلنے کے معنی میں ہے۔ اثم ، گناہ جو سعادتمندانہ زندگی میں رکاوٹ بن جائے۔

آخر میں فرمایا کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ یہ نقطہ اس بات کو بیان کر رہا ہے یہ حکم ابتدائی نہیں بلکہ حکم ثانوی ہے حرام کی گئی چیزیں عام حالت میں حلال نہیں بلکہ صرف اضطرار کی حالت میں حلال ہو جاتی ہیں۔ حکم اولی وہی تھا جو بتایا گیا یہ چیزیں حرام ہیں جب مسلمان مجبور ہو جائے اور بھوک سے مر جانے کا خوف ہو تو مرنے سے بچنے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے۔ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ اتنی مقدار میں کھا سکتا ہے جس سے مرنے سے بچے اور بھوک مٹ سکے۔ تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح مغفرت اور رحمت بعض گناہوں کو مٹا دیتی ہے اسی طرح خود حکم کو بھی اٹھا لیتی ہے یعنی جہاں مغفرت اور رحمت گناہ مٹاتی ہے تو بعض دفعہ ایک دیا ہوا حکم کو وقتی طور پر اٹھا لیتی ہے، جیسے یہاں پر خدا نے بہت ساری چیزوں کے کھانے کی حرمت کا حکم دیا اور پھر مجبوری کی حالت میں اس حرمت کے حکم کو اٹھا لیا گیا۔ جب قحط یا بھوک کی حالت ہو اور ایسی بیماری ہو جس میں اگر حرام کو استعمال نہیں کرتا تو مر جائے گا، تو اتنی مقدار میں استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے اس سے زیادہ استعمال نہ کرے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

''تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیز حلال ہے، کہہ دو تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور جو شکاری جانور جسے شکار پر دوڑنے کی تعلیم دو کہ انہیں سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، سو اس میں سے کھاؤ جو

وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اور اس پر اللہ کا نام لو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے"۔

کھانے پینے کی حلال چیزیں

یہاں پر ایک کلی سوال مطرح ہوا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ کونسی چیزیں حلال ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ایک کلی ضابطہ بتایا گیا ہے کہ وہ چیزیں تمہارے لیے حلال ہیں جن میں تصرف کرنا پاک اور معقول ہو۔ پس ہر وہ چیز جس کو تمام لوگ پاک اور پاکیزہ جانیں وہ حلال ہے۔ اس کلی نتیجہ گیری کی دلیل یہ ہے کہ اس حکم کو عام بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی مطلق فرد غیر متعارف کو شامل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو شکاری جانور جسے شکار پر دوڑنے کی تعلیم دو کہ انہیں سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، سو اس میں سے کھاؤ جو وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اور اس پر اللہ کا نام لو۔ جوارح، جارحہ کہ جمع ہے، جارحہ اس جانور کو کہتے ہیں جو شکار کی خاطر دوسرے جانور کے پیچھے جائے۔ ''مُكَلِّبِيْنَ'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شکاری حیوانات کے شکار کا باقی ماندہ صرف کتے کے ساتھ خاص ہے، کتے کے علاوہ دوسرے شکاری حیوانات کے باقی ماندہ شکار حلال نہیں ہے۔

'' مِمَّآ اَمۡسَكۡنَ عَلَيۡكُمۡ '' یہ جملہ شکار کے حلال ہونے کی دوسری قید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار اس وقت حلال ہے جب کتا شکار کو تمہارے لیے پکڑے، اس لیے اگر وہ شکار کو اپنے لیے پکڑے تو جائز نہیں ہے۔ '' وَاذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهِ '' کتے کی شکار کے حلال ہونے کی آخری قید ہے۔ یعنی شکاری کتے کا مالک کتے کو شکار کے لیے چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے۔ اور آخر میں فرمایا کہ '' وَاتَّقُوا اللّٰهَ '' یعنی تفریح، سرگرمی، دکھاوے، اپنی طاقت دکھانے اور بے ہودہ کاموں کے لیے شکار نہ کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی دقیق حساب

کرنے والا ہے۔ اس بنا پر شکار کے حوالے سے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور ضرورت اور احتیاج کے مطابق شکار کرو۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَ لَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۠۝۵

''آج تمہارے واسطے سب پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور اہل کتاب کا کھانا تمہیں حلال ہے اور تمہارا کھانا انہیں حلال ہے، اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور ان پاک دامن عورتوں میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے جب کہ ان کے مہر انہیں دے دو ایسے حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ بدکاری کرنے والے اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والے، اور جو ایمان سے منکر ہوا تو اس کی محنت ضائع ہوئی اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔

پاکیزہ چیزوں کا حلال ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنے احسان کو دوبارہ بیان کیا ہے کہ اے میرے بندے، اے مومنو! میں نے تمہارے لیے طیبات کو حلال کیا ہے۔ اہل کتاب کے بارے میں تمہیں جو پریشانی تھی اور جو شک تھا کہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا معاشرت کرنا کیسے

ہوگا تو اس کے بارے میں بھی اللہ نے بتادیا کہ اہل کتاب کا کھانا بھی تمہارے لیے جائز ہے اور ان کی پاک عورتیں بھی طیبات سے ہیں اور وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔

اس آیت میں جن غذاؤں کی حلیت کا تذکرہ ہوا ہے اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو انسان کی بھوک کو مٹادیتی ہیں۔ جیسے گندم، جو اور دوسری دانے دار چیزیں اور غلات اور حلال گوشت حیوان یہ سب حلال ہیں۔ یہ حکم حرام گوشت حیوانات، مردار یا خنزیر کے گوشت یا جس حیوان کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو کو شامل نہیں ہے وہ حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فسق، نجاست اور اثم کا نام دیا ہے۔ اس کے بعد والے جملہ میں اہل کتاب کی عورتوں کی حلیت کا ذکر ہوا ہے یہ بھی احسان ہے کہ مومنوں پر آسانی کی گئی ہے ان پر سختی نہیں کی گئی۔ اہل کتاب سے مراد وہ ہیں جو مسلمانوں سے پہلے آسمانی کتاب رکھتے تھے اور توحید اور رسالت اور معاد کے قائل تھے، مشرکین اور بت پرستوں کے برعکس۔

یہ آیت، سورہ بقرہ کی آیت 221 '' تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ '' کہ اہل کتاب کی عورتیں جب تک ایمان نہ لائیں تو ان سے تم نکاح نہیں کرسکتے، کی ناسخ ہے۔ قرآن کی زبان میں اہل کتاب مشرک نہیں ہیں، سورہ المائدہ کیونکہ قرآن کریم کی آخری سورہ ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی اس بنا پر کوئی اور سورہ؛ سورہ المائدہ میں بیان شدہ احکام کو نسخ نہیں کرسکتی۔ '' الۡمُحۡصَنٰتُ '' سے پاک دامن عورتیں مراد ہیں جن کے شوہر نہیں ہیں، ایسی عورتیں مومنین کے لیے حلال ہیں۔

اہل کتاب کے لیے بھی یہی ہے یعنی اگر وہ پاک دامن ہوں اور شادی شدہ نہ ہوں تو ان کی اجرت یعنی مہر یہ دے کر ان کے ساتھ دائمی یا موقت نکاح کرسکتے ہیں شرط یہ ہے کہ وہ زناکاری اور بدکاری اور پہلے سے دوستی اور فسق والے عمل اور بدکرداری کی مرتکب نہ ہوں۔ انسان نکاح کے ذریعے رابطہ برقرار کرسکتا ہے خواہ نکاح موقت ہو یا دائم لیکن زنا کے ذریعے نہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ مخفی اور پوشیدہ باتوں سے آگاہ ہے البتہ اس کا بقیہ حصہ علم فقہ میں

آیا ہے وہاں دیکھنا چاہیے اس کے متعلق احکام کیا ہیں۔ کیونکہ یہاں ظاہری عبارت کا ترجمہ مقصود تھا لہذا اسی کو بیان کیا گیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا کہ کفر، عمل کے احباط یعنی باطل ہونے کا باعث بنتا ہے۔ یہاں کفر پوشیدہ کے معنی میں ہے یعنی اللہ کی نعمات پر جو پردہ ڈالے ان کا شکر ادا نہ کرے، اللہ نے جو معجزات بھیجے ہیں ان کا انکار کرے، رسول اللہ ﷺ کا انکار کرے، اللہ کی توحید کا منکر ہو، قیامت کے دن کا انکار کرے، جبکہ اس آیت میں آیا ہے عمل کو ترک کرنا جس کے بارے میں وہ جانتا ہے، مشرکین اور بت پرستوں اور کافروں کو دوست رکھنا، اُن کے ساتھ اُٹھک بیٹھک جبکہ معلوم ہے کہ اسلام حق پر ہے، برحق ہے اور دینی ارکان جو ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کو چھوڑنا اور نبوت پر یقین کے باوجود اس کے بارے میں شک کرنا، تو یہ سارا کفر ہے۔ اسلام میں جو دستورات بیان کئے گئے ہیں وہ انسان کی زندگی کی خوشحالی کا وسیلہ ہیں۔

حق باتوں پر پردہ ڈالنا اُس کا کفر ہے اور ایمان کے خلاف عمل کرنا ہے۔ جو علم کے خلاف عمل کرتا ہے اس کو کافر نہیں کہتے اسے فاسق کہتے ہیں۔ احباط عمل، کافر سے مختص ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، حق پر پردہ ڈالتے ہیں تو ایسا شخص صالح عمل بھی کرے تو اس کا بھی اسے اجر نہیں دیا جائے گا۔ یہ بیان سابق جملہ کا تتمہ ہے جس سے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اہل کتاب سے معاشرت اور مجالست اور ان سے میل جول میں سہل انگاری نہ کرو اور چوکنا رہو۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ جو تخفیف دی گئی ہے یہ تمہاری سہولت کے لیے ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اسلامی اخلاق کو اپناؤ اور اسلام کا انہیں گرویدہ بناؤ لیکن ان کے دام میں نہیں پھنسو اور علم نافع اور عمل صالح کی جانب انہیں کھینچ کر لے آؤ نہ کہ نفسانی خواہشات کے گڑھے میں جا گرو اور ان کے حسن و جمال کے گرویدہ ہو جاؤ، بے بند و بار ہو جاؤ، آزاد ہو جاؤ یہ پھر تباہی کا سبب ہو گا ان کی جو عادات ہیں ان کے جو اخلاق

ہیں ان کو اپنالو یہ پھر کافر ہونے کا سبب ہے جس کے نتیجے میں تمہارے جو اعمال ہیں وہ حبط ہو جائیں گے اور آخرت میں تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

مولا علیؑ کا ایک نام ایمان ہے

البتہ یہاں پر ابن عباس کی ایک روایت ہے کہ اُن سے کسی نے سوال کیا کہ علیؑ کا نام قرآن میں نہیں ہے تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ نہیں علیؑ کا نام قرآن میں ہے اور تمہیں معرفت نہیں ہے۔ انہوں نے اس آیت کو پڑھا: وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُہٗ ۫ جو ایمان کا انکاری ہو تو اس کا عمل حبط ہو جائے گا۔ تو انہوں نے پوچھا کہ ایمان علیؑ کا نام کیسے ہے؟ تو انہوں نے کہا جنگ خندق میں اللہ کے نبی نے فرمایا تھا کہ پورے کا پورا ایمان پورے کے پورے کفر کے مقابلے میں جارہا ہے۔ وہاں پر علیؑ کا نام ایمان رکھا گیا ہے، یہ نہیں کہا مجاہد جارہا ہے یہ نہیں کہا نفس جارہا ہے۔ صرف یہ کہا کہ ایمان جارہا ہے۔ تو ظاہر ہے ایمان تو اس وقت تک ہوتا ہی نہیں جب تک ولایت علیؑ کو قبول نہ کرے۔ تو جو علیؑ کی ولایت کا انکار کرتا ہے تو گویا وہ ایمان کا کفر کرتا ہے، علیؑ کی ولایت کا مطلب ہے سارے بارہ اماموں کی ولایت۔ جو امام کی ولایت کا انکار کرے تو اس کے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے تو یہ مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ مسلمان ہی اسلام لانے کے بعد اور غدیر میں علیؑ مولا کی ولایت کے اعلان کے بعد وہ اس سے انکاری ہو گئے تو یہ کفران ہے ایمان کا علیؑ کی ولایت کا انکار یہاں پر مراد ہے علیؑ کی ولایت جو کہ برحق ہے اس پر پردہ ڈالنا اس کا تذکرہ نہ کرنا جو کچھ غدیر خم میں بیان ہوا تھا یہ اس کی جانب اشارہ ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡھَکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَ امۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ ؕ وَ

اِنۡ كُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا ؕ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآٮِٕطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَ اَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ ؕ مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّ لٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَ لِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۞

"اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو نیز اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرو، اگر تم حالت جنابت میں ہو تو پاک ہو جاؤ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا (ہمبستری کی) ہو پھر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی سے تیمّم کرو پھر اس سے تم اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو، اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک اور تم پر اپنی نعمت مکمل کرنا چاہتا ہے شاید تم شکر کرو۔"

نماز کے لیے طہارت کا حکم اور وضو کا طریقہ

اس آیت میں نماز پڑھنے کے لیے وضو اور غسل جنابت سے طہارت کا حکم دیا گیا ہے۔ لفظ "قیام" جب حرف "اِلٰی" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو ارادے اور چاہنے کے معنی میں آتا ہے، جب تم نماز کا ارادہ کرو تو وضو کرلو۔ پھر وضو کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ غُسل، دھونے کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے مراد صفائی اور پاکیزگی کے لیے اعضاء وضو پر پانی جاری کرنا ہے۔ ''وجہ''، کسی بھی چیز کے ظاہری حصے اور کسی بھی چیز کے مقابل کو کہتے ہیں جو اس کے سامنے ہوتی ہے لیکن یہ لفظ زیادہ تر انسان کے چہرے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

وضو میں چہرے کو دھونے کی مقدار کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ لمبائی میں سر کے بال سے لے کر تھوڑی کے نیچے تک اور عرض میں بڑی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان جتنا حصہ آتا ہے دھونا واجب ہے۔ اس حوالے سے متعارف ہاتھ کو دیکھنا ہوگا یعنی انسان کا ہاتھ معمولی اندازے کا ہو جتنا عام لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے، بعض لوگوں کا ہاتھ معمول سے زیادہ چھوٹا ہوتا ہے یا معمول سے زیادہ بڑا ہو تو وہ معیار نہیں ہوگا۔ ہاتھوں کو دھونے کی مقدار یہ ہے کہ بازوں کو کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سرے تک دھولے۔ ''وَاَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھوں کو کہنیوں سے انگلیوں کے سرے تک دھونا ہے اور دھونے کا یہ طبیعی طریقہ ہے ہمیشہ کثافت اور گندگی دور کرنے کے لیے ہاتھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھویا جاتا ہے نہ کہ نیچے سے اوپر کی طرف۔

اُمت اسلام کا اجماع ہے کہ اگر کوئی اوپر سے نیچے کی طرف دھوتا ہے تو اس کا وضو صحیح ہے۔ کیونکہ '' اِلَی الۡمَرَافِقِ'' موضوع '' اَیۡدِیَکُمۡ '' کی قید ہے، حکم '' فَاغۡسِلُوۡا'' کی قید نہیں ہے۔ ''مسح'' ہاتھ پھیرنا یا ایک عضو دوسرے کو چھوئے اور ان کے درمیان کوئی حائل نہ ہو اور ''مسح'' اگر بغیر "با" کے استعمال ہو تو شمول کا معنی دیتا ہے اور اگر اس کے مفعول پر حرف "با" داخل ہو تو ملموس کے بعض حصے کو لمس کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ مسح سر کی روایت کے مطابق سر کا فی الجملہ مسح کرنا واجب ہے اور اس کی مقدار پیشانی کے اوپر سر کا اگلا حصہ ہے۔

''اَرۡجُلَکُمۡ'' ''بِرُءُوۡسِکُمۡ''پر عطف ہے اور ''اَرۡجُلَکُمۡ'' کے لام پر زبر کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ''رُءُوۡسِکُمۡ'' کے محل پر عطف ہے اور ''رُءُوۡسِکُمۡ'' مفعول ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ پاؤں کے مسح کرنے کی مقدار انگلیوں کی نوک سے لے کر پاؤں کے اوپر اٹھی ہوئی جگہ تک ہے۔ اہل سنت نے بعض روایات کا حوالہ دے کر مسح سے ہلکا دھونا مراد لیا ہے

لہٰذا وہ وضو میں اپنے پاؤں پر مسح کرنے کے بجائے دھوتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ عمل آئمہ اہل البیت علیہم السلام کے عمل کے مخالف ہے اور قرآن کی ظاہری عبارت کے بھی مخالف ہے۔ ''کَعْبَیْنِ'' کعب پاؤں کی اوپر اٹھی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں پاؤں کی پشت اور اس سے ڈبل مراد ہے دونوں پاؤں کی اوپر اٹھی ہوئی جگہ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے پنڈلی اور پاؤں کے درمیان اتصال کی جگہ مراد ہے جہاں ہڈیوں کی جگہ ملتی ہے۔

غسل جنابت اور تیمّم کے بارے بیان

آیت بیان کر رہی ہے کہ نماز کے صحیح ہونے میں طہارت شرط ہے اور یہ کلام اس طرح بنے گی کہ اے مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو دھولو، اپنے سر اور پاؤں پر مسح کرو اور یہ اُس صورت میں ہے جب آپ جنب نہیں ہو لیکن اگر مجنب ہو عورت کے ساتھ ہمبستری کی ہوئی ہے یا منی کا اخراج ہو چکا ہے تو پھر تمہیں طہارت کرنی چاہیے غسل جنابت کے ذریعے اور اس عبارت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وضو کا قانون جنب کی حالت والے کے لیے نہیں ہے اس صورت میں جنابت کا غسل کافی ہے وضو کی ضرورت نہیں ہے۔

بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر مریض ہو اور پانی کا استعمال تمہارے لیے نقصان دہ ہے یا سفر میں ہو اور وہاں پانی نہیں ملتا تو تیمّم کرلو۔ اگر حدث اصغر یعنی نجاست یعنی پیشاب یا پاخانہ کیا ہے یا ہوا خارج ہوئی ہے یا حدث اکبر یعنی منی خارج ہوئی ہے یا ہمبستری کی ہے تو وضو کرو اور غسل کرو یا مجبوری کی حالت میں غسل اور وضو کے بدلے تیمّم کرو۔ پس پہلی دو شقیں پاخانہ کرنا یا بیوی سے ہمبستری کرنا دوسری دو شقوں کے مدمقابل نہیں ہے بلکہ یہ دو شقیں تقسیم ہوئی ہیں یعنی مسافر اور بیمار یہ دو حالتیں ہیں اور حدث اکبر یا حدث اصغر سے محدث ہونا یہ دو حالتیں ہیں ایک مسافر بیمار ہے اور ایک حدث اصغر یا حدث اکبر

میں ہے تو ان تمام موارد میں پانی نہیں مل رہا تو تیمّم کا حکم ہے۔ غسل کے بدلے میں تیمّم کرنا ہوتا ہے اور وضو کے بدلے بھی تیمّم کرنا ہوتا ہے۔

تیمّم قصد اور ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔ صعید، زمین کے اوپر والے حصے کو کہتے ہیں زمین کی پاک مٹی پر تیمّم کریں۔ اپنے ہاتھ کو پاک و طاہر مٹی پر مارنا ہوگا، جس طرح پانی پاک کرتا ہے اسی طرح مٹی بھی پاک کرتی ہے اور اس طرح نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ تیمّم میں سر اور پاؤں کا مسح نہیں ہے، چہرے کا مسح ہے جس طرح وضو میں چہرہ اور ہاتھ دھونا ہوتا ہے تیمّم میں اس حکم میں تخفیف دی گئی ہے اور مسح پر اکتفاء کیا ہے کہ پیشانی سے چہرے کا مسح کریں اور دونوں ہاتھوں کی پشت کا مسح کریں۔ اللہ تعالیٰ نے حرج کی نفی کی ہے حقیقت میں خداوند حرج نہیں چاہتا، وہ اپنے بندوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا ہے۔

حرج دو قسم کا ہوتا ہے ایک حرج حکم کا معیار ہے اور مطلوب ہے جس سے حکم ہوتا ہے اور حکم زیادہ تر حرج اور تکلیف نہیں دیتا، صاحب حکم دشواری اور حرج کو چاہتا ہے کیونکہ حکم معیار کے تابع ہے۔ دوسرا حرج حکم کا ملاک اور معیار نہیں ہے نتیجے کے طور پر یہ حکم اپنی ذات کے لحاظ سے حرج والا نہیں تھا لیکن اتفاقاً ایسی چیز آ گئی جس سے اس میں حرج آگیا اور وہ مشکل میں پڑ گیا۔ لہٰذا جو افراد مشکل میں پڑ گئے تو اس صورت میں حکم خصوصی ساقط ہو گیا اور عارضی حکم ان کے لیے آگیا۔

خداوند تبارک تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کے احکام حرج لانے والے نہیں ہیں، دشواری میں ڈالنے والے ہیں اور نہ ہی اس لیے قانون سازی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کا مقصد تمہیں پاک کرنا اور تمہارے اوپر نعمت کو پوری کرنا ہے۔ احکام کا اصل معیار یہی ہے نہ کہ تمہاری زندگی میں مشکلات ہوں اور تم تنگی میں پڑو، ایسا نہیں ہے۔ یا تمہارے نقصان میں ہو۔ لہٰذا اگر مجبوری کی حالت میں وضو اور غسل کا فریضہ تم سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے تیمّم آ جاتا ہے تو یہ تمہیں ایک سہولت دی گئی ہے، وسعت دی گئی ہے۔ طہارت میں

اصل حکم وضو یا غسل کرنا ہے اور یہ کلی طور پر ختم نہیں ہوتی البتہ اس کی شکلیں بدل جائیں گی ۔ طہارت صرف ظاہری نجاست سے پاک ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ اسے باطنی طہارت بھی مراد ہے جو وضو، غسل اور تیمّم سے حاصل ہو جاتی ہے۔

'' وَ لِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ '' میں نعمت سے دین کی نعمت مراد ہے۔ اس حوالے سے کہ دین تمام حالات اور امور میں خدا کے آگے تسلیم ہونے کا نام ہے، یہی بندوں پر اللہ کی ولایت اور اللہ کی حکمرانی ہے۔ یہ ولایت جب پوری ہو جاتی ہے تو پھر دین کے سارے احکام من جملہ طہارت کے جو تین عناوین ہیں وضو، غسل اور تیمّم اس کا قانون بنتا ہے تو یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور یہ بھی نعمت ہے ۔ '' لِيُطَهِّرَكُمۡ '' کا مقصد یہ ہے کہ وضو، غسل اور تیمّم کا جو قانون بنا ہے یہ تمہاری طہارت اور پاکیزگی کے لیے بنا ہے۔ یہ قانون سازی اور سارے احکام کی غرض اللہ کی نعمت کو مکمل اور پورا کر دینا ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے تم پر نعمت پوری کر دی ہے تو پھر تم اس نعمت کا شکر بجا لاؤ، یہ نعمت اللہ کی عطاء کردہ ہے اس کی ناشکری نا کرو۔

وَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ مِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۷

''اور اللہ کا انعام جو تم پر ہوا ہے اسے یاد کرو اور اس کا عہد جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے، جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مان لیا، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ دلوں کی بات خوب جانتا ہے''۔

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اللہ نے تم پر جو بہت سارے انعامات کئے ہیں ان کو یاد کرو۔ اسلام سے پہلے تمہاری کیفیت اور حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی، امنیت نہیں تھی، مالی پریشانی تھی ڈر اور خوف تھا لیکن اسلام کے سائے میں وہ ڈر بھی جاتا رہا اور حالات بھی بہتر ہوئے، روزگار بھی بہتر ہو گیا، معیشت بھی بہتر ہو گئی، تمہیں عزت و آبرو بھی مل گئی، غرض یہ کہ دین حنیف کے سائے میں تمہیں بہت ساری نعمتیں ملیں، امن مل گیا سلامتی مل گئی ثروت مل گئی۔ یہ وہی میثاق تھا جو اللہ نے ان سے لیا تھا اور جس وجہ سے انہوں نے اسلام قبول کیا اور اللہ کے ہاں تسلیم مطلق ہو گئے یعنی ہر لحاظ سے اللہ کی بات کو قبول کر لیا اور اللہ کی اطاعت کی اور یہ وہی اسلام حقیقی ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کو یاد دلایا ہے کہ وہ اللہ جو دل کے تمام زاویوں سے واقف ہے، دل میں جو سوچ و فکر آتی ہے اس سے بھی اللہ آگاہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ایسا ہے جب اللہ آپ کی ہر بات سے آگاہ ہے، آپ کے دل کی بات سے بھی آگاہ تو اللہ کے غضب سے بھی ڈرو اور اللہ کا تقویٰ اپناؤ کیونکہ وہ تمہارے تمام حالات سے باخبر ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾

"اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، انصاف کرو کہ یہی بات

تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے خبر دار ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

گواہی دینے میں ظلم نہ کرو

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین گواہی دینے میں ظلم اور زیادتی نہ کریں اور اگر اُن کی کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی ہے تو اُس وجہ سے جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے وہ دشمنی انہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ وہ اپنے مشہود کو بیان نہ کریں جو انہوں نے دیکھا ہے لہٰذا گواہی کو مقید کر دیا ہے قسط سے یعنی گواہی انصاف پر مبنی ہو، شہادت اور گواہی دینا ایک کلی مسئلہ کی فرع ہے، وہ یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کی خاطر انجام دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کسی کے ساتھ دشمنی اور بغض و عداوت کی وجہ سے عدالت اور انصاف کو ضائع کر دو۔ اسی لیے مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ عدالت پر مبنی رویہ اپناؤ کیونکہ عدالت پر مبنی رویہ ہی تقویٰ کے قریب تر ہے، یہ وسیلہ ہے تقویٰ کے حاصل کرنے کا اور تقویٰ اللہ کے اوامر کی پابندی کرنا اور اللہ کے نواہی کو چھوڑ دینا ہے۔ پھر خبر دار کیا کہ اگر تقویٰ کا لحاظ نہ رکھوگے اور عدالت رعایت نہ کروگے تو پھر اللہ کے غضب سے ڈرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے باخبر ہے، اگر تم نے ذاتی مفاد کی خاطر صحیح گواہی نہیں دی، حق پر پردہ ڈال دیا تو تم اللہ کے غضب کا شکار ہو جاؤ گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٩﴾

"اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے کہ ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے"۔

نیک مومنین کے لیے اجر عظیم کا وعدہ

یہ آیت "وَعَدَ اللّٰہُ" سے شروع ہوئی ہے یعنی اللہ نے وعدہ کیا ہے، یہ وعدہ کن کے لیے ہے، ان کے لیے ہے جو ایمان لائے، خالی ایمان نہیں بلکہ ایمان کو مقید کیا ہے عمل صالح سے، ایمان لانے کے ساتھ انہوں نے عمل صالح بھی انجام دیا۔ دوسرا جملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے بڑا اجر رکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بغیر عمل کے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ایمان کے ساتھ عمل صالح ضروری ہے ورنہ وہی منافقت ہے زبان سے کچھ ہو اور اندر سے کچھ ہو۔ جب دل سے تسلیم ہو تو پھر اللہ کی ہر بات مانی جاتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

"اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتیں جھٹلائیں وہ دوزخی ہیں"۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والے دوزخی

جس طرح پچھلی آیت میں ایمان کو عمل صالح سے مقید کیا گیا تھا اسی طرح اس آیت میں کفر کو مقید کیا گیا ہے آیات کو جھٹلانے سے، کیونکہ اللہ کی آیات ہی سبب بنتی ہیں کہ لوگ حق کو سمجھ جائیں اور اس پر ایمان لے آئیں۔ جب کوئی شخص اللہ کے بھیجے ہوئے معجزات، اللہ کی نشانیوں اور آیات کا انکار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کا انکاری ہے، اللہ کا انکاری ہے۔ حق کے انکار کی وجہ، حق کی نشاندہی کرنے والی اللہ کی آیات کا انکار ہے۔ آیات کے انکار کا مطلب یہی ہے کہ اس نے حق کو چھوڑ دیا ہے۔

البتہ وہ لوگ جو مستضعف ہیں اور حق کی تشخیص دینے سے عاجز ہیں یعنی فکری طور پر عاجز ہیں تو اُن کا معاملہ جدا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کفر کو آیات کے جھٹلانے سے مقید کیا ہے۔ یہ ان کے بارے میں ہے جو سب کچھ سمجھتے ہیں، حق کو جان کر اُس کا انکار کرتے ہیں،

اس کو جھٹلاتے ہیں لیکن جو فکری طور پر کمزور ہیں، جو حق کی تشخیص ہی نہیں دے سکتے یا ان تک اللہ کی آیات نہیں پہنچیں تاکہ وہ ان آیات کی روشنی میں حق کو سمجھ لیتے، تو ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے اللہ ان کو سزا دے چاہے انہیں بخش دے۔

''جَحِيۡمِ'' جحھم سے لیا گیا ہے جو آگ کے شعلوں کے شدت سے بھڑکنے کے معنی میں ہے۔ جس طرح پچھلی آیات میں مومنین اور صالحین کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا گیا تھا اسی طرح اس آیت میں کفار اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو جہنم کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اہل دوزخ کو دوزخ کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ لیکن وہ کفار جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا نہیں، اس وجہ سے کہ یا تو ان کے پاس آیات آئی ہی نہیں یا اس حوالے سے کہ وہ حق کو سمجھتے ہی نہیں، حق کو باطل سے جدا نہیں کر سکتے تو ان کا معاملہ جدا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ هَمَّ قَوۡمٌ اَنۡ يَّبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ اَيۡدِيَهُمۡ فَكَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾

''اے ایمان والو! اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب لوگوں نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں پھر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے''۔

ایمان والو! اللہ کا احسان یاد کرو

یہ آیت بہت سارے واقعات پر تطبیق ہو سکتی ہے کیونکہ کفار اور مسلمانوں کے درمیان بہت سارے واقعات رونما ہوتے رہے جن میں جنگ بدر، اُحد، احزاب اور دیگر

جنگوں کی داستانیں ہیں۔ اس آیت سے وہ سازشیں بھی مراد ہیں جو مشرکین مسلمانوں کے خلافکرتے رہتے تھے۔ اسلام کا نام مٹانے اور دین توحید کے خاتمے کی سازشیں کرتے تھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے شر سے بچایااور وہ شر اُن سے ٹالا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ تقویٰ ترک نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ کو ترک نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہاراانجام یہود و نصاریٰ جیسا ہو۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد ومیثاق کو بھلا دیا تھااور اللہ کے عہد کو توڑ دیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قسم قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلاء ہوئے۔ اگر وہ اللہ کے حضور تسلیم رہتے، خدا کا تقویٰ اپناتے، توکل کرتے تو خداوند تبارک و تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دُور نہ کرتا۔

اس کلام میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اطاعت اور اللہ کے دستورات کے آگے خضوع و خشوع کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اپنے تمام امور میں اللہ کو اپنا وکیل بنائیں، اور دینی، دنیاوی اور اخروی امور میں اس کا انتخاب کریں جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے انتخاب کیا ہے۔ غیر خدااور غیر رسول کی پیروی مت کریں۔ رسول اللہ ﷺ جو کچھ لائے ہیں اللہ کی طرف سے لائے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ستم گر بادشاہ اور شیطان پرست احبار اور رہبان خاخام اور کشیش یہود و نصاریٰ کے علماء کے سامنے تسلیم محض نہ ہو جائیں۔ اور ان کی طرح نہ بنیں کہ انہوں نے مکمل طور پر اللہ کے سامنے اپنے آپ کو پیش نہیں کیا اور اس کے سامنے تسلیم نہیں ہوئے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کی جائے جو بھی ایسا کرے گا تو اس کو کئی کی سزا ملے گی اور اس جرم کی اسے معافی نہیں ملے گی۔

وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ
نَقِیْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ
اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ
عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ
كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

”اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے، اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز کی پابندی کروگے اور زکوٰۃ دیتے رہوگے اور میرے سب رسولوں پر ایمان لاؤگے اور ان کی مدد کروگے اور اللہ کو اچھے طور پر قرض دیتے رہوگے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور تمہیں باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، پھر جو کوئی تم میں سے اس کے بعد کافر ہوا تو بے شک وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہوا“۔

بنی اسرائیل سے لیا گیا عہد

اس آیت میں بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد کا تذکروہ ہوا ہے۔ ”نقب“ دیوار اور چمڑے میں سوراخ ہونے کے معنی میں ہے جس طرح '' ثقب '' لکڑی کے چیرنے کو کہتے ہیں۔ '' نقیب '' اُس کو کہتے ہیں جو کسی قوم کے افراد کی تعداد کی گنتی کرتا ہے اور ان کے حالات کا جائزہ لیتا ہے، ان کو شمار کرتا ہے اور پھر اُن کے معاملات کو سرکار سے منظوری لے کر انجام دیتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں یونین کونسل کے ہر وارڈ کے ممبران ہوتے ہیں۔ ہر وارڈ کا ممبر اس کا نقیب ہوتا ہے۔ یہاں پر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ نقباء

بنائے، ایسے بارہ افراد بنائے جو ان کے تمام معاملات کو سمجھتے تھے اور اُن کے امور پر ان کی نظر تھی۔ بنی اسرائیل کے بارہ گروہ تھے اور ہر گروہ پر ایک سربراہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ ان کو اسباط کا نام دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کے اسباط کی ہر گروہ پر رہبریت تھی وہ ان کے امور سے آگاہ تھے ان کے حالات سے آگاہ تھے اور ان کے مسائل اور مشکلات حل کرتے تھے، دینی، دنیاوی اور اخروی معاملات پر ان کی نظر تھی۔ ان پر آسمان سے وحی نہیں آتی تھی اور نہ ہی ان کے پاس کوئی شریعت تھی بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی اور ان کی شریعت کی روشنی میں ہی سارے امور انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ بڑے علماء تھے جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی جماعت کے دینی، دُنیاوی اور اُخروی معاملات پر نظر رکھیں اور ان کو بھٹکنے نہ دیں، حق سے دُور نہ ہونے دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں شرط یہ ہے کہ تم اللہ کی اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تمہاری مدد کریں گے لیکن اگر تم نے نافرمانی کی اور حق سے پھر گئے تو پھر تمہیں ذلیل و خوار کریں گے۔

''رُسُل'' سے اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جو دونوں اولوالعزم اور صاحب شریعت ہیں۔ حضور پاک ﷺ کی شریعت تمام ادیان کی خاتم ہے۔ فرمایا کہ ان کی تعظیم کرنے اور ان کی مدد کرنے کا تم سے وعدہ لیا ہے اور مستحب صدقہ اور خیرات دیا کرو، نمازیں پڑھو گے زکوۃ دو گے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور جو رسول آئے ہیں ان کا احترام کرو گے، اللہ کی راہ میں قرض دو گے، مستحب صدقات دو گے تو اللہ فرماتا ہے تمہارے ان اعمال کے نتیجے میں تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، تمہیں بہشتوں میں لے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور تمہیں اچھے حالات دیں گے اور اللہ صادق الوعد ہے، اس نے اپنے ماننے والوں کو جو وعدے دیے ہیں ان کو یقیناً پورا کرے گا۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ کے ان دستورات پر عمل نہ کرے، کافر ہو جائے اور جو راستہ انہیں جہنم سے بچاتا ہے اور جنت کی طرف جاتا ہے

اس راستے کو چھوڑ دیں تو پھر ایسے افراد کی دُنیاوی سعادت بھی گئی آخرت کی سعادت بھی گئی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنۡهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاصۡفَحۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

''پھر ان کی عہد شکنی کے باعث ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا، وہ لوگ کلام کو اس کے ٹھکانے سے بدلتے ہیں، اور اس نصیحت سے نفع اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی، اور تو ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت پر اطلاع پاتا رہے گا مگر ان میں سے کچھ کے علاوہ، سو انہیں معاف کر اور در گزر کر، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور اس کا انجام

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کا کفران کا حق تعالیٰ کی رحمت سے دُور ہونے کا سبب بنا اور ان کے دل سخت کر دیے گئے۔ ان کے دل کے سخت ہونے کی وجہ اور سبب ان کا کفر تھا کیونکہ وہ حق کے سامنے خشوع و خضوع نہیں کرتے تھے اور ان پر کوئی نصیحت اثر گذار نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے اللہ کے کلام کو بدل دیا، اللہ کے کلام میں تحریف کی اور اپنے مطلب کی باتیں رہنے دیں، اس میں اپنی مرضی کے مطابق اضافے کر دیے اور جو ان کی پسند کا نہ تھا اس کو اللہ کی کتاب سے حذف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس کام

پر راضی نہیں ہے۔اس کے علاوہ دوسرے بہت سارے دینی حقائق کو اُنھوں نے ضائع کر دیا، اُنھوں نے دین کے ان اصولوں کو چھوڑ دیا جو ان کی دُنیاو آخرت کی سعادت کے ضامن تھے۔اس طرح وہ بدبختی میں مبتلا ہو گئے۔

اسی طرح وہ تشبیہ کے قائل ہو گئے یا موسیٰؑ کو خاتم الانبیاء سمجھنے لگے اور تورایت کی شریعت کو ہمیشہ کے لیے قرار دیدیا، باطل عقائد اختیار کئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق اپنے پیغمبر اکرم سے فرماتے ہیں: تو ہمیشہ ان کی خیانت پر گواہ رہو گے۔ البتہ ان میں سے جس قلیل تعداد نے خیانت نہیں کی وہ ان سے جدا ہیں اور اس تھوڑی تعداد کا استثناء اس بات سے منافات نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت یہود اور بنی اسرائیل پر لعنت بھیجی اور ان کو عذاب میں مبتلا کیا۔ یہ تھوڑی تعداد جو ایمان لے آئی ہے یا اصلاً اس میں شامل ہی نہیں ہے لہٰذا اللہ کی لعنت اور عذاب ان کے لیے نہیں ہوگا۔ اللہ بخشش کرنے والا اور معافی دینے والا ہے۔

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

”اور جو لوگ اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا پھر وہ اس نصیحت سے نفع اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی، پھر ہم نے ان کے درمیان ایک دوسرے کی دشمنی اور بغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا، اور اللہ انہیں جتلائے گا جو کچھ وہ کرتے تھے“۔

نصاریٰ کی عہد فراموشی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نصاریٰ سے عہد لیا تھا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں گے، دُنیا داری میں غرق نہ ہوں گے اور انہیں دُنیا کی زینتوں کو چھوڑنے کی تلقین کی اور انہیں صلح کے ساتھ رہنے کا حکم دیا لیکن اُنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے اصولوں کو بھلا دیا۔ اسی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو اس کی سزا دی کہ ان کے درمیان ہمیشہ دشمنی ہو، سکون نہ ہو۔ ''فَاَغْرَیْنَا'' کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کا ساتھ لگ جانا، چپکنا، وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے کینہ ورزی اور بغض و نفرت میں لگے رہیں گے، وہ اس حالت سے جدا نہیں ہوں گے۔ وہ صلح و صفائی اور امن کے بجائے جنگ و جدل اور کینہ و دشمنی میں گرفتار رہیں گے۔ جیسے ہی وہ اس حالت سے نکلنا چاہیں گے اور یہ کہ وہ اس غم سے نجات پائیں دوبارہ اسی غم میں جا پھنسیں گے۔ انہیں کہا جائے گا آگ جلانے کا مزہ چکھو۔ اس کا نمونہ عالمی جنگیں ہیں، انہوں نے پورے روئے زمین کو بے امن کرکے رکھ دیا، خرابی ہوئی، ویرانی ہوئی، تباہی ہوئی اور لاکھوں کروڑوں افراد نابود ہو گئے۔ یہ دُنیاوی عذاب تھا لیکن آخرت کا عذاب اس سے زیادہ ہے۔ آخرت میں اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے کئے ہوئے سے انہیں آگاہ کرے گا کہ تمہارے یہ کارنامے تھے، یہ تمہاری کارستانیاں تھیں جس وجہ سے تمہیں یہ ساری سزائیں ملی ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾

''اے اہل کتاب! تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو بہت سی چیزیں تم پر ظاہر کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے درگزر

کرتا ہے، بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے"۔

اللہ کی جانب سے رسول اور روشن کتاب

یہ خطاب مسیحیوں کو ہے کہ تمہارے پاس پیغمبر اسلام ﷺ آئے ہیں اور کہ اُن کی نبوت کی نشانیاں تمہارے علماء کو معلوم ہیں اور ان کے بارے بشارت تمہاری کتاب میں موجود ہے اور بہت سارے احکام جو رجم کے متعلق تھے اور سنگسار کے متعلق تھے وہ سب انہوں نے چھپا لیے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے آکر اُن کے چھپائے ہوئے احکام کو روشن کیا۔انہوں نے بہت سارے دینی حقائق پر پردہ ڈال دیا تھا اُن کو واضح کیا اور بہت سارے حقایق جن پر اہل کتاب نے پردہ ڈال دیا تھا اس سے چشم پوشی بھی کرتے رہے۔ یہ عفو اور چشم پوشیاں دو کتابوں کے درمیان اختلافی موارد کو شامل ہے مثلاً تورات میں توحید و نبوت سے متعلق جو مسائل تھے اُن کو خدا کی طرف نسبت دی جیسے خدا کو جسم قرار دینا اور یہ کہنا کہ وہ ایک جگہ بیٹھے ہیں یا بہت سارے گناہوں اور لغزشوں کی نسبت پیغمبروں کی جانب دینا، معاد کا مسئلہ ہے ، دینی معارف کا بنیادی ترین مسئلہ ہے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا اور اُس کے بارے میں کچھ بات نہ کرنا۔

انجیلیوں میں خاص کر انجیل یوحنا؛ میں ایسے عقائد بھر دیے جو سرے سے باطل ہیں جیسے بت پرستی ہے۔ قرآن نے بہت سارے مسائل کا نام لیا ہے اور بہت سارے مسائل کا نام نہیں لیا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ لوگ اپنی عقل سے خود بخود ان کی باتوں کو سمجھ جائیں گے کہ یہ عقائد جو انہوں نے بیان کئے ہیں یہ خرافات اور باطل ہیں اور ان کا اللہ اور اللہ کے رسولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نور سے مراد قرآن کریم ہے یہ احتمال بھی ہے کہ نور سے حضور اکرم ﷺ مراد ہوں کیونکہ اللہ نے جگہ جگہ قرآن کو قرآن کہا ہے اور پیغمبر کو بھی

لفظ نور سے تعبیر کیا ہے۔ ''سراج منیر'' جیسے سورہ احزاب آیت 46 میں ہے، روشن اور چمکتا دمکتا اور چراغ۔ ''انزلنا نورا مبینا'' سورہ النساء کی آیت ۱۷۴ میں آیا ہے: '' ہم نے تمہاری طرف واضح نور اُتارا''۔

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

''اللہ سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اسے جو اس کی رضا کا تابع ہو، اور ایسے لوگوں کو اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور انہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے''۔

رضای الٰہی کے تابع کے لیے سلامتی کی راہیں

''بِهٖ'' میں جو ضمیر ہے یہ نور یا کتاب کی طرف پلٹ رہی ہے چاہے نور سے مراد رسول اللہ ﷺ ہوں یا قرآن کریم ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہدایت کو قرآن یا رسول سے نسبت دینے کے ساتھ ساتھ اس نکتہ پر تاکید کر رہا ہے کہ ہدایت کی برگشت اور اس کا اصلی منبع خود اللہ کی ذات ہے۔ حقیقی ہادی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ ہدایت کے تحقق کے لیے جتنے بھی ظاہری اسباب ہیں اُن اسباب کو وجود میں لانے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اختیار میں رکھ دیا ہے، ان ہدایت کے وسائل میں سے ایک قرآن اور رسول اللہ ﷺ بھی ہیں۔ دوسری طرف اس آیت میں قرآن اور پیغمبر ﷺ کے وسیلے سے ہدایت کو مشروط کر دیا گیا ہے کہ ہدایت اُن کو ملے گی جو اللہ کی خوشنودی اور اللہ کی رضا کے پیرو ہوں اور اس کی تلاش میں ہوں لہٰذا اس جگہ ہدایت سے مقصد تک پہنچانا مراد ہے، اس جگہ ہدایت سے مراد خالی راستہ دکھانا نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس میں "سلام" کی جو صفت آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے راستوں کو سلامتی کا راستہ کہا ہے یہ بغیر شرط اور قید کے بطور مطلق بیان کیا گیا ہے تاکہ سمجھایا جائے کہ اللہ کا راستہ ہی صحیح و سالم ہے اور شقاوتوں، بدبختیوں اور محرومیتوں کی جتنی بھی اقسام ہیں ان سب سے یہ راستہ محفوظ ہے۔ جو بدبختیاں انسان کو دُنیا وآخرت کی سعادت اور خوش بختی سے محروم کرتی ہیں، ان کے سسٹم میں خلل لاتی ہیں ان سب سے یہ راستہ پاک ہے، پس اللہ تعالیٰ کے سلامتی کے راستے میں انحراف، محرومیت اور بدبختی کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ ظلمات اور تاریکیوں کو جمع کی شکل میں لایا گیا ہے اور نور کو مفرد کی شکل میں لایا گیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ اگرچہ راہ حق میں مقامات، مراتب اور مراحل کے اعتبار سے تعدد ہے لیکن اس میں اختلاف اور تفرقہ نہیں ہے۔ لیکن باطل میں سرتاپا اختلاف اور تفرقہ ہے۔

''بِاِذْنِہٖ'' کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء لوگوں کو تاریکیوں سے نکالنے کے عمل میں اور انہیں نور میں داخل کرنے کے لحاظ سے از خود کوئی استقلالی حیثیت نہیں رکھتے یہ سب اللہ کی رضا کے مطابق اور اللہ کے علم کے مطابق انجام پاتا ہے، اس سلسلے میں حقیقی سبب خود باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اصولی طور پر قرآن مجید میں جہاں بھی تاریکیوں سے نکالنے کی نسبت رسول اللہ ﷺ یا اللہ کی کتاب کی طرف دی گئی ہے تو وہاں پر "باذن اللہ" خدا کے اذن کی قید لائی گئی ہے، جس کا معنی یہ ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ رضا کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کا معنی بھی اذن خدا ہے اور علم خدا ہی مراد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی اسکی شرح دی جاچکی ہے۔

"صراط مستقیم" ایسا راستہ ہے جو تمام راستوں میں ممتاز ہے اور تمام دوسرے راستوں پر اُسے فوقیت حاصل ہے۔ اس راستے کی نسبت اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہے۔ صراط مستقیم تک لے جانا ایسی ہدایت ہے جو سب ہدایتوں سے برتر ہے اور ہدایت کی تمام اقسام پر اس

کو غلبہ حاصل ہے اور دوسرے تمام راستوں پر اسے بالادستی حاصل ہے۔ صراط کو نکرہ لانے کا مقصد تکثر اور زیادہ تعداد کو بیان کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اس کی عظمت اور بڑائی کو بتانا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

"بے شک وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مریم کا بیٹا مسیح ہے، کہہ دیجئے کہ پھر اللہ کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے اگر وہ چاہے کہ مریم کے بیٹے مسیح اور اس کی ماں اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کر دے، اور آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، اللہ جو چاہے اسے خلق کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

عیسیٰؑ کے متعلق مسیحیوں کا باطل عقیدہ

اس آیت میں مسیحیوں کا وہ باطل عقیدہ بیان ہوا ہے جس میں وہ حضرت مسیحؑ اور اللہ کی وحدت کے قائل ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عیسیٰؑ بشر ہے اور الٰہ اور معبود بھی ہے۔ مسیحیوں کے کچھ گروہ عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور تین خداؤں کے قائل ہیں، وہ بھی کافر ہیں۔ اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلا گروہ مراد ہے جو عیسیٰؑ کو خدا کے ساتھ متحد ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے بعد والے جملے میں برہان تناقض کے ذریعے مسیحیوں کے اس عقیدے کو باطل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ ایک لحاظ سے معبود اور الٰہ ہے اور دوسرے لحاظ سے بشر اور مخلوق ہے پس خدا کا حکم اُس

کے بشر ہونے پر جاری ہے۔ اس بنا پر مسیح اس عالم کا ایک جزو ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ دوسری مخلوقات کی طرح اسے بھی ہلاک کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ مسیح کی ماں کو بھی مار سکتا ہے اور زمین کے سارے جو رہنے والے ہیں اُن کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کام سے کوئی روکنے والا اور منع کرنے والا موجود نہیں ہے۔ جب عقلی اعتبار سے مسیح کی موت جائز اور ممکن ہے تو پھر کس طرح وہ معبود ہو سکتا ہے؟ لہٰذا عیسیٰؑ کے بشر ہونے کا عقیدہ اُس کے خدا ہونے کے عقیدے کی ضد اور مخالف ہے۔

دوسری طرف برہان امکان سے استفادہ کیا ہے کہ مسیح اور ان کی ماں دوسرے انسانوں کی طرح بشر ہیں اور اُن کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح ساری ہستی اور تمام موجودات اللہ کا ملک علی الاطلاق ہیں، مسیح بھی ان موجودات میں سے ایک ہے، تو ہر حکم اور ہر واقعہ جو سارے انسانوں اور موجودات کے بارے جاری ہے وہی حکم اُن کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور ان کی ماں کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ فلسفیوں کا یہ قول ہے کہ امثال (یعنی ایک جیسی چیزوں) کا حکم جائز ہونے یا جائز نہ ہونے میں ایک جیسا اور یکساں ہوتا ہے۔ اگر ایک جیسی چیزوں میں سے ایک کا حکم عدم ہے تو اس جیسی دوسری چیز کا حکم بھی وہی ہوگا۔ اگر اس کا حکم وجودی ہے تو اس جیسی چیز کا حکم بھی وہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہلاک کرنے پر قادر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمان، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے وہ سب اللہ کی ملک اور اللہ کے اختیار میں ہے۔ "اللہ" کو مقدم کرنے کا مقصد انحصار سمجھانا ہے، کہ آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کی ملکیت اللہ میں منحصر ہے۔

اس کے بعد مالکیت کی علت اور وجہ بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور پوری مخلوقات پر اس کی مکمل مالکیت ہے اسی لیے وہ اُن کی ہلاکت کا ارادہ کر سکتا ہے اور پورے عالم کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی

مخلوقات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو الوہیت اور خدا ہونے میں اللہ کا شریک ہو۔ اللہ کی مشیت وارادے کے نافذ ہونے اور اللہ کی قدرت کے مطلق ہونے کا برہان اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات مستجمع جمیع صفات کمالیہ وجمالیہ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں سارے کمالات پائے جاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہر وہ چیز جس کو کمال کہا جائے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود ہے) اسی وجہ سے اسم جلالہ "اللہ" کا اس آیت میں بار بار تکرار ہوا ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور تمام صفات کمالیہ اسی کے لیے ہیں، اس ذات میں کوئی نقص نہیں ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

"اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہہ دو پھر تمہارے گناہوں کے باعث وہ تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی اور مخلوقات کی طرح بشر (آدمی) ہو، وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے، اور آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، اور (سب نے) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

یہود و نصاریٰ کے جھوٹے دعوے

اس بات میں کوئی شک نہیں یہود اور نصاریٰ کا یہ دعوی کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں حقیقی نہ تھا بلکہ وہ مجاز گوئی کے تحت کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ ان کے اس دعوے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح بادشاہ کے بیٹے باقی رعیت کی نسبت بادشاہ کے نزدیک زیادہ عزیز ہوتے ہیں اور رعیت بیٹوں کی مانند نہیں ہوتی، بادشاہ کے بیٹے سزا سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اور جو احکام باقی مخلوق اور انسانوں پر جاری ہوتے ہیں وہ بادشاہ کے بیٹوں پر جاری نہیں ہوتے۔ یہود اور نصاریٰ کا خیال تھا کہ کیونکہ ہماری مثال بادشاہ کے بیٹوں جیسی ہے تو ہم پر بھی وہ احکام جاری نہیں ہوتے جو عام رعیت پر جاری ہوتے ہیں، اور سزا سے ہم مستثنیٰ ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اللہ کا مقرب سمجھتے ہیں کیونکہ باپ کی نگاہ میں بیٹے عزیز ہوتے ہیں لہٰذا یہود اور نصاریٰ بھی یہی سمجھتے تھے کہماں کی غلطیوں پر اُن کو سزا نہیں دی جائے گی، جس طرح دُنیا میں بادشاہوں کے بیٹوں کو استثناء ملتی ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا کہنے سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے لیے تقرب کا امتیاز اور شرف قرار دینا چاہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دلیل کو باطل اور غلط ثابت کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اللہ نے کیوں تمہارے اعمال کی وجہ سے تم کو سزا دی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی عذاب سے بھی تمہیں نجات نہیں ملے گی۔ تمہیں دُنیا میں ملنے والی سزا اس بات کی دلیل ہے کہ تمہیں اخروی عذاب بھی ملے گا جبکہ وہ خود بھی فی الجملہ اخروی عذاب کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آگ نے ہمیں چھوا بھی تو صرف چند دنوں کے لیے ہی ہو گا، زیادہ دیر ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (سورہ بقرہ آیت ۸۰)

مسیحی قربانی کے مسئلہ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح اُمت کے گناہوں کی خاطر قربان ہو گئے۔ پس ہر حالت میں اُن کے لیے عذاب ہو گا۔ نیک لوگوں کو پہنچنے والے دُنیاوی مصائب ان کے درجات کی بلندی کا باعث بنتے ہیں اور گناہگار آدمی پر آنے والی مصیبت اس

کے لیے سزا ہے۔ اس لحاظ سے ایک اور دلیل اُن کے جواب میں لائی گئی ہے اور کہا گیا کہ تم بھی باقی انسانوں کی طرح افراد بشر ہی ہو، تمہارے اور دوسروں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے، سب اللہ کی مخلوق ہیں، جس طرح باقی لوگوں کو گناہ اور خطاء کے مرتکب ہونے پر عذاب ملتا ہے تمہیں بھی ملے گا۔ خدا مالک علی الاطلاق اور متصرف مطلق ہے اور سب اختیار اسی کا ہے۔ وہ جس طرح کا چاہے حکم جاری کرے، جو فیصلہ چاہے دے، اسی میں یہ صلاحیت اور لیاقت ہے کسی اور میں یہ لیاقت نہیں ہے، وہ نیک لوگوں کو ثواب اور گناہگاروں کو عذاب دیتا ہے۔ تمام زمین اور آسمان خدا کی ملک ہے اور ان میں جو کچھ ہے وہ مخلوق خدا ہے، وہ اپنی مخلوق میں جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾

"اے اہل کتاب! تحقیق تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آیا جو تمہیں صاف صاف بتلاتا ہے ایسے وقت میں جب کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا تاکہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا، سو تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اہل کتاب کے اعتراضات کا جواب

اللہ تبارک و تعالیٰ اس آیت میں مسیحیوں سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے محمد ﷺ کو تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ جو کچھ تم نے اپنی کتاب میں سے چھپا دیا تھا وہ تمہارے لیے ظاہر ہو جائے۔ یہ دین تمہارے دین کی تائید بھی کرتا ہے اور تمہاری کتاب کی بھی تائید کرتا ہے۔

'' فَتْرَةٍ '' کا مطلب ہوتا ہے سُستی، غضب کا بیٹھ جانا اور شدت کے بعد گشائش حاصل ہونا اور ضعف کے بعد قوت کا آجانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کئی سال گزر گئے اور کوئی پیغمبر نہیں آیا تو حضور پاک ﷺ تشریف لائے، اب تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہ آیا تھا، ہمیں نہ تو کسی نے ڈرایا اور نہ ہی کسی نے اچھی خبریں سنائیں تو ہم کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے بشارت دینے والا اور سزا سے ڈرانے والا پیغمبر تمہارے پاس آگیا ہے۔ یہ یہودیوں کی گفتار کا توڑ بھی ہے جو کہتے ہیں ہماری شریعت خاتم ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں، پیغمبر آگیا ہے، اس کے متعلق ان کی کتاب میں بھی تذکرہ ہوا ہے۔ اس میں یہودیوں کے دوسرے قول کا بھی جواب ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے تو اس کا جواب بھی انہیں مل گیا کہ اللہ ہر کام پر قادر ہے اور ہر شخص کو اس کے عمل کا نتیجہ دے گا اور اس کی گرفت بھی کرے گا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم میں نبی پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا، اور تمہیں وہ دیا جو جہان میں کسی کو نہ دیا تھا''۔

قوم موسیٰؑ پر اللہ کے احسانات

یہ گفتگو اس دور میں ہوئی کہ جب بنی اسرائیل مصر سے باہر آ چکے تھے اور اللہ کی نعمتیں اُن پر فراوان تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی کے عنوان سے مبعوث ہو چکے تھے اور انہیں اللہ کے دین کی ہدایت دے رہے تھے، انہیں آل فرعون اور فرعونیوں کے مظالم سے نجات دے دی تھی، اللہ تعالیٰ نے تورات اتاری اور دین کے قوانین اس میں بیان ہوئے، خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان نعمتوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ اس آیت میں بتائی گئی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ان کی قوم سے نبی مبعوث ہوا۔

دوسری بات یہ کہ ان کو اپنا اختیار دیا اور ان کو اپنے امور کا مالک بنادیا اور انہیں فرعون کی بندگی اور غلامی سے نجات دے دی۔ اس طرح کہ ہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی جان، مال، اہل و عیال کا خود مالک ہوں اور مستقل ہوں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزات اور دلائل اور بڑی کھلی نشانیاں عطا کیں اس زمانے میں کسی اور کے پاس ایسی چیزیں موجود نہیں تھیں مثلاً آسمان سے کھانوں کا اُترنا، بارہ چشموں کا پھوٹنا، آسمان کے بادلوں کا ان پر سایہ کرنا، قوم فرعون پر آسمانی مصائب، بلاؤں اور عذاب آنا جیسے خون کا اُترنا، مکڑی کا آنا اور دریا کا دو نیم ہونا اور بنی اسرائیل کا نجات پانا اور فرعونیوں کا غرق آب ہونا اور بنی اسرائیل کو ان کے ظلم سے نجات دینا۔ ان میں سے ہر ایک بات کسی قوم کی ہدایت کے لیے کافی تھی لیکن بنی اسرائیل ایسے بدبخت تھے کہ ان سب واضح اور روشن معجزات کے باوجود بھی کافر ہوگئے۔ ظاہر ہے جب اس طرح کا کفر کیا تو اللہ کی جانب سے ان کے لیے سزا بھی سخت ہے۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾

”اے میری قوم! اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کر دی ہے اور پیچھے نہ ہٹو ورنہ نقصان میں جا پڑو گے“۔

بنی اسرائیل کو مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم

یہ سرزمین اس اعتبار سے مقدس ہے کہ وہ انبیاء اور مومنین کی سکونت کی جگہ ہے اور وہاں پر طہارت اور پاکیزگی ہے، شرک نہیں ہے۔ اس کا مبارک ہونا اس حوالے سے ہے کہ وہاں سے خیر کثیر حاصل ہوئی ہے اور توحیدی دین کا نفاذ وہاں سے ہوا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے فلسطین کی سرزمین مراد ہے۔

آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰؑ اپنی قوم کو یہ پیغام دے کہ اللہ تعالیٰ نے طے کیا ہے کہ تم اس سرزمین میں جا کر رہائش پذیر ہو جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام ان کے حالات سے آگاہ تھے کہ یہ اس دستور کی مخالفت کریں گے لہٰذا انہوں نے تاکیداً فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ تم مرتد ہو جاؤ اور پیچھے کی جانب پلٹ جاؤ، اور پہلے کی طرح کافر نہ ہو جاؤ۔ اس کا تمہیں بہت خسارہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ اس سرزمین پر جائیں اور وہاں پر رہائش اختیار کریں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی مخالفت کرنا اور اس شہر میں نہ جانا گناہ اور فسق تھا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

”انہوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک وہاں ایک زبردست قوم ہے، اور ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے یہاں تک کہ وہ وہاں سے نکل جائیں، پھر اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے“۔

بنی اسرائیل کا مقدس سرزمین میں داخل نہ ہونا

''جبر'' طاقت کے ذریعے کسی چیز کی اصلاح کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ صرف طاقت اور زور یا صرف کسی چیز کی اصلاح کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔[1] ''اجبار'' دوسرے کو کسی کام پر مجبور کرنے کے معنی میں ہے۔ ''جبّار'' اسے کہتے ہیں جو اپنے اندر موجود کمی کو اللہ تعالیٰ سے ملنے والے امتیاز کا دعوی کرکے جبران کرے، ایسا امتیاز جس کا وہ حقدار نہ ہو۔ اس آیت میں جبّارین سے قدرت اور شوکت والے افراد مراد ہیں جو لوگوں کو اپنے مقاصد کے انجام دینے پر مجبور کرتے ہیں اور اپنے ارادوں کو ان پر مسلط کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے کو جبّارین کے اس شہر سے باہر آنے سے مشروط کیا تھا، ان کی یہ شرط حقیقت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کو رد کرنے کے مترادف تھی۔ اگرچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرانے بعد دوبارہ کہا تھا کہ اگر جبّارین اس شہر سے خارج ہوجائیں تو ہم اس شہر میں داخل ہوں گے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ جبّارین عمالقہ (عربوں کے ایک قبیلے کا نام) تھے جو بڑے جسم اور لمبے قد والے انسان تھے۔ اور اس مقدس سرزمین پر موجود تھے۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾

[1] ۔اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام "جبار" ہے۔ جس کا معنی جوڑنے والا اور جبران کرنے والا ہے۔ (مصحح)۔

"اللہ سے ڈرنے والوں میں سے ان دو مردوں نے کہا جن پر اللہ کا فضل تھا کہ ان پر حملہ کر کے دروازہ میں گھس جاؤ، پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے، اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم ایمان دار ہو"

صاحبان ایمان کا بیان

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے دو بندوں نے کہا جن کے دل میں اللہ کا خوف تھا کہ اللہ کے امر کی نافرمانی اور اللہ کے پیغمبر کے دستور کو نہ ماننے پر سزا ہو گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا ترس فقط یہی دو نہیں تھے بلکہ ایک جماعت تھی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں جس میں فرمایا کہ ہم نے ان کو نعمت عطا کی تھی اس نعمت سے مراد ولایت الٰہی ہے یعنی یہ دو آدمی اولیاء الٰہی میں سے تھے کیونکہ اولیاء اللہ ہی ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے اور وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، نعمت سے مراد یہی اللہ کا خوف ہے جو ان کے دل میں موجود تھا۔ کیونکہ اللہ کا خوف بھی اس کی طرف سے کسی کے لیے ایک قسم کا انعام ہے۔ "باب" سے شہر کا دروازہ مراد ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ مقدس سرزمین کا پہلا شہر "اُریحا" تھا۔ سرحدی شہروں کے لیے بھی باب کا استعمال عام ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے جن دو آدمیوں نے کہا تھا کہ اگر اس سرحدی شہر میں داخل ہو گئے تو دشمن پر تمہاری کامیابی حتمی ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شہر تمہاری رہائش کے لیے ہی مقدر کیا ہے، ان دو آدمیوں میں ولایت الٰہیہ کا نور تھا اور وہ اولیاء اللہ میں سے تھے۔ انہوں نے اس بات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے سمجھ لیا تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دو آدمی یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا تھے جو بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں میں سے تھے۔ آخر میں اُن دونوں نے لوگوں کو جوش دلانے اور انہیں اطمینان دلانے کے لیے کہا اگر تم مومن ہو تو اللہ پر توکل کرو کیونکہ اللہ

تعالیٰ اپنے اوپر توکل کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔ان دونوں نے بنی اسرائیل والوں سے یہ کہہ کر حضرت موسیٰؑ کی تائید وحمایت کی۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

''کہا اے موسیٰ! ہم کبھی وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں موجود ہیں، سو توں اور تیرا رب جائے اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔

بنی اسرائیل کی گستاخی

اس قوم نے دوبارہ انکار کیا اور اپنی سابقہ بات کا تکرار کرتے ہوئے کہا ہم اس سرزمین میں بالکل نہیں جائیں گے اور اپنے اس جملے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مایوس کر دیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس دعوت کا اصرار نہیں کیا۔ان کی اس گفتار میں بہت ساری اہانتیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام اور اللہ تعالیٰ کے امر کی توہین تھی۔اس عبارت میں عجیب قسم کا نظم پایا جاتا ہے۔اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کا رخ ان دو آدمیوں کے بجائے سیدھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف موڑ دیا، جسے ادبیات عرب کی اصطلاح میں ''ایجاز بعد از اطناب'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح وہاں پر استعمال ہوتی ہے جہاں بحث کرنے والے دو طرف کے درمیان دشمنی ہو اور ایک طرف والا دوسری طرف والے سے کہے کہ ہمیں تمہاری بات سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ اور حرف بہ حرف ہماری بات ہی صحیح ہے۔ یعنی انکار کے لیے یہ انداز اپنایا جاتا ہے تو انہوں نے بھی یہی کیا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ بات بے ادبی تھی کہ انہوں نے دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا اور کہا کہ ہم ہرگز اس سرزمین میں نہیں جائیں گے۔ تیسری بات یہ تھی کہ ان کی جہالت اور جسارت نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا کہ تم خود اپنے رب کے ساتھ جاؤ اور جنگ لڑو۔ یہ گویا ان کا مقام الوہیت کے بارے میں باطل عقیدہ تھا جسے انہوں نے بیان کیا۔ ان کا یہ عقیدہ بت پرستوں کے عقیدے کی مانند تھا۔ جبکہ خدا تو کسی سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کا اثر قبول کرتا ہے جیسا انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا تم پہلے ہمارے لیے اسی طرح کا خدا بناؤ جیسے بت پرستوں کا ہے۔ بت پرست اللہ تعالیٰ کے متعلق جسمانیت اور شباہت کے قائل تھے، ان کا یہ عقیدہ یہودیوں کے درمیان بھی رائج تھا اور آج بھی یہودیوں میں ایسے باطل عقائد موجود ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾

"موسیٰ نے کہا اے میرے رب! میرے اختیار میں تو سوائے میری جان اور میرے بھائی کے اور کوئی نہیں، سو جدائی ڈال دے ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان"۔

موسیٰؑ کی اپنی قوم سے مایوسی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام جس میں آپ نے کہا تھا کہ اے میرے پروردگار! میرے اختیار میں تو سوائے میری جان اور میرے بھائی کے اور کوئی نہیں، یہ ہماری بات قبول نہیں کرتے اور ان پر ہم جبر بھی نہیں کر سکتے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان میں دعوت دینے کی قدرت نہیں تھی، ان کا مقصد یہ تھا کہوہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتے کہ اپنی

قوم کو نیک اعمال دینے پر مجبور کریں۔ البتہ ان کا مطلب مطلق قدرت کی نفی کرنا بھی نہیں تھا کیونکہ ان میں کچھ خداترس لوگ موجود تھے جیسے وہ دو آدمی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرلیا تھا۔ ان کا یہ کلام حقیقت میں اس بات سے کنایہ تھا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے ان کو دعوت دی تھی، پیغام رسانی میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی لیکن بنی اسرائیل نے ہماری دعوت کو رد کر دیا اور ہماری شان میں گستاخی کی۔

دوسرے لفظوں میں یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکایت تھی کہ خدایا میں نے تو دعوت دینے میں کوتاہی نہیں کی اور جو میرے ذمہ تھا وہ کام میں نے کر دیا، میرے پاس تو صرف میرا اپنا اور میرے بھائی کا اختیار ہے اور جو میری دعوت کو قبول کرے، اس کے علاوہ کسی اور پر میرا اختیار نہیں ہے۔ اے ہمارے پروردگار! اپنی ربوبیت کی قدرت سے ہمارے عمل کی گرہ کھول دے اور میرا معاملہ اس نافرمان قوم سے علیحدہ کر دے۔ ظاہر ہے اسم فاعل ''فاسق'' دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے اس کا مطلب ہے کہ یہ مسلسل گناہ کر رہے تھے، یہ قوم عصیان اور گناہ کی حالت میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان کے لیے عذاب کی درخواست نہیں تھی بلکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ چاہا کہ ہدایت کے راستے میں موجود گرہ کھول دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہادی مطلق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر عذاب آنے کا خوف تھا اس لیے اللہ کے حضور اس انداز سے دعا کی اور فرمایا کہ اے ہمارے رب! ان کی وجہ سے ہماری گرفت نہ کر۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦

''فرمایا: تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس کے لیے حرام کی گئی ہے، اس ملک میں سرگرداں پھریں گے، سو تو افسوس نہ کر نافرمان قوم پر''۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی کی سزا

''فَاِنَّهَا'' میں ھا ضمیر ارض مقدسہ کی طرف پلٹ رہی ہے۔ ان پر اس سرزمین پر داخلہ حرام ہے تو یہ حرمت تشریعی نہیں ہے بلکہ اس سے تکوینی حرمت مراد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اُن کی نافرمانی کی وجہ سے ان کے لیے مقدر کر دیا ہے کہ اب چالیس سال تک اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکیں گے بلکہ صحرا میں سرگرداں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت میں پہلی بات یہ کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم ان کی اس حالت پر غمگین مت ہو۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی تائید کر دی اور موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان جدائی ڈال دی اور ان کو فاسق کا عنوان دیا۔ بنی اسرائیل اس تکوینی حکم کے تحت صحراء میں صبح سے شام ادھر سے اُدھر جاتے اور سرگرداں پھرتے رہے، اور ایک سرگرداں گھوڑے کی طرح جو کسی چیز کے گرد چکر لگا رہا ہوتا ہے، سرگرداں رہے اور کسی شہر اور کسی وادی میں نہیں پہنچ سکے۔ یہ ان کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی دنیاوی سزا تھی۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

''ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دے، جب ان دونوں نے قربانی کی ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی، اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا، اس نے جواب دیا اللہ پرہیزگاروں ہی سے قبول کرتا ہے''۔

آدمؑ کے بیٹوں کی داستان

اس آیت میں '' اتْلُ '' یعنی تلاوت، پڑھنے کے معنی میں ہے۔'' قُرْبَانًا'' یعنی ہر وہ عمل اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے انسان اللہ تبارک و تعالیٰ یا کسی اور کا قرب حاصل کرے۔'' يُتَقَبَّلْ'' قبول کرنے کو کہتے ہیں، ایسی قبولیت جس میں بڑی عنایت اور اہتمام ہو ۔''عَلَيۡهِمۡ '' میں ھم ضمیر اہل کتاب کی طرف پلٹ رہی ہے۔آدم سے وہی ابو البشر مراد ہیں جو پہلے پیغمبر الٰہی ہیں اور ہابیل و قابیل سے ان کے بیٹے مراد ہیں۔

آیت میں '' نَبَاَ '' کو '' بِالْحَقِّ ''یعنی یہ سچی خبر ہے، سے مقید کرنے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حضرت آدم کے بیٹوں کے متعلق جو داستان بنی اسرائیل میں مشہور تھی وہ تحریف شدہ ہے اور اس کی جزئیات وہاں سے ہٹا دی گئی ہیں مثلاً تورات میں کوے کا آنا اور اپنی چونچ سے زمین کو کھودنا کا تذکرہ نہیں ہوا ہے۔اس کے علاوہ تورات میں نقل شدہ داستان میں اللہ تعالیٰ کو جسم قرار دیا گیا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی اباطیل اور باطل باتوں سے برتر، منزہ اور پاک ہے۔

اصل داستان یہ ہے کہ حضرت آدم کے دو بیٹوں نے اللہ کے حضور قربانی دی لیکن اُن میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ قابیل جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اس نے ہابیل سے کہا میں تجھے قتل کر دوں گا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں ہابیل کے بارے حسد تھا۔ کیونکہ ہابیل نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہابیل کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا۔ ہابیل نے جواب میں کہا، قربانی کا قبول ہونا یا نہ ہونا کوئی جرم اور تقصیر تو نہیں، تیرا جرم یہ ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہو، تم میں اللہ کے عذاب کا خوف نہیں ہے۔ اللہ اس قربانی کو قبول نہیں کرتا جس میں تقویٰ نہ ہو، خدا صاحبان تقویٰ کی قربانی کو قبول کرتا ہے۔

لَىِٕنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾

''اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں''۔

ہابیل کا قابیل کو جواب

یہ جملہ ''بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ'' اس بات سے کنایہ ہے کہ قابیل نے قتل کے آلات تیار کر لیے تھے۔ اس جملہ شرطیہ کے جواب میں ہابیل نے مثبت جملہ کہنے کے بجائے منفی جملہ استعمال کیا اور وہ بھی جملہ اسمیہ لا کر اس بات کی تاکید کی کہ یہ جس جنایت اور جرم کے تم مرتکب ہو رہے ہو، میں ایسا نہیں کر سکتا، میں نہ فقط ایسے جرم کے ارتکاب کا فیصلہ نہیں کروں گا بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آخر میں کہا ہے کہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں یعنی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جی ہاں! متقین ہمیشہ اپنے رب کی یاد میں ہوتے ہیں اور ان کا دل ہر وقت لرزاں رہتا ہے اور مقام ربوبیت کو وہ دیکھ چکا ہوتا ہے۔ مقام ربوبیت انہیں ایسا کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی جس میں اللہ کی نافرمانی ہو اور وہ کسی ظلم اور گناہ کا مرتکب ہو اور ہلاکت میں جا پڑے۔ ہابیل نے کہا کہ میں تیرے قتل کی فکر اور سوچ و خیال اس لیے نہیں کر سکتا کیونکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی پرواہ رکھتا ہوں یعنی اللہ کے احکام کا لحاظ کرتا ہوں اور اللہ کے عذاب سے خود کو بچاتا ہوں۔

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِكَ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۚ۲۹﴾

"میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن جائے، اور ظالموں کی یہی سزا ہے"۔

قابیل کو قتل کرنے کی سزا کی اطلاع

"تَبُوءَ" "ترجع" کے معنی میں ہے۔ یعنی ہابیل نے قابیل سے کہا کہ جس وقت تم میرے قتل کے جرم سے فارغ ہو گے تو میرا گناہ اور تیرا گناہ سب تیری گردن پر آجائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے قاتل مقتول کے گناہ کو بھی اپنے دوش پر لے لیتا ہے، مقتول اپنے گناہوں سے بری ہو جاتا ہے اور وہ بے گناہی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ البتہ یہ معنی سورہ النجم آیت ۳۸ "کسی کے گناہ کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا" سے منافات نہیں رکھتا کیونکہ یہ مسئلہ عقل نظری کے احکام سے نہیں ہے تاکہ عقل حکم دے کہ ایسا ہونا محال ہے بلکہ یہ ثبوت میں عقل عملی کے احکام سے ہے اور اس کی تبدیلی معاشرہ کی مصلحتوں اور مفادات کے تابع ہے۔ اس مورد میں کیونکہ قاتل معاشرے کے ایک فرد کے قتل کا سبب بنا ہے کہ وہ اجتماع اور سوسائٹی کے حقوق کو نہ پاسکے۔ لہٰذا معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاتل کی اچھی خدمات اور اس کے صالح اعمال کو نظرانداز کردے۔ اس طرح قاتل نے اس قتل سے مقتول کے گناہوں کو بھی اپنی گردن پر لے لیا ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو اپنے قتل کی اجازت دی ہو تاکہ وہ شقی اور بدبخت ہو جائے اور عذاب میں ہو اور خود ہابیل خوش بخت ہو۔ یا یوں کہیں کہ مظلوم اگر چاہے تو ظالم اس کے گناہ کا بوجھ بھی اپنی گردن پر لے لے اور مظلوم صبر کرے اور اپنے حق کا دفاع نہ کرے۔ یہ باتیں نادانی کی وجہ سے ہیں کیونکہ اس طرح کی بات گناہ اور ظلم پر اعانت اور مدد کرنے کے مترادف ہے اور یہ خود گناہ اور ظلم شمار ہوتا ہے۔ اس طرح مظلوم ظالم کے گناہ میں شریک ہو جائے گا جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سورہ

شوریٰ کی آیت ۴۱ میں فرماتا ہے: ترجمہ: ''وہ شخص جو ظلم کے بعد جو اس پر ہوا ہے اپنے انتقام کے لیے مدد طلب کرے تو اس کے لیے کوئی راستہ جواب طلبی کا موجود نہیں ہوگا''۔

یہ تو مسلم ہے کہ گناہ کا نتیجہ آتش دوزخ ہے اور اسی وجہ سے ستمگاروں کی سزا انہیں ملے گی اور جنہوں نے ظلم کیا ہے وہ فکر نہ کریں کہ وہ اللہ کی طرف پلٹ کر نہیں جائیں گے۔ اس مسئلے میں بھی ایسا نہیں ہے کہ ہابیل نے سر آگے کر دیا ہو اور قابیل سے کہا ہو کہ مجھے مار دو بلکہ ہابیل نے کہا میں اس خوف سے کہ تو مجھے مار رہا ہے تجھے قتل نہیں کروں گا۔ یعنی اس نے یہ بات کہی باقی تو مجھے قتل کرے گا تو اس سے تجھے سزا ملے گی۔ یعنی اس نے اسے سمجھانے کی بھی کوشش کی مجھے قتل کرنے پر تجھے سزا ملے گی۔ للذا تم میرے قتل کرنے سے رک جاؤ کیونکہ اس جرم کی بڑی سزا ہے۔ اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ہابیل مکالمہ کے ذریعہ قابیل کو اپنے قتل سے روک رہے تھے۔ اس طرح اپنی حفاظت یقینی بنانا چاہتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور قابیل نے تاریخ انسانیت کا پہلا جرم اور وہ بھی قتل کر ڈالا ۔ ہابیل فقط قابیل کے ارادہ قتل کی وجہ سے اسے مار نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کہا کہ تم نے جو ارادہ کر لیا ہے تو میں اس بناء پر تجھے قتل نہیں کروں گا۔ لیکن ساتھ اسے سمجھایا کہ تم اس جرم کا ارتکاب نہ کرو، لیکن قابیل پر اس کا نفس غالب آگیا اور اس نے یہ بڑا جرم کر ڈالا۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۳۰

''پھر اسے اس کے نفس نے اپنے بھائی کے خون پر راضی کر لیا پھر اسے مار ڈالا پس وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا''۔

قابیل کا اقدام قتل

قابیل کے نفس نے پے در پے اس کو وسوسے میں ڈال دیا اور آخر کار اس نے ٹھان لی کہ اس برے عمل کا ارتکاب کرے اور اس طرح اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ ظاہر ہے

قاتل نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہے۔ یہ انہی میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں، یا اس طرح کہیں گے کہ قتل کے بعد جب یہ صبح کو اٹھا تو یہ نقصان اٹھانے والوں میں سے تھا، لیکن پہلا معنی درست تر ہے۔ قابیل نے اپنے خسارہ کا سودا کیا اور بڑا جرم کر ڈالا جس کا اسے ہی نقصان ہوا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

''پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدتا تھا تاکہ اسے دکھلائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپانا ہے، اس نے کہا افسوس مجھ پر اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر کرتا، پھر پچھتانے لگا''۔

کوے کی لاش دفنانے کی رہنمائی

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قابیل اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد کچھ عرصہ متحیر اور خوف کی حالت میں تھا کہ دوسرے لوگ اس کی جنایت سے باخبر ہو جائیں گے اور وہ اس فکر میں تھا کہ اپنے بھائی کے جسد کے ساتھ کیا کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے کوے کو مامور کیا کہ وہ زمین کھودے اور کسی چیز کو زمین میں دفن کرے، اس طرح اس کو سکھایا کہ بھائی کے جسد کو کس طرح دفن کرے۔ ''سَوْءَةَ'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے انسان ناپسند کرے۔ قابیل کی گفتگو اس کے عاجز ہونے کی حکایت کرتی ہے جس میں اس نے کہا کہ وائے ہو مجھ پر کہ میں ایک کوے سے بھی کمتر ہوں۔ یہ استفہام انکاری، سوال ہے کہ کیوں اس

طرح کی سوچ مجھ میں نہیں آئی اور اتنا عرصہ میں متحیر رہا اور اپنے بھائی کو دفن نہ کر سکا۔ یا کلی طور پر اس قتل پر پشیمان ہوا۔

عام طور پر انسان ایک گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے تو وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے اس کے جرم سے مطلع ہوں کیونکہ معاشرہ اس قسم کے اعمال کو اپنے سسٹم میں ٹھیک نہیں سمجھتا، جو نظام اس پر حاکم ہوتا ہے اس کو توڑنا نہیں چاہتا اور معاشرہ کے اجزاء ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خواہ مخواہ ایسے اعمال سوسائٹی میں ظاہر ہوتے ہیں تو مجرم چاہتا ہے کہ معاشرے کو مجبور کرے کہ اس کے عمل کو قبول کرے جبکہ معاشرہ اس قسم کے جرائم پیشہ کے اعمال کو قبول نہیں کرتا۔ اگر کوئی انسان زہر کھالیتا ہے تو حتمی بات ہے کہ اگر اس کا ہاضمہ کچھ دیر تک تو اس کو تحمل کرتا ہے ہضم کرتا ہے آخر کار زہر کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ مر جاتا ہے اور اس کا اثر زائل نہیں ہوتا۔ ظلم بھی اسی طرح ہے کہ جب ظلم ایک معاشرے اور سوسائٹی کے اندر ہو تو گویا وہ سوسائٹی کے جسم میں داخل ہوا ہے اور وہ ایک حد تک رہے گا آخر کار وہ اس سوسائٹی کی تباہی اور اس کے نظم اور اس کی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ سورہ فجر، آیت ۱۴: ترجمہ: ''تیرا رب کمین گاہ میں ہے، تیری تاک میں ہے''۔ کوے کی رہنمائی سے قابیل نے اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں دفن کر دیا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اسی سبب سے، ہم نے بنی اسرائیل پر لکھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد (روکنے) کے علاوہ قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی کو زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی، اور ہمارے رسول ان کے پاس کھلے حکم لا چکے ہیں پھر بھی ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس کے بعد بھی زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں''۔

ایک انسان کا قتل سارے انسانوں کے قتل کے مترادف

اس آیت میں ''اَجَلِ'' جنایت کے معنی میں ہے، یا ایسی جنایت کے معنی میں ہے جس کا آنے والے زمانے میں واقع ہونے کا خوف ہو۔ ہر جنایت اجل نہیں ہے۔ یہ لفظ آہستہ آہستہ سببیت اور علت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے اس چیز کو بتانے کے لیے کہ یہ کام اس وجہ سے ہوا ہے۔ ''ذٰلِكَ'' آدم کے بیٹوں کی داستان کی طرف اشارہ ہے یعنی ایک دردناک واقعہ جو آدم کے بیٹوں کا ہوا اور جس کی وجہ سے انسان کی طبیعت اور مزاج رنجیدہ ہوا۔

انسان اگر نفسانی خواہشات کو اپنائے گا تو حتمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور کینہ ورزی ہو گی اور حسادت گویا رب تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا ہے، ہدف خلقت کو باطل سمجھنا ہے۔ کیونکہ حسد کرنے والا اللہ کے کام میں چوں چراہ کرتا ہے۔ کیونکہ جس فرد سے حسد کیا جاتا ہے ممکن ہے آخر میں بات اس کے قتل تک پہنچ جائے۔ یہ امر زمین میں فساد کا موجب ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ کا جو ہدف ہے کہ زمین پر انسان کی نسل بڑھے یہ امر اس کے خلاف ہے۔ بغیر وجہ کے کسی کا قتل، اللہ کے حکم کو باطل قرار دینا ہے اور اللہ کے حکم کے سامنے کھڑا ہو جانا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بڑی دقت کے ساتھ بتا دیا کہ بغیر وجہ کے ایک فرد کا قتل سب انسانوں کو قتل کرنے کے مترادف

ہے اور ایک فرد کو مرنے سے بچا لینا ساری انسانیت کو بچا لینے کے مانند ہے۔ یہ ایک کلی قاعدہ ہے۔

یہاں پر "کتابت" حکم تکلیفی کے معنی میں نہیں ہے۔ لیکن یہ تشدید اور تہدید سے بھی خالی نہیں ہے اور بنی اسرائیل اور دوسرے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے کہ نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور اس کے انجام سے ڈریں کیونکہ ایسے اعمال رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں اور دُنیا و آخرت میں برے نتائج ان کے گریبان کو پکڑیں گے۔

آخر میں بنی اسرائیل کا وصف بیان کیا کہ یہ فسادی ہیں اور گناہ پر اصرار کرتے ہیں، تکبر کرتے ہیں، نافرمان ہیں جبکہ ان کے پاس کثیر تعداد میں پیغمبر کھلے معجزات لے کر آئے لیکن انہوں نے اعتدال کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ صراط مستقیم سے منحرف ہوتے چلے گئے، پیغمبروں کو قتل کیا ان کی باتوں کو نہیں مانا اور مسلسل فساد پھیلاتے رہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

"ان کی بھی یہی سزا ہے جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں یہ کہ انہیں قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں، یہ ذلت ان کے لیے دنیا میں ہے، اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

محاربین اور فساد پھیلانے والوں کی سزا

"محاربہ" کا لفظی معنی اللہ کے حوالے سے محال ہے۔ اس بنا پر ہم کہیں گے کہ یہاں پر اس کا مجازی معنی مراد لیا گیا ہے کہ جو اللہ کے احکام کی مخالفت کرے گا یا ظلم اور اسراف کا مرتکب ہو گا۔ رسول خداﷺ کے ساتھ محاربہ سے ہر وہ عمل مراد ہے جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی ولایت باطل ہو جائے جیسے خود ان سے یا مسلمانوں سے جنگ کرنا، راہزنی کرنا اور عمومی امن کو تباہ کرنا اور زمین میں فساد پھیلانا، فساد کے لیے اسلحہ اٹھانا، محترمات کی بے حرمتی کرنا۔ ولایت پیغمبر کے دامن میں امن عامہ قائم ہوتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے جو ان بُرے افعال کا مرتکب ہوتا ہے یا تو اُس کو قتل کیا جائے گا یا اسے پھانسی پر لٹکایا جائے گا یا اس کے مخالف سمت کے ہاتھ اور پاؤں کو کاٹا جائے گا یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں۔

فساد پھیلانے کی کیفیت کیا ہے؟ اور جس نے یہ عمل کیا ہے وہ کس حد تک کیا ہے؟ کیا اسلحہ اٹھایا ہے یا چوری کر کے فساد پھیلایا ہے یا قتل کا مرتکب ہوا ہے؟ "تبعید اور نفی بلد" سے مراد یہ ہے کہ اس کو شہر بدر کیا جائے، جس شہر میں اس نے گناہ کیا ہے فساد کیا ہے اس سے نکال کر دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ دوسری جگہ کے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ شخص فلاں شہر سے اس جرم کی وجہ سے نکالا گیا ہے، اس کے ساتھ رہن سہن خرید و فروخت، ازدواج مت کرو اور اس کا سوشل بائیکاٹ کرو، اسے اپنے کھانے پینے کے نظام میں شریک نہ کرو۔ اگر وہ دوسرے شہر میں گیا ہے تو وہاں کے لوگوں کو بھی بتانا ہو گا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ایسا کریں یہاں تک کہ وہ مر جائے۔

اگر کہا جائے کہ وہ کفر اور شرک کے شہروں میں چلا جائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہاں چلا جائے تو یا اُن لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا یا وہ انہیں قتل

کر دے گا۔ "خِزۡیٌ" ذلت اور رسوائی کے معنی میں ہے۔آیت میں کہا جارہا ہے کہ یہ ظالم اور مفسد کے لیے دنیا کی ذلت اور رسوائی ہے۔اس کا اخروی عذاب اس سے بھی بہت بڑا ہے اور اس کو دی جانے والی دُنیاوی سزا اس کی اخروی سزا کے ختم ہونے کا سبب نہیں بنتی۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَيۡهِمۡ‌ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۴﴾

"مگر جنہوں نے تمہارے قابو پانے سے پہلے توبہ کرلی، تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

مجرم کی توبہ

یہ حکم اس محارب اور مفسد کے ساتھ مخصوص ہے جس نے گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کرلی ہو۔لیکن اگر کوئی محارب اور مفسد مومنین کے تسلط اور غلبہ حاصل کرلینے اور گرفتاری کے بعد توبہ کرلے جبکہ دو گواہوں نے اس کے جرم پر گواہی بھی دے دی ہو اور کہا ہو کہ اس نے مومنوں پر تلوار کھینچی ہے یا کسی کو قتل کیا ہے تو اس صورت میں شرعی حد اور قصاص اس سے ساقط نہیں ہو گی۔

" فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۴﴾ "اس بات سے کنایہ ہے کہ اگر وہ گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے تو اس سے شرعی حد ساقط ہو جائے گی۔ یہ اُن موارد میں سے ہے جہاں اللہ کی مغفرت اور بخشش اخروی امر سے متعلق نہیں ہے۔اخروی امر علیحدہ ہے۔ یہ توبہ سبب بن جائے گی کہ حد اس سے ساقط ہو جائے اور اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ عدالت میں جا کر اپنا تعارف کروائے کہ میں وہ شخص ہوں کہ جس نے فلاں کو قتل کیا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَ ٱبۡتَغُوٓا إِلَيۡهِ ٱلۡوَسِيلَةَ وَ جَٰهِدُوا فِي سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ۝٣٥

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اللہ کا قرب تلاش کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

قرب الٰہی کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کا حکم

"وسیلہ" یعنی وہ ذریعہ جس کے ذریعے سے رغبت اور خوشی کے ساتھ خود کو کسی جگہ پہنچایا جاتا ہے۔ درگاہ خدا تک پہنچنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کا معنی یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے مناسب ذرائع استعمال کئے جائیں اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کا خیال رکھا جائے۔ اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے احکام کا علم ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی پیروی اور اللہ کی بندگی کی جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مکارم اخلاق اور اچھے اخلاق اور شریعت میں بیان شدہ مستحبات پر عمل کیا جائے۔ یہ ساری چیزیں تقرب الٰہی کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان عبودیت اور بندگی کی ذلت سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہے۔

بندگی کی حقیقت خضوع و خشوع وانکساری اور عاجزی ہے جو انسان کو اللہ تک پہنچاتی ہے۔ راہ خدا میں جہاد سے مطلق جہاد مراد ہے، جو جہاد بالسیف یا جہاد بالنفس، کافروں کے ساتھ جنگ لڑنا ہو یا اپنے اندر کے شیطان کے ساتھ سب کو شامل ہے۔ اسی طرح وسیلہ سے بھی مطلق وسیلہ مراد ہے یعنی ہر وہ چیز جو انسانکو اس کے رب سے جوڑ دے اور رب کے قریب کرے۔ وسیلہ تلاش کرنے کے حکم کے بعد راہ خدا میں جہاد کرنے کا حکم عام کے بعد خاص ہے، اور یہ اس امر کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے ہے کہ اللہ کے لیے وسیلہ تلاش کرو یعنی تقویٰ

اختیار کرو یہ تقویٰ کا حکم بھی عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ وسیلہ، تقویٰ سے خاص تر ہے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بندہ تقویٰ کے کمال تک تو پہنچا ہے لیکن اس کے پاس وسیلہ نہیں ہے جس کا اعلیٰ مصداق پیغمبر ﷺ اور آئمہ دین کی ولایت ہے، ایسا انسان کامیابی نہیں پا سکتا، کیونکہ رستگاری اور کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے خدا کی طرف جانے کے لیے وسیلہ تلاش کر لینا اور اس کی بندگی کر لینا۔ لہٰذا جس نے خدا تک جانے کے وسیلے کو حاصل کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَهٗ مَعَهٗ لِیَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۳۶﴾

”بے شک جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لیے تاوان میں دیں تو بھی ان سے قبول نہ ہوگا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

کفار کے لیے قیامت کا حتمی عذاب

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی چیز تقویٰ، وسیلہ اور راہ خدا میں جہاد کا متبادل نہیں ہے۔ پس جو کافر ہوئے، تقویٰ اختیار نہیں کیا، رب تعالیٰ تک جانے کا وسیلہ حاصل نہ کر سکے، اللہ کی راہ میں جہاد کو نظر انداز کیا تو فرض کر لیں کہ جو کچھ زمین میں ہے اور اس سے بھی ڈبل اور جو کہ بنی آدم کی آخری آرزو ہوتی ہے کہ یہ سب دولت و مال اسی کے لیے ہو اور اس سے بھی زیادہ ہو اور اس سب کو قیامت کے دن دے کر اللہ کے عذاب سے بچنا چاہیں تو ان سے کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور کوئی بھی چیز ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گی۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

''وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں حالانکہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں، اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے''

کفار کے عذاب کا دائمی ہونا

کافروں کی کوشش تو بہت ہو گی کہ وہ آتش جہنم اور عذاب سے باہر نکل آئیں اور وہ بڑا ہاتھ پاؤں ماریں گے لیکن اُن پر عذاب پائیدار اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور کبھی بھی ان سے جدا نہیں ہو گا۔ اس میں پہلی بات یہ ہے کہ عذاب ایسی چیز ہے کہ جو اُن لوگوں کے لیے ہے جن کا انجام یہ قرار پایا ہے۔ انسان کو اس عذاب سے دُور کرنے کا واحد سبب ایمان اور تقویٰ ہے۔ جب ایمان اور تقویٰ نہیں تو اس عذاب سے بچنا ممکن ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ آگ سے درد اور تکلیف محسوس کرتا ہے اور انسان کبھی نہیں چاہتا کہ وہ آگ میں جائے۔ لیکن جب ایسے اعمال کرے گا جن کا انجام آگ کا عذاب ہے تو اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس عذاب سے باہر نکلے اور اب وہ چاہے کہ آگ اس تک نہ پہنچے تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ اس آگ سے باہر آنے کی کوشش بھی کریں گے لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو گی۔

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

"اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

چوری کی شرعی حد

اس جگہ چوری کا حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ چور مرد ہو یا عورت؛ اُن کے ہاتھ کاٹنے ہوں گے۔ ید سے جسم کا مشہور حصہ مراد ہے۔ روایات میں ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ہاتھ کے کاٹنے کے کئی مصادیق ہیں یہ کندھے سے کاٹنے پر بھی صادق آتا ہے اور اس کے ایک حصے کو کاٹنے پر بھی صادق آتا ہے۔[1]

"قطع" کاٹنے والے وسیلے اور اوزار سے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ "جَزَآءً" یہ جملہ حالیہ ہے درحالیکہ یہ ہاتھ کاٹنا سزا ہے اس برے عمل کی جس کو اس نے انجام دیا ہے اور یہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اللہ کی طرف سے اس کے لیے عذاب ہے۔ "نَکَالًا" اس عقوبت اور سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے جرائم سے ہاتھ اٹھالے اور دوسرے بھی اس کی اس حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ خداوند متعال کے سارے احکام حکمت کے تحت ہیں اور اس کی عزت و اقتدار کو بیان کر رہے ہیں، اللہ کے احکام بے ہودہ اور بے مقصد نہیں ہیں۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۹﴾

---

[1] ۔ فقہی اعتبار سے چور کی سزا یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹی جائیں گی۔ دوسری دفعہ بائیں پاؤں کی پانچ انگلیاں کٹیں گی، تیسری دفعہ ہمیشہ کے لیے جیل میں ہوگا، چوتھی دفعہ اگر اس نے جیل میں بھی چوری کر لی تو اس کو قتل کیا جائے گا۔ اس کی تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔ (مصحح)

”پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کرلی تو اللہ اس کی توبہ قبول کرلے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے“۔

توبہ کی قبولیت

چور کا ہاتھ کاٹنا اللہ کی جانب سے عقوبت ہے تاکہ جس کو عقوبت اور سزا ملی ہے وہ اپنے گناہ سے واپس پلٹ آئے۔ اگر چوری کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے، چوری کا مال واپس لوٹا دے اور پھر چوری نہ کرنے کا عہد کرے تو اس صورت میں خدا بھی اپنی مغفرت اور رحمت کے صدقے اس کی واپسی کو قبول کرلے گا اور اس کی توبہ قبول ہوگی۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

”کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے، اور اللہ سب چیزوں پر قادر ہے“۔

اللہ کا مطلق اختیار

یہ آیت پچھلی آیت میں بیان شدہ مطلب کی علت کو بیان کر رہی ہے۔ اگر چور توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو ہم اس کی توبہ کو قبول کرلیں گے، یہ بات اللہ تعالیٰ سے بعید نہیں ہے کیونکہ وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور ہر مالک اپنے مملوک پر جیسا چاہے فیصلہ کر سکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا اختیار ہے، اللہ اختیار مطلق کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہے معاف کرے جس کو چاہے سزا دے۔ یہ سب معاملات حکمت اور مصلحت کے تحت ہیں جس کو وہ جانتا ہے۔ ”مُلك“ اللہ کی قیومیت اور اللہ کی ایجاد اور اللہ کی خلقت کے فروعات سے ہے اور اللہ کی قدرت کے لوازمات سے ہے لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ کا حکم اور ارادہ ہی نافذ ہے اور مطلق

ملک (اختیار) اسی کا ہے اور کسی کو کچھ دینا اور کسی سے کچھ روکنا اسی کی قدرت میں ہے، اپنے ملک میں صاحب اختیار وہی ہے لہٰذا اپنی حکمت کے تحت چور کی توبہ قبول کر لے یا اسے سزا دے یہ اسی کا اختیار ہے اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾

"اے رسول! ان کا غم نہ کر جو دوڑ کر کفر میں گرتے ہیں وہ لوگ جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں حالانکہ ان کے دل مومن نہیں ہیں، اور وہ جو یہودی ہیں، جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرتے ہیں وہ دوسری جماعت کے جاسوس ہیں جو تجھ تک نہیں آئی، بات کو اس کے اصلی جگہوں سے بدل دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تمہیں یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ملے تو بچتے رہنا، اور جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے پھر توں اللہ کے ہاں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، یہ وہی لوگ ہیں جن کے

دل پاک کرنے کا اللہ نے ارادہ نہیں کیا، ان کے لیے دنیا میں ذلت ہے، اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے"۔

منافقوں کا رویہ اور یہودیوں کی سازشیں

اس آیت میں منافقوں کے رویہ اور یہودیوں کی سازشوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور حضور پاک ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ ان کے ان رویوں اور سازشوں سے پریشان اور غمزدہ نہ ہوں۔ یہ منافقین تیزی سے کفر کے راستے کو طے کرتے ہیں، ان کے اعمال اور اقوال ان کے کفر کا سبب تھے۔ یہ منافقین زبان سے کہتے تھے ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان نہ تھا، ان کے دل ایمان نہیں لائے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کے بارے میں جو پیغمبر کے پاس آکر آپ سے گفتگو کرتے تھے، فرمارہا ہے کہ ان کی باتیں اُن کے عمل کے الٹ ہیں، آپؐ سے کہا جارہا ہے کہ اُن کی باتوں سے غمگین نہ ہوں۔

جیسا کہ آیت میں بیان ہوا ہے یہودی بہت زیادہ جھوٹ بولتے اور سنتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ جھوٹ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو قبول کرتے اور دوسری قوم کو فائدے پہنچانے کے لیے جو تیرے پاس نہیں آئے وہ بہت زیادہ جھوٹ سنتے ہیں اور وہ قوم جو کچھ کہے یہودی اسے قبول کرتے تھے۔ ان کی باتوں میں تحریف کرتے تھے۔ اس پوری گفتگو میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہودیوں کی ایک تعداد ایک دینی مسئلے اور واقعے میں مبتلا ہوئے اور اُس واقعے کے متعلق اُن کے دین کا حکم ثابت تھا لیکن علماء یہود نے ان کے دین میں اس حکم کے ثابت ہونے کے باوجود اس حکم کو بدل دیا، اس نیت سے کہ یہ حکم نافذ نہ ہو۔ انہوں نے یہودیوں کے ایک گروہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا اور اُن سے کہا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنے اس مسالہ میں حکم قرار دیں، اگر انہوں

نے وہی فیصلہ دیا جو تحریف شدہ تھا تو قبول کرلینا اور اگر کوئی اور حکم دیا یعنی وہی حکم دیا جو یہودیوں کی کتاب تورات کا واقعی حکم تھا تو اس کو قبول نہ کرنا، اس سے پھر چوکنا رہنا۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے رسول خدا ﷺ سے فرمایا یہودی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خدا نے فتنے میں مبتلا کیا ہے۔ جان لیں کہ سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کی جانب سے یہ جس ماجرا میں مبتلا ہوئے ہیں اس ماجرا کے تمام پہلوؤں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اس کے کسی پہلو کے مالک نہیں ہیں لہٰذا اس حادثے سے غمگین نہ ہوں۔ کیونکہ یہودی اور منافقین ایسے لوگ ہیں جن کے دل اُسی سابقہ پلیدی اور نجاست پر باقی ہیں اور اس کی وجہ اور سبب اُن کے وہ گناہ ہیں جن کے یہ بار بار مرتکب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے نہیں چاہا کہ ان کی تطہیر کرے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو خبردار کیا ہے کہ خدا دُنیا میں بھی انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام کی روایت ہے کہ خیبر کے اشراف کی ایک عورت کے ساتھ اسی قبیلہ کے ایک فرد نے زنا کیا، زناکار مرد اور عورت دونوں شادی شدہ تھے۔ یہودیوں کے بڑے علماء سے اس واقعہ کا حکم پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ اس فعل کا حکم سنگسار ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ عورت اور مرد دونوں اشراف سے تھے اور بڑے گھرانے سے تھے تو علماء یہود نے ان کے سنگسار کرنے کو ناپسند کیا۔ لہٰذا مدینہ کے یہودیوں کو خط لکھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے اس مسئلے کے بارے میں حکم دریافت کریں کہ اس اُمید کے ساتھ کہ شاید اسلام کا حکم تورایت میں دیئے گئے حکم سے آسان تر ہوگا۔ جیسا کہ بیان ہوا توریت میں ایسے مجرم کی سزا سنگسار تھی۔

مدینے کے یہودیوں کی ایک تعداد جن میں کعب بن اشرف، کعب اُسید اور شعبہ بن عمر اور کچھ دوسرے لوگ مل کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور مسئلہ پیش کیا کہ اے محمد ﷺ ہمیں اس بارے میں بتائیں کہ اگر ایک شادی شدہ مرد، شادی شدہ عورت سے زنا

کے جرم کا ارتکاب کرے تو ان کی سزا کیا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میرے فیصلے کو پسند کرو گے؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں! اسی وقت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور ان دونوں کے سنگسار کا حکم لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان دونوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو سنگسار کیا جائے گا۔ یہودیوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔

جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ عبداللہ بن صوریا نامی شخص جس کی یہ نشانیاں ہیں کو اپنے اور ان کے درمیان حکم قرار دو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس آئے ہوئے یہودیوں سے پوچھا کہ ایسا جوان جس کے چہرے پر بال نہیں اُگے، جس کا چہرہ سفید اور نرم و نازک ہے، فدک میں اس کا گھر ہے تم اسے پہچانتے ہو؟ سب نے کہا جی ہاں! تو آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے نزدیک وہ کیسا آدمی ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے؟ سب نے کہا کہ وہ یہودی علماء میں سب سے زیادہ علم والا ہے۔ روئے زمین پر موجود یہودی علماء میں سے سب سے بڑا عالم ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا اس کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ وہی ہے۔ تو حضرت ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اسے لے آؤ۔ یہودیوں نے ایک وفد فدک روانہ کیا اور عبد اللہ بن صوریا کو لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تجھے اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں، وہ اللہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور وہی خدا ہے جس نے توریت کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا ہے اور دریا کو تم بنی اسرائیل کے لیے دو نیم کیا اور تمہیں غرق ہونے سے نجات دی، فرعون اور فرعونیوں کو غرق کیا، وہی خدا جس نے تمہارے سروں پر بادل کا سائبان بنا دیا، تمہارے لیے من و سلویٰ نازل کیا، کیا شادی شدہ مرد اور عورت کے زنا کرنے کی سزا تمہاری کتاب میں سنگسار ہے؟ تم نے یہ اپنی کتاب میں پڑھا ہے یا نہیں پڑھا؟ ابن صوریا نے کہا: اس خدا کی قسم اُٹھا کر کہتا ہوں جس کی خصوصیات آپ نے شمار کی ہیں، توریت کا حکم بالکل ایسا ہی ہے اور اسی خدا کی قسم اُٹھا کر کہتا ہوں اگر اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ توریت کا رب مجھے توریت کے بارے میں جھوٹ باندھنے اور اس کو

تحریف کرنے کے جرم میں آگ میں ڈال دے گا تو میں اس کا اعتراف ہر گز نہ کرتا۔ لیکن اے محمد ﷺ! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی کتاب میں شادی شدہ کے زنا کرنے پر کیا سزا ہے تو حضرت محمد ﷺ نے فرمایا قرآن میں زنا کی سزا کا حکم یہ ہے کہ چار گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے دیکھا ہے کہ مرد کا آلہ تناسل اسی طرح عورت کے فرج میں داخل تھا جس طرح سرمہ دانی میں سرچو، تو اس صورت میں حاکم پر واجب ہے کہ وہ عورت اور مرد دونوں کو سنگسار کرے، رجم کرے۔

ابن صوریا نے کہا اللہ تعالیٰ نے توریت میں بھی اسی طرح حکم اُتارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر ابن صوریا سے فرمایا: پہلی بار کب تم نے اللہ کے حکم کو نظرانداز کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ اگر زنا کرنے والی عورت بڑے گھرانے سے ہوتی تو ہم اسے سنگسار کی سزا نہیں دیتے اور اسے آزاد کر دیتے تھے لیکن اگر کمزور گھرانے سے ہوتی تو اس پر زنا محصنہ کی سزا سنگسار جاری کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ اشراف اور بڑے گھرانوں میں زنا عام ہو گیا۔ ایک دفعہ ہمارے بادشاہ کے چچازاد بھائی زنا محصنہ کے مرتکب ہوئے تو اسے سنگسار نہیں کیا گیا، کچھ ہی عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نچلے طبقے کا ایک آدمی زنا محصنہ کا مرتکب ہوا تو ہم نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس نے کہا میں کبھی بھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دُوں گا کہ تم مجھے سنگسار کرو، جب تک تم بادشاہ کے چچا کے بیٹے کو سنگسار نہ کرو۔ اس وقت جب ہم نے علماء یہود کی آبرو کو خطرے میں دیکھا تو اکٹھے ہوئے اور ہم نے زنا محصنہ یعنی شادی شدہ مرد اور عورت کے زنا کے لیے ایک حد معین کر دی جو حد سنگسار سے خفیف تر اور کم تھی چاہے وہ اشراف سے ہوتے یا غیر اشراف سے۔ یعنی بڑے گھرانے والے اور چھوٹے گھرانے والے سب کے لیے ایک جیسی سزا مقرر کر دی۔ اور وہ سزا یہ تھی کہ ان کو تازیانے لگائے جاتے تھے یعنی چالیس کوڑے لگائے جاتے تھے پھر اس کے چہرے کو سیاہ کرتے پھر زنا کار مرد کو ایک گدھے پر سوار کرتے اور زانیہ عورت کو دوسرے گدھے پر سوار کرتے اس

طرح کے ان دونوں کا منہ گدھے کی دم کی جانب ہوتا یعنی الٹا بیٹھا کر ان کو اسی شہر میں گھماتے تھے۔ اس کے بعد شادی شدہ عورت کے زنا کی سزا رجم کی بجائے اس طرح سزا دی جاتی تھی۔

دوسرے یہودیوں نے ابن صوریا کی مذمت کی کہ کتنی جلدی تم نے یہودیوں کے اسرار اور رازوں کو فاش کر دیا ۔ تمہارے پاس اس مشکل کو حل کرنے کی اہلیت اور لیاقت نہیں تھی کیونکہ تم غائب تھے تو ہم نے نہیں چاہا کہ تیری بدگوئی کریں اور ہم یہ کہیں کہ ہمیں تیری حاکمیت قبول نہیں ہے۔ ابن صوریا نے کہا میں نے اس لیے اعتراف کیا کہ انہوں نے مجھے تورات کی قسم دی، اگر یہ نہ ہوتا تو میں یہودیت کا راز فاش نہ کرتا۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی عورت اور مرد کو مسجد کے دروازے کے سامنے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ ابن صوریا نے عرض کیا میں پہلا یہودی عالم ہوں جس نے اُس بات کو جسے دوسروں نے چھپایا، تمہارے لیے واضح اور روشن کر دیا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اس بارے یہ آیت اُتاری: ''بتحقیق بلاشک ہمارا رسول تمہارے پاس آیا، بہت سارے موارد جو آسمانی کتاب کے تھے، پہلے تم مخفی کرتے تھے اس نے تمہارے لیے آشکار کر دیے اور بہت ساروں سے چشم پوشی کی'' (سورہ المائدہ، آیت ۱۵)۔ ابن صوریا نے جب یہ آیت سنی تو اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ باندھکر التجا کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور کہا میں اللہ اور تیری پناہ میں آتا ہوں، کیا آپؐ کو جس چیز سے چشم پوشی کرنے کا کہا گیا ہے اسے میرے لیے بیان کر سکتے ہیں؟ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی اس بات کی پرواہ نہیں کی۔ اس کے بعد ابن صوریا نے رسول اللہ ﷺ سے چند اور سوال کیے ،جب صحیح سوال سن لیے تو مسلمان ہو گیا اور رسالت کی گواہی دی۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۴۲﴾

''جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں اور بہت حرام کھانے والے ہیں، سو اگر وہ تیرے پاس آئیں تو ان میں فیصلہ کر دے یا ان سے منہ پھیر لے، اور اگر تو ان سے منہ پھیر لے گا تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان میں انصاف سے فیصلہ کر، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

قوم یہود کی دیگر خصوصیات

آیت میں بیان شدہ اوصاف سب قوم یہود کے بارے ہیں۔ یعنی وہ یہود جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور وہ یہود جو آپؐ کے پاس نہیں آئے سب کو شامل ہے۔ پہلا جملہ ان یہودیوں کا وصف ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے جبکہ دوسرا جملہ ان علماء کا وصف ہے جنھوں نے رشوت لے کر اور حرام کھا کر تورات کا حکم بدلا۔ البتہ یہ دونوں جملے اُن کو بھی شامل ہیں جو اس وصف کے حامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں کے دو گروہ ہیں ایک گروہ جو رشوت خور ہیں، دوسرا گروہ جو اُن کے پیروکار ہیں اور علماء کی جھوٹی باتوں پر بہت زیادہ کان دھرتے ہیں اور ان باتوں کو تحقیق کئے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔

''سُحت'' اس چھلکے کو کہتے ہیں جسے دور پھینک دیا جاتا ہے۔ لہٰذا سُحت ایسے اعمال کو شامل ہے جو دین اور مروت کو فاسد کر دیتے ہیں اور دین کو ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ ''سُحت'' حرام مال کے معنی میں بھی آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہر وہ گوشت جو سُحت سے تیار ہوا ہے اسے آگ میں جلایا جائے گا اور وہ اسی کے لائق ہے۔ اس

حدیث میں سُحت حرام مال پر بولا گیا ہے۔ اسی حوالے سے رشوت کو بھی "سُحْت" کہا گیا ہے۔ یہ آیت اُن علماء یہود کے بارے ہے جو حرام خور تھے اور رشوتیں لے کر اللہ کے احکام جو تورات میں موجود تھے اُن کو تبدیل کرتے تھے۔

آخر میں رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا ہے کہ جب اس قسم کے لوگ فیصلہ لے کر آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے کہ اُن کے بارے فیصلہ دیں یا فیصلہ دینے سے انکار کر دیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بارے فیصلہ کر لیں اور اگر مصلحت دیکھیں تو اُن سے الگ رہیں اور اُن کے بارے فیصلہ نہ دیں۔ اگر آپ ان کے بارے فیصلہ نہ کریں تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔ اگر اُن کے بارے فیصلہ دینا ہے اور آپ فیصلہ دینے کو مناسب سمجھتے ہو تو پھر فیصلہ عدل و انصاف پر مبنی ہو، چونکہ عدل و انصاف کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اور عدل پر مبنی فیصلہ دینے والے افراد کو اللہ پسند کرتا ہے۔

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اور وہ تجھے کس طرح منصف بنائیں گے حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے پھر اس کے بعد ہٹ جاتے ہیں، اور یہ مومن نہیں ہیں"۔

یہودیوں کا رویہ

اس آیت میں یہ انداز اپنایا گیا ہے کہ سننے والا یہودیوں کے رویوں کے بارے میں تعجب کرے کیونکہ یہ ایسی قوم ہے جن کے پاس کتاب بھی موجود تھی، قانون بھی تھا لیکن انہوں نے اپنی شریعت سے منہ موڑ لیا ہے تو یہ سچ مچ مومن نہیں ہیں۔ اس لیے مومن نہیں ہیں کہ انہوں نے تورات اور تورات میں بیان شدہ اللہ کے حکم سے منہ موڑا ہے اور ایمان سے

کفر کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ قرآن تصدیق کر رہا ہے کہ تورات میں اللہ کے احکام موجود ہیں، حدود موجود ہیں، سزائیں موجود ہیں، انہوں نے اُن میں سے کچھ میں تحریف کی ہے اور کچھ کو حذف کر دیا ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا مقصود ہے کہ اگر یہ حق کو قبول کرتے ہیں تو وہی حکم تورات میں ان کے ہاں موجود ہے اُسی پر راضی ہو جائیں اور اگر تیرے پاس آئے ہیں تو تیرا فیصلہ بھی تورات کے حکم کے مطابق ہونا ہے، لیکن وہ تیرے اس فیصلے کو بھی نہیں مانیں گے جیسا کہ تورات میں موجود حکم کو نہیں مانا تھا۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّ نُوۡرٌ‌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ‌ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ اخۡشَوۡنِ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا‌ ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

"ہم نے تورات نازل کی کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے، اس پر اللہ کے فرمانبردار پیغمبر یہود کو حکم کرتے تھے اور اہل اللہ اور علماء بھی اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے، سو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑا مول مت لو، اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں"۔

تورات کا وصف

اس آیت میں تورات کے درج ذیل اوصاف بیان کیے گئے ہیں:۔

1۔ پہلی بات یہ ہے کہ تورات اللہ نے اُتاری ہے۔
2۔ دوسری بات یہ ہے کہ تورات میں احکام و معارف الٰہی اور قوانین موجود ہیں۔
3۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ ہدایت کا سرمایہ ہے۔
4۔ چوتھی وصف یہ ہے کہ وہ نور ہے۔
5۔ پانچویں وصف یہ ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے اُتاری گئی ہے اور اُن کے درمیان جو اختلافات پیدا ہونے تھے یا موجود تھے ان اختلافات کو اُن احکام و قوانین کی روشنی میں نپٹانا مقصد تھا۔

انبیاءؑ تورات میں بیان شدہ حکم کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔ انبیاءؑ کا وصف اسلام سے بیان کیا ہے، یہاں پر اسلام سے مراد اللہ کے آگے تسلیم ہونا ہے۔اسلام وہی دین ہے جو خدا کے نزدیک معتبر دین ہے چاہے وہ سابق میں تھا یا اب ہے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خدا کے آگے تسلیم ہو، اس کے حکم کو بے چون وچرا مانے، اس میں نہ کمی کرے اور نہ اضافہ کرے اور نہ ہی اعتراض کرے اور اللہ کے بیان میں تکبر نہ کرے۔ پس انبیاء تورات کے مطابق یہودی قوم میں فیصلے دیا کرتے تھے

" الرَّبّٰنِيُّوْنَ " ربانی کی جمع ہے، اس سے وہ علماء مراد ہیں جو علم و عمل دونوں کے حوالے سے غیر خدا سے کٹے ہوئے ہیں، وہ فقط خدا کے ہیں اور اپنے علم کے مطابق عمل کرتے تھے یا اس سے مراد وہ ہیں جن کو انسانوں کی تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

" الْاَحْبَارُ " حِبْر کی جمع ہے جو باخبر لوگوں کو کہتے ہیں۔ یہودی علماء کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ تورات کے حافظ ہوں اور اُس پر گواہ ہوں اور جہاں پر اختلاف پیدا ہو تو جو تورات انہوں نے حفظ کر رکھی ہے اس کے ذریعے گواہی دیں کہ یہ مطلب تورات سے ہے اور یہ مطلب تورات سے نہیں ہے۔اس طرح وہ تورات کو تحریف سے بچائیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اب جب ایسا ہے تو تورات کے معارف اور حقایق کو مت چھپاؤ۔ ڈر یا لالچ کی وجہ سے تورات کے احکام میں تبدیلی مت لاؤ۔ صرف خدا سے ڈرو! تھوڑے پیسے اور دُنیاوی فائدے کے لیے اللہ کی آیات کو مت بیچو۔ یہ جملہ پہلے جملے کی فرع اور اُسی کی شاخ ہے۔

آخر میں بیان کیا کہ جو اللہ کے حکم اور قانون کے مطابق فیصلہ نہ دے وہ حقیقت میں کافر ہیں۔ ظاہر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ دے گا وہ اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق فیصلہ دے گا، اور یہ کام خدا سے بغاوت ہے کیونکہ اس صورت میں لوگ اپنی مرضی کے فیصلے دیں گے اور ایسے قوانین کے تحت فیصلے دیں گے جو اللہ کے بیان کردہ احکام کے مخالف ہوں۔ جبکہ اللہ کے حکم اور اللہ کے قانون میں انسان کی بہتری ہے۔ گویا انہوں نے انسان کی خیر و صلاح کے مطابق فیصلہ نہیں دیا اور یہی عمل بعینہٖ کفر ہے۔ سورہ آل عمران، آیت ۸۳ میں ہے: ترجمہ: ''کیا تم اللہ کے علاوہ کوئی اور نظام کو چاہتے ہو؟ تو اللہ کی طرف سے کوئی اور نظام قبول ہی نہیں ہے''۔

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور ہم نے ان پر اس کتاب میں لکھا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور

زخموں کا بدلہ ان کے برابر ہے، پھر جس نے معاف کر دیا تو وہ گناہ سے پاک ہو گیا، اور جو کوئی اس کے موافق حکم نہ کرے جو اللہ نے اُتارا سو وہی لوگ ظالم ہیں"۔

تورات میں قصاص کا قانون

اس آیت میں تورات میں بیان شدہ قصاص کے قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ جو قتل کر دینا، کسی عضو کو کاٹ دینا، زخمی کر دینے والے جرایم پر کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ حکم ہے۔ جیسا جرم، ویسی سزا ہے۔ اس آیت میں حرف "باء" مقابلے کے معنی میں ہے۔ قصاص کے مقام پر جان کے مقابلے میں مجرم کی بھی پوری جان لی جائے گی۔ آنکھ کے مقابلے میں آنکھ، ناک کے مقابلے میں ناک، ہر عضو کے مقابلے میں وہی عضو ہے جس کو مجرم نے نقصان پہنچایا ہے۔ اگر "مضروب" جس کا نقصان ہوا ہے انتقام اور قصاص کی بجائے، ضَارِبْ کو معافی دے دے تو اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ اگر صاحبِ حق قصاص کرنا چاہے اور قصاص سے صرف نظر نہ کرے تو پھر قاضی کو چاہیے کہ جیسا اللہ کا دستور ہے اسی طرح قصاص لے اور وہی فیصلہ دے جو اللہ نے کہا ہے۔ اگر حاکم اور قاضی اللہ کے بیان کردہ حکم اور قانون کے مطابق فیصلہ نہیں دے گا تو پھر ظالموں سے ہو گا۔ اللہ کے احکام میں تبدیلی کرنا ظلم و زیادتی ہے اور اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ اللہ کی حدود اور قیود اور قوانین کو تبدیل کیا جائے؟

وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور ہم نے ان کے پیچھے انہیں کے قدموں پر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا تھا، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا تھا اور وہ راہ بتانے والی تھی اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت تھی"۔

حضرت عیسیٰؑ اور کتابِ انجیل

"قَفَّیْنَا " کا مطلب ہے ایک چیز کے بعد دوسری چیز کا آنا، ایک چیز کے بعد دوسری چیز کو قرار دینا۔ " آثار" جمع ہے اثر کی، ہر چیز جس کا اثر دیکھ کر پہلی چیز کے وجود کا پتہ چل جائے۔ "اٰثَارِھِمْ "انبیاءؑ کی نشانیاں۔ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام اسی راستے پر تھے جس راستے پر اس سے پہلے انبیاءؑ تھے۔ اُن کی دعوت بھی وہی تھی جو پہلوں کی تھی یعنی توحید، اللہ کے سامنے تسلیم ہونا اور جو کچھ ان سے پہلے آیا ہے اس کی تصدیق کرنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت وہی تھی جو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت تھی اور اللہ تعالیٰ ان دو کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔

انجیل بشارت کے معنی میں ہے۔ جو کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اس کا ایک حصہ ہدایت تھی نور تھا یعنی احکام اور معارف پر مشتمل تھا، ایسے معارف جو انسان کی ہدایت کا ذریعہ تھے اور کیونکہ پہلے بھی تورات کے وصف میں یہی معنی بیان ہوا اور فرمایا گیا کہ انجیل تورات کی مؤید اور تصدیق کرنے والی ہے۔ پھر دوبارہ کہا گیا کہ تورات متقین کے لیے ہدایت ہے، اس میں نصیحت ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی دفعہ جو ہدایت ہوئی ہے وہ اور ہے اور دوسری دفعہ جو ہوئی ہے وہ اور ہے جس کی تفسیر لفظ "وَّمَوْعِظَةً" کر رہا ہے۔ لہٰذا پہلی ہدایت سے وہ معارف اور اعتقادات مراد ہیں جن سے آگاہی حاصل کرکے لوگ ہدایت پاتے ہیں، یعنی اصول دین کی ہدایت پاتے ہیں اور دوسری ہدایت سے وہ معارف مراد ہیں

جن کے وسیلہ سے وہ عمل کی جانب ہدایت پاتے ہیں یعنی دینی تقویٰ اور فروع دین سے آگاہ ہوتے ہیں۔ پہلی ہدایت میں اصول دین کی بات ہوئی ہے جبکہ دوسری ہدایت میں فروع دین کی بات ہوئی ہے۔

کلمہ ''نُوْرٌ'' کا مصداق احکام اور قوانین ہیں۔ احکام اور شرائع ایسے امور ہیں جو انسان کو زندگی کے راستے میں روشنی دیتے ہیں۔ انسان ان سے روشنی لیتا ہے تاکہ صحیح راستے سے منحرف نہ ہو اور برائی کی تاریکیوں میں بھٹک نہ جائے۔ انجیل کو دوسری بار ذکر کرنے کا مقصد تورات کی تصدیق کرنا یا تاکید کے باب سے نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انجیل کی پیروی حقیقت میں تورات کی شریعت کی پیروی ہے۔ کیونکہ انجیل کے احکام بھی تورات کے احکام ہی ہیں۔ سوائے ان چند احکام کے جن کو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نئے لے کر آئے تھے جو پہلے موجود نہ تھے، قرآن ان کے بارے میں فرمارہا ہے:

'' وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ '' (سورہ آل عمران، آیت ۵۰)

ترجمہ: ''تاکہ تمہارے لیے حرام کی گئی کچھ چیزوں کو حلال کرے۔''

آخر میں انجیل کو اہل تقویٰ کے لیے موعظہ قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اہل تقویٰ ہیں، جنہوں نے دین کے لباس کو زیب تن کیا ہے جو حقیقت میں بندگی اور عبودیت کا لباس ہے وہی تورات کی ہدایت اور موعظہ الٰہی سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝٤٧

''اور چاہیے کہ انجیل والے اس کے موافق حکم کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے، اور جو شخص اس کے موافق حکم نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو پھر وہی لوگ نافرمان ہیں''۔

اہل انجیل، انجیل کے مطابق فیصلہ دیں

اس آیت میں یہ بتادیا گیا کہ اہل انجیل اس آسمانی کتاب میں بیان شدہ احکام کے مطابق فیصلہ دیں۔ یہ بڑا واضح حکم ہے۔ اس آسمانی کتاب کی جو عمدہ بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان مطالب کی تصدیق کر رہی ہے جو یہودیوں کی کتاب تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ سوائے ان چند مطالب کے جو نسخ ہو چکے ہیں اور جو مطالب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے اس میں کچھ استثناء آیا اور کچھ چیزیں جو حرام تھیں ان کے لیے حلال قرار دے دی گئیں اور پھر اس کی تاکید کی گئی جو پہلے بھی بتلایا گیا کہ جو بھی اللہ کے بیان کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ دے، حکم نہ کرے تو وہ فاسق اور گناہگار ہے۔ ان آیات میں تین مقامات پر ایک ہی تعبیر آئی ہے۔

پھر یہودیوں کو خطاب کرکے انہیں کافر اور ظالم کہا گیا ہے۔ اس دفعہ نصاریٰ کے متعلق کہا ہے کہ اگر وہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل نہیں کریں گے تو فاسق ہوں گے۔ یہودیوں کے لیے کفر اور ظلم کو اس لحاظ سے ثابت کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔ ان کی نافرمانی اشتباہ کی وجہ سے نہ تھی اور نہ ہی وہ جاہل تھے بلکہ ان کی نافرمانی اور کفر تمام الٰہی معارف کے علم رکھنے کے باوجود تھا اگر انہوں نے اس کو تبدیل کیا ہے تو یہ عین کفر ہے۔ الٰہی آیات کا انکار کرکے اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

نصاریٰ کے بارے میں یہ ہے کہ اُنہوں نے توحید کو تبدیل کر دیا، تین خداؤں میں؛ تثلیت کے قائل ہو گئے اور تورات کے احکام کو بھی ایک طرف رکھ دیا اور ان کا بولس نامی

بزرگ نے مسیح کے دین کو یہود سے علیحدہ اور مستقل دین قرار دیا اور کہا کہ یہ دین ایسا دین ہے جس میں کوئی قانون نہیں ہے، دین مسیحیت کے احکام کے بارے میں کہہ دیا کہ مسیح کے فدا اور قربان ہونے سے وہ ختم ہو گئے اور انسان سے تکالیف اٹھالی گئیں۔ یہی سبب ہوا کہ وہ توحیدی دین سے منحرف ہو گئے اور فاسق ہو گئے کیونکہ یہاں فسق خارج ہونے اور ایک اصلی چیز سے نکل جانے کے معنی میں ہے۔ وہ نکل گئے اصلی چیز سے اور حکم شرعی کی مخالفت کرکے دین خدا کے ثابت شدہ عمل سے الگ ہو کر اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور یہ عین کفر ہے۔ کیونکہ جس امر کا ثبوت تھا جس کو وہ جانتے تھے اس کو رد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے فقط عمل میں مخالفت نہیں کی بلکہ عمل میں مخالفت کے ساتھ اصل حکم کی بھی نفی کر دی کیونکہ اگر انسان جہالت کی وجہ سے عمل نہیں کرتا یا اسے پتہ نہیں چلتا تو اس میں تو قصوروار نہیں ہوتا ہے لیکن یہاں وہ بات نہیں تھی۔ اگر کسی حکم کے ثابت ہونے کا علم نہ ہو تو پھر اس کو رد کرنا کفر کا باعث نہیں اور نہ ہی عمل میں مخالفت گناہ ہے کیونکہ اس صورت میں اس کے پاس اس کوتاہی کا عذر موجود ہے اور اس کا عذر قبول ہے لیکن اگر اس نے کچھ مقدمات میں کوتاہی کی ہو جیسے علم حاصل کرسکتا تھا لیکن حاصل نہیں کیا، دینی وظائف کو جان سکتا تھا لیکن جاننے کی کوشش نہیں کی تو اس کا حکم الگ ہے۔

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

”ہم نے تجھ پر برحق کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کے مضامین پر نگہبانی کرنے والی ہے، سو توں ان لوگوں میں اس کے موافق حکم کر جو اللہ نے اتارا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر اپنے پاس آنے والے حق سے منہ موڑ کر، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں اپنے دیے ہوئے احکام سے آزمانا چاہتا ہے، اس لیے نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو، سب کو اللہ کے پاس پہنچنا ہے پھر اللہ تمہیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے (ان اختلافات کے بارے تمہیں خبر دی جائے گی“۔

قرآن کی سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود اصول کی تائید

قرآن مجید سابقہ آسمانی کتابوں میں بیان شدہ اصولوں کی تائید کرتا ہے۔ لیکن وہ فروعات جو خاص زمانے کے لیے تھے اور ضروری تھا کہ اب وہ نہ ہوں تو معاشرے کے تقاضوں کے تحت اور زمانے کی ترقی اور تکامل کے تحت اُن کو نسخ کر دیا ہے اور اس کا غلبہ اُن کی حفاظت اور تحفظ اور ان کی نگرانی قرآن کے لیے ہے۔ جو کچھ ان کتابوں میں آیا ہے قرآن نے اس کی تائید کی اور اُن میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کی۔ ہر صورت قرآن جن موارد کی تائید کرتا ہے اور جن موارد کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی ہر بات برحق ہے۔ اے پیغمبر جو کچھ تم پر اُتارا گیا ہے اور جو کچھ قرآن میں آیا ہے اس کے مطابق فیصلہ دو اور منافقوں کی چالوں میں مت آجاؤ جو خواہشات کے پجاری ہیں۔ یہودیوں سے بھی پہلو تہی کرو اور اُن کی حرکات پر نظر رکھو اور حق کے مطابق فیصلہ دینے میں کوئی چیز تیرے لیے رکاوٹ نہ بنے۔

شریعت واضح اور انحراف سے محفوظ راستے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حصے میں شریعت کو اپنی طرف نسبت دی ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ صحیح راستہ اور صحیح شریعت وہی ہے جو اللہ کا ہے یا جسے اللہ کے رسول نے بیان کیا ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے تو اس نے اللہ کی پیروی کی ہے پس وہی ادیان معتبر ہیں جن کو خدا نے قرار دیا ہے۔ لیکن جن راستوں کی اللہ نے تائید نہیں فرمائی تو اُن راستوں پر چلنا صحیح نہیں ہے، ان راستوں پر چلنے والوں کو سوائے گمراہی کے کچھ نہیں ملے گا۔ خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعت کامل شریعت ہے اور جو اس شریعت کی مخالفت کرے گا وہ گمراہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو تم سب کو ایک مذہب وملت قرار دیتے لیکن مصلحت کے تحت اور مختلف زمانوں کے حالات کے تحت ہم نے مختلف راستے متعین کئے اور اس لمبے عرصے میں ہر ایک زمانے کے لوگوں کی استعداد اور صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ان کے لیے قوانین وضع کئے لیکن جو بنیادی باتیں تھیں، اصولی

باتیں تھیں ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمات تھیں جو ہر دور میں اُمتوں کے لیے اُترتی رہیں اور یہ اختلاف نعمت اس لیے تھا کہ امتحان اور آزمائش تھی۔

اصلی غرض یہ تھی کہ لوگ شریعت پر عمل کریں اور ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ صاحب ایمان کون ہے اور کافر کون ہے۔ اللہ کا حکم ماننے والا کون ہے اور اللہ کے حکم سے رخ موڑنے والا کون ہے۔ سورہ آل عمران آیت ۱۴۲: ترجمہ: ''لہٰذا مختلف شریعتوں کا ہونا سوائے اس کے نہیں کہ انسان کی زندگی کے جو مختلف مراحل ہیں جن سے وہ گزرا ہے ان کا امتحان لیا جائے اور حالات بدلنے کے ساتھ الٰہی فرائض اور تکالیف جو ہیں وہ بھی تبدیل ہوتی رہیں اور انسان سعادت اور شقاوت کے راستے اپنے لیے انتخاب کرے''۔ حزب الشیطان اور حزب الرحمٰن ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۱۲۴: ترجمہ: '' جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو نہ وہ گمراہ ہوگا نہ بدبخت۔ جس نے میری یاد سے رخ موڑ لیا تو اس کے لیے زندگی، معیشت دشوار ہوگی اور قیامت کے دن وہ اندھا محشور ہوگا''۔

ایک اور تعبیر ہے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابلیس کو خطاب کرکے فرمایا:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ﴿۴۲﴾

''اے شیطان جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا تسلط نہیں ہے مگر وہ تیرے پیرو ہیں جو گمراہ ہیں، بھٹکے ہوئے ہیں۔ (سورہ الحجر آیت ۴۳)

لہٰذا نیکیوں اور اچھے اعمال میں ایک دوسرے پر سبقت لو اور شریعت حق کی پیروی کرو اور یہ راہ حق تمام شریعتوں پر مسلط اور غالب ہے اور آپس میں نیک کاموں میں مقابلہ جاری رکھو۔ اختلاف اور تفرقے میں مت پڑو اور سب کی بازگشت اور واپسی اللہ کی طرف ہے۔ اللہ تمہارے اختلاف سے تمہیں خبر دے گا اور تمہارے درمیان حتمی عادلانہ فیصلہ صادر کرے گا۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

"اور یہ کہ تم ان لوگوں میں اس کے موافق حکم دو جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے بچتے رہو کہ تجھے کسی ایسے حکم سے بہکا نہ دیں جو اللہ نے تجھ پر اتارا ہے، پھر اگر یہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ انہیں مصیبت میں مبتلا کرنے کا ہے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں، اور بتحقیق لوگوں میں بہت سے نافرمان ہیں"۔

اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے دو

یہ آیت بھی پچھلی آیت میں بیان شدہ دستور کا تتمہ ہے جس میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کے مطابق فیصلے دے جو اللہ نے اُتارا ہے اور لوگوں کی ہوا و ہوس اور خواہشات سے چوکنا رہے اور خبردار رہے اور لوگوں کے لیے جو دستور دیا گیا ہے اگر اس سے سرپیچی کرتے ہیں تو یہ گناہ میں پڑنے کا سبب ہوگا۔ اگر وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے سرپیچی کریں گے تو یہ فسق اور گمراہی ہے اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا وہ گناہ کی وجہ سے فاسق ہو جاتے ہیں۔ سورہ حجر، آیت ۴۳: ترجمہ: " پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان کے فتنوں سے چوکنے رہو"۔ اگر پیغمبرؐ کو ایسا دستور دیا گیا ہے جبکہ آپؐ عصمت مآب ہیں، کیونکہ عصمت انسان کے اختیار میں ہے اور عصمت کی وجہ سے انسان کا اختیار سلب نہیں ہوتا یعنی ایسا نہیں

ہوتا ہے کہ اس سے خطا نہ ہو سکے تو نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت، علمی صلاحیتوں کی جنس سے ہے اور اس میں یہ نہیں ہے کہ جو عمل کرنے والی صلاحیتیں انسان کے اندر ہوتی ہیں اُس کو ختم کر دیا گیا ہو؛ نہیں! ایسا نہیں وہ صلاحتیں موجود رہتی ہیں لیکن صاحبِ عصمت کا علم سبب بنتا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں یہ علم عطا ہوتا ہے۔

آگے فرمایا کہ ان کے سابقہ گناہ ان کے راہ حق سے منحرف ہونے کا سبب ہیں۔ لوگوں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے ملک اور مملکت میں تصرف سے عاجز کر دیں۔ خدا اپنے کام کرنے میں بااختیار بھی ہے غالب بھی ہے مقتدر بھی ہے، وہی ہے جس نے فسق کرنے والوں کو ان کے گناہ کے جرم میں بھٹکایا ہے اور وہ صحیح راستے سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور اکثر لوگ فاسق اور گناہگار ہیں۔ اسی گناہ کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۵۰

"تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے ہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں"۔

دورِ جاہلیت کے فیصلوں کے طلبگار

اس آیت میں استفہام توبیخی ہے یعنی ڈانٹا جا رہا ہے کہ جب تمہیں اللہ پر یقین ہے اور تم اس پر ایمان لائے ہو تو پھر اُس کے فیصلے سے روگردانی کیوں کرتے ہو؟ اور حکم جاہلیت کی تلاش میں کیوں جاتے ہو؟ حکم جاہلیت تمہیں گمراہ کرنے والا ہے۔ استفہام توبیخی کے بعد فرمایا کہ ہر حکم یا تو الٰہی حکم ہے یا جاہلیت کا حکم ہے اور جاہلیت کا حکم خالق کے بنائے ہوئے

قانون سے انحراف ہے۔ کسی بھی حکم کی پیروی اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ اُس کے بارے میں نیک گمان ہوتا ہے اس سے بہتری کی توقع ہوتی ہے۔ اہل یقین جانتے ہیں کہ اللہ کا فیصلہ اور اللہ کے قانون سے بہتر کوئی اور فیصلہ اور قانون نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا قانون ہی سب قوانین سے بہتر ہے اور اللہ کا فیصلہ ہی سب فیصلوں سے بہتر ہے۔

تفسیر برہان میں اسی آیت کے ذیل میں اصول کافی سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ احمد بن محمد بن خالد نے اپنے باپ سے اور اُس نے ابی عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ قاضی (جج) چار قسم کے ہیں: ان میں سے تین گروہ جہنم میں جائیں گے اور ایک گروہ بہشت میں ہوگا۔

پہلا: وہ گروہ جو ظلم و جور کے مطابق فیصلہ دیتا ہے اور اسے پتہ ہے کہ جو فیصلہ دے رہا ہوں یہ ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے تو ایسا قاضی جہنم میں جائے گا۔

دوسرا: وہ جو کہ ظالمانہ فیصلہ کرتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

تیسرا: فیصلہ برحق کرتا ہے لیکن جہالت کی بنیاد پر فیصلہ دیتا ہے۔ اس کے فیصلہ کی بنیاد درست نہیں، اسکا ٹھکانہ بھی جہنم ہے۔

چوتھا: جو شخص علم کے مطابق اور حق پر مبنی فیصلہ دیتا ہے تو اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہے۔

پھر فرمایا حکم اور قانون دو قسم کے ہیں: ایک اللہ کا قانون ہے اور ایک زمانہ جاہلیت کا قانون ہے۔ جو اللہ کے قانون سے منحرف ہوتا ہے وہ خطاء میں ہے کیونکہ جو اللہ کے حکم سے منحرف ہوتا ہے تو وہ زمانہ جاہلیت کے حکم میں جا پڑتا ہے اور زمانہ جاہلیت کے قانون کے مطابق حکم کرنے والے گمراہ ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

"اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو کوئی تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے تو وہ ان ہی میں سے ہے، اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

یہود و نصاریٰ سے دوستی ممنوع

"اتخاذ" کسی چیز پر اس طرح اعتماد کرنا کہ اُس سے انسان کا دل بہل جائے، یعنی وہ شئے اس کی دل گرمی کا سبب ہو، اس کی وجہ سے اپنائیت آئے۔ "ولایت" ایک چیز کا دوسری چیز کے اس طرح قریب ہونا کہ خاص قسم کی کیفیت ان کے اندر آجائے۔ اس طرح کہ ان دو چیزوں کے درمیان موجود تمام رکاوٹیں ختم ہوں اور وہ ایک دوسرے سے متصل ہوں، البتہ سب رکاوٹیں دور نہیں ہوتی بلکہ وہ رکاوٹیں دور ہوتی ہیں جو اس ولایت اور ہدف تک پہنچنے میں رکاوٹ ہیں۔ یہاں ولایت قربت کے معنی میں ہے، ولی کا معنی ناصر، مددگار اور یاور ہے کہ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو، اس شخص کی مدد کرنے میں جو اس کے قریب ہے۔ ولی ایسے محبوب کو کہتے ہیں جس کی محبت میں انسان اپنے آپ کو اس کی خواہشات کے سامنے جھکا دے اور اس راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔ ولی وہی ہوتا ہے جس کی اطاعت کی جارہی ہوتی ہے، ولی وہ ہے جس کی انسان اطاعت کرتا ہے۔

لہٰذا اس آیت میں یہود و نصاریٰ سے معاشرت، اُن سے میل جول اس انداز سے کہ ان کے ایسے دوست بن جائیں کہ نصرت اور مدد کا ذریعہ بنیں کیونکہ میل جول مودت و محبت

اور روحانی تعلق کا سبب بن جاتا ہے، تاثیر اور تاثر، اخلاقیات کا بھی سبب ہوتا ہے۔ نتیجے میں انسان کی دینی روش اور سیرت کفر میں بدل جاتی ہے۔ انسان نفسانی خواہشات اور شیطان کی عبادت اور فطرت کے راستے سے نکل جاتا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے (بعض کو بعض پر) کہ یہود و نصاریٰ میں بعض دوسرے بعض کے اولیاء ہیں یعنی اُن کے دل ایک دوسرے کے قریب ہیں اور وہ ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں، خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ حق قبول کرنے سے انکار کرنے میں اور نور خدا کو بجھانے کے لیے سازشیں کرنے میں، رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشوں میں ساتھ دینا، مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے متحد ہونا، ان سارے امور میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ ایک تن ہیں، اگرچہ وہ مختلف اقوام سے ہیں لیکن یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے خلاف ایک ہاتھ کی مانند ہیں۔

اسلام نفسانی خواہشات کی پیروی کا مخالف ہے لہٰذا یہود و نصاریٰ اپنی تمام تر باہمی دشمنیوں کے باوجود ایک ہدف میں مشترک ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ہیں اور وہ ہدف اسلام سے دشمنی ہے۔ لہٰذا قرآن فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ولی مت بناؤ، یاور و مددگار مت قرار دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گروہ باوجودیکہ آپس میں دشمن ہیں لیکن تم مسلمانوں کے خلاف اکٹھے اور متحد ہیں۔ لہٰذا ان کے قریب ہونا اور ان سے محبت اور ان کی دوستی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ وہ ایک دوسرے کے یاور ہیں لیکن تمہیں کبھی مدد نہیں دیں گے لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی انہیں ولی کے طور پر منتخب کرے تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا اگرچہ حسب ظاہر مومنین سے ہوگا لیکن ایسے مومنین نے راہ خدا کو طے نہیں کیا ہے بلکہ ایسے راستے پر ہیں جس پر یہود و نصاریٰ ہیں اور ان کا اختتام انہی کے ساتھ ہوگا۔ اور ان کا راستہ یہود و نصاریٰ کے راستے سے جا ملے گا۔ اخلاص کے نقطۂ نگاہ سے ایمان کے مراتب ہیں، وہ مومنین جو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرتے ہیں اگرچہ ظاہری طور پر مومن ہیں لیکن ان کے اعمال اور افعال یہود

و نصاریٰ کی مانند ہیں کیونکہ ایمان کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے جو بھی ان کے ساتھ دوستی کرتا ہے اور ان کی ولایت رکھتا ہے، ان کی پیروی کرتا ہے تو وہ ہدایت کے راستے پر نہیں ہے، خدا اس کی ہدایت نہیں کرتا۔ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح ظالم ہے اور خدا ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

”پھر تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان (مخالفین) میں دوڑ کر جا ملتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر زمانے کی گردش نہ آ جائے، سو قریب ہے کہ اللہ جلدی فتح ظاہر فرما دے یا کوئی اور حکم اپنے ہاں سے ظاہر کرے پھر یہ اپنے دل کی چھپی ہوئی بات پر شرمندہ ہوں گے“۔

دل کی بیماری میں مبتلاء لوگوں کی خصوصیات

گمراہی کے مصادیق میں سے ایک مصداق یا دوسرے لفظوں میں وہ موارد جن میں ہدایت الٰہی اُن کے شامل حال نہیں ہوتی یہ ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرف چلے گئے ہیں اور اُن کو اپنا ولی بنایا ہوا ہے۔ یہ عذر گناہ سے بدتر ہونے کی مثال ہے۔ ان کا بہانہ یہ ہے کہ ہم یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ جبکہ یہود و نصاریٰ اللہ کے دشمن ہیں اور اُن کو دوست رکھنے کا مطلب، اللہ کے دشمن سے دوستی کرنا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر ایمان کے دعویدار ہیں لیکن باطن میں کافر ہیں۔ ان کا عذر پیش کرنے کا مقصد یہ

ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین ان کی سرزنش نہ کریں اور اُن سے ناراضگی کا اظہار نہ کریں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مستقبل میں فتح و کامیابی کی خبر دے رہا ہے اور فرما رہا ہے کہ جب اسلام، کفر کی بساط الٹ دے گا اور اللہ تعالیٰ کفر پر اپنا حتمی فیصلہ جاری کر دے گا تو یہ منافق جماعت اپنے اس باطنی کفر کی وجہ سے جو انہوں نے چھپا رکھا ہے پشیمان ہوں گے۔ کسی کام پر ندامت اور پشیمانی اسی وقت ہوتی ہے جب انسان نے غلط کام کیا ہو۔ غلط کام پر انسان کو شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ یعنی انسان کسی چیز کو ہدف اور مقصد قرار دے کر ایک کام انجام دے اور بعد میں اس کا الٹ ہو جائے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ منافقین اپنے دل میں یہود و نصاریٰ کی محبت کو چھپائے ہوئے ہیں لیکن جب حق کی فتح ہو گی تو پھر یہ نادم اور پشیمان ہوں گے۔ بعد والی آیات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فتح سے فتح مکہ یا یہودیوں کے مضبوط قلعوں کی فتح مراد نہیں ہے جن کو مسلمانوں نے فتح کیا، بلکہ فتح کے متعلق قرآن کی پیش گوئی اُمت اسلامیہ کے آئندہ کے حالات کے بارے میں ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ جب کفر بالکل ختم ہو جائے گا اور اسلام کی بالادستی ہو گی اور حق باطل پر غالب آجائے گا اور اس امر نے ہر صورت واقع ہونا ہے اور یہ امر حضرت امام مہدی علیہ السلام کی قیادت میں ہوگا۔ البتہ اس کو تمام پہلوؤں کے حوالے سے بھی لیا جا سکتا ہے یعنی جب بھی مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو وہ لوگ جو یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاتے تھے وہ نادم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حتمی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کے لیے منافقین کا یہ بہانہ کہ ضرورت کے موقع پر ہم اُن سے مدد لے سکیں گے اور یہ کہ وہ ہمیں نقصان نہ دیں، کسی بھی حوالے سے قابل قبول نہیں ہے۔

وَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ ؕ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾

"اور مسلمان کہتے ہیں کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام کی پکی قسمیں کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال بر باد ہو گئے پھر وہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے"۔

یہود و نصاریٰ کسی کی مدد نہیں کر سکیں گے

اس آیت میں منافقین کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے فتح و نصرت حاصل ہو گی تو وہ مومنین جو امتحان الٰہی کے موقع پر ثابت قدم رہے، ضعیف الایمان مومنین سے کہیں گے کیا یہود و نصاریٰ وہی لوگ نہیں تھے جو بھاری بھاری قسمیں اٹھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری مدد کریں گے؟ اب وہ تمہیں کیوں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے؟ دراصل یہ ایک پوشیدہ سوال کا جواب ہے کہ کسی سے پوچھو کہ آخر یہ کمزور ایمان والے مومنوں کا انجام کیا ہوا؟ یہود و نصاریٰ کی دوستی نے ان کو کہاں لا کھڑا کیا؟ اس پوشیدہ سوال کے جواب میں کہا جا رہا ہے کہ اسلام میں انجام دئے گئے ان کے اعمال بغیر ثواب کے رہ گئے اور باطل ہو گئے اور اس طرح یہ لوگ نقصان میں رہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَ يُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى

الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

''اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایسی قوم کو لائے گا کہ جن کو اللہ چاہتا ہے اور وہ اللہ کو چاہتے ہیں، وہ مسلمانوں پر نرم دل ہوں گے اور کافروں پر زبردست، اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دیتا ہے، اور اللہ گنجائش والا جاننے والا ہے''۔

اللہ کو چاہنے والے مومنین

''ارتداد'' ایمان سے کفر کی طرف پلٹنے کو کہتے ہیں، یعنی ایمان سے ہٹ جانا، ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانا۔ یہ آیت پچھلی آیات کے ساتھ مربوط ہے اور اس بات کی وضاحت کر رہی ہے کہ اللہ کا دین بیمار دل اور چکر باز لوگوں سے بے نیاز ہے، ان کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ اپنے مادی منافع اور فوائد کی خاطر اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور یہود و نصاریٰ سے دوستی کرتے ہیں وہ ایسے راستے پر جا کھڑے ہوئے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں نفاق گھر کر جاتا ہے اور ان کے دل بیمار ہو جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہلاکت اور خسران کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

خداوند متعال نے اس جگہ ایک غیبی پیش گوئی کی ہے کہ دین کو ان دو چہرے والوں اور جہاد کے معاملے میں سُستی کرنے والوں کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے بدلے میں ایسے گروہ کو لے آئے گا جو اللہ کو دوست رکھتے ہوں گے اور اللہ بھی ان کو دوست رکھتا ہو گا۔ وہ مومنین کے سامنے متواضع اور کفار کے ساتھ بڑی جرأت کا

مظاہرہ کرنے والے ہوں گے، ان کے سامنے شکست قبول نہیں کرتے ہوں گے۔ راہ خدا میں جہاد کرتے ہوں گے۔ انہیں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم کو لانے کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور کہا ہے کہ خدا ایسی قوم کو لے آئے گا کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ناصر نہیں ہے اور نصرت فقط اور فقط اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ یہ قوم اس قدر محبت خدا میں غرق ہو گی کہ اللہ کے سوا کسی کو ترجیح نہیں دیں گے اور ان کی محبت شہوانی نہیں ہو گی، خواہشات، مال وجاہ و منصب اور قبیلہ اور قوم اور زبان اور رنگ و نسل کی محبت نہ ہو گی۔ خدا بھی اس واسطے کہ انہیں دوست رکھتا ہے انہیں کفر، فسق اور فجور جیسی ہر معنوی آلودگی سے پاک کردے گا اور ان صفات سے بچا کر رکھے گا۔ ان کو آلودگیوں سے پاک کرنا یا تو عصمت الٰہی کہ اللہ کے بچانے کی وجہ سے ہے یا اللہ کی مغفرت اور توبہ کے راستے سے ہے۔

یہ وہ ہیں جو مومنوں کے آگے متواضع ہیں، مومنوں کے سامنے اپنے آپ کو حقیر جانتے ہیں کیونکہ مومنین اولیاء اللہ ہیں اور اللہ بھی ایسے لوگوں کا ولی، ناصر، مددگار اور ان سے محبت کرنے والا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ عزت، حرمت اور کرامت اور بزرگی فقط اللہ کی طرف سے ہے اس لیے وہ مومنوں کے سامنے متواضع ہیں۔ ان کے نزدیک کفار کی ظاہری عزت اور اقتدار جھوٹے ہیں اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ان کے مقابلے میں وہ شکست ناپذیر ہیں اور جہاد کے معاملے میں ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیتے جو مال اور جان کے چلے جانے کے ڈر سے جہاد میں شرکت نہیں کرتے۔ یہ ان کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے فضل و انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس فضل و انعام کو اپنی حکمت کے مطابق جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ گشائش دینے والا ہے۔ اس سے نہ کچھ کم ہوتا ہے نہ کچھ فنا ہوتا ہے۔ وہ ہی دانا ہے کہ کس کو فضل دینا ہے اور کس کو نہیں دینا۔

(تفسیر ثعلبی اور مجمع البیان میں امام باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے کئی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان خصوصیات کے حامل افراد وہی ہیں جو قرآن کریم کی نگاہ سے زمین کے وارث ہیں، اور انہی کے لیے اچھا انجام ہے)۔ [1]

(اس حوالے سے پہلے بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ جو نئی قوم لائے گا وہ حضرت سلمان علیہ السلام کی قوم ہوگی، یعنی ایران کے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے۔ آخری دور میں ایسا ہوگا کہ عرب کفار کے آگے جھک چکے ہوں گے جبکہ غیر عرب کفار کے مقابلے میں ڈٹ جائیں گے تو اللہ انہیں عزت و اقتدار دے گا۔ جس کے آثار ہم ایران کی سرزمین پر دیکھ سکتے ہیں کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے انقلاب کے بعد ایرانی قوم چالیس سال سے زیادہ کے عرصہ میں دُنیا کے ہر طاغوت اور ہر جابر اور ظالم، منافقین اور کفار کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ وہ اپنا اقتدار کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور کسی کے آگے نہیں جھکے، انہیں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں)۔ (اردو مترجم)

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

"تمہارا دوست تو اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان دار لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں"۔

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔

مومنین کا ولی اللہ، رسول اور زکوۃ دینے والے مومنین

''ولاء اور تولی'' کا معنی یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی دو یا چند چیزیں اس طرح ہوں کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہ ہو۔ یہ لفظ استعارہ کے طور پر قربی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قُرب مکانی، یعنی جگہ کے اعتبار سے قریب ہونا۔ قربِ نصرت اور مدد سے حاصل ہونے والا قرب، قرب عقیدتی، عقیدے کے لحاظ سے حاصل ہونے والا قرب) ''ولایت'' نصرت، تولی، سرپرستی، کسی کام کی ذمہ داری لینے کے معنی میں ہے۔ ولایت ایک طرح کا قرب ہے جو خاص قسم کے تصرف کا جواز مہیا کرتا ہے جس سے تدبیر کی مالکیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حاکم لوگوں کے امور کا ولی ہوتا ہے یعنی اُسے اُن کے معاملات میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ ان کے درمیان فیصلے دیتا ہے۔ اس کی حکومت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اس کی ولایت بھی اتنی وسیع تر ہوتی جائے گی۔

اس آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی ولایت سب ایک معنی میں ہے۔ ولایت الٰہی دو طرح کی ہے، پہلی قسم ولایت تکوینی (حقیقی) ہے جس کا مطلب ہے کہ خدا ساری مخلوقات کا مالکِ مطلق ہے اور سب مخلوق میں تصرف کا مالک ہے، مخلوق کے سارے امور اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ دوسری قسم ولایتِ تشریعی (اعتباری) ہے جس کا مطلب ہے کہ قانون سازی، ہدایت دینا، ارشاد، راہنمائی دینا، توفیق دینا ان سارے معاملات کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یعنی قانون بنانے کا حق اور قانون پہنچانے کا حق اور قانون کے نفاذ کا حق اللہ کے لیے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت تشریعی ولایت ہے یعنی شریعت کے نفاذ کا اختیار، دین کی جانب دعوت دینے کا اختیار، اُمت کی تربیت کا اختیار، اُمت کے درمیان حکمرانی کرنے کا اختیار، اُمت کے جھگڑوں میں اُن کے درمیان

فیصلہ دینے کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔ یہ سب رسالت اور پیغمبری کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

پس جس طرح اللہ کی اطاعت بغیر شرط کے واجب ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی بغیر قید و شرط کے واجب ہے۔ سب مومنین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کریں۔ اس آیت میں ذکر شدہ مومنین کی ولایت بھی اللہ اور رسولؐ کی ولایت کی مانند ہے کیونکہ مومنین کی ولایت کو واؤ کے ذریعے اللہ اور رسولؐ کی ولایت پر عطف کیا گیا ہے۔

علیؑ، مومنین کے ولی

''اِنَّمَا'' کے لفظ سے جو حصر کیا گیا ہے اس سے افراد میں حصر مراد ہے، یعنی اس امر کو بیان کرنا مقصود ہے کہ مومنین کی ولایت کس کے پاس ہے۔ لیکن آیت میں بیان کئے اوصاف کے اعتبار سے یہ آیت فقط حضرت علی علیہ السلام پر صادق آتی ہے جیسا کہ بہت ساری روایات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس آیت کے نزول کے بارے میں تفسیر کشاف میں ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام مسجد میں حالت نماز میں تھے تو ایک سائل نے ان کے ہاں آکر آواز دی تو آپ نے اپنی انگوٹھی رکوع کی حالت میں سائل کو دے دی۔ انسان رکوع کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور خضوع و خشوع کی ایک اعلیٰ شکل میں ہوتا ہے۔

شیعہ نقطہ نظر سے یہ آیت امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت اور خلافت پر نص ہے کیونکہ فقط وہی ہیں جنہوں نے رکوع کی حالت میں سائل کو انگوٹھی دی تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر کیا ہے۔ لیکن اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے نص نہیں ہے کیونکہ یہاں پر رکوع سے اس کا حقیقی معنی یعنی نماز کی حالت میں رکوع مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مجازی معنی مراد ہے، یعنی اللہ کی عظمت کے سامنے خضوع و خشوع

کرنا۔ اس بنا پر اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے ولی یہود و نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ تمہارا ولی اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوۃ دیتے ہیں اور تمام حالات میں اللہ کے حضور خاضع و خاشع رہتے ہیں اور زکوۃ دیتے وقت اپنے آپ کو فقیر و تنگدست قرار دیتے ہیں یعنی ان میں تکبر اور بڑائی نہیں آتی۔

جیسا کہ تفسیر المنارج جلد ۶ صفحہ ۴۴۱ اور تفسیر فخر الرازی میں آیا ہے۔ لیکن اس آیت کے ماقبل اور مابعد اس طرح اس پوری سورہ کے مطالب میں دقت کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے متعلق اہل سنت مفسرین کی رائے درست نہیں ہے۔ اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ انہوں نے آیت کے سیاق کو مد نظر رکھتے ہوئے ولایت کو نصرت کے معنی میں لیا ہے نہ کہ سرپرستی اور کسی کام کو ذمہ لینے کے معنی میں۔ ان کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ آیات کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں معین نہیں ہوئی بلکہ خلیفہ سوئم کے زمانے میں آیت کی ترتیب معین کی گئی۔ اس بنا پر یہاں پر ولایت سرپرستی کے معنی میں ہے نہ کہ نصرت کے معنی میں۔

دوسری بات: سابقہ آیات میں مومنین کو کفار سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو دستور دیا ہے کہ کفار اور منافقین کی بدکاریاں اور ان کے برے اعمال کے متعلق اُن کو بتاؤ۔ لہٰذا ان آیات میں سے ہر ایک کی اپنی الگ غرض ہے اور ان کا سیاق ایک نہیں ہے۔

تیسری بات: اسی سورہ کی آیات ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹ میں بیان ہو گا کہ ان آیات میں ولایت نصرت کے معنی میں نہیں ہو سکتی کیونکہ مناسب نہیں ہے کہ کہا جائے "ان میں سے بعض دوسروں کے اولیاء ہیں" یا "جو ان کو اپنا ولی بنائے تو خود انہی میں سے ہے" کوئی کسی کے ساتھ معاہدہ کر لینے یا اس کی مدد کرنے سے اس کے ساتھ ملحق نہیں ہو جاتا بلکہ یہ مودت اور محبت ہے جو وحدت اور یکجہتی لے آتی ہے۔ اس بنا پر یہاں محبت مراد ہے۔

چوتھی بات: یہ درست نہیں ہے کہ کہا جائے ”پیغمبر مومنین کا یاور اور مددگار ہے“ بلکہ یہاں پر ولایت سے محبت اور تصرف کا حق رکھنا مراد ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ بہت ساری شیعہ اور اہل سنت روایات میں ذکر ہوا ہے کہ یہ دو آیات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن بعض تنگ نظر اور متعصب افراد نے اس کا معنی بدلنے کی کوشش کی ہے اور اس معنی پر دلالت کرنے والی روایات پر بھی اعتراض کیا ہے اور آیت کے ظاہر کو بدلنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ترجمہ: ” خداوند و تبارک و تعالیٰ جس کی وہ توصیف کرتے ہیں اللہ یاور و مددگار ہے“۔[1]

پانچویں بات: بعض اہل سنت کا کہنا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام اس لیے اس آیت کے مصداق نہیں بن سکتے کیونکہ یہاں پر جمع کی ضمیر ” وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا “ استعمال ہوئی ہے یعنی وہ لوگ جو ایمان لے آئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو باتوں میں بہت زیادہ فرق ہے کہ جمع کا لفظ استعمال کیا جائے اور اس سے ایک فرد مراد لیا جائے اور اس بات میں کہ ایک کلی اور عمومی قانون بنایا جائے کہ جمع کے لفظ کو مفرد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ان دو باتوں میں فرق ہے، ایک دفعہ ایک قانون کلی بیان کیا جارہا ہے، دوسری دفعہ جمع کا لفظ لا کر مفرد مراد لیا جاتا ہے۔ عمومی اور کلی قانون بنا کر کہنا کہ جمع کے لفظ سے مفرد کا ارادہ کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ لفظ جمع ایک آدمی کے علاوہ کسی پر صادق نہیں آرہا تو ایسا تو پہلے کبھی عرف میں نہیں ہوا، یہ پہلا مورد ہے۔ لیکن دوسرا مورد قرآن میں بھی آیا ہے اور عرف میں بھی ہے کہ جمع کا لفظ استعمال ہوا ہو اور اسے صرف ایک فرد مراد لیا گیا ہو۔ یہ آیت بھی انہی موارد میں

[1]۔ (سورہ یوسف آیت ۱۸)۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔

سے ہے جہاں پر جمع کا لفظ بول کر ایک فرد مراد لیا گیا ہے کیونکہ یہ معنی اسی ایک فرد پر صادق آتا ہے کسی اور پر صادق آتا نہیں ہے۔

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان داروں کو دوست رکھے تو (مطمئن رہے کہ) اللہ کی جو جماعت ہے وہی غالب ہونے والی ہے"۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ان لوگوں میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور کافروں کو، اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو"۔

دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی نہ کرو

"هُزُوًا" کسی کی عدم موجودگی میں اس کا مذاق اڑانے کو کہتے ہیں۔ "لعب" ہر اس کام کو کہتے ہیں جسے کسی صحیح مقصد اور غرض کے بغیر انجام دیا جائے۔اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ کفار اور اہل کتاب مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دین سوائے غلط قسم کے مقاصد کے اور کچھ نہیں ہے، یہ کھیل تماشا ہے اور اس میں کوئی عقلائی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں سنجیدگی ہے۔

ولایت حقیقی کا معنی ہے کفار کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے پیار محبت کرنا، ان کو اپنے معاملات میں دخل دینا اور اجتماعی اور نفسیاتی امور میں تصرف کرنا یہ سب تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دوستی یک طرفہ ہے کیونکہ وہ اگر تمہیں دوست رکھتے تو تمہارے دین اور مقدسات کا مذاق نہ اڑاتے اور انہیں کھیل تماشا نہ بناتے۔

آخر میں کفار سے دوستی نہ رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا گیا کہ حقیقی مومن وہ ہے جس نے ایمان کی رسی کو تھام رکھا ہے۔ ایسے افراد اس بات کو بلکل بھی پسند نہیں کرتے کہ اغیار ان کے دین اور عقیدے کا مذاق اڑئیں اور وہ انہیں اپنا دوست بنائیں۔ اگر دوستی سچی ہو تو پھر تمہارے عقائد کا مذاق کیوں اڑاتے ؟ اگر تم مومن ہو تو تقویٰ اختیار کرو اور کفار سے دوستی مت رکھو۔

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں۔''

نماز کے بلاوے پر مذاق اڑانے والے

'' وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ'' سے وہی اذان مراد ہے جو ہر واجب نماز سے پہلے دی جاتی ہے۔ ''اتَّخَذُوْهَا ''کی ضمیر اذان کی طرف پلٹتی ہے، اس مقام پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جو لوگ اذان کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس کا مسخرہ کرتے ہیں، یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ بے مغز ہیں، ہلکے ہیں، حقیر اور بے عقل ہیں اور دینی معاملات میں تحقیق نہیں رکھتے اور نہ ہی الفاظ پر توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ الفاظ ہیں جو اللہ کے قرب کا وسیلہ ہیں اور دنیا و آخرت کی

سعادت کا ذریعہ ہیں وہ ان کی سمجھ ہی نہیں رکھتے۔ مومنوں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ دوستی میں سچے ہوتے تو وہ تمہارے ان عبادتی اعمال کا جو اللہ کا ذکر ہے اس طرح کا رویہ نہ اپناتے کہ وہ اس کو کھیل تماشا قرار دے کر اس کا مذاق اڑاتے۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَ اَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾

''کہہ دو اے اہل کتاب! تم ہم میں کون سا عیب پاتے ہو اس کے سوا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا ہے اور اس پر بھی جو پہلے بھیجا جا چکا ہے، اور بات یہ ہے کہ تم میں اکثر لوگ نافرمان ہیں''۔

اہل کتاب کی عیب جوئی کی وجہ

اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرما رہا ہے کہ اہل کتاب سے کہہ دو ہمارے عیب نکالنے، ہمیں برا بھلا کہنے اور ہم پر طنز کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، جو کچھ ہمارے اوپر اتارا ہے اس پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم سے پہلوں پر اترا ہے اس پر بھی ایمان لائے ہیں۔ یہاں پر یہ نہیں کہا گیا کہ جو تم پر اتارا گیا ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تم نے دستورات الٰہی پر عمل نہیں کیا، اسی وجہ سے تم ہمارے خلاف باتیں کرتے ہو۔ ان کو یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ تم ایسے لوگ ہو جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والے دستورات پر عمل پیرا نہیں ہوئے۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی آسمانی کتاب پر عمل نہیں کیا لہٰذا یہ حقیقی یہود و نصاریٰ ہیں ہی نہیں، یہ حقیقی اہل تورات اور اہل انجیل نہیں ہیں۔ ہم مسلمان تمام آسمانی کتابوں اور ادیان کو مانتے ہیں اور ہمارے نزدیک ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم تمہاری طرح نہیں ہیں جنہوں نے کہا: ''نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ

نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ''" بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں۔ (سورہ النساء۔ آیت ۱۵۲)
کیونکہ ایسا کہنا کفر ہے۔ تم اس لیے ہماری سرزنش اور عیب جوئی کرتے ہو کہ ہم مومن ہیں وگرنہ اس کا تمہارے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ تم فاسق وگناہگار ہو اور تمہارا گناہ تمہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ ہمارے بارے اس طرح کی غلط باتیں کرو۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

''کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ کے ہاں ان میں سے کس کی بری جزا ہے، وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب نازل کیا اور بعضوں کو ان میں سے بندر بنایا اور بعضوں کو سوئر اور جنہوں نے شیطان کی بندگی کی، وہی لوگ درجہ میں بدتر ہیں اور راہ راست سے بھی بہت دور ہیں''۔

بری جزاء والے بدتر لوگ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کفار کے ساتھ مسالمت آمیز باتیں کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اُن کو اپنی بات ماننے پر قانع کرسکیں۔ اس حوالے سے آپؐ سے کہا جارہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ فرض کرو ہم تمہاری بات مانتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لانا اور نماز پڑھنا شر اور برا عمل ہے تو سب سے پہلے اس چیز کا مذاق اڑایا جائے جو ہر شر سے بدتر ہے اور ہر اشتباہ سے زیادہ غلط اشتباہ ہے اور اتفاقاً وہ تمہاری اپنی راہ و روش ہے جو سب سے زیادہ بری ہے۔ اگر فرض کریں ہم گمراہ ہیں تو تم تو ہم سے زیادہ گمراہ ہو کیونکہ اللہ کی لعنت تمہارے اوپر آئی، تم ہی میں سے کچھ لوگ بندر اور خنزیر بنے، طاغوت پرست بھی تمہاری قوم ہی سے تھے، کیا یہ

سارے عیب جو تمہارے اندر ہیں ان کو نظرانداز کروگے؟ اور ہماری عیب جوئی کرنے لگے ہو؟ ہمارا عیب تو یہی ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ کیا تم اس کو عیب شمار کرتے ہو جبکہ یہ تو تمہارے اتنے سارے عیبوں کے مقابلے میں بالکل ناچیز اور معمولی ہے۔

اس جگہ "مَثُوبَةً" سے مطلق جزا اور عاقبت مراد ہے اور "طاغوت" سے اللہ کے سوا ہر معبود یا سرکش اور کافر مراد ہے۔ یعنی اس طرح کفار کو لاجواب بھی کیا ہے اور اُن کے رویے کی مذمت بھی کی ہے اور انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے تاکہ وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں۔

وَ اِذَا جَآءُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَ قَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَ ہُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

"اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی گئے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے تھے"۔

منافقین کا اندرونی نفاق

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے اندرونی نفاق کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی پلیدی اور خباثت کو دل میں چھپا کر رکھا ہے۔ وہ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو بڑی زوردار آواز میں کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ وہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی گئے، خالی ایمان کا دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ہر حال میں کافر ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ منافقین کے باطنی نفاق سے آگاہ ہے۔ یہ تم سے تو اپنے کفر کو چھپاتے سکتے ہیں لیکن اللہ سے کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ یہ منافق کافروں سے بھی بدتر ہیں۔

وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾

"اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے کے لیے دوڑتے ہیں، بہت برا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں"۔

منافقوں کی گناہوں کے لیے دوڑ

"اثم" سے گناہ مراد ہے جیسا کہ بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ اُن کا گناہ میں گھسنا یعنی دوسروں کے عیبوں کی ٹوہ میں رہنا، مومنین کے خلاف ان کے عیب تلاش کرتے رہنا، ان کی کمزوریوں پر نظر رکھنا اور ان کو افشاء کرنا مراد ہے۔ "الۡعُدۡوَانِ" حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے اور یہ زبانی اور قولی کفر کے مصادیق میں سے ہے کیونکہ دین کے معارف میں عیب جوئی کرنا اور مومنین کی خامیاں تلاش کرنا کفر کا موجب اور گناہ کا سبب ہے۔ یہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں یہ اُن کا قولی کفر ہے۔ "اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ" سے ان کے عملی گناہ اور مومنین پر تجاوز کرنا مراد ہے، جیسے رشوت خوری، سود خوری۔ آیت میں جن تین گناہوں کا نام لیا گیا ہے یہ ایسے گناہ ہیں جن کا دائرہ باقی گناہوں سے وسیع تر ہے۔ حقیقت میں یہ گناہ ان بہت سارے گناہوں کا نمونہ ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے اور ان کے علماء یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء ان کی راہنمائی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان گناہوں سے انہیں منع کرتے تھے۔ اسی لیے خداوند تبارک و تعالیٰ نے بعد والی آیت میں ان کے علماء کی سرزنش کی ہے۔

لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

"ان کے مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے اور حرام مال کھانے سے انہیں کیوں نہیں منع کرتے، البتہ بری ہے وہ چیز جو وہ کرتے ہیں"۔

اہل کتاب عالموں کی سرزنش

" الرَّبّٰنِيُّوْنَ " سے وہ افراد مراد ہیں جو غیر اللہ سے کٹ چکے اور اللہ سے وابستہ ہوئے۔ "احبار" بنی اسرائیل کے علماء کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں علماء یہود و نصاریٰ کی اس وجہ سے سرزنش کی گئی ہے کہ وہ اپنی قوم میں رونما ہونے والے گناہوں کو دیکھتے اور اس پر خاموشی اختیار کرتے اور انہیں کچھ نہ کہتے۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے علماء کی سرزنش کی گئی ہے کہ وہ اپنی ملت میں انجام پانے والے گناہوں کے مقابلے میں چپ رہتے ہیں اور اُن کو گناہ کرنے سے روکتے نہیں۔ "الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ" زبانی اور عملی گناہوں کے دو کلی نمونے ہیں جیسے عیب جوئی، مومن کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہنا اور دینی معارف کی عیب جوئی کرنا۔ علماء یہود و نصاریٰ کا اپنی قوم کو گناہوں سے نہ روکنا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اعمال اور اقوال گناہ ہیں بہت برا اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ جس کا انہوں نے ارتکاب کیا، ان علماء کا اپنی ملت کو گناہوں سے نہ روکنا برا عمل ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ

الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

''اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے، انہیں کے ہاتھ بند ہوں اور انہیں اس کہنے پر لعنت ہے، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے خرچ کرتا ہے، اور جو کلام تیرے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں زیادتی کا باعث بن گیا ہے، اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے، جب کبھی لڑائی کے لیے آگ سلگاتے ہیں تو اللہ اس کو بجھا دیتا ہے، اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہودیوں کے اعتراضات اور اللہ کا جواب

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ یہودی اس لحاظ سے کہ دینی احکام میں نسخ کے جواز کے قائل نہیں اور نہ ہی تکوینی امور میں بداء کے جواز کے قائل ہیں، مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے اور ان کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ مسلمان احکام میں نسخ کے قائل ہیں، مثلاً ایک مصلحت کے تحت ایک حکم پہلے آیا تھا لیکن وہ مصلحت جس کے تحت یہ حکم آیا تھا اب وہ مصلحت نہ رہے تو وہ حکم بدل دیا جاتا ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے ہاں تسلیم شدہ ہے تو یہودی ان پر اعتراض کرتے تھے۔ اُن کی اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت لامحدود نہ ہو اور وہ جس طرح چاہے اس طرح اپنا فیصلہ صادر نہ کرسکے اور حکم نہ دے سکے۔ جو نسخ اور بداء کو جائز نہیں سمجھتا وہ قدرت الٰہی کو محدود کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب یہودی مسلمانوں کی کمزور مالی حالت کو دیکھتے تو اُن کا مذاق اڑاتے اور کہتے تھے کہ مسلمانوں کا اللہ تو

تنگ دست ہے ، وہ مسلمانوں کو دولت مند نہیں بنا سکتا۔ اسی لیے کہا کہ ''یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ''۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ یہودیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اس سال یہودی قحط اور خشک سالی میں تھے اس وجہ سے انہوں نے شکوہ اور شکایت کے طور پر یہ کفر آمیز بات کہی۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ جب قرض الحسنہ کی آیات اُن کے کانوں تک پہنچی کہ اللہ کو قرض حسنہ دو تو انہوں نے مسلمانوں کا مذاق اڑایا کہ ان کا کیسا خدا ہے کہ جو اپنے دین کی ترویج کے لیے لوگوں سے قرض لینے کا محتاج ہے؟ اس آیت کے شانِ نزول کو دیکھتے ہوئے یہ آخری بات سب سے زیادہ مناسب لگتی ہے۔ خداوند ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہودیوں کے ہاتھ بندھے ہوں۔ یہ جملہ ایک طرح کی نفرین ہے اور اللہ کی لعنت کا مصداق ہے اور دُنیا و آخرت میں اُن کے لیے عذاب ہے۔ اس بات کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ'' ''اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں'' یہ جملہ عرب ادبیات میں قدرت واستطاعت کے معنی کا کنایہ ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ فلاں کا ہاتھ کھلا ہوا ہے تو یہ سخاوت سے کنایہ ہے۔ ''يَدٰهُ'' یعنی دو ہاتھ کی اصطلاح انسان کی قدرت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنی لامحدود قدرت کو ثابت کرنے کے لیے تثنیہ کا استعمال کیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: یہود نے کتنی بڑی جرأت اور جسارت کی اور اپنی سرکشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کفر کو بڑھا دیا۔

بہت سارے مواقع ایسے آئے جب قرآن کی آیات نازل ہوتیں تو وہ حسد کرتے اور ان کا کفر اور بڑھ جاتا۔ کیونکہ یہودی کینہ رکھنے والے لوگ ہیں اسی وجہ سے جب انہوں نے دیکھا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے غیر یہود پر قرآن نازل کیوں کیا ہے تو یہ بات ان کے کفر اور حسد اور سرکشی میں اضافے کا سبب بن گئی۔ کیونکہ وہ خود کو امین سے اشرف سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر اللہ کی جانب سے کوئی چیز نازل ہو تو فقط انہی پر نازل ہو کیونکہ وہ اپنے آپ

کو دوسروں سے برتر اور پڑھے لکھے سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کتابوں کے عالم ہیں۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کے نزول اور اللہ کی اس بڑی نعمت کے کافر ہوئے اور انہوں نے تکبر کیا۔ خدا نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا اور وہ مختلف مذاہب میں بٹ گئے اور بکھر گئے۔

" اَلْعَدَاوَةَ "ایسی ناراضگی کو کہتے ہیں جس میں ناراضگی کے ساتھ عملی تجاوز ملا ہوا ہو۔" اَلْبَغْضَآءَ "اندرونی بغض اور کینہ کو کہتے ہیں، ممکن ہے کہ اس کا عملی طور پر بھی اظہار ہو اور ممکن ہے کہ نہ ہو۔ اس بنا پر پہلی بات یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ یہودی قیامت تک باقی رہیں گے، بعض نے کہا ہے کہ قیامت تک سے مراد یہاں پر حضرت امام مہدی علیہ السلام کی حکومت کا قیام ہے اس وقت تک یہ باقی رہیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ناراضگی اور اندرونی نفرت اور ان کے آپس کے جھگڑے بھی قیامت تک چلتے رہیں گے یعنی جب تک ان کا وجود ہے تو کبھی بھی آرام اور چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس میں بھی وہی ہے کہ جب امام زمانہ (عج) کی حکومت قائم ہو جائے گی تو کفر تو ختم ہو جائے گا کوئی یہودی باقی نہیں رہے گا۔

یہودی جب بھی مسلمانوں کے خلاف عملی اقدامات کرنا چاہیں گے اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہیں گے تو خدا ان کے درمیان اختلاف ڈال دے گا اور اس طرح جنگ کی آگ بجھادے گا۔ یہ مسلمانوں کے لیے خوش خبری تھی۔ البتہ سیاسی اور قومی مسائل کے لیے لڑی جانے والی جنگیں اس آیت کے سیاق سے باہر ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ پوری زمین کو دین کے خلاف کھڑی کریں اور اس مقصد کے لیے فساد پھیلانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا، فسادیوں کا اللہ تعالیٰ مخالف ہے لہٰذا زمین اپنے بندوں کے سپرد کرے گا جو فساد کا خاتمہ کریں گے۔ اللہ اپنی زمین فسادیوں کو نہیں دے سکتا تاکہ یہ فسادی اپنی پلید اور گندگی آرزوں کو حاصل کرسکیں، ان کی کوشش اور سعی بے ہودہ اور بے نتیجہ ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان میں سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور ضرور انہیں نعمت کے باغوں میں داخل کرتے''۔

ایمان کے بعد تقویٰ

ایمان کے بعد تقویٰ سے پارسائی اختیار کرنا اور حرام کاموں سے بچنا، گناہ کبیرہ سے بچنا، اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں پر دوزخ کا وعدہ دیا ہے ان کو انجام نہ دینا، خدا کا شرک نہ کرنا مراد ہے۔ ''سَیِّئَات'' سے گناہان کبیرہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کریں تو ان کے گناہان صغیرہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اس آیت کی مشابہ آیت سورہ النساء ۳۱ میں بھی آچکی ہے۔ ''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے''۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے اور اس کو جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے، کچھ لوگ ان میں سیدھی راہ پر ہیں، اور اکثر ان میں سے برے کام کر رہے ہیں''۔

توریت اور انجیل کے بیانات پر عمل نہ کرنا

یعنی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی حقیقی تورات اور انجیل کی انہوں نے تحریف نہ کی ہوتی، دوسری آسمانی کتابیں جو ان سے پہلے نازل ہوئیں ان پر بھی ایمان لے آتے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے مزامیر جن کو قرآن کریم نے زبور کے نام سے یاد کیا ہے؛اس کو بھی قبول کرتے، ان آسمانی کتابوں کے مطابق عمل کرتے، مبداء اور معاد کے عقیدے پر قائم ہوتے تو ان کے لیے نعمتوں کے دروازے کھل جاتے، آسمانوں اور زمین سے انہیں بے حساب روزی ملتی اور ان کے لیے نعمت وافر ہوتی، بدبختیاں ان سے دُور ہوتی۔ ان میں کچھ میانہ رو اور معتدل لوگ ہیں جو اللہ کے آگے تسلیم ہیں، اللہ کے اوامر واحکام پر عمل پیرا ہیں لیکن یہ بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ان کی اکثریت حدود الٰہی سے تجاوز کرتے ہیں اور کفر اور استکبار اور سرپیچی اور انحراف میں مبتلاء ہیں۔ ان کے یہ اعمال بہت ہی برے اور ناپسندیدہ ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

”اے رسول! جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اُترا ہے اِسے پہنچا دے، اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا، اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا، بے شک اللہ کافروں کی قوم کو راستہ نہیں دکھاتا“۔

وصایت اور جانشینی کے اعلان کا حکم

یہاں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ جو پیغام تیرے پاس آچکا ہے اس کو ہر صورت پہنچاؤ اور سختی سے کہا جارہا ہے کہ اگر یہ پیغام تو نے نہ پہنچایا تو گویا اپنے رب کے کسی بھی پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس حکم کو پہنچانے کے حوالے سے آپ کو جو خوف ہے اور جن خطرات کا احتمال ہے تو اللہ تعالیٰ ان خطرات سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پیغام انتہائی اہم ہے اور اس حکم کے پہنچانے میں یا تو رسول خدا ﷺ کی جان کو خطرہ تھا یا دینی پیش رفت کو خطرہ تھا۔ اس آیت کا پہلے والی آیت اور بعد والی آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اہل کتاب اس حالت میں نہ تھے کہ ان کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ یا اسلام کو ان سے کوئی خطرہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطرہ خود منافقین اور مسلمانوں سے تھا جس کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ دلا رہا ہے۔

یہ آیت ایک بڑے اہم امر کو بیان کر رہی ہے؛ یا تو اس میں پورا دین مراد ہے یا کوئی ایسا حکم ہے جس کا پورے دین سے تعلق ہے یا دین کے احکام کی اہمیت بتانا مقصود ہے۔ اس امر کو نکرہ کی صورت میں لایا گیا ہے جس سے اس امر کی عظمت سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ امر جو بھی تھا رسول اللہ ﷺ کو اس کے پہنچانے میں خوف تھا اور دل میں یہ سوچ رکھا تھا کہ کسی مناسب موقع پر اس حکم کو پہنچائیں گے۔ البتہ یہ خوف اپنی جان کے حوالے سے نہیں تھا بلکہ خوف یہ تھا کہ کہیں دین خطرے میں نہ پڑ جائے اور افتراق اور انتشار کی وجہ سے دین کمزور نہ ہو۔ ہو سکتا ہے اس بات کا خوف ہو کہ لوگ آپ پر تہمت لگا دیں جس وجہ سے اللہ کا دین اور اللہ کے دین کی طرف جو دعوت ہے وہ بے نتیجہ ہو جائے۔ ممکن ہے لوگ اس قسم کی تہمت لگائیں گے کہ حضور پاک ﷺ ایسا قانون اور شریعت لانا چاہتے ہیں جو ان کے اپنے فائدے میں ہو۔ اس سے یہ سمجھایا جارہا ہے کہ یہ ایسا حکم ہے کہ جو دین کی تمامیت اور اس کے مستقر

ہونے سے متعلق ہے۔ یہ ایسا حکم ہے کہ اگر نہ پہنچایا جائے تو پیغمبر اکرم ﷺ نے جتنی زحمتیں اٹھائی ہیں وہ سب بے نتیجہ رہ جائیں گی۔ یہ ایسا حکم ہے کہ اگر اس کو نافذ کریں تو لوگ اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے جس سے دین کی بنیاد درہم برہم ہو جائے گی۔ یہ بات کفار یا بت پرستوں یا اہل کتاب کی جانب سے نہیں تھی بلکہ یہ خوف مسلمانوں کی طرف سے تھا اور یہ ڈر تھا کہ مسلمان کہیں یہ نہ کہیں کہ پیغمبر ﷺ اپنے فائدے کے لیے یہ حکم دے رہے ہیں۔

اہل سنت اور شیعہ حدیثی کتابوں میں بیان شدہ احادیث اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ اس آیت میں جس حکم کی بات ہو رہی ہے وہ حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کی بابت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مامور کیا کہ وہ یہ پیغام فوری پہنچا دیں جبکہ حضور پاک ﷺ کو خوف تھا کہ لوگ خیال نہ کریں کہ وہ اپنے فائدے کے لیے بات کر رہے ہیں، اپنے چچازاد بھائی کو اپنا جانشین بنا رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر کو پہنچانے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھے اور اس لیے اسے موخر کر رہے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور آپ مجبور ہوئے کہ غدیر خم پر اس کا عملی مظاہرہ کریں اور اس حکم کو پہنچائیں۔ وہاں پر آپؐ نے اللہ کی جانب سے یہ حکم پہنچا دیا کہ ''من کنت مولاہ فھذا علی مولا'' ''جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں''۔[1]

[1]۔ رسول خدا ﷺ کا مشہور خطبہ جو خطبہ غدیر یہ کے نام سے معروف ہے، کتب اہل سنت میں بھی نقل ہوا ہے۔ جس کے متعلق کتاب الغدیر، غایت المرام اور عبقات میں تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ (مصحح)

غدیر خم میں ولایت علیؑ کا اعلان

رسول اللہ ﷺ کا خطبہ غدیر یہ اہل سنت کی کتابوں اور کتاب الغدیر اور غایت المرام میں نقل ہوا ہے۔ جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ''من کنت مولاہ فھذا علی مولا''۔ غدیر ایک چوراہا تھا وہاں سے راستے مختلف جگہوں کو جاتے تھے عراق، یمن، مدینہ؛ تو وہاں پر آپ رکے اور آپ نے تفصیلی خطبہ دیا اور اس میں بتایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے بلاوا آچکا ہے اور میں لبیک کہہ کر چلا جاؤں گا تو میرے بعد اس نظام کو سنبھالنے والے علی علیہ السلام ہیں۔ جو مجھے اپنا آقا، رہبر اور مولا مانتا ہے تو میرے بعد علیؑ کو اپنا مولا اور آقا سمجھے۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ہر اُمت ولی کے بغیر نہیں رہ سکتی جو ان کے تمام امور کی سرپرستی کرے ان کے معاملات کو حل کرے، کوئی عقل مند اس بات کو جائز نہیں جانتا کہ ایک ایسا دین جو عالمی ہے وہ بغیر سرپرست اور بغیر رہبر کے ہو۔ یہ دین جس نے قیامت تک رہنا ہے، جو دین خاتم ہے، جس کے معارف چاہے وہ عقائد ہوں یا اخلاقیات، فروعات یا اجتماعی اور انفرادی امور سب کی حفاظت کی ضرورت ہے، یہ دین حاکم اور والی سے بے نیاز ہو، اور اسے کسی ایسے رہبر کی ضروت نہ ہو جو ان کے امور کی تدبیر کرے۔ ایسا خیال درست نہیں ہے۔

سیرت پیغمبر اکرم ﷺ ایسی تھی کہ جب آپؐ جنگ کے لیے شہر سے باہر جاتے تھے تو مسلمانوں کے امور کے حل کے لیے اپنی جگہ کسی نہ کسی کو مقرر کر دیتے تھے جیسا کہ جنگ تبوک میں جب جانے لگے تو علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا کر گئے جبکہ حضرت علی علیہ السلام کو شہادت کا شوق تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم میرے خلیفہ ہو مدینہ میں اور آپؑ یہیں رہو گے۔ حالانکہ مدینہ میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ کوئی نہ تھا تو علی علیہ السلام نے جب یہ سوال کیا کہ مجھے عورتوں اور بچوں پر مقرر کر کے جا رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ کیا تم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی؟ مگر فرق یہ ہے کہ ہارون نبی تھے ،آپ نبی نہیں ہیں۔اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ لوگوں کے درمیان نہ ہوں گے تو ان کو والی اور حاکم کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔اب جب ایک مختصر عرصے کے لیے جارہے ہیں تو اپنا قائم مقام بنارہے ہیں اور جب ہمیشہ کے لیے جارہے ہوں تو اپنا قائم مقام کیوں نہیں بنائیں گے؟ جب حضور پاک ﷺ لوگوں کے درمیان نہیں ہوں گے تو لوگ اپنے مسائل کو حل کروانے کے لیے کس کی طرف رجوع کریں گے؟

صحیح بخاری میں وہب بن عبد اللہ سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے میں نے کہا کیا کوئی بات آپ کے پاس وحی سے ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو؟ تو علی علیہ السلام نے فرمایا نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو چیرا ہے، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ جو قرآن سے مجھے عطا ہوا ہے۔ یعنی جو کچھ میرے پاس ہے وہ قرآن سے ہی ہے۔اس آیت کے مضمون کے حوالے سے چند نکات :

آیہ "ابلاغ" کے بارے چند نکات

ا۔ حضور پاک ﷺ کے بہت سارے القاب ہیں لیکن اس آیت میں آپؐ کو رسول کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی اے پیغام رساں۔اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ کے تبلیغ کے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اسے پہنچاؤ۔اور آپ کا کام اللہ کے پیغام کو پہنچانا ہے،اس کے علاوہ آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۲۔اس آیت میں امر مہم کو مبہم بتایا گیا ہے تاکہ اس امر کی عظمت اور بڑائی کی طرف بھی اشارہ ہو اور سمجھایا جائے کہ اس امر کے بارے میں پیغمبر ﷺ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ دو مطالب پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے عذر بھی ہیں اور اس مطلب کے اظہار میں آپ

کو جرأت بھی عطا کرتے ہیں۔ یعنی پوری قاطعیت اور حتمیت کے ساتھ اور یقین کے ساتھ اس بیان کو لوگوں کے درمیان پیش کرنے میں پیغمبر اکرم ﷺ جرأت کا مظاہرہ۔

۳۔رسول اللہ ﷺ کے فہم و فراست کی تصدیق کی جا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پیغام کے پہنچانے کے متعلق جو کچھ سوچ رکھا تھا کہ اسکو بیان کرنے سے خطرہ لاحق ہوگا تو ان کی یہ تشخیص صحیح تھی اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔

۴۔آیت شریفہ میں یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ یہ امر ان امور میں سے ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم ﷺ زندہ ہیں خود اپنی زبان سے یہ اسے لوگوں تک پہنچائیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس امر کو پہنچانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

۵۔یہ مطلب اس قدر مہم ہے کہ ساری رسالت اور پیغمبرؐ کی تمام محنت اسی امر پر موقوف ہے، یہ ایسا حکم ہے کہ اگر اسے نہ پہنچایا تو گویا پیغمبرؐ نے پوری زندگی میں پیغام رسانی کا جو عمل انجام دیا تھا، کچھ بھی انجام نہیں دیا۔

۶۔اللہ تعالیٰ وعدہ دے رہا ہے کہ تیرے ذہن میں جو بات ہے اور آپ جس چیز کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھے گا، اس میں مومن، منافق، عام و خاص سب شامل ہیں۔ یعنی جو دینی مقاصد ہیں وہ پورے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ضمانت دے رہا ہے کہ اس حکم کے بیان کرنے سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

۷۔اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ کفار کو خدا ہدایت نہیں دیتا۔ اس جگہ کفر سے اس خصوصی حکم کا انکار مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس حکم کا انکار کرنے والوں کو کافر کہہ رہا ہے۔ اس جگہ ہدایت سے مراد بھی راہ راست کی ہدایت نہیں ہے بلکہ ہدایت سے مراد ان کے بُرے مقاصد ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ عمل کے وسائل اور کامیابی کے اسباب ان کے ہاتھ میں نہیں دے گا تاکہ وہ اپنے برے مقاصد کو حاصل کر سکیں۔ اللہ انہیں اتنا آزاد نہیں رکھے گا کہ وہ دین کو اور کلمہ حق کو نقصان دے سکیں۔ یا اللہ تعالیٰ انہیں اپنی طرف سے اتارے گئے نور کو بجھانے کی

اجازت نہیں دے گا اور شر اور فساد عام کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں نابود کرے گا، ان کے مکر اور حیلہ اور فساد اور شر کو ان ہی کی طرف پلٹا دے گا۔ سورہ فاطر آیت ۴۳: ترجمہ: ''حالانکہ بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے''

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

''کہہ دو اے اہل کتاب! تم کسی راہ پر نہیں ہو جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات کو اور انجیل کو اور اسے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور ضرور یہ فرمان جو تم پر نازل ہوا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھائے گا، سو افسوس نہ کرو انکار کرنے والوں کے حال پر''۔

اہل کتاب کو ستون دین قائم کرنے کی نصیحت

اے اہل کتاب جو ایک اساس اور بنیاد ثابت ہے تم اس کا سہارا لو اور وہ محکم ستون اور محکم بنیاد تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی جب تک تم حقیقی تورات اور انجیل اور اسی طرح دوسری آسمانی کتب کو اپنے اوپر نافذ نہ کرو۔ تمام آسمانی کتب میں مشترکہ بنیاد یہ چیزیں ہیں: اللہ پر ایمان، قیامت پر ایمان، تقویٰ پر چلنا، اللہ کی طرف رجوع کرنا، گناہوں سے توبہ کرنا یہی وہ مضبوط ستون ہے جو مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ انسان اسی پر اعتماد کرتے ہوئے دُنیا و آخرت کی سعادت کو پا سکتا ہے۔

دوسرا نکتہ جس کے متعلق اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے یہ ہے کہ تیرے اوپر اس قرآن کے نازل ہونے کے سبب اہل کتاب کے کفر، طغیان اور سرکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ پچھلی آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب خود کو اہل مکہ سے اشرف اور افضل سمجھتے تھے اور مکے والوں کو اُمی، جاہل اور ان پڑھ قرار دیتے تھے تو جب قرآن قریش کے ایک فرد پر اُترا اور جس کا لقب بھی اُمی بتایا گیا تو انہوں نے حسد کیا، بغض اور کینہ کرتے ہوئے اس کا انکار کر دیا اور کہا کہ اگر یہ اللہ کی جانب سے اتری ہوتی تو ہم پر اُترتی کیونکہ ہم اللہ کے پیارے ہیں، ہم اللہ کے قریبی ہیں۔ تو آخر میں اللہ نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ان کی اس حالت پر اور ہٹ دھرمی اور حقائق کے انکار کی وجہ سے تم غمگین مت ہو کیونکہ یہ لوگ کافر، سازشی اور سرکش ہیں، انہوں نے مخالفت کرنا ہی ہے اور انہوں نے کفر اختیار کرنے کی عادت بنا رکھی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

”بے شک مسلمان اور یہودی اور صابئ اور عیسائی جو کوئی بھی (اپنے مذہب کے زمانے میں) اللہ اور قیامت پر ایمان لایا اور نیک کام کیے تو ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔

سعادت کا تعلق اسماء والقاب سے نہیں

”صَابِئُوْنَ“ اس قوم کو کہتے ہیں جو اللہ، قیامت کے دن اور بعض انبیاء پر ایمان رکھتے تھے لیکن بعض ستاروں کی خیر و شر میں تاثیر کے قائل تھے۔ یہ آیت اس مطلب کو بیان کر رہی ہے کہ سعادت اور نیک بختی کا تعلق اسماء والقاب سے نہیں ہے۔ لہٰذا مومن یا یہودی

یا صابئ یا نصاریٰ کا عنوان کسی کے لیے سعادت کا موجب نہیں ہے۔ یعنی اگر کسی شخص پر مومن کے عنوان کا اطلاق ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جنتی ہے۔ بلکہ جو چیز دُنیا و آخرت کی سعادت کا سبب ہے وہ اللہ اور روز جزاء پر ایمان اور نیک عمل انجام دینا ہے۔ اگر کوئی اللہ اور روز جزاء پر ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے تو پھر اس کو نہ تو کوئی ڈر ہے اور نہ کوئی پریشانی اور نہ تکالیف کا خوف۔ اس کی اخروی سعادت یقینی ہے۔ اس مطلب کے بارے سورہ البقرہ کی آیت ۶۲ میں بحث ہو چکی ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾

''ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے تھے، جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ حکم لایا جو ان کے نفس نہیں چاہتے تھے تو (رسولوں کی) ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر ڈالا''۔

نبیوں کے ساتھ بنی اسرائیل کا سلوک

اس آیت میں بنی اسرائیل کی بات ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ شریعت اور دین کے احکام پر عمل کریں گے جو ہم نے پیغمبروں پر نازل کئے ہیں اور جنہوں نے ان تک شریعت، قانون اور ہمارے احکام پہنچائے ہیں اُن کی تعظیم کریں گے اور ہمارے بیان کے مخالف قوانین کو چھوڑ دیں گے اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے کیونکہ ان کی خیر و سعادت اسی میں ہے۔ لیکن جب ان کے پاس اللہ کا قانون اور شریعت لے کر انبیاء آئے تو انہوں نے ان کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر دیا۔ جب ایسا ہے تو ظاہر

ہے ان کے لیے پھر اللہ کی ناراضگی یقینی ہے اور اس جرم کی اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح بتایا کہ بنی اسرائیل کا مزاج ہی ایسا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام نفسانی خواہشات کے تحت نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے سارے احکام ایک مصلحت کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ امر ہوا پرستوں اور خواہشات کے پجاریوں کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو جھٹلاتے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی اصلیت کو واضح کیا گیا ہے۔

وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

"اور یہی گمان کیا کہ کوئی فتنہ نہیں ہوگا پھر اندھے اور بہرے ہوئے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی پھر ان میں سے اکثر اندھے اور بہرے ہو گئے، اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ دیکھتا ہے"۔

بنی اسرائیل کی بعض خصوصیات کا تذکرہ

اس آیت میں بنی اسرائیل کی کچھ اور خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔ "حسبان" خیال اور سوچ کے کو کہتے ہیں اور "فِتْنَةٌ" امتحان کے معنی میں ہے، ایسا امتحان جو بے خبر کو دھوکہ دے دے یا اس سے مطلق شر مراد ہے۔ "عمی" یعنی اندھا پن، اس جگہ اس سے مراد ایسا فرد ہے جس کے پاس حق بین آنکھ نہ ہو اور خیر اور شر کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت اپنے ہاتھ سے دے بیٹھے۔ "صمم" یعنی بہرا پن، اور یہاں پر اس سے موعظ اور نصیحت نہ سننا اور اس سے بے توجہی کرنا مراد ہے۔ ان کا یہ اندھا پن اور بہرا پن اُن کے غلط خیالات کا نتیجہ ہے جو یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی امتحان نہیں ہے۔ ان کے یہ غلط خیالات بھی اس بات کے معلول تھے کہ وہ اپنے لیے فضیلت اور کرامت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ ہم

یعقوب کی نسل سے ہیں اور ہم اللہ کے بیٹے ہیں، اللہ کے اولیاء ہیں، ہمارے لیے عذاب نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے وہ یہاں تک پہنچ گئے کہ وہ حق کو دیکھنے اور سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنی رحمت کی نظر ان پر کی اور اُنہیں اس کیفیت سے باہر نکالا اور وہ اہل تقویٰ اور اہل حق ہو گئے، انبیاء کے مواعظ اور نصیحتوں کو سنا اور حق کو پہچانا اور سمجھا اور یہ بھی جان لیا کہ فقط اسماء و القاب اور عناوین کامیابی اور سعادت کا سبب نہیں ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر اسی غفلت، اندھے پن اور بہرے پن میں پڑ گئے اور پھر حقیقت سے منحرف ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ تو بصیر ہے، ہر ایک کی نیتوں سے واقف ہے، جو کچھ انہوں نے دلوں میں چھپا رکھا ہے اس کو بھی جانتا ہے اور بندوں کے اعمال سے مکمل آگاہی رکھتا ہے، کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کو حقیقت سمجھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ سارے حقائق سے آگاہ ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

"البتہ بتحقیق وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ وہی مریم کا بیٹا مسیح ہی ہے، اور (حالانکہ) مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! اس اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے، بے شک جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا سو اللہ نے اس پر جنت حرام کی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا"

نصرانیوں کے باطل عقائد

یہ آیت اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ مسیحی بھی یہودیوں کی طرح اس بات پر خوش تھے کہ وہ مسیحی ہیں اور خیال کرتے تھے کہ مسیح سے اُن کی نسبت اُنہیں کفر، شرک اور عذاب الٰہی سے بچالے گی۔ وہ اپنی اس نسبت اور لقب سے بڑے خوش تھے تو اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ مسیح بھی تو ایک انسان تھا جس کی طرف انہوں نے الہٰ ہونے کی نسبت دی حالانکہ انسان کجا اور پوری کائنات کا رب اور مالک کجا۔ مسیح خود کہتے تھے اللہ کی پرستش کرو، اللہ میرا بھی رب ہے تمہارا بھی رب ہے، میں تمہاری طرح اللہ کا بندہ ہوں۔ ان کے پاس اُن کے کفر کی کوئی دلیل نہیں تھی۔ مسیح کا یہ بیان ان کی بات کی تردید ہے۔

پھر فرمایا کہ جو بھی الوہیت اور معبودیت میں کسی کو اللہ کا شریک قرار دے تو وہ مشرک اور کافر ہے۔ ایسے فرد کا بہشت میں جانا حرام ہے اور ان کا ٹھکانہ آتش جہنم ہے وہاں پر ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ مذکورہ مطالب مسیحیوں کے اس عقیدے کو رد کرتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں کہ مسیح اس لیے پھانسی پر چڑھے ہیں تاکہ مسیحیوں کے سارے گناہوں کو معاف کروادیں، مسیح اپنے پاؤں کے ساتھ چل کر تختہ دار پر گئے تاکہ اپنی جان قربان کریں اور اپنے پیروکاروں کو آتش جہنم سے بچائیں اور اس قربانی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے پیروکاروں کے گناہوں کو معاف کر دیا اور جتنے بھی الٰہی فرائض تھے اُنہوں نے اپنی گردن پر لے لیے ہیں اور قیامت کے دن سارے مسیحی بہشت میں جائیں گے اور آگ ان کے جسموں کو نہیں جلائے گی۔

مسیحیوں نے اس داستان کو اس لیے گھڑ لیا ہے تاکہ دینداری کے عنوان پر اکتفاء کریں اور اللہ کے تمام محرمات کا ارتکاب کرتے رہیں اور آخرت میں اس وجہ سے کہ اللہ کے بیٹے ہیں سیدھے بہشت میں جائیں۔ جو مطالب اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں وہ انجیل کے مختلف ابواب میں بھی بیان ہوئے ہیں جن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

۱۔ امر بہ توحید، کہ اللہ کو یکتا مانو۔ (الاصحاح ۱۲۔ ۲۹۔ انجیل مرقس)
۲۔ مشرک کی عبادت باطل ہے۔ (۶۔ ۲۴ متیٰ)
۳۔ ظالم ہمیشہ آتش جہنم میں ہوں گے۔ (متیٰ ۱۳۔ ۵۔۔ ۲۵۔ ۳۱۔ ۴۷)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳

"بے شک وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے، اور (حالانکہ) سوائے ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں، اور اگر وہ اس بات سے باز نہ آئیں گے جو وہ کہتے ہیں تو ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں کو دردناک عذاب پہنچے گا"۔

اقانیم ثلاثہ کا نظریہ

اس آیت میں مسیحیوں کے ایک اور باطل عقیدے کو رد کیا گیا ہے۔ وہ خدا کو تین مقدس اقنوم یعنی تین مقدس ہستیاں، باپ، بیٹا اور روح القدس میں سے ایک مانتے تھے۔ ان کے اس نظریہ کا لازمہ یہ ہے کہ ایک چیز اس لحاظ سے کہ وہ ایک ہے اسی حالت میں تین بھی ہو۔ عقل اس معنی کو قبول نہیں کرتی، اگر باپ ہے تو بیٹا کیسے ہو گیا اور اگر وہی بیٹا ہے تو باپ کیسے ہو گیا اور پھر ایک ہی ذات باپ اور بیٹا دونوں کیسے ہو گئے؟ کسی بھی طریقے سے خدا میں کثرت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد حقیقی ہے، وہ ایسی ذات ہے جس میں تعدد نہیں ہے، وہ ذات یکتا ہے، نہ عقل میں اور نہ ہی وہم میں اس کے متعلق کثرت کا تصور نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی چیز اس کے ساتھ ضمیمہ ہو سکتی ہے۔ وہ کسی چیز سے ترکیب نہیں پا سکتا، اس کی وحدت وحدت عددیہ نہیں ہے، نہ ذات میں کثرت نہ نام میں کثرت نہ

صفات میں کثرت؛ کسی بھی حوالے سے وہاں کثرت نہیں ہے وہاں وحدت حقیقی ہے، وحدت عددی یا کثرت عددی یا مخلوقات کے احکام اور آثار اللہ تعالیٰ کے متعلق قابل تصور نہیں ہیں۔ کس طرح صانع اور خالق ان امور سے متصف ہو سکتا؟ عالم وجود میں اصلاً کوئی ایسی ذات یا چیز ہے ہی نہیں جو اللہ یا معبود ہو۔ اللہ ہی معبود یگانہ اور یکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے نہ اس کے باہر نہ اندر اور نہ وہم و خیال میں ہے۔

پھر یہاں پر تثلیث کے قائل ہونے کی وجہ سے نصاریٰ کی سرزنش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تثلیث کے عقیدے کا صحیح یا باطل ہونے کو علماء ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن عام لوگ جنہیں عقائد کے متعلق صحیح ادراک نہیں ہوتا ہے اور وہ دینی عقائد کو طوطے کی مانند رٹ لیتے ہیں اور ان کو دہراتے ہیں وہ تثلیث کے عقیدے کو مقدس چیز کے عنوان سے قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا اس بارے علماء اور عام لوگ میں فرق ہے، سب حقیقی کفر والے نہیں ہیں اور نہ ہی توحید کے منکر ہیں۔ علماء ہی حقیقی کفر میں ہیں کیونکہ مسیحی علماء کو حقیقت کا علم ہونے کے باوجود تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ حقیقت جاننے کے باوجود خدا کی وحدانیت کے منکر ہوئے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ ان کی سرزنش کر رہا ہے اور ان کو دردناک عذاب کی خبر بھی دے رہا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہم '' الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ '' میں '' مِنْ '' کو بیانیہ قرار دیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو بات کہی ہے اس کا بیان ہے۔ یعنی ان میں سے جو سب کچھ جانتے ہوئے کافر ہوئے ان کا یہ حکم ہے۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اللہ کے آگے کیوں توبہ نہیں کرتے اور اس سے گناہ نہیں بخشواتے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

توبہ نہ کرنے والوں سے سوال

یہ سوال لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے اور توبہ و استغفار کرنے کا شوق دلانے کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اللہ کی رحمت اور مغفرت یاد دلائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ یہ اپنے حال پہ توجہ نہیں دیتے اور خود کو اس حالت سے نکالتے کیوں نہیں، اللہ کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے، اللہ کی جانب واپس کیوں نہیں پلٹتے؟ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں استفہام توبیخ اور انکار کے لیے ہو، اس بناپر اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہ استغفار اور توبہ کیوں نہیں کرتے؟ کیوں یہ طلب مغفرت اور طلب رحمت کے درپے نہیں ہوتے؟ یعنی ان کا ایسا نہ کرنا ایک مذموم حرکت ہے۔ ان کو ایسا کرنا چاہیے، وہ کیوں نہیں کرتے؟ یہ ایسے ہے کہ آپ نے کسی سے کہا فلاں کام کرو، جب اس نے نہیں کیا تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے کیوں ایسا نہیں کیا، کیا سبب تھا کہ آپ نے اس کام کو چھوڑ دیا، کیوں چھوڑا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گناہ کرلیا ہے تو اب توبہ کرلو میں توبہ قبول کرلوں گا لیکن جب ایسا نہیں کیا تو اللہ پوچھ رہا ہے کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾

"مریم کا بیٹا مسیح تو صرف ایک پیغمبر ہی ہے، اس سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں، اور اس کی ماں سچی ہے، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے، دیکھ ہم انہیں کیسی دلیلیں بتلاتے ہیں پھر دیکھو وہ کہاں الٹے پھرے جاتے ہیں"۔

مسیح کے متعلق صحیح عقیدہ

نصرانیوں کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ مسیح الٰہ ہے اور ان میں الوہیت کا جوہر پایا جاتا ہے، ان کے اندر الوہیت داخل ہے۔ اس آیت میں ان کی گفتار کو رد کیا گیا ہے، فرمایا کہ مسیح بھی باقی رسولوں کی مانند ایک رسول ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، جیسے ان کو موت آئی ہے ان کو بھی موت آئے گی اور یہ سب ہدایت دینے کے لیے آئے ہیں نہ کہ خود کو الٰہ اور رب کہہ کر ان سے اپنی عبادت کروائیں۔ مسیح کی ماں بھی انسان ہیں اور سچی ہیں، وہ خدا کی آیات کی تصدیق کرنے والی ہیں۔ یہ دونوں انسانوں سے ہیں اور باقی انسانوں کی طرح کھانا کھاتے ہیں۔ ان کا خوراک کھانا دلیل ہے کہ یہ مخلوق ہیں کیونکہ مخلوق ہونے اور انسان ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی غذا کھانا ہے۔ مسیح خالق نہیں مخلوق تھا اس کی ماں بھی انسان ہے۔ لہٰذا پیغمبر کو کہا گیا دیکھو! یہ کیسے لوگ ہیں کہ ہم ان کی باتوں کے بطلان اور ان کے غلط ہونے پر دلیلیں پیش کرتے ہیں لیکن یہ ان ساری نشانیوں کو نظرانداز کرتے ہیں اور ان واضح دلائل کو پس پشت ڈالتے ہیں اور حق کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے۔ یہ جھوٹے ہیں۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ ۷۶

”کہہ دو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے نفع و نقصان کا مالک نہیں، اور اللہ وہی ہے سننے والا جاننے والا“۔

ایسے کی عبادت کیوں جو نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان؟!

یہ چیز انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ اول تاریخ سے اپنے سے ضرر اور شر کو دُور کرنے اور منفعت، فائدہ اور خیر کو جلب کرنے کے لیے کسی خدا کی پرستش کرتا رہا ہے۔ تاکہ جس کو اس نے معبود بنایا ہے وہ اس سے فائدہ پہنچائے اور اس سے ضرر کو دور کرے۔ اللہ کی پرستش اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ وہ پرستش کے لائق ہے، اس کی پرستش اس لیے نہیں کی جاتی، تاکہ اس کے ذریعے فائدہ حاصل کیا جائے یا اپنے آپ سے نقصان کو دور کیا جائے۔ غیر اللہ جو بھی ہے وہ سب اللہ کا محتاج اور ممکنات سے ہے۔ جو خود اپنے نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں، جو اپنے سے نقائص کو دُور نہیں کر سکتے، اپنے نقصانات ختم نہیں کر سکتے وہ کس طرح اپنے پیروکاروں سے شر اور نقائص کو دُور کریں گے۔

اللہ کے علاوہ ہر معبود خود اللہ کا محتاج ہے، خود اللہ کا مملوک ہے۔ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے، لہٰذا کس طرح اس کی عبادت کی جا سکتی ہے؟ کس طرح اسے رب کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اس کا شریک شمار کیا جاتا ہے؟ لہٰذا عقل فیصلہ دیتی ہے کہ خدا ہی وہ واحد ذات ہے جو عبادت کے لائق ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ اسے رب کہا جائے، وہی دعا کرنے والوں کی دعا سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے، وہی بندوں کی حاجات کو پوری کرتا ہے اور ان سے غافل نہیں ہے، وہی برائیوں کو ان سے دُور کرتا ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

''کہہ دو اے اہل کتاب ! تم اپنے دین میں ناحق زیادتی مت کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے دور ہو گئے''۔

دین میں غلو نہ کرو

''غلو'' افراط اور حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ کے دین میں افراط اور تجاوز کے ذریعے تحریف نہ کرو یہ دین توحید کا حکم دیتا ہے، یعنی یہ نہ کہو کہ اللہ باپ ہے اور مسیح وعزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ خلق اور ربوبیت یعنی کسی چیز کو وجود میں لانا اور اس کی تربیت کرنا، اللہ کے سپرد ہے۔ سابقہ بت پرستوں اور مشرک اقوام کی طرح تم اپنی خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس کی پیروی مت کرو جو خود بھی گمراہ تھے اور بہت سارے لوگوں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ کیونکہ باپ، بیٹا اور روح القدس کا عقیدہ بھی بت پرستوں کے خیالات سے لیا گیا ہے جو خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، تو یہ گمراہی پر گمراہی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: دین کی ابتداء اللہ کی معرفت ہے اور معرفت کا کمال اس کے وجود کی ہے اور تصدیق کا کمال اسے یکتا جاننا ہے اور توحید کا کمال خالص ہونا ہے اور اخلاص کا کمال اس سے صفات کی نفی کرنا ہے کیونکہ ہر صفت گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے۔ ہر موصوف گواہی دے رہا ہے کہ وہ اپنی صفت کا غیر ہے۔ پس جو شخص ذات خدا کو صفت سے جدا توصیف کرے تو اس نے اللہ کا قرین بنایا ہے اور جو اللہ کا قرین اور ساتھی قرار دے تو اس نے اللہ پر دو ہونے کا حکم لگایا ہے۔ اور جو اللہ پر دو ہونے کا حکم لگاتا ہے تو اس نے خدا کے لیے اجزاء قرار دیئے اور جس نے خدا کے لیے اجزاء قرار دیے تو گویا کہو وہ اللہ سے جاہل ہوا اور جو اللہ سے جاہل ہوا وہ اسے اس قابل بھی

جانے گا کہ اس کی طرف اشارہ حسّی ہو سکتا ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو اشارہ حسّی کے قابل جانا تو اس نے اللہ کو محدود کر دیا اور جس نے اللہ کو محدود کیا تو اس نے اللہ کو شمار کیا اور جس نے اللہ کو شمار کیا تو پھر وحدت کہاں رہی؟ پس اللہ کی وحدت، وحدت عددی نہیں ہے اور اس کی صفات اس کی ذات کے عین ہیں۔ اس کی وحدت وحدت حقیقی ہے اقانیم ثلاثہ کا نظریہ باطل ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

”بنی اسرائیل میں سے جو کافر ہوئے ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے گزر گئے تھے“۔

کفار بنی اسرائیل پر لعنت

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خبر دی گئی کہ اہل کتاب نے پہلے ہی کفر کیا ہے اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تبلیغ کو قبول نہیں کیا اور ان کی موجودگی میں ہی ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس لیے حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی ان پر لعنت بھیجی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی لعنت بھیجی۔ انہوں نے ہمیشہ حد سے تجاوز کیا اور اللہ کے بیان کردہ احکام کو نظر انداز کیا۔ ان کے حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

”آپس میں برے کام سے منع نہ کرتے تھے جو وہ کر رہے تھے، کیسا ہی برا کام ہے جو وہ کرتے تھے“۔

منکرات سے نہ روکنا

ان کی روش یہ تھی کہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو خود برا عمل کرتے تھے، اور کچھ وہ تھے جو ان کے ان برے عمل پر راضی ہوتے تھے اور انہیں ان برے اعمال سے روکتے نہیں تھے۔ دوسرے کے برے عمل پر خاموش رہنا اور اس برے عمل کرنے والے کو اس برائی سے منع نہ کرنا؛ یہ خود اس عمل کرنے والے کی مانند ہے۔ ان کا شیوا یہی تھا کہ ہمیشہ منکرات کے مرتکب رہے۔ ان کا یہ رویہ بہت ہی برا تھا۔ اس بناء پر وہ اللہ کی لعنت کے مستحق ٹھہرے۔

تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡهُمۡ یَتَوَلَّوۡنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ لَبِئۡسَ مَا قَدَّمَتۡ لَهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ اَنۡ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ وَ فِی الۡعَذَابِ هُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾

''توں دیکھے گا کہ ان میں سے بہت سے لوگ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں، انہوں نے کیسا ہی برا سامان اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجا ہے اور وہ یہ کہ ان پر اللہ کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں''۔

اپنے لیے بُرا سامان آگے بھیجنا

اس آیت میں اہل کتاب کے وجدان کی گواہی مانگی گئی ہے یعنی اگر ان لوگوں کو اپنے دین کی قدر ہوتی اور اس کی معرفت رکھتے تو اس سے ہاتھ نہیں اٹھاتے اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرتے۔ اس امر کا لازمہ یہ تھا کہ یہ اہل توحید سے محبت کرتے اور کافر نہ ہوتے۔ کیونکہ وجدان اور ضمیر گواہی دیتا کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے تو ان کے عمل سے بھی راضی ہوتا ہے۔ لہٰذا کفار کے ساتھ انکی دوستی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے دین سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور دین کو نظر انداز کیا ہے۔ کفار کی دوستی بہت ہی برا سرمایہ ہے کہ جسے وہ

اپنی آخرت کے لیے بھیج رہے ہیں۔ ان کی سزا خداوند تبارک و تعالیٰ کا غضب اور ہمیشہ کا عذاب ہے اور یہ ان کے اعمال کا ہی وبال ہے جو ان پر آئے گا۔ انہوں نے جو عمل آگے بھیجے ہیں تو وہ عذاب کی شکل میں انہیں ملیں گے۔

وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اور اگر وہ ایمان لاتے اللہ اور نبی پر اور اس چیز پر جو اس کی طرف سے نازل کی گئی ہے تو کافروں کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں''۔

اللہ اور پیغمبروں پر ایمان لانے کا تقاضا

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر اہل کتاب اللہ اور پیغمبر اسلام اور قرآن اور جو کچھ پیغمبروں کی کتابوں میں آیا ہے اس کو قبول کر لیتے، ان پر ایمان لے آتے تو پھر یہ کافروں کے کبھی بھی دوست نہ بنتے۔ کیونکہ ایمان تمام اسباب کو خواہ وہ جس قدر بھی موثر ہوں ان کو اپنے دائرے میں لے آتا ہے اور ان ساروں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لے آتا ہے تو پھر ایمان کے ہوتے ہوئے وہ ایسا عمل انجام نہیں دیتا جو ایمان کے منافی ہو۔ جو ایسا کرتے ہیں تو وہ در حقیقت ایمان ہی نہیں لائے۔ پھر ایسے افراد کی طرف اشارہ دیا ہے کہ اس طرح بہت سارے لوگ گمراہ ہو گئے ہیں اور ایمان سے منحرف ہیں۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ

اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو سب لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کا دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائے گا، اور تو سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں سے ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے''۔

مسلمانوں سے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا تعلق

اس آیت میں قرآن مجید اہل کتاب کے اعتقادات کا آپس میں تقابل پیش کر رہا ہے۔ اس حوالے سے بتایا گیا ہے کہ یہود اور مشرکین تکبر اور روحیات اور مزاج میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں کیونکہ وہ رذائل اخلاقی اور غلط اعمال میں مشترک ہیں۔ اگرچہ بعض بری باتیں یہودیوں کا خاصہ ہیں جیسے انہوں نے یہ کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ یا بعض نصاریٰ نے کہا کہ مسیح خدا ہے یا کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ لیکن بہر حال یہود اور مشرکین مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور مکر و حیلہ اور خیانت اور دھوکہ دینے اور پیمان شکنی اور ایمان نہ لانے میں ایک دوسرے کی مانند ہیں۔

لیکن نصاریٰ اس لحاظ سے کہ ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا ہے اور بغیر کسی جنگ کے اسلام کے گرویدہ ہوئے اور ایمان لے آئے ہیں، حالانکہ وہ ایمان لانے یا جزیہ دینے یا جنگ کرنے میں آزاد تھے۔ اس لیے مودت کے اعتبار سے باقی لوگوں کی نسبت وہ مومنوں کے قریب تر ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ان میں عبادت گذار عالم اور زاہد موجود ہیں اور ان میں انکساری ہے، وہ تکبر نہیں کرتے۔ ان میں یہ تین باتیں ہیں علم، عبادت اور

ان میں تکبر کا نہ ہونا۔ اور یہی تین چیزیں ان کی سعادت اور نیک بختی کی چابی ہیں۔ اور یہی چیزیں آدمی کی سعادت کے لیے آمادگی کا سرمایہ ہیں کیونکہ دینی اعتبار سے سعادت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان پہلے عمل صالح کی معرفت حاصل کرے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے۔

یہودیوں میں اگرچہ علماء موجود تھے اور وہ عمل صالح کو جانتے تھے لیکن وہ متکبر تھے اور حق کے ساتھ انہیں عناد اور دشمنی تھی اس لیے وہ حق پر عمل نہیں کرتے تھے۔ مشرکین کے ہاں تو علماء تھے ہی نہیں، وہ اپنے فیصلے یہود و نصاریٰ کے علماء سے جا کر کرواتے تھے لیکن ایک ناپسندیدہ صفت یعنی تکبر اور عصبیت یہودیوں اور مشرکین میں مشترکہ تھی وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔ اسی لیے اس آیت میں یہود و مشرکین کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے اور نصرانیوں کو ان سے علیحدہ کرکے بیان کیا گیا ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

''اور جب اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول پر اُتری تو ان کی آنکھوں کو دیکھے گا کہ ان سے آنسو بہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے پس تو ہمیں ماننے والوں کے ساتھ لکھ لے''۔

مومنوں سے نصاریٰ کی قربت کی علامتیں

اسلام اور قرآنی آیات کی حقانیت کی شناخت اور معرفت آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا ہے۔ حق ان کے دلوں پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ سننے والے اس بات کی تصدیق کر رہے ہوتے ہیں جو پڑھا جا رہا ہے وہ برحق ہے۔ جو پچھلی آیت میں کہا گیا کہ نصاریٰ مومنوں کے

قریب تر ہیں اور ان کے دلوں میں مومنوں کی محبت دوسروں کی نسبت زیادہ ہے۔ کیونکہ نصاریٰ حق کے آگے خاضع ہیں، جھکے ہوتے ہیں۔ جب وہ حق کو سنتے ہیں تو کہتے ہیں اے ہمارے رب ! ہم تیرے اوپر ایمان لے آئے، ہمیں گواہوں کے ساتھ لکھ دو کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے ہے کہ ان کے درمیان کشیش، عیسائی علماء، راہبان بہت ہیں اور یہ کہ وہ متکبر نہیں ہیں۔ اس آیت میں نصرانیوں کی عمومی کیفیت بتائی گئی ہے کہ ان میں یہودیوں جیسا تکبر نہیں ہے۔ اور اس آیت میں ان کے حق کو تسلیم کر لینے کی بات بیان کی گئی ہے ان میں اگر تکبر ہوتا تو وہ بھی یہودیوں اور مشرکین کی طرح ایمان نہ لاتے۔ انکے پاس جو معلومات تھیں اور ان میں خضوع وخشوع اور انکساری کی حالت حق کو ماننے کا سبب بن گئی۔

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

"اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں اور اس چیز پر جو ہمیں حق سے پہنچی ہے، اور ہم اس کی طمع رکھتے ہیں کہ ہمیں ہمارا رب نیکوں میں داخل کرے گا"۔

ایمان لانے والے نصرانیوں کی دعاء

اللہ اور جو کچھ اللہ کی طرف سے حق بات آئی ہے اس پر ایمان فطرت سلیم کے عین مطابق ہے وہ فطرت جو کسی سے متاثر ہو کر بدلی نہیں جاتی اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ پھر ہم کیوں ایمان نہ لائیں؟ اس حالت میں ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالحین سے قرار دے گا اور ہمیں نیکوں کے گروہ میں رکھے گا۔ نصاریٰ کی یہ گفتار جسے اللہ تعالیٰ نے ان سے نقل کیا ہے در حقیقت اس مطلب کی تائید کا دوسرا مصداق ہے جو ان کے بارے میں کہا گیا کہ اہل ایمان سے محبت کرنے

کے اعتبار سے یہ لوگ باقی سب لوگوں سے مومنین کے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی مومنین کے ساتھ محبت اور مودت ان کی ہدایت کا سبب بنی ہے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

''پھر اللہ نے انہیں اس کہنے کے بدلے میں ایسے باغ دیے کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور نیکی کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے''۔

دعاء کی قبولیت

''اثابۃ'' ثواب دینا، بدلہ دینا اور جزاء دینے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں نصاریٰ کو جزاء دینے کی بات ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ثواب میں ایسے باغ دیے کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ کا ان کو جزاء اور پاداش دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان نصرانیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام لا چکے ہیں۔ بعد والی آیت میں یہود اور مشرکین کی سزا کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس طرح ان تین گروہوں کی عاقبت کو بیان کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع

''اور وہ لوگ جو کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں رہنے والے ہیں (وہ دوزخی ہیں)''۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کی سزا

اس آیت میں یہودیوں اور مشرکین جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کا مشابہہ قرار دیا ہے ان کے بارے بتایا جارہا ہے۔ یہودیوں اور مشرکین کی مومنین سے دشمنی اور ان کا تکبر اور اللہ کی آیات کو جھٹلانا اس بات کا سبب بنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جہنم قرار دے دیا۔ ان کے کفر کا سبب ان کا اللہ کی آیات کو جھٹلانا ہے۔ جہنم ان کا مقدر اسی لیے قرار پائی کہ انہوں نے کفر کیا، اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، حق کو نہیں مانا اور دشمنی پر اُتر آئے اور واضح نشانیوں کو جھٹلایا جب کہ ان کو حقیقت کے متعلق معلوم تھا۔ علم رکھنے کے باوجود انہوں نے انکار کیا تو انکی سزا جہنم قرار پائی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اے ایمان والو! ان ستھری پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو

''حرام'' اس چیز کو کہتے ہیں جس سے منع کیا گیا ہو، یہ منع چاہے اللہ کے ارادے کے سامنے مسخر ہونے کی وجہ سے ہو یا عقل یا شرع یا جبر کرکے کسی کو کسی چیز سے منع کیا جائے یا یہ منع اس کی طرف سے ہو جس کی اطاعت لازمی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے ان کو اپنے اوپر حرام قرار نہ دو۔ حلال یا تو ''حلّ'' سے ہے اور حل کا معنی ہوتا ہے گرہ کھولنا یا ''حلول'' سے ہے سرایت کرنے اور ''نزول''

اترنے کے معنی میں ہے۔ حلال حرام کے مقابلے میں ہے۔ اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اللہ کے حلال کو حرام مت کرو اور حرام کو حلال مت کرو۔ یہ اس لحاظ سے ہے کہ اللہ کی حلیت کے قانون کے مقابلے میں حرمت کا قانون نہ بناؤ یا اگر کوئی حلال عمل انجام دے رہا ہے تو اس کے آگے رکاوٹ کھڑی نہ کرو یا اگر خود اس کو انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہو تو اس سے نہ رکو۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی تحریم سے منع فرمایا ہے یعنی حلال کو حرام قرار دینا یا حلال کے استعمال سے روکنا یا خود اس حلال چیز کو استعمال میں نہ لانے سے منع کیا ہے۔ ایسا کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی سلطنت میں مداخلت قرار دیا ہے۔ یہ چیز اللہ کی حکمرانی کا انکار، اللہ پر ایمان لانے کے خلاف ہے اور اللہ کے اوامر کے آگے تسلیم ہونے کے منافی ہے اور اللہ کی تشریعی حکمرانی سے تجاوز ہے اور اللہ کے اوامر کی پابندی اور اس کے آگے تسلیم ہونے سے خروج ہے، اللہ تعالیٰ سے اعتداء و دشمنی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ تجاوز کرنے والوں اور حلال کو حرام قرار دینے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے میں کیا حکمت اور مصلحت ہے اور کسی کے حرام ہونے کی مصلحت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ اور طیبات کو حلال قرار دیا ہے اور خبائث اور جن چیزوں میں نقصان ہے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا خداوند متعال اس میں کسی کی مداخلت کو قبول نہیں کرتا

وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

”اور کھاؤ اللہ کے رزق میں سے جو چیز حلال ستھری ہو، اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو“۔

حلال کا استعمال اور خدا خوفی

اس آیت میں پچھلی آیت کا مضمون تکرار ہوا ہے اور اسی بات کی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ نہی کے بعد آنے والا امر جواز پر دلالت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نعمات کا استعمال جائز ہے۔ ''اکل'' سے یا تو نعمات الٰہی کا کھانا مراد ہے یا اس میں تصرف کرنا مراد ہے۔ ان دو آیات کے شان نزول کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ کچھ مومنین نے اپنے اوپر بعض کھانے کی چیزیں حرام کرلی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ کے قوانین کی مخالفت سے ڈرو اور خداوند تبارک و تعالیٰ پر تم ایمان لائے ہو تو پھر اس کے تمام اوامر کے سامنے تسلیم رہو، اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرو۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

''اللہ تمہیں تمہاری فضول قسموں پر نہیں پکڑتا لیکن ان قسموں پر پکڑتا ہے جن پر تم اپنے آپ کو پابند کرو، سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا دینا ہے (ایسا کھانا) جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا یا گردن (غلام) آزاد کرنا، پھر جو شخص یہ نہ کر پائے تو پھر تین دن کے روزے رکھنے ہیں، یہ تمہاری

قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ، اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے حکم بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر بجالاؤ"۔

قسم کے احکام

"لغو" ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جس پر کسی بھی قسم کے عملی آثار مرتب نہ ہوں، بے ہودہ قسم کا عمل۔ "اَیمان" یمین کی جمع ہے اور یمین قسم کو کہتے ہیں۔ قسم کو اس لیے یمین کہا گیا ہے کیونکہ انسان جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ طے کرلیتا ہے کہ میں فلاں شخص کے ساتھ فلاں معاملہ انجام دُوں گا تو قسم کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہیں۔ لغو اور بے ہودہ ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری رہتی ہیں۔

قسمیں دو قسم کی ہیں ایک قسم وہ ہے جو بات بات پر آدمی قسم اٹھالیتا ہے کہ فلاں کی قسم میں یہ کروں گا۔ قَسم کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان باقاعدہ اپنی زبان پر کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے یا کسی عہد کے ماننے پر قسم اٹھاتا ہے۔ مثلاً کہے کہ فلاں نیک عمل کو انجام دُوں گا یا فلاں برے عمل کو نہیں کروں گا تو یہ قسم لغو اور بے ہودہ نہیں ہے۔ یہ آیت کے مضمون سے منافات نہیں رکھتی کہ شارع مقدس نے فرمایا ہے کہ واللہ میں فلاں حرام کا مرتکب ہوں گا یا کہے واللہ فلاں واجب کو ترک کروں گا تو یہ بے ہودہ قسم ہے۔ اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا کیونکہ ہر وہ عمل جس کی قسم اٹھائی جاتی ہے پھر اس کو چھوڑنا جائز نہیں ہوتا اگر اسے چھوڑے گا تو پھر اس پر کفارہ عائد ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ میں حرام کا مرتکب نہیں ہوں گا تو حرام کا ارتکاب تو ویسے ہی گناہ ہے یا کسی واجب کو ترک کرنے کی قسم اٹھائے تو واجب کو ترک کرنا ویسے ہی جرم ہے تو یہ بے ہودہ قسم ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اس قسم

کی قسم کے لیے اللہ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اس طرح کی قسم کھانا کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو اللہ کی قسم میں فلاں کھانا کھلاؤں گا یہ لغو اور بے ہودہ قسم نہیں ہے۔

''تعقید'' عقد اور معاہدے میں مبالغہ کو کہتے ہیں اس طرح کی قسمیں صرف ان موارد میں جائز ہیں جو شریعت کی نگاہ میں جائز ہیں۔ اگر ایسی قسم کو توڑے گا تو اس کا کفارہ ہے۔ کفارہ انجام دی گئی برائی پر پردہ ڈالتا ہے یا اس گناہ کو محو کر دیتا ہے۔

قسم توڑنے کا کفارہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ تین چیزیں ہیں اور ان تین چیزوں کو لفظ ''او'' کے ذریعے عطف کر کے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک کفارہ ادا کرو، تینوں چیزیں اکٹھی واجب نہیں ہیں ان میں سے ایک کرلوگے تو کافی ہے۔ ان تینوں میں انسان کو اختیار ہے اور ان کے درمیان ترتیب بھی ضروری نہیں ہے کہ جب پہلے سے عاجز ہو تو دوسری چیز واجب ہے اور دوسری سے عاجز ہو تو تیسری واجب ہے، ایسا نہیں ہے۔ قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ یا دس مساکین کو کھانا کھلائے یا دس کو لباس پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے یا تین دن روزہ رکھے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ پہلا کفارہ ادا نہ کرسکے تو دوسرا ادا کرے۔ تین میں سے ایک عمل ہی کافی ہے۔ یہ بھی نہ کرے تو تین دن روزہ رکھ لے۔ یہ کفارہ ان قسموں کا ہے جو شرعاً جائز ہیں، لیکن ایسی قسمیں جو شرعاً جائز نہیں ہیں ان کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعے اپنے احکام اور قوانین بیان کرتا ہے تاکہ تم احکام کو یاد کرلو اور اللہ کے شکر گذار بندے بنو کہ اللہ تمہارے لیے اتنی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر سب شیطان کے گندے کام ہیں سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ"۔

شراب، جوا، بت اور فال کے تیر شیطانی کام

"خمر" ہر اس مائع کو کہتے ہیں جو مست کرنے والا ہے اور جس کے پینے سے انسان کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ رسول خداﷺ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ملعون ہے وہ شخص جو اس دستر خوان پر بیٹھے جس پر شراب پی جاتی ہے"۔ دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: "چار قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی نظر رحمت سے محروم رکھے گا: ا۔ عاق والدین۔ ۲۔ احسان جتانے والا۔ ۳۔ جھوٹا آدمی اور ۴۔ شرابی۔ شرابی قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا چہرہ سیاہ ہو گا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہوں گی، نیلی پڑ گئی ہوں گی اور سر جھکا ہو گا اور اس کے منہ سے بدبودار پانی جاری ہو گا اور اس کی زبان کو کھینچ کر پیچھے سے باندھ دیا گیا ہو گا۔

"میسر" یعنی قمار (جوا) اور اس کی جتنی اقسام ہیں یہ سب ہی گناہ ہیں۔ "انصاب" بتوں کو کہتے ہیں یا اس سے مراد وہ پتھر ہیں جو خانہ کعبہ کے گرد حیوانات کو ذبح کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ "ازلام" وہ لکڑیاں ہیں جو خاص طریقے سے بنائی جاتی تھیں اور ان کے ذریعے قرعہ نکالا جاتا تھا یا فال نکالی جاتی تھی اور یہ بھی جوا کھیلنے میں استعمال ہوتی تھیں۔ "رجس" ہر پلید چیز، نجس چیز جس سے انسان کی طبیعت اور مزاج روگردان ہو اور اس سے نفرت کرے۔ یہ سب اعمال شیطانی ہیں اور شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور وہ وسوسے ڈالتا ہے، دھوکہ دیتا ہے۔ شیطان انسان کے دل میں دھوکہ ڈالتا ہے، یہ چاہتا ہے کہ اسے اللہ کے راہ سے بھٹکائے اور نماز سے روکے اور لوگوں کے درمیان

ایسے مسائل پیدا کردے جس سے ان میں دشمنی پھیلے جو انسان کے لیے نقصان دہ عمل ہے۔ اس لیے ان اعمال سے منع کیا گیا ہے۔

معلوم ہے کہ ان مضرات (نقصان دینے والی چیزیں) کو بیان کرنے کے بعد ان سے روکنا یہ انسان کے فائدے میں ہے۔ اگر انسان ان کو قبول کرتا ہے تو یہ خود اس کے فائدے میں ہے۔ اور تاکید کی گئی ہے کہ یہ سب چیزیں چھوڑو، اس لیے چھوڑو تاکہ تم کامیاب ہو سکو کیونکہ اگر تم عملی طور پر ان چیزوں کو چھوڑ دوگے اور ان کو استعمال میں نہ لاؤگے اور ان سے جدا رہوگے تو تم کامیاب ہو جاؤگے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾

"شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تم میں دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے، سو اب بھی باز آجاؤ"۔

شیطان کی انسان سے دشمنی

''عَدَاوَةَ'' حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ مندمل ہونے اور جوڑنے کا متضاد ہے۔ اگر یہ لفظ قلب کے حوالے سے استعمال ہو تو دشمنی کے معنی میں ہوتا ہے۔ ''بَغْضَآءَ'' محبت کے مقابلے میں ہے جو دلی نفرت اور کینہ کو کہتے ہیں۔ شیطان شراب اور جوا کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالتا ہے اور تمہارے درمیان نفرتیں پیدا کرتا ہے۔ شراب خواری اور جوا بازی کے اثرات میں سے ان دو چیزوں کو اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شراب اور جوا برے اثرات کے اعتبار سے دونوں واضح ہیں۔ شراب نوشی سے

انسان کے دماغی اعصاب بھڑک جاتے ہیں، اس میں مستی آجاتی ہے، اور اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے عقل زائل ہو جاتی ہے، حیوانی شہوات کو تحرک ملتا ہے جس کی وجہ سے وہ زنا جیسے برے کاموں کا مرتکب ہو جاتا ہے، لوگوں کے مال پر ہاتھ ڈال دیتا ہے، ناموس پر ہاتھ ڈال دیتا ہے بعض دفعہ قتل کا بھی سبب بن جاتا ہے، دینی مقدسات کی ہتک حرمت کا مرتکب ہو جاتا ہے، اور سوسائٹی میں اجتماعی حدود کو توڑ ڈالتا ہے۔

قمار اور جوا میں شکست کھانے کی صورت میں جس چیز کو انسان نے طویل عرصے میں بڑی محنت اور کوشش سے کمایا ہے خواہ وہ مال ہو یا عزت اور آبرو، قلیل مدت میں کھو بیٹھتا ہے۔ اور اگر جوئے میں کامیاب ہوتا ہے تو یہی حرام مال جو بغیر زحمت اور مشقت کے اس کو مل جاتا ہے انحرافات کا سبب بنتا ہے اور صحیح راستے سے نکل جاتا ہے اور وہ مال صحیح راستے پر خرچ بھی نہیں کرتا کیونکہ حرام کا مال ہوتا ہے، اس سے سستی اور آوارہ گردی جیسی عادات آجاتی ہیں، فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس طرح مال کو ضائع کر دیتا ہے، پھر ہمیشہ مال کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے۔ جو قمار میں شکست کھاتا ہے وہ اپنی حیثیت کو گنوا بیٹھتا ہے اور جب پیسہ نہیں رہتا تو زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور مخالف سے بغض و کینہ رکھتا ہے اور ایک عمر اسی حسرت میں گزار دیتا ہے کہ کس طرح وہ سب کچھ واپس لائے جو جواء میں ہار بیٹھا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اللہ کی یاد بھلا دیتی ہیں اور انسان کے اندر سے خدا ترسی کو ختم کر دیتی ہیں۔انسان ان کی وجہ سے عبودیت اور بندگی کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ انسان کی خلقت کا اصلی ہدف اور مقصد ہی عبودیت اور بندگی ہے۔

اس آیت میں ''ذکر'' یاد کرنے کے معنی میں ہے جو نسیان، فراموشی اور بھول کے مقابلے میں آتا ہے۔ لہٰذا عدم ذکر اللہ یعنی اللہ کو یاد نہ رکھنا یا اس سے غفلت کرنا اور اس کو فراموش کرنا انسان کو عبودیت کے راستے سے خارج کر دیتا ہے۔ نماز کو علیحدہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے حالانکہ نماز بھی ایک لحاظ سے ذکر کا مصداق ہے کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کی یاد کا کامل

ترین نمونہ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کی تاکید کی ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ نماز دین کا ستون ہے۔

شراب اور جواء کے ان سارے مفاسد کو بیان کرنے کے بعد آخر میں استفہام انکاری کے ذریعے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کیا تم اس جرم سے ہاتھ نہیں اٹھاتے ہو؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں مسلمان ان دو عادتوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس نہی کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ فرمایا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے کہ ان دو افعال کے فوائد ان کے نقصانات سے زیادہ ہوں اور نتیجے میں یہ دو چیزیں تمہارے لیے مباح ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں چیزیں گناہ ہیں۔ ان کے نقصانات بہت زیادہ ہیں ان سے حاصل ہونے والے فوائد کی حیثیت نہیں لہٰذا تمہیں انہیں ترک کر دینا چاہیے۔ اللہ کا ذکر اور نماز پڑھو یہ تمہارے فائدے میں ہے۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

"اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور بچتے رہو، پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہی ہے"۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت

اس آیت میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے جو کچھ سابق آیت میں بیان ہوا ہے۔ اسی حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی بات کو مانو۔ سابقہ آیت میں کہا گیا کہ شراب اور جوا جیسے برے کاموں سے دوری اختیار کرو۔ کیونکہ قانون بنانے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کے امر کی اطاعت کرو اور دوسرے مرحلے میں اس

قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری رسول خدا ﷺ کی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ تیسرے مرحلے میں اس امر کی مخالفت سے ڈرایا گیا ہے۔ اس کے بعد اسی امر کی تاکید کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ جان لو اگر تم نے اس معاملے میں رسول خدا ﷺ کی مخالفت کی تو اس میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہے، کیونکہ ان کا کام تو صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہے اس کے سوا ان کی کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔ تمہارا اللہ اور اس کے رسول کے دستورات کی مخالفت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پروردگار عالم سے دشمنی کررہے ہو جس کی تمہیں سخت سزا ملے گی۔

لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اَحۡسَنُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۹۳﴾

”جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو پہلے کھا چکے ہیں (اس صورت میں کہ) جب پرہیزگار ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو پھر (مستقل مزاجی سے) پرہیزگار ہو گئے اور نیکی کرنے لگے، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے“۔

گناہ کے بعد نیک عمل

یہ آیت ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس عمل کا ارتکاب اتنا بڑا گناہ ہے تو جو مومنین اس عمل کے حرام ہونے سے پہلے اس کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کا کیا بنے گا؟ جیسے اگر کسی مومن نے شراب کے حرام ہونے سے پہلے شراب پی ہو۔ اس مقدر سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جو لوگ اس عمل کے حرام ہونے سے پہلے اس

کے مرتکب ہوئے ہیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ آیت میں تقویٰ کا تین دفعہ تکرار اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ یہاں پر تقویٰ سے اس کا اعلیٰ ترین درجہ مراد ہے۔

یہاں پر ''طعام'' سے کھانے پینے کی ساری چیزیں مراد ہیں یا ساری پاکیزہ چیزیں جو انسان کے لیے حلال ہیں یا اس سے نیکیاں مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ اور حرام چیزوں کو مومنین کے لیے بیان کیا ہے۔ آیت میں ذکر شدہ پہلے ایمان سے اجمالی ایمان مراد ہے یعنی ان چیزوں پر اجمالی ایمان لانا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے پہنچایا ہے۔ اور دوسرے ایمان سے تفصیلی ایمان مراد ہے، یعنی ان احکام میں سے ہر ایک حکم پر ایمان لانا جن کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابلاغ فرمایا ہے۔ اس طرح سے کہ ان میں سے کسی کو بھی رد یا انکار نہ کرے۔ ''احسان'' دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس کا ایک معنی یہ ہے کہ کسی کام کو اچھے طریقے سے انجام دیا جائے اس طرح کے انجام دینے میں کوئی بری نیت نہ ہو۔ احسان کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کوئی ایسا کام انجام دیا جائے جس کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچے، یہ ان کاموں میں سے ہے جن کو معاشرہ میں اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس آیت میں احسان کا پہلا معنی مراد ہے آدمی نیک کام کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور اس کے دستورات کے آگے تسلیم ہونے کی نسبت سے انجام دے اور اس کے عمل میں کسی بھی قسم کی بری نیت نہ ہو۔

اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ بہر حال ایمان لانے والے اور اعمال صالح انجام دینے والوں پر ان کے گذشتہ برے اعمال جیسے شراب نوشی اور دوسرے گناہوں کے ارتکاب کی کوئی حرج اور سزا و سرزنش نہیں ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ اپنے اعمال میں احسان کی بھی رعایت کریں، اور تمام واجبات کو انجام دیں اور تمام محرمات سے پرہیز کریں۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے اگر انہوں نے شراب کی حرمت کو بیان کرنے والی آیت کے نازل ہونے سے پہلے یا اس حکم کو سننے سے پہلے ایسا فعل انجام دیا ہو تو ان

پر کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے گذشتہ گناہوں سے چشم پوشی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نیک کام انجام دینے والوں سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ عقیدہ اور عمل دونوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

"اے ایمان والو! البتہ اللہ تمہیں آزمائے گا اس شکار کی چیز میں جس پر تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچیں گے تاکہ اللہ معلوم کرے کہ بن دیکھے اس سے کون ڈرتا ہے، پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

حج کے دوران شکار کے ذریعے لوگوں کا امتحان

اس آیت میں "بلاء" امتحان اور آزمائش کے معنی میں ہے۔ "لَيَبْلُوَنَّكُمْ" میں لام قَسم ہے اور ن میں "تشدید" تاکید کے لیے ہے، تاکید در تاکید یعنی ہر صورت میں اور حتمی طور پر ایمان لانے والوں کا شکار کے حوالے سے امتحان ہوگا۔ "بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ" شکار کا کچھ حصہ، اس کو چھوٹا اور معمولی شمار کیا ہے تاکہ مخاطب جن کو منع کرنے جا رہے ہیں ان کو یہ بات سمجھائی جائے کہ جس چیز سے تمہیں روکا گیا ہے وہ حقیر سی چیز ہے اور اس کا فائدہ معمولی سا ہے، اس سے ہاتھ اٹھا لیں۔ "تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ" جس پر تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچیں گے، اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لیتا ہے تاکہ پتہ چلے اور ہمارے لیے واضح کردے کہ کون ہے جو آخرت کے دردناک عذاب کا خوف رکھتے ہیں اور اسی نیت سے وہ اللہ کی منع کردہ چیزوں سے پرہیز کریں۔

اس آیت میں اس بات کا اشعار موجود ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس میں تحریم اور روکنے کا حکم بیان کیا جارہا ہے تو جو اللہ تعالیٰ کی طے شدہ حدود کو پھلانگے گا اور ان کا لحاظ نہیں کرے گا تو آخرت میں اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ جب ایک چیز سے منع کرتا ہے تو پھر اس سے رکنا چاہیے، اگر کوئی نہیں رکتا اور اللہ کی بیان کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اسے سزا ملے گی۔ یہاں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ حج یا عمرہ کے دوران احرام کی حالت میں شکار سے منع کیا گیا ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے، اس لیے اس حالت میں شکار نہیں کرنا چاہیے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

''اے ایمان والو! شکار کو نہ قتل کرو جب تم احرام میں ہو، اور تم میں سے جو کوئی اسے جان بوجھ کر مارے تو پھر بدلے میں اس مارے ہوئے کے برابر مویشی لازم ہے جو تم میں سے دو معتبر آدمی تجویز کریں بشرطیکہ قربانی کعبہ تک پہنچنے والی ہو یا کفارہ کا کھانا مسکینوں کو کھلانا ہو یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کام کا وبال چکھے، اللہ نے اس چیز کو معاف کیا جو گزر چکی، اور جو کوئی پھر کرے گا اللہ اس سے بدلہ لے گا، اور اللہ غالب بدلہ لینے والا ہے''۔

احرام کی حالت میں شکار کرنا

''حُرُم'' حرام کی جمع ہے جو رکاوٹ او منع کرنے کے معنی میں ہے؛ ہر وہ چیز جس سے روکا گیا ہے۔ جو شخص حج کے لیے جاتا ہے اور احرام باندھ کر کچھ موارد کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے تو ایسے شخص کو محرم کہتے ہیں۔ ''مِّثْل'' مانند و شبیہ کے معنی میں ہے۔ ''عَدْلٍ'' کی ع پر خواہ فتحہ ہو یا کسرہ، یہ لفظ مثل اور مانند کا معنی دیتا ہے۔ ''وَبَال'' یعنی نامطلوب بوجھ، ایسا بوجھ جو پسندیدہ نہیں ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ احرام کی حالت میں جان بوجھ کر شکار کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو خطاء کرے، بھول کی وجہ سے کرے تو وہ اس بحث میں شامل نہیں ہے۔ جو جان بوجھ کر شکار کرے اس پر کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ جس طرح کا جنگلی حیوان اس نے شکار کیا ہے اسی طرح کا پالتو جانور قربانی کرے۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ جو حیوان کفارہ کے طور پر دے رہا اسی کی طرح ہے جس کا شکار کیا ہے یا نہیں ہے تو یہ دو عادل اور دین دار مرد تشخیص دیں گے۔ اس حیوان کو اللہ کی راہ میں ''ھَدْی'' کی شکل میں قربانی کرنا ہوگا مکہ بھیجا جائے گا اور دستور کے مطابق خود مکہ میں یا منیٰ میں اسے ذبح کیا جائے گا۔

''اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا'' میں کفارہ کی دو اور خصلتیں بیان ہوئی ہیں۔ جب کوئی حرم میں شکار کرے تو اس شکار کے کفارہ میں یہ تین خصلتیں ترتیب کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر ممکن ہے تو حیوان کی قربانی دے، اسی طرح کا حیوان جس طرح کا اس نے شکار کیا تھا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو فقراء و مساکین کو کھانا کھلائے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اتنی مقدار میں روزہ رکھے۔ کفارہ دینا بھی سزاؤں کی قسموں میں سے ایک قسم ہے کیونکہ اللہ فرما رہا ہے یہ کفارہ اس لیے ہے تاکہ مجرم اس عمل کی سختی اور سنگینی کا ذائقہ چکھ

لے۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے آنے سے پہلے کیے جانے والے شکار کے متعلق تم سے در گزر کیا ہے اور حرمت کے حکم کے آنے کے بعد جو دوبارہ اس عمل کا ارتکاب کرے گا، کفارہ کے بعد پھر تکرار کرے گا تو کفارہ اس کے عمل کی تلافی تلافی نہیں کر سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ عذاب سے اس جرم کا بدلہ لے گا۔ کیونکہ خداوند مقتدر، شکست ناپذیر اور انتقام لینے والا ہے اور کوئی نہیں جو اللہ کو اس کے عمل سے روکے یا اللہ تعالیٰ کسی کو سزا دینا چاہے تو اس کی سزا کے آگے رکاوٹ بنے۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

''تمہارے لیے دریا کا شکار کرنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے، اور تم پر جنگل کا شکار کرنا حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام میں ہو، اور اس اللہ سے ڈرو جس کی طرف جمع کیے جاؤ گے''۔

احرام کی حالت میں حلال شکار

یہ آیت حیوانات کے شکار کرنے کا حکم بیان کر رہی ہے۔ شکار دو قسم کے ہیں، ایک دریائی شکار ہے دوسرا صحرائی شکار ہے۔ اس آیت میں ان کے کھانے کا حکم بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ شکار کرنے کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔ سمندری حیوانات کا شکار تمہارے لیے حلال ہے اور دریائی حیوانات کو کھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد احسان چڑھاتے ہوئے فرمایا حالت احرام میں تم ہو تب بھی حلال ہے اور اُن کے علاوہ جو اور راہگزر ہیں ان کے لیے بھی حلال ہے۔ لیکن جب تک تم احرام کی حالت میں ہو تو خشکی کے حیوانات، صحرائی حیوانات تمہارے لیے حرام ہیں۔

پس اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کی پابندی کرو، تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ تم نے ایک دن محشر کے میدان میں اللہ کے حضور نے آنا ہے، وہاں تمہارے سارے اعمال کا احتساب ہوگا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآىِٕدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

"اللہ نے کعبہ کو جو کہ بزرگی والا گھر ہے لوگوں کے لیے قیام کا باعث کر دیا ہے اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں قربانی والے جانور کو بھی اور وہ جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر کعبہ کو لے جائیں، یہ اس لیے ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ کو معلوم ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔

کعبہ بزرگی والا گھر

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو اس لیے حرم امن قرار دیا ہے اور لوگوں کو ماہ حرام یعنی ذوالحجہ، ذوالقعدہ میں نشان والی قربانیاں اپنے ساتھ لے کر مکہ جانے کا حکم دیا ہے تاکہ کعبہ کو اجتماعی سعادت مندانہ زندگی کا اہم مرکز بنایا جائے اور اسے لوگوں کے لیے قبلہ گاہ بنایا ہے تاکہ لوگ اپنے دل کو بھی اس طرف متوجہ کریں اور اپنے چہرے کو بھی اس کی طرف متوجہ کریں اور اپنے اموال کا منہ بھی اس طرف کریں اور اپنی قربانیوں کا بھی؛ بہر حال اس کا احترام کریں۔ اور جمعیت واحدہ تشکیل دے کر اپنے دین کو زندہ کریں اور اپنے اجتماع کو پائیدار بنائیں۔

کعبہ لوگوں کے لیے سکون ہے اور اعتماد کرنے کی جگہ ہے کیونکہ ان کے دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ حرام مہینوں میں جنگ کو حرام قرار دیا ہے، تاکہ ان مہینوں میں ان

کی جان، مال اور عزت و آبرو دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے۔ یہ اس لیے تھا کہ ان کے دل ایک دوسرے کے قریب ہوں، دشمنوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کی پشت بانی کریں، مدد کریں۔ یہ ساری چیزیں اس لیے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو کہ اللہ ہی مالک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس سے آگاہ ہے اور اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جو احکام قرار دیتا ہے تو ان میں تمہارے ہی مفادات کو مد نظر رکھتا ہے، کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ احکام بے ہودہ اور خرافات ہیں۔ ایسا نہیں ہے ہر حکم کے پیچھے ایک فلسفہ ہے جس سے ہر بندہ آگاہ نہیں ہے، اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ ہی آگاہ ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

"ان لو کہ بے شک اللہ سخت عذاب والا بھی ہے اور بے شک اللہ بخشنے والا مہربان بھی ہے"۔

اللہ کی صفات

اس آیت میں پچھلی آیت میں بیان شدہ احکام کی تاکید کی گئی ہے اور ان کی مخالفت سے ڈرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی مخالفت پر سزا ہو گی اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس آیت کے پہلے جملے میں نافرمانی کرنے والوں کے لیے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ اور دوسرے جملے میں فرمانبردار اور مطیع لوگوں کے لیے مغفرت اور رحمت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس آیت میں تہدید اور دھمکی کا اشارہ موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کی شدت کی صفت کو رحمت اور مغفرت سے پہلے ذکر کیا ہے۔ اللہ کی تین صفات کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ 1: شدید العقاب؛ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے جو اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں انکے لیے سزا دینے کی بات ہے۔ 3،2: غفور، رحیم؛ اللہ بخشنے والا مہربان ہے یہ دو صفات گناہوں کی معافی ملنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ اللہ اطاعت کرنے والوں پر مہربان ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

"رسول کے ذمہ سوائے پہنچانے کے اور کچھ نہیں، اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو"۔

رسول کی ذمہ داری

یہ آیت بھی پچھلی آیت کے مطالب کا تسلسل ہے جس میں ان لوگوں کی سرزنش کی گئی ہے جو دستورات الٰہی کی اطاعت نہیں کرتے۔ اس میں ڈرایا دھمکایا گیا ہے اور عذاب کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ الٰہی احکام کی مخالفت کریں تو اس کا نقصان اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا کام تو بات پہنچا دینا ہے اور انہوں نے پہنچایا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ انسانوں کے سارے اعمال سے واقف ہے چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، اللہ سے تو کچھ مخفی نہیں ہے۔ یہ بیان نافرمانوں کو تنبیہ کے لیے ہے کہ تمہاری نافرمانی کا نقصان خود تمہیں ہوگا۔ رسولؐ کا کام تو تھا کہ وہ بات کو پہنچا دیں تو انہوں نے ایسا کر دیا اب اگر کوئی شخص پیغام سننے کے بعد اسکے مطابق عمل نہ کرے گا تو پھر خود اسے اس کا نقصان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال سے آگاہ ہے اس پر کچھ بھی پوشیدہ نہ ہے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"کہہ دو کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں اگرچہ تمہیں ناپاک کی کثرت متاثر کرتی ہو، پس اے عقلمندو! اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہاری نجات ہو"۔

پاک اور ناپاک برابر نہیں

یہاں پر ایک فطری امر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فطرت کہتی ہے کہ پاکیزہ اور صاف ستھرے لوگ اور ناپاک اور گندے لوگ برابر نہیں ہیں۔ ناپاک اور نجس لوگ اگر چہ تعداد کے لحاظ سے پاک لوگوں سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں وہ طیب اور طاہر لوگوں سے بہتر نہیں ہو سکتے۔ پاکیزگی اور پلیدی، پاکی اور ناپاکی دو حقیقی وصف اور دو خارجی حقیقتیں ہیں۔ یہ دونوں اعتباریات میں مجازی طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ تقویٰ کا تعلق الٰہی شرائع سے ہے اس لیے طیب اور خبیث کا تعلق تکوینی چیزوں سے ہے۔ کچھ چیزیں طیبات سے ہیں کچھ خباثات سے ہیں۔ اللہ کا دین طیب اور پاکیزہ زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسان فطری طور پر پاکیزگی کی طرف مائل ہے اور ناپاکی سے گریزاں ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو چیزیں حلال کی ہیں وہ سب طیبات ہیں اور جو خبائث ہیں انہی کو حرام قرار دیا ہے۔

پس دینی قواعد، کائنات کی تمام چیزوں کی تکوینی صفات ہیں۔ عقل مند انسان فطرتاً پاکیزگی سے محبت کرتا ہے اور ناپاکی سے گریزاں رہتا ہے لہٰذا عقلمندوں کو چاہیے کہ اللہ کی شریعت اور قوانین پر عمل کر کے خداوند تبارک و تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کریں اور دُنیا و آخرت کی سعادت کو پہنچیں، عقلمند انسان فطرت کے تقاضوں کے مطابق جانتا ہے کہ پاک ناپاک سے بہتر ہے اور اپنی زندگی کو خیر کے تحت گزارے اور شر پر ترجیح دے اور برائی کی طرف مائل نہ ہو۔ خداوند تبارک و تعالیٰ کا تقویٰ اپنائے، اللہ کے راستے پر چلے، اگرچہ اسے یہ لگے کہ جو منحرف ہو چکے ہیں جو دھوکہ کھا چکے ہیں جو غفلت میں ہیں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کی زیادہ تعداد عقلمند انسان کو متاثر نہیں کر سکتی، اسے چاہیے کہ وہ اس زیادہ تعداد کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے، فلاح اور کامیابی کی اُمید ان لوگوں کے لیے ہے جو طہارت اور پاکیزگی کے خواہاں ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ
تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ
غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

''اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں، اور اگر یہ باتیں ایسے وقت میں پوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی، گذشتہ سوالات اللہ نے معاف کر دیے ہیں، اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے''۔

بعض چیزوں کے متعلق سوال کرنے سے منع

یہ آیت مومنوں کو بہت ساری چیزوں کے بارے میں ٹوہ میں لگے رہنے سے منع کر رہی ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا سوال نہ کریں جس کا جواب اگر ان پر ظاہر ہو جائے تو ان کی ناراحتی کا سبب بنے اور ان کو اس سوال کا جواب سن کر تکلیف ہو۔ اگرچہ اس آیت کے مخاطب وہ مومنین ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے، اوران کو خاص سوالات سے منع کیا گیا ہے لیکن آیت میں سوال کرنے سے منع کرنے کی جو وجہ بتائی گئی ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ سوال ہے جو مقصد سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ نتیجے میں ہر اس چیز کے بارے سوال کرنا جس کی آگاہی کے عام اسباب کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بند کیا ہوا ہے تو ان چیزوں کے بارے سوال کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنی موت کے وقت کے بارے میں یا دوستوں اور رشتہ داروں کی موت کے متعلق سوال کرے یا حکومت اور عزت وآبرو کے زائل ہونے کے بارے سوال کرے تو یہ ہمیشہ ہلاکتاور بدبختی کا

موجب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسی قسم کی جستجو اور اسی قسم کے مطالب جاننے کے لیے ٹوہ میں رہنا ہلاکت اور بد بختی لے آئے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے خلقت کے نظام کی بنیاد حکمت پر رکھی ہے اور اسی کے کچھ امور کو آدمیوں پر آشکار کیا ہے اور کچھ امور کو ان سے مخفی رکھا ہے۔ مخفی امور کو آشکار کرنے کی جستجو میں پڑنا نظام کو درہم برہم کرنے کا سبب ہوگا۔ اسی لیے اس آیت میں ایسے امور کے بارے سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ مومنین سے کہہ رہا ہے کہ اے مومنو! رسول اللہ ﷺ سے ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جن کے متعلق شریعت خاموش ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے عفو کی رو سے اور بندوں کی آسانی کے لیے اور اس وجہ سے کہ ان پر زیادہ بوجھ نہ پڑے، ان باتوں کو مخفی رکھا ہے تو تم ان کے بارے میں مت پوچھو۔ کیونکہ قرآن کے نزول کے وقت تم بعض چیزوں کے بارے سوال کروگے تو یہ سبب ہو جائے گا کہ ان کا جواب دیا جائے اور ہو سکتا ہے یہ تمہارے غم اور بے آرامی کا سبب بنے۔ اسی لیے ''وَاِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَـكُمۡ'' والا جملہ پہلی والی نہی کی تکمیل کر رہا ہے۔ یہ جملہ قرآن کی آیات پوری ہونے سے پہلے سوال کرنے کی نہی کو ختم نہیں کر رہا ہے۔ ''عفا اللہ عنہا'' میں سوال کرنے سے منع کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اگر خدا نے تمہیں بے فائدہ سوالات کرنے سے منع کیا ہے تو یہ رحمت، عفو اور مغفرت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ خدا معاف کرنے والا اور بردبار ہے۔ للذا مومنین اس سے فائدہ اٹھائیں اور خود کو غیر ضروری سوالات پوچھنے سے بچائے رکھیں۔

قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾

''ایسی باتیں تم سے پہلے ایک جماعت پوچھ چکی ہے پھر ان باتوں کے وہ مخالف ہو گئے''۔

یہودیوں کے بے ہدف سوالات

یہاں پر یہ بتایا جارہا ہے کہ تم سے پہلے بھی ایک قوم تھی جو اس قسم کے سوال کرتے تھے۔ اسقوم سے یہود مراد ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے گائے ذبح کرنے کا کہا تو انہوں نے گائے کے متعلق مختلف قسم کے سوال کرنا شروع کر دیئے، آخر کار ان کے لیے ایک ایسا جواب آگیا کہ پھر اس کے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ "ثم" حرف عطف ہے جو معطوف کے معطوف علیہ سے مؤخر ہونے کو بیان کررہا ہوتا ہے وہ لوگ سوال تو کر بیٹھے لیکن جب کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس سوال کا جواب آگیا تو اس بات کے مخالف ہو گئے اور احکام خدا کا انکار کر بیٹھے۔

اس آیت کے انداز سے لگ رہا ہے کہ یہ آیت ان موارد کو بیان کررہی ہے جن میں احکام کے متعلق سوال ہوں، احکام کی شرائط اور قیود کے متعلق سوال ہوں، کیونکہ اس طرح کے سوالات دین میں زیادہ دشواریوں کا سبب بن جائیں گے، جس کے نتیجے میں لوگ دین سے گریزاں ہو جائیں گے اور یہی احکام کفر کا سبب بن جائیں گے۔ اگرچہ قرآن میں اس قوم کا نام نہیں لیا گیا لیکن قرآن کی داستانوں اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ یہودیوں کے متعلق ہے۔ جیسے نصاریٰ کا دستر خوان اور یہود کا گائے کے متعلق سوال کرنا یا دوسری اقوام جو اس قسم کے سوال کرتے رہے اور پھر جب ان کے جواب آئے تو ان کے جوابات پر انہیں تکلیف ہوئی اور وہ کفر کر بیٹھے۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ تم سابقہ اقوام جیسے نہ بنو۔ انکے حالات سے عبرت حاصل کرو۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اللہ نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام مقرر نہیں کیے، لیکن کافر اللہ پر بہتان باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں"۔

زمانہ جاہلیت کے مقدس حیوانات

زمانہ جاہلیت کے لوگ ان چار قسم کے حیوانات کے احترام کے قائل تھے۔ اسی لیے انہوں نے ان کے لیے خاص احکام بنا رکھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یہ احکام ہماری طرف سے نہیں ہیں۔

''بحیرہ'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو پانچ بچے جن چکی ہو، اگر اس کا پانچواں بچہ نر ہوتا تو اس اونٹ کے بچے کے کانوں میں سوراخ کر دیتے تھے اور اس پر سوار نہیں ہوتے تھے، اسے ذبح بھی نہیں کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے، جہاں سے مرضی پانی پیئے جو گھاس جہاں سے مرضی آئے کھائے اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

''سائبہ'' ایسے اونٹ کو کہا جاتا ہے جن کو وہ نذر کرتے تھے اور بحیرہ کی مانند اس سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان اونٹوں کو وہ بتوں کی رضا اور خوشنودی کے لیے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور اُن سے جو بھی منفعت حاصل ہوتی تھی اسے فقراء میں خرچ کرتے تھے۔

''وصیلہ'' ایسی بھیڑ کو کہتے تھے جو اگر مادہ جنے تو اسے اپنے پاس رکھتے اور اگر وہ نر جنتی تو اسے بتوں کے لیے وقف کر دیتے۔ اگر نر اور مادہ جڑواں ہوتے تو دونوں کو اپنے لیے رکھ لیتے اور کہتے کہ مادہ اپنے بھائی کے ساتھ متصل ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ وصیلہ اس بکری کو کہتے جس نے سات دفعہ بچے جنے ہوں اور ساتواں بچہ نر ہو تو اسے اللہ کی راہ میں ذبح کرتے تھے اور اس کا گوشت مردوں کے لے حلال ہوتا اور اگر ساتواں مادہ ہوتا تو اسے گوسفندوں میں داخل کر دیتے اور ذبح نہیں کرتے تھے۔ اگر جڑواں ہوتے تو کسی ایک کو بھی ذبح نہیں کرتے۔

''حام'' سے ایسی اونٹنی مراد ہے جو ایک اونٹ کے نطفہ سے دس بچے جن چکی ہو، وہ اس اونٹنی کو مبارک خیال کرتے تھے اور اس کی پیٹھ کو بھی محترم جانتے تھے اور اس پر بوجھ نہیں لادتے تھے اور اس پر سوار بھی نہیں ہوتے تھے اور کسی بھی پانی یا گھاس سے اسے منع نہیں کرتے تھے۔

بعض کے نزدیک ''حام'' سے ایسا نر اونٹ مراد ہے جو اس وقت تک زندہ رہے جب اس کی جنی ہوئی اونٹنی بھی زندہ رہے اور وہ اس اونٹنی پر یہ سوار ہو کر اسے حاملہ کرے، زمانہ جاہلیت میں اس اونٹ کو محترم شمار کیا جاتا تھا۔

بہر حال اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ کون سے احکام اور قوانین محترم ہیں اور کون سے محترم نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اس قسم کے خرافاتی احکام جہالت کا نتیجہ ہیں اور ان کو کفار نے وضع خود کیا ہے اور ان کو اللہ کی جانب جھوٹی نسبت دی ہے۔ ان احکام کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے۔ ان کا اختلاف بھی ان کی نادانی اور جہالت کا ثبوت ہے اور بہت ساروں نے نادانی اور جہالت کی وجہ سے ان احکام کی پیروی کی جو ان کے سربراہ اور پیشواوں نے دشمنی کی بناء پر حق کو جانتے ہوئے خدا پر افتراء باندھا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ علم رکھتے ہوں نہ انہوں نے ہدایت پائی ہو''۔

جاہلوں کی تقلید قبیح عمل

رسول اللہ ﷺ کا کام اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ رسول ﷺ کی پوری دعوت حق ہے اور آپؐ کی دعوت سوائے حق اور صداقت کے اور کچھ نہیں۔ حق ایسی سچائی کو کہتے ہیں جس میں کسی قسم کے جھوٹ کا نہ ہو۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں کا دعویٰ جھوٹ اور جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس بنا پر حتمی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت بعینہٖ سچائی ہے، علم اور حق ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور آپ کی فرمائش کو رد کیا اور اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جاہل کی تقلید صحیح نہیں ہے، جاہل عالم سے پوچھے تو وہ صحیح ہے، جاہل عالم کی پیروی کرے تو صحیح ہے، لیکن ایک جاہل کا دوسرے جاہل کی پیروی کرنا باطل اور قابل مذمت ہے۔ عقلاء اس کی قسم کی تقلید کو قبول نہیں کرتے۔ عقل کہتی ہے مسائل جاننے کے لیے جاہل کا جاہل کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ روش حقیقت میں ایسے راستے کو طے کرنا ہے جو خطرات سے پُر ہے۔ انسانی زندگی کی سنت اور طریقہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان ایسے راستے پر چلے جو خطرے سے محفوظ نہ ہو۔

یہ جو فرمایا ''وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾'' یہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ہے بجائے اس کے کہ فرماتے جاہل کا اپنے جیسے جاہل کی تقلید کرنا قابل مذمت ہے، یہی انداز اپنایا اور کہا ہے کہ وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر جس کی تقلید کی جارہی ہے وہ حقیقتاً جاہل ہو تو اس اور اس کی تقلید کرنے والوں میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا دونوں ایک جیسے ہی ہیں تو یہ پھر اس سے کیوں پوچھتے۔ اگر مقلد جاہل ہے تو اسے راہنما چاہیے، ایک ایسا شخص چاہیے جو عالِم ہو تو ایسے جاہل کا عالم کی پیروی کرنا تو برا نہیں ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ ان کے آباء و اجداد فقط جاہل ہی نہیں بلکہ انہوں نے ہدایت بھی حاصل نہیں کی لہٰذا ان کی تقلید کسی بھی حوالے سے جائز نہیں ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

"اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہو جب کہ تم ہدایت یافتہ ہو، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں بتلا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے"۔

اے اہل ایمان! اپنے بارے مراقب رہو

یعنی اپنے بارے مراقب رہو، اپنے اوپر نظر رکھو تاکہ جس روش پر چل رہے ہو اس کی وجہ سے گمراہ نہ ہو جاؤ۔ مومن ایسے طریقے اور روش پر چل رہا ہوتا ہے جو اس کو پروردگار تک پہنچاتا ہے اور یہی طریقہ ہی ہدایت اور سعادت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر تم اس روش اور طریقے پر قائم رہو گے تو تمہیں ہدایت نصیب ہو گی اور ایسی صورت میں گمراہوں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ کیونکہ ہدایت اور گمراہی دونوں کسی راستے پر چلنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں اگر وہ ہدایت کا راستہ ہو تو آپ خدا تک پہنچیں گے اور اگر جس راستے پر تم چل رہے ہیں وہ گمراہی کا راستہ ہو تب بھی آخرت میں خدا تک جاؤ گے لیکن گمراہی کی حالت میں۔ کیونکہ غائیت اور اختتام اسی ذات پر ہے۔

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ایسے راستے پر چلے جو رستگاری اور کامیابی کا راستہ ہے۔ اگر وہ گمراہی کے راستے پر چلے گا تو اس کا نقصان اور خسارہ خود اسی کو ہو گا۔ لہٰذا مومن پر واجب ہے کہ وہ اپنے نفس کو اہم امور میں مشغول رکھے اور دین سے متمسک رہے اور اہل ضلالت جو گمراہ لوگوں سے منہ موڑے اور ان کے گروہ سے نہ بنے اور انکی گمراہی سے گھبرائے بھی نہیں۔ لوگوں میں گناہوں کا عام ہونا اور لوگوں کا گمراہ ہونا اسے حق سے بھٹکا نہ دے، اس وجہ سے اس کے قدم نہ ڈگمائیں، لوگوں کے برے اعمال اسے اپنی طرف نہ کھینچیں کیونکہ

حق، حق ہے۔ اگر لوگ اس کو چھوڑ دیں تو اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ باطل باطل ہے اگرچہ لوگوں کی اکثریت اس پر عمل پیرا ہو۔ لہٰذا باطل کو اپنے سے دور کر دے چاہے وہ دونوں ہاتھوں سے آکر اس کے ساتھ چپک ہی کیوں نہ جائے۔ مومن کو گمراہ لوگوں کی باتوں پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آج کی دُنیا میں روحانیت اور معنویات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور آج کے حالات اور ماحول اجازت نہیں دیتے کہ انسان ادیان کا پابند ہو۔ مومن پر واجب ہے کہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور ہدایت کے وسائل کو استعمال میں لے آئے اور اس کا نتیجہ اللہ کے سپرد کر دے کیونکہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

مومن کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ لوگوں کو ہلاکت سے نجات دلانے کے لیے خود کو ہلاکت میں ڈال دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کسی دوسرے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی کو دوسرے کا وکیل بنایا ہے۔ البتہ یہ بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کی منافی نہیں ہے۔ اس آیت کے آخر میں انسان کے انتہائی اہم مقصد کو پیش کیا گیا ہے کہ تم سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہے کیونکہ انسان کا منتہیٰ، انسان کا آخری نقطہ، انسان کا انجام، اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان کا منتہیٰ اور جو چیز اس کا انجام ہے وہ نفسانی احوال اور اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ اور نفسانی احوال اور اخلاقیات انسانی اعمال پر قائم ہے۔

اس بنا پر انسان کے اعمال صالح یا فاسد، تقویٰ یا فسق و فجور پر تقسیم ہوتے ہیں۔ انسان جس وقت متوجہ ہوگا کہ اس سے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے تو وہ اپنے تمام اعمال پر نظر رکھے گا، جتنے بھی اعمال ہیں اس کی کیا نسبت ہے تو وہ اپنے آپ کو غیر خدا سے جدا کر لے گا۔ جس کے نتیجے میں اس کے نفس کے سامنے موجود پردوں کو اللہ تعالیٰ ہٹا دے گا۔ صرف پروردگار ہی قادر ہے کہ سارے پردوں کو ہٹائے۔ جو خدا اس کے پیچھے اور اس کے سامنے سے رکاوٹیں دُور کرتا ہے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ اسے ہدایت کے وسائل مہیا کر دے اس

صورت میں وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کا مونس اور غم خوار اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یہ جو فرمایا ''اِلَی اللهِ مَرْجِعُكُمْ ''اسی معنی کو سمجھتا ہے۔ جب نفس میں ادراک اور شعور آجاتا ہے اور نفس شرک سے عبودیت کے وطن میں آجاتا ہے۔ توحید کے مقام کی جانب ہجرت کر لیتا ہے اس کے حال میں الٰہی عنایت شامل ہو جائے تو پھر شرک اور وہمیات کا عقیدہ ختم ہو جاتا ہے پھر خدا سے دُور نہیں رہتا، تکبر نہیں ہوتا۔ تکبر شیطان سے ہے اور یہ فرضی و خیالی استغناء ہوتا ہے۔ اس کے خیالات ایک کے بعد دوسرا توحید کی طرف پلٹتے ہیں، حقائق کا ادراک ہوتا ہے جیسے ہی حقائق کا ادراک ہوتا ہے تو خدا کے قریب ہو جاتا ہے، اس میں رحمانی تواضع و انکساری آجاتی ہے، فقر اور احتیاج اس کے سامنے ہوتے ہیں کہ یہ محتاج محض ہے۔

یہ ساری چیزیں عبودیت میں بدل جاتی ہیں کہ وہ اللہ کا عبدِ محض ہے۔ اگرچہ اس لحاظ سے کہ ہم مادی موجودات اور خاک نشین ہیں ہمان حقائق کو اس طرح درک نہیں کر سکتے جس طرح ادراک کرنا چاہیے، لیکن تدبر، دقت، گہرائی ہمیں ان حقائق کی کلیات کی تصدیق کی راہنمائی دیتی ہے پس حقیقت تک پہنچنے کا راستہ وہی نفس ہے۔ شیعہ سنی حدیثی منابع میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے اپنی ذات کو پہچان لیا تو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا'' یعنی جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اللہ کو پہچان لیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ

الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

"اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے تو وصیت کے وقت تمہارے درمیان تم میں سے دو معتبر آدمی گواہ ہونے چاہئیں، یا پھر غیروں میں سے دو گواہ ہوں اگر زمین میں سفر کرتے وقت تمہیں موت کی مصیبت آ پہنچے، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان دونوں کو نماز کے بعد کھڑا کرو کہ وہ دونوں اللہ کی قسمیں کھائیں کہ ہم گواہی کے بدلے میں مال نہیں لیتے اگرچہ رشتہ داری ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہم اللہ کی گواہی چھپاتے ہیں ورنہ ہم بے شک گناہگار ہوں گے"۔

وصیت کے متعلق سچی گواہی دینے کا حکم

اس آیت میں خطاب مومنوں کو ہے اور یہ حکم بھی مومنوں سے خاص ہے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی سفر میں ہو اور احساس کرے کہ اس کی موت کا وقت آگیا ہے اور کوئی وصیت کرنا چاہتا ہے تو وصیت کے وقت مسلمانوں سے دو گواہ لے لے، اگر مسلمان نہ ملیں تو یہود و نصاریٰ سے گواہ لے لے۔ اگر اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ اس وصیت کو قبول نہ کریں اور ان کی گواہی کے بارے میں شک کریں تو پھر ان گواہوں کو لے آئیں اور نماز کے بعد ان سے قسم اٹھوائیں کہ جو گواہی دے رہے ہیں وہ سچ ہے ، تاکہ جھگڑا ختم ہو۔ وہ اس طریقے سے قسم اٹھائیں گے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس میں کوئی مادی منفعت ہمارے مد نظر نہیں تھی۔ اگرچہ وصی ہمارے رشتہ داروں سے ہی کیوں نہ ہو۔ گواہی کے ذریعہ مادی فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ گواہ مادی اغراض کے لیے اپنی گواہی کو تبدیل کرکے اسے کم قیمت اور بے حیثیت چیزوں کے عوض بیچ دے اور اس کے ذریعے کوئی

منفعت حاصل کرنا چاہتا ہو جیسے مال حاصل کرنا چاہتا ہے یا کوئی عہدہ چاہتا ہے یا رشتہ داروں کے احساسات کو قانع کرنا چاہتا ہے۔اس لیے گواہی دیتے وقت وہ کہیں کہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم خلاف واقع شہادت اور گواہی نہیں دیتے کیونکہ گواہی دینا حقیقت میں اللہ کا حق ہے، لیکن اس نے یہ حق اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمایا ہے تو ان پر واجب ہے کہ جیسا ہے ویسی گواہی دیں اور اس میں کوئی تحریف نہ کریں و گرنہ وہ گناہگار ہوں گے اور ان کو عذاب دیا جائے گا۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

”پھر اگر اس بات کی اطلاع ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مستحق ہوئے تو ان کی جگہ ان میں سے دو گواہ کھڑے ہوں جن کا حق دبایا گیا ہے، پھر اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی، ورنہ ہم بے شک ظالموں میں سے ہوں گے“۔

گواہی کے غلط ہونے کا علم

اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ جو اہل کتاب گواہ تھے انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور خیانت کی ہے اور اس وجہ سے گناہگار ہیں تو اس صورت میں میت کے اولیاء ان کے خلاف جنہوں نے جھوٹ بولا ہے دو عادل گواہ لائیں گے اور وارثان کے گواہ قسم اٹھا کر کہیں گے کہ ان گواہوں نے جھوٹ بولا ہے اور ہم ان کے جھوٹ اور خیانت پر گواہی دیتے ہیں۔ ہماری گواہی ان کی جھوٹی گواہی سے حق کے قریب تر ہے۔ ہم وصیت کے

متعلق ان کیجھوٹی گواہی کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور ہم نے حق سے تجاوز نہیں کیا ہے اور نہ ہی ظلم کیا ہے اگر ایسا کریں تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔اس طرح اس غلط گواہی کا ازالہ کیا جائے گا۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

”یہ اس بات کے زیادہ قریب کہ یہ لوگ ٹھیک طور پر گواہی دیں گے، یا یہ اس بات سے ڈر جائیں گے کہ قسمیں ان کی قسموں کے بعد رد کی جائیں گی، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو، اور اللہ نافرمانوں کو سیدھی راہ پر نہیں چلاتا“۔

صحیح گواہی دینے کا اہتمام

یہ آیت اس قانون کی حکمت بیان کر رہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ مختصر ترین راستہ ہے اور احتیاط کے مطابق ہے تاکہ گواہی دینے والے گواہی دینے میں زیادتی نہ کریں اور اس بات سے ڈریں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر ہم نے غلط گواہی دی تو ہماری یہ گواہی قبول نہیں ہو گی۔ کیونکہ انسان نفسانی خواہشات کا پجاری ہے اور ہمیشہ وہ اپنے نفع اور فائدے کا سوچتا ہے لیکن جب وہ کوئی رکاوٹ دیکھے تو پھر اس زیادتی سے رک جاتا ہے۔اس لیے یہ تنبیہ ہے کیونکہ ایک دفعہ برے کام کی سزا ہوتی ہے اور ایک دفعہ برے کام پر رسوا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔

نفسیاتی طور پر انسان گھبراتا ہے کہ میں رسوا ہو جاؤں گا اور یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے نفسیاتی طور پر کہ جس کا اللہ پر ایمان ہے اور سب بندوں نے اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور سب کے اعمال کا حساب ہونا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ ہونا ہے، نیک عمل کا ثواب بھی اسی

کے ہاتھ میں ہے اور برے عمل کی سزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وصیت کے مسئلہ میں حقیقت اگر چھپی ہے مجہول ہے تو اس کو کشف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسا کام کریں جس سے گواہوں کی گواہی کی سچائی کے بارے میں اطمینان ہو اس کے لیے ان کے باطنی ایمان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ کی قسم اٹھائیں۔ جب معلوم ہو جائے کہ انہوں نے دھوکہ کیا ہے، خیانت کی ہے تو قسم میت کے ورثاء کی طرف پلٹا دی جائے گی کہ وہ گواہوں کی خیانت کے بارے میں قسم اٹھائیں۔ جب دو گواہ قسم اٹھائیں اور ان کی قسم رد ہو جائے تو میت کے ورثاء قسم اٹھائیں تو یہ ایک ذریعہ ہے کہ گواہوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ہمیشہ سچ بولیں۔ یہ ان کو انحراف سے بچانے کا بہترین مانع اور رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ آخر میں انسانوں کو موعظہ اور نصیحت کرتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کے احکام پر پوری توجہ دو، اللہ فاسقین کو بالکل معافی نہیں دے گا اور انہوں نے جن ذمہ داریوں سے فرار کیا ہے ان کو سزا دے گا۔ اللہ گمراہوں اور گناہگاروں کو کبھی بھی ہدایت نہیں دے گا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝١٠٩

”جس دن اللہ سب پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر کہے گا کہ تمہیں (اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیا گیا تھا، وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں، تو ہی چھپی باتوں کا جاننے والا ہے“۔

قیامت کے دن اللہ کا پیغمبروں سے سوال

یعنی قیامت کا دن ہو گا، سارے پیغمبر اللہ کے حضور پیش ہوں گے اور ہر ایک نبی اپنی اُمت پر گواہ ہو گا اور وہ گواہوں میں سے بہترین گواہ ہیں۔ ان سے گواہی طلب کی جائے گی اور

پوچھا جائے گا کہاں لوگوں نے کس طرح اور کس حالت میں تمہاری دعوت کو قبول کیا؟ اس وقت انبیاء جو ان لوگوں کے اعمال سے سب سے زیادہ واقف ہیں، پروردگار کی طرف سے اپنی اُمت پر گواہ ہیں وہ جواب دیں گے باوجودیکہ سب کچھ آگاہی ہے پھر بھی کہیں گے ''لا علم لنا'' اس بارے ہمارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا سبحانہ و تعالیٰ ہی ہر چیز کا عالم ہے اور اپنے بندوں کے اعمال پر گواہ ہے۔ لہٰذا گواہی دینے والے اپنے رب تعالیٰ کے مقام سے ڈریں! اللہ کی ناراضگی سے ڈریں اور حق کے مطابق گواہی دینے سے منحرف نہ ہوں۔

اس آیت میں پیغمبروں نے اپنے سے جس علم کی نفی کی ہے یہ اصل علم نہیں ہے بلکہ تمام غیبی علوم کی نفی ہے کہ جو فقط اللہ کے لیے ثابت ہے وگرنہ فی الجملہ غیب سے آگاہی تو پیغمبروں کے لیے اللہ کے اذن سے محقق اور ثابت ہے۔ کیونکہ علم اسباب اور اس کے متعلقات کے لحاظ سے اتنی ہی مقدار میں حقیت کو عالِم کے لیے کشف کرتا ہے جتنا اس کا علم ہے۔ مثال کے طور پر ایک دیکھنے والے کی آنکھ دیکھتی ہے تو وہی تصویر اس کے سامنے ہوتی ہے جو اس نے دیکھا ہے لیکن اصل اور واقعیت اس سے اوجھل ہوتی ہے۔ موجودات کے بارے میں حقیقی علم کسی کو حاصل نہیں ہے، تمام موجودات کی ابتدا اور انتہاء اسی کو پتہ ہے جس نے اس کو بنایا ہے، اسی کا احاطہ علمی ہے۔ احاطہ انسانی طاقت کے مافوق ہے۔ لہٰذا پیغمبروں کا یہ فرمانا کہ ہم علم نہیں رکھتے یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضور کے ادب کا تقاضا اور حقیقی امر کا اظہار ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، حالانکہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے انہیں لوگوں کے اوپر گواہ قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (سورہ الاعراف، آیت ۶) فرمایا:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶

ترجمہ ''پس جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ہر صورت میں ان سے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ہم ضرور پوچھیں گے۔''

اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ اذۡکُرۡ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ ۘ
اِذۡ اَیَّدۡتُّکَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ۟ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَ کَہۡلًا ۚ وَ اِذۡ
عَلَّمۡتُکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۚ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ
الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ فَتَنۡفُخُ فِیۡہَا فَتَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِیۡ وَ
تُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ ۚ وَ اِذۡ
کَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡکَ اِذۡ جِئۡتَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا
مِنۡہُمۡ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۰﴾

”جب اللہ کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میرا احسان یاد کر جو تجھ پر اور تیری ماں پر ہوا ہے، جب میں نے پاک روح سے تیری مدد کی، تو لوگوں سے بات کرتا تھا گود میں اور ادھیڑ عمر میں، اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائی، اور جب تو مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے بناتا تھا پھر تو اس میں پھونک مارتا تھا تب وہ میرے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا تھا، اور مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، اور جب مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتا تھا، اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روکا جب تو ان کے پاس نشانیاں لے کر آیا پھر جو ان میں کافر تھے وہ کہنے لگے کہ یہ تو بس صریح جادو ہے“۔

حضرت عیسیؑ کے معجزے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے معجزات کو شمار کیا ہے۔ اسی طرح ان احسانات کا تذکرہ کیا ہے جو ان کی والدہ گرامی پر کئے تھے۔ ان سارے معجزات کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔ درحقیقت یہ اللہ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ گرامی پر نعمتیں ہیں۔

1۔ پہلی نعمت تو نعمت ولادت ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اس طرح کی ولادت، اللہ کی خاص نعمت ہے خود ان کے لیے اور ان کی ماں کے لیے۔

2۔ دوسری نعمت روح القدس کے وسیلے سے تائید ہے۔ یقینی امر ہے کہ یہ تائید نعمت وحی کے علاوہ ہے کیونکہ وحی تو سب انبیاءؑ کے لیے ہے تو عیسیٰؑ کے لیے بھی ہے۔ اس سے مراد وہی تائید الٰہی ہے کہ گہوارے میں گفتگو کی۔

3۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی جانے والی ایک اور نعمت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے میں نے ان کو کتاب کی تعلیم دی، حکمت کی تعلیم دی، تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔ یہ سارے علوم ایک دفعہ اور بغیر تدریج کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دل میں القاء کئے گئے۔

4۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے معجزات میں سے ایک اور معجزہ یہ تھا کہ وہ مٹی کے بنے ہوئے مجسمے میں پھونکتے تو وہ پرندہ بن جاتا اور پرواز کرنے لگتا تھا۔

5۔ اندھے مادر زاد کو شفاء دینا، جزامی مریض کو شفاء دینا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے تھے۔ ان دو معجزات میں اذن الٰہی تکرار نہیں ہوا کیونکہ پرندے کی خلقت اور مادر زاد اندھے کو شفاء دینا اور جزامی کو شفاء دینا؛ یہ سب بغیر زمانی فاصلے کے تھا۔ کلام میں "باذنی" کا تکرار اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ خلقت کا مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عظمت والا ہے۔ اللہ نے اجازت دی تو ایسا ہوا۔

6۔ ایک اور نعمت جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا کی گئی، مردوں کو زندہ کرنا ہے کہ آنحضرتؑ دفن شدہ مردہ کو زندہ کرتے تھے۔ اور یہ امر ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ انجام پایا۔

7۔ اور پھر اس نعمت کا تذکرہ کیا کہ آپؑ کو بنی اسرائیل کے شر سے بچایا۔ وہ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دینا چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے شر کو ان سے دور کیا۔

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی

یہاں پر بنی اسرائیل کی زیادتی کا تذکرہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اتنے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود جو ان کی نبوت کی سچائی پر دلیل تھے کافر ہوگئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منہ موڑ لیا اور ان پر ایمان نہیں لائے۔ انہوں نے مکاری کی، سازشیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مکاری کے رد میں تدبیر کی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے اور سازشیوں کی سازش کا توڑ پیش کرنے والا ہے۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۞ (سورہ آل عمران، آیت: ۵۴)

"ان لوگوں نے تدابیر سوچیں اور اللہ نے (بھی جوابی) تدبیر فرمائی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے"۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَ بِرَسُوْلِىْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝۱۱۱

"اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈال دیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہے کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں"۔

عیسیٰؑ پر اللہ کے دیگر احسانات

حواری انسان کے خاص ساتھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اس نداء پر لبیک کہا تھا، جس میں آپ نے کہا تھا ''مَن انصاری الی اللہ'' ''راہ خدا میں تم میں سے میرے خاص ساتھی کون ہیں؟'' تو انہوں نے کہا تھا: ''نحن انصار اللہ'' ''ہم اللہ کی راہ میں آپ کے ساتھی ہیں'' خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان پر الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہاں پر اس بات کی جانب اشارہ لازم ہے کہ اس آیت میں کلمہ وحی سے الہام مراد ہے، کیونکہ وحی نبی کو ہوتی ہے، لیکن الہام اللہ اپنے کسی بھی دوست اور ولی کو کر سکتا ہے۔ البتہ اس ایمان سے مراد پہلا ایمان نہیں ہے بلکہ یہ ایمان اس کے علاوہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس وقت کی جب انہیں لگا کہ وہ کفر کر رہے ہیں۔ قرینے سے ایسے لگتا ہے آپ نے یہ باتیں اپنی دعوت کے آخری ایام میں کیں۔ آپ نے ان سے جو میثاق لیا وہ دین خدا کی مدد کرنے کے لیے تھا نہ کہ اللہ پر ایمان لانے کے لیے کیونکہ اللہ پر تو ان کا ایمان تھا۔ اسی لیے آیت کا اختتام اس جملہ کے ساتھ ہوا ہے ''وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ'' اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے تسلیم محض ہونے کا عہد کریں اور اس راستے میں آنے والی مشقتوں کو برداشت کریں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تسلیم ایمان کے بعد ہے، جب کوئی فرد ایمان لے آتا ہے تو ایمان کے بعد اس کے مطابق عمل شروع کرتا ہے اور اس کے تمام احکام کی پابندی کرتا ہے۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ١١٢

''جب حواریوں نے کہا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تیرا رب یوں کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے کھانا اتارے، کہا اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو''۔

حواریوں کا عیسیٰؑ سے معجزات کا تقاضا

یہاں پر استطاعت سے کسی کام کے انجام کی قدرت مراد نہیں کیونکہ یہ بات مناسب نہیں لگتی کہ مسیحؑ کے اصحاب اور خاص شاگرد اس قسم کی بات کریں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے علم اور دینی معارف کی روشنیاں کسب کر چکے تھے اور ان کے بتائے ہوئے آداب کی پیروی کرتے تھے۔ ایمان کا کمترین مرتبہ یہ ہے کہ انسان اس بات کو سمجھے کہ خدا ہر امر پر قادر ہے اور عاجزی اور ناتوانی رب تعالیٰ کے مقام سے دُور ہے۔ اس بنا پر یہاں پر استطاعت کا معنی یہ ہے کہ کیا تمہارے رب کے نزدیک مصلحت کا تقاضا ہے اور اس قسم کی اجازت اللہ دے سکتا ہے کہ ہمارے لیے کھانے کا دستر خوان بھیج دے۔

''مائدہ'' اس دستر خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا لگا ہو اور ہر قسم کی غذا موجود ہو۔

یہ درخواست بے ادبی کی رُو سے نہیں تھی اور نہ ہی ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر شک تھا اور نہ ہی اس لیے تھی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑائیں، نہ اس لیے تھی کہ اُن کو دھمکایا گیا ہو کہ اس معجزہ کے نہ اتارنے پر وہ کافر ہو جائیں گے، بلکہ معجزات انبیاء اور پیغمبروں کی دعوت کی تائید کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور ان کا دوسرا مقصد کفار پر اتمام حجت کرنا ہے۔ جن کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے ان کو محکوم کیا جائے اور جو واضح ثبوت اور دلیل ہے وہ باقی رہے۔ مختلف پیغمبروں کے معجزات کا مختلف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کافروں کی خواہشات بدلتی رہتی تھیں اسی لیے پیغمبروں کے معجزات بھی مختلف تھے، جیسے صالح علیہ السلام کی اونٹنی یا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات جو قوم فرعون کے لیے آتے رہے، مکڑیوں کا حملہ یا مینڈک، یا نوح علیہ السلام کا طوفان یا ٹھنڈی ہوا، یہ سب معجزات

کافروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اور ان کے مطالبے پر ہوتے تھے۔ کچھ معجزات مومنین کی ضرورت کے پیش نظر رونما ہوتے تھے جیسا بھنے ہوئے پرندوں کا آنا، ترنجبین کا بنی اسرائیل کے لیے آنا۔

حواریوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس قسم کا معجزہ مانگنا حالانکہ انہوں نے ان کے بہت سارے معجزے دیکھے تھے اور ان پر ایمان بھی لا چکے تھے تو یہ گویا کہ نو خواہی کے عنوان سے تھا یعنی ایک نئی چیز مانگی تھی۔ اس قسم کی بات بہت سارے معجزات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ثبوت میں تھے اور اللہ کی طرف دعوت دینے کے برحق ہونے کے لیے تھے اس کے بعد ہے۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ جس میں وہ مبتلاء ہو چکے تھے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اس قسم کا بے جا معجزہ کیوں مانگ رہے ہو اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کھیل تماشا کرنا ہے۔

قَالُوۡا نُرِيۡدُ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا وَ تَطۡمَٮِٕنَّ قُلُوۡبُنَا وَ نَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا وَ نَكُوۡنَ عَلَيۡهَا مِنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾

"انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس پر گواہ رہیں"۔

اپنے مطالبہ بارے حواریوں کا عذر

حواریوں نے اپنی درخواست کا عذر پیش کیا اور کہا کہ ہماری درخواست چار مقاصد کے لیے ہے۔

پہلا: کھانا، یہ کوئی غیر عقلائی بات نہیں ہے اور نہ ہی کھیل تماشا ہے بلکہ ہم چاہ رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے یہ کھانا اترے اور ہم اس سے کھائیں۔

دوم: اطمینان قلب، ہمارے دل کے اندر اخلاص کے منافی کوئی بات ہو تو دور ہو جائے۔ یہ بھی پسندیدہ بات ہے۔

سوم: ان کو معلوم ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی جانب سے جو تبلیغ کی ہے اور ان کو جو پیغام پہنچایا ہے وہ سچ ہے۔ یہاں پر علم سے یقینی علم مراد ہے، ایسا علم جس سے نفسانی وسوسے اور خیالات دُور ہوں۔ یا اس سے مراد یہ تھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے دعا کے قبول ہونے کا جو وعدہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ تمہارے ایمان کے ثمرات میں سے ایک یہ ہے کہ تمہاری دعا قبول ہوگی، ان کی یہ بات صحیح ہے یا نہیں ہے اور یہ وعدہ پورا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم ایمان والوں کی یہ بھی ایک قسم کی درخواست ہے، اب یہ درخواست قبول کی جاتی ہے یا نہیں۔

چہارم: معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں تاکہ قیامت کے دن گواہی دیں کہ یہ امر واقع ہوا ہے۔ یہ بھی عقلائی اغراض سے ہے۔ انہوں نے معجزہ کی درخواست کے لیے یہ عقلائی اغراض بیان کئے تاکہ اس طرح اس درخواست کے قبیح اور اس کے ہلکا پن کو ختم کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے عذر اور توجیہ کو قبول کیا اور اُن کی درخواست رب تعالیٰ کے حضور پیش کر دی۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١٤﴾

''مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا اے اللہ ہمارے رب! ہم پر بھرا ہوا خوان آسمان سے اتار جو ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، اور ہمیں رزق دے اور تو ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے''۔

عیسیٰؑ کا حواریوں کی درخواست اللہ کے حضور پیش کرنا

حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں کی درخواست اللہ کی خدمت میں پیش کر دی اور فرمایا: ''کہا اے اللہ ہمارے رب! ہم پر بھرا ہوا خوان آسمان سے اتار جو ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، اور ہمیں رزق دے اور تو ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے'' ''رَبَّنَآ'' کا لفظ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ ندا اور دعا کے درمیان مطابقت پیدا ہو۔ لفظ کے اعتبار سے اس دعا میں جو خصوصیت ہے وہ دوسری دعاؤں میں نہیں ہے کیونکہ ''اللّٰھُمَّ رَبَّنَآ'' دقت اور آگاہی کے ساتھ ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے اُمت کی مائدہ (دستر خوان) اتارے جانے کی درخواست کو عید کا دن قرار دے دیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے نوآوری تھی جبکہ حواریوں کی درخواست میں ایسی بات نہیں تھی۔ اس امر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے بڑے الٰہی معجزات کے ہوتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ہیں اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اس درخواست کو اس پیرائے میں پیش کریں جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی ہو اور اللہ کی کبریائی اور عزت کے مقام کے منافی بھی نہ ہو۔ کیونکہ کسی دن کے عید قرار دینے کے بہت سارے اچھے اثرات ہیں جن میں افراد امت کے درمیان وحدت کا ایجاد ہونا اور قومی زندگی کی تجدید، لوگوں کے دلوں کی مسرت اور عید کے دن دین کا اعلان شامل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دستر خوان کے نزول میں رزق کے طلب کرنے کو فرعی فائدے اور غرض کے طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ اس دعاء کا اصلی مقصد عید تھی۔ حواریوں کی نظر میں اصلی غرض رزق و روزی تھا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نظر میں اصل مقصد عید تھی جس دن نیک عمل اللہ کے حضور پیش کئے جائیں اور بالذات کھانا مراد نہیں تھا تو یہ عید عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مختصات سے ہو گئی۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

"اللہ نے فرمایا بے شک میں وہ خوان تم پر اتاروں گا، پھر اس کے بعد جو کوئی تم میں سے ناشکری کرے گا تو میں اسے ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہو گی"۔

حواریوں کے لیے مائدہ آسمانی کا اترنا

"مُنَزِّلُهَا" یعنی تدریجاً اتارنا، ایک ہوتا ہے "مُنزِلها" جو انزال سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ایک دفعہ اترنا۔ اور "مُنَزِّلُهَا" تنزیل سے لیا گیا ہے جو تدریجاً اتارنے کے معنی میں ہے۔ یہ عبارت بغیر تشدید کے قواعد کے ساتھ موافق تر ہے۔ یہ کلام حواریوں پر مائدہ آسمانی کے اترنے کے متعلق صریح اور واضح وعدہ ہے کیونکہ انزال کو اسم فاعل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نہ کہ لفظ فعل کے ساتھ، اس سے استفادہ ہوتا ہے کہ مائدہ کے اتارے جانے کے متعلق مسیحؑ کی جو درخواست تھی وہ پوری ہوئی تھی اور حتمی طور پر ان کی امت پر مائدہ نازل ہو چکا ہے اگرچہ مسیحی اس کے بارے میں خبر نہیں رکھتے۔

"فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ" والا جملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا رد نہیں بلکہ اس کی قبولیت اور ایسی رحمت مطلقہ ہے جس سے آپ کی اُمت کے اولین و آخرین بہرہ

مند ہوں گے، سوائے کافروں کے کیونکہ یہاں انزال کا وعدہ مطلق ہے۔ لیکن جو اس میں شرط ذکر ہوئی ہے وہ صریح اور واضح نہیں ہے بلکہ اس بات سے مشروط ہے کہ اگر مائدہ (دستر خوان) کے نزول کے بعد کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دستر خوان کا کفران کرنے والوں کے لیے خاص عذاب کا وعدہ اس لیے دیا ہے کیونکہ ان کا مطالبہ بھی خاص قسم کا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر وہ کافر بنیں گے تو ان کے لیے سخت عذاب ہو گا کیونکہ یہ خصوصی درخواست تھی۔ خداوند نے یہاں سخت عذاب کا اعلان فرمایا ہے، ایسا عذاب کہ جو پہلے کسی کو نہیں دیا گیا ہوگا۔ اور جو دستر خوان ان کے لیے اترا تو یہ قوم عیسیٰ علیہ السلام کے لیے شرف تھا جو کسی اور قوم کو نہ ملا۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕؔ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

"اور جب اللہ فرمائے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو، وہ عرض کرے گا تو پاک ہے مجھے لائق نہیں کہ ایسی بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھے ضرور معلوم ہوگا، جو میرے دل میں ہے تو جانتا ہے اور جو تیرے دل میں ہے وہ میں نہیں جانتا، بے شک تو ہی چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا ہے"۔

اللہ کا عیسیٰؑ سے سوال

اس گفتگو سے اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ گفتگو مراد ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن سچوں کو ان کی سچائی فائدہ پہنچائے گی۔ حضرت عیسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے جواب میں عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! جب تک میں ان کے درمیان تھا ان کے اعمال پر گواہ تھا، اور اس وقت میں نے ان کو ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ لیکن میرے ان کے درمیان سے اٹھ جانے کے بعد تو ہی ان کے امور سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ : ''کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو'' اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی سب سے مہم دلیل کا جواب دیا جائے جس میں وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ عیسیٰؑ الٰہ ہیں اور اس بات پر ان کی دلیل یہ تھی کہ عیسیٰؑ بغیر باپ کے مریم سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ : عیسیٰؑ اور ان کی ماں، یہ نہیں کہا کہ عیسیٰؑ اور مریم۔

یہاں پر ''دون'' غیر کے معنی میں ہے، یعنی عیسیٰؑ اور ان کی ماں کی پرستش شرک ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی الاہیت کی نفی کی جارہی ہو۔ مسیحیوں کا کہنا ہے کہ اللہ کے دو شریک ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں کو الٰہ مانیں اور اللہ سے الوہیت کی نفی کریں۔ کیونکہ کسی کو معبود و الٰہ بنانا اور کسی کی الاہیت کے قائل ہونا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ مگر یہ کہ کہا جائے کہ الٰہ اور الوہیت میں لازمہ پایا جاتا ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَ اَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

''میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے، اور میں اس وقت تک ان کا نگران تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا پھر توں ہی ان کا نگران تھا، اور توں ہر چیز سے خبر دار ہے''۔

عیسیٰؑ کا ناروا نسبتوں کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف دی جانے والی نسبت کے سبب کی نفی کرکے اس نسبت کی نفی کرنے کے بعد اس عنوان سے کہ انہوں نے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی فرمایا: اے میرے رب! تو نے مجھے جو دستور دیا تھا میں نے تو وہی کچھ پہنچایا اور میں نے تو ان سے یہ واضح کہہ دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے اور اس میں کوئی شک اور شبہ بھی نہیں ہے اور وہ سب لوگوں کا رب ہے اور اللہ کی عبادت اور ربوبیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک اور ذمہ داری جو عیسیٰ علیہ السلام کی تھی اس کو بیان کرتے ہیں کہ میں ان کے اعمال پر گواہ تھا کیونکہ میں نے رسالت پہنچائی، بے شریک خدا کی پرستش کا کہا اور پھر میری اُمت کے جو عمل تھے اس پر گواہی بھی دی۔ لہٰذا میں نے دونوں ذمہ داریوں کو انجام دینے میں غلطی اور کوتاہی نہیں کی ہے۔ اس بنا پر میں ان کی اس ناروا نسبت سے منزہ و مبرا ہوں کہ میں نے ان کو اپنی یا اپنی ماں کی پرستش کی دعوت دی ہو۔

''کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ'' والے جملے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ان کے درمیان تھے تو اس وقت بھی حقیقی رقیب و گواہ اللہ تعالیٰ ہی تھا اور جب عیسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان سے چلے گئے اور اللہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو اس وقت بھی اللہ ان پر ناظر اور گواہ تھا کیونکہ جس طرح تمام امور کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ مستقل ہے

بندوں کے اعمال پر گواہ ہونے میں بھی وہ مستقل ہے۔ اگر خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بعض امور کی تدبیر سپرد کرتا ہے تو تب بھی اصل تدبیر تو خود اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے، رزق دینا، زندہ کرنا، مارنا، حفاظت کرنا، بندوں کو ہدایت دینا ان سب امور کا حقیقی وکیل اللہ ہی ہے اور اللہ ہی خود ذمہ دار ہے۔ اس بنا پر تدبیر کی طرح گواہی میں بھی اللہ تعالیٰ مستقل ہے اور اولاً و بالذات گواہ اللہ ہے اور باقی گواہ اللہ کی طرف سے ہیں کہ اللہ نے ان کو متعین کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اس قسم کی ناروا نسبتوں سے مبرا ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد جن امور کے وہ مرتکب ہوئے ہیں تو ان سے بھی اللہ آگاہ ہے، اگر اللہ ان پر عذاب دے تو دے اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے اور اگر چشم پوشی کرے تو وہ مقتدر ہے اور اللہ کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾

''اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں، اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو بے شک تو زبردست حکمت والا ہے''۔

عیسیٰؑ کی اللہ سے درخواست

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنی بے قصوری ثابت کر دی اور یہ کہ ان پر جو ذمہ داری تھی وہ ادا کر چکے اور ان کے اعمال کے گواہ اسی وقت تھے جب ان کے درمیان تھے تو پھر اپنے وظیفے کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی اور کوئی ناحق بات بھی نہیں کی۔ اب اس ملت نے جو کفریہ کلمات کہے یا غلط اقدام کئے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ توں عظمت والا ہے، قدرت والا ہے، شان والا ہے، اُن کے اقوال تیرے سامنے ہیں، اب آپ

کی مرضی ہے چاہے توں ان کو عذاب دے دے کیونکہ توں ان کا مولا ہے، بندوں کا اختیار تیرے ہاتھ میں ہے۔ اگر توں چاہے تو اپنی رحمت کے سائے میں عفو و در گزر کرلے اور انہوں نے جو بڑا ظلم کیا ہے اس کو مٹا دے۔ کیونکہ تو ہی اقتدار والا ہے تو ہی حکمت والا ہے اور توں جو بھی امر کرتا ہے تو اسی کے مطابق کرتا ہے جس میں مصلحت ہوتی ہے اور تیری طرف تو نہ گناہ کی نسبت دی جاسکتی ہے اور نہ ہی ظلم کی نسبت دی جاسکتی ہے اور توں اگر کسی کو معاف کرتا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

"اللہ فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا، ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ان سے اللہ راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

عیسیٰؑ کی باتوں کی تصدیق

یہ جملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باتوں کی تصدیق ہے البتہ صراحت کے ساتھ نہیں بلکہ اس میں کنایہ ہے کیونکہ جب قرینہ مقامی ہو تو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ سچوں کی سچائی سے دُنیا کی سچائی مراد ہے نہ کہ آخرت کی سچائی کیونکہ اللہ کی طرف سے بہشت ان کا بدلہ ہے جو دنیا میں سچے تھے۔ یہ جنتیں ان کے لیے ہیں، آخرت میں تکلیف شرعی ہوتی نہیں ہے نہ ہی کوئی فریضہ ہوتا ہے اور ثواب تکلیف شرعی کی فرع ہے، آخرت حساب اور ثواب لینے کی جگہ ہے، دُنیا عمل کی جگہ ہے، ذمہ داریاں ادا کرنے

کی جگہ ہے، دُنیا میں جو سچے تھے آخرت میں انہیں اس کا اجر ملے گا، سچائی کا فائدہ ملے گا اور اللہ تبارک و تعالیٰ ان سے راضی ہو گا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے یہ وہی ثواب ہے جو اللہ انہیں دے گا اور وہ اس پر خوش ہوں گے۔

اس آیت میں اللہ کی خوشنودی خود بندوں سے ہے نہ کہ ان کی سچائی سے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے عمل سے تو راضی اور خوش ہے لیکن خود شخص سے اس کو نفرت ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ یہاں سچوں کی صداقت سے بھی راضی اور خوش ہے اور خود ان سے بھی راضی اور خوش ہے۔ اللہ اسی وقت اپنے بندے سے راضی ہوتا ہے جب وہ غرض خلقت کو پورا کرے، اور انسان کی غرض خلقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: ''جن و انس کو ہم نے خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ عبادت کریں'' (سورہ ذاریات، آیت: ۵۶) یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سچوں نے عبودیت کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھایا ہے اس لیے ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوئی ہے۔ انہوں نے خود کو نہیں دیکھا وہ غیر خدا کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوئے، اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ طہارت نفس کے مقام پر فائز تھے اور کفر و فسق کے تمام مراتب سے پاک ہوئے۔ بندے کو حاصل مقام اللہ کا فضل اور اللہ کی طرف سے نعمت ہے اور جس چیز سے اللہ نے روکا ہے یا اس کو عطا نہیں کیا وہ حکمت کے تحت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اللہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا'' (سورہ زمر، آیت ۷) اور دوسری آیت میں فرمایا: ''اللہ فاسقوں سے بالکل راضی نہیں ہوتا'' (سورہ توبہ، آیت ۹۷) جب اللہ بندوں سے راضی ہے تو وہ بطریق اولیٰ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے، اللہ نے ان کو اعمال کا بدلہ دیا ہے تو وہ کیسے راضی نہ ہوں۔

لَهُمۡ مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيدٞ ۝٣٥ (سورہ ق، آیت ۳۵)

''وہاں ان کے لیے جو وہ چاہیں گے حاضر ہے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے''

واضح سی بات ہے کہ جب انسان کو وہ سب کچھ ملے جسے وہ چاہتا ہے تو وہ اس پر راضی ہو گا اور یہ مقام بندگی کے اعتبار سے انسان کی سعادت کا انتہائی درجہ ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٢٠﴾

''آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کی سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اللہ کی سلطنت اور اقتدار

''مُلْكُ'' اس خاص سلطنت کو کہتے ہیں جو اشیاء کے درمیان نظام پر حاکم ہے۔ اس سلطنت کا اثر یہ ہے کہ جس پر مالک کا ارادہ حاوی ہے وہ اس میں ہر قسم کا تصرف کرے، مِلْك فرد سے متعلق ہے اور مُلْك جماعت اور گروہ سے متعلق ہے۔ کیونکہ مُلْك میں فعلی ارادے کا نفوذ قدرت رکھنے کے ساتھ مشروط ہے پس اگر قدرت مطلق ہے تو مُلْك بھی مطلق ہو گا اور کسی حالت میں مقید نہیں ہو گا لہٰذا آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ تمام امور پر قادر ہے یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ مُلْك مطلق اللہ کا ہے۔

یہاں پر سورہ مائدہ اختتام پذیر ہوئی۔ اس سورہ کا مقصد بندوں کو اللہ کی عبادت اور اس عہد و پیمان کو پورا کرنے کی طرف مائل کرنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں سے لیا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے اللہ کے مملوك مطلق بننے، اس کے حکم کو سننے اور اطاعت کرنے، اپنے پروردگار کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرنے اور اس کو نہ توڑنے کے علاوہ کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اور یہی چیز اس سورہ کے مقاصد کے ساتھ ہماہنگ ہے۔

سورۃالانعام

(مکی۔آیات 165)

سورہ کے مطالب

اس سورہ کے مطالب میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور اس پر دلائل اور مشرکین کا جواب، معاد، نبوت کے حوالے سے دلائل اور شرعی احکام کا بیان اور شریعت میں حرام شدہ چیزوں کا بیان اور اللہ تعالیٰ کی 0 اپنی مخلوق پر نعمات کا تذکرہ شامل ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱﴾

”سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور اندھیرا اور اُجالا بنایا، پھر بھی یہ کافر اوروں کو اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں“۔

نظام کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حمد

اس سورہ کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے ہوا ہے اور یہ حمد بعد میں بیان ہونے والے مطالب کے لیے مقدمہ ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں توحید کے بارے میں تفصیلات بیان ہونی ہیں اور اُن معارف کی طرف اشارہ کرنا ہے جو شریعت کی بنیاد اور اساس ہیں اور ان کے تین نظام بنتے ہیں۔ یہ تین قسم کے نظام اسی مخلوق میں چل رہے ہیں۔

1۔ عمومی نظام، جس کا اشارہ پہلی آیت میں ہوا ہے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور نور اور تاریکی کا ایجاد کرنا، ان سب کا اسی عمومی نظام سے تعلق ہے۔

2۔انسان کے متعلق خصوصی نظام، جس کا بیان دوسری آیت میں آیا ہے۔

3۔انسان کے عمل کا نظام، جس کی طرف آیت نمبر تین اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تین آیات پروردگار کی حمد پر مشتمل ہیں اس اعتبار سے کہ اس نے ایسی عظیم کائنات خلق کی ہے جس میں انسان زندگی گزار رہا ہے اور ایک عالم صغیر خلق کیا ہے کہ جو خود انسان کا وجود ہے جو دو جہتوں میں محدود ہے ایک اس کا آغاز ہے جو مٹی ہے اور دوسرا حتمی اور مکتوب موت ہے۔اس اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات حمد کے لایق ہے کہ وہ انسان کے تمام آشکار اور پوشیدہ کاموں سے آگاہ ہے۔

آیت کے اس حصے ''خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ'' کے ذریعے اس نظام کی طرف اشارہ ہے جو عالم کبیر پر حاکم ہے اور اس عالم کی تمام چیزیں اپنی کثرت اور آپس کے فرق کے باوجود اس نظام کے تحت چل رہی ہیں۔ ہمارے لیے مشہود عالم یہی زمین ہے کہ وسیع و عریض آسمانوں نے جس کا احاطہ کیا ہوا ہے اور وہ سب کے سب متواتر تحول اور تکامل اور ارتقائی حالت میں ہیں۔ ''جَعَلَ'' یہاں پر خلق کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ کلمہ خلقت اصل میں '' خلق الثوب'' سے لیا گیا ہے جو متفرق چیزوں کا آپس میں جوڑنے اور ترکیب کرنے کے معنی میں ہے۔ ظلمت اور نور ایک چیز کے دوسری چیز کے ساتھ ترکیب سے پیدا نہیں ہوئی لہٰذا اس کو ''جَعَلَ'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے '' خَلَقَ'' استعمال نہیں کیا۔

''الظُّلُمَاتِ'' جمع کا صیغہ ہے اور ''النُّوْرَ'' مفرد آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلمت، نور کا نہ ہونا ہے اس چیز میں جس کی شان یہ ہے کہ وہ نورانی ہو اس میں نور نہ ہو تو اس کو ظلمانی کہتے ہیں۔ اس قسم کی چیز نور سے دوری اور نزدیکی کی بنا پر متعدد ہو جاتی ہے۔ برخلاف نور کے، نور ایک امر وجودی ہے اور اس کا وجود ظلمت کے ساتھ تقابل سے حاصل نہیں ہوتا

اوراس میں تکثر اور تعدد موجود نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ ''ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝
'' اس آیت میں حرف عطف ''ثم ''جو تاخیر اور بعدیت کے معنی میں ہے، سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس میں تعجب، حیرانگی اور ملامت اور سرزنش ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم کائنات کو اکیلا خلق اور ایجاد کرنے اور الوہیت میں اپنی یگانگی کی تعریف کر رہا ہے اور پھر مشرکین اور کافروں پر تعجب کیا گیا ہے جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور جنہوں نے غیر خدا کو الٰہ بنا رکھا ہے۔ پھر لفظ ''ثم'' کے ذریعے ان کی خاموشی اور حیرت کے اعمال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے اعمال غلط ہیں، کفار کس طرح بتوں کی پرستش کرکے ان کو اللہ واحد، قہار اور صانع کا شریک ٹھہراتے ہیں اللہ کے بدلے ان کو اپنا معبود بناتے ہے جس کا کوئی مثل نہیں، مانع نہیں ہے، اس کا کوئی شریک اور ہمتا نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

''اللہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک وقت مقرر کر دیا، اور اس کے ہاں ایک مدت مقرر ہے، تم پھر بھی شک کرتے ہو؟''

خلقت عالَم صغیر

اس عبارت میں عالم صغیر جو کہ انسان ہے اس کی خلقت کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالَم کبیر کو خلق کرنے کے بعد انسان کو خلق کیا اور اس کے امور کی تدبیر فرمائی، اس کی ظاہری اور دنیاوی بقا کے لیے مدت مقرر کی ہے۔ انسان کا وجود محدود ہے گیلی مٹی کے جو اس کا آغاز ہے اور معین وقت کے درمیان، جو موت کے وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے ''اجل'' سے قیامت کا دن مراد ہو جو خدا کی طرف لوٹنے کا دن ہے۔ ''اجل'' کو نکرہ لایا گیا

تاکہ ابہام کا معنی دے اور اس بات پر دلالت کرے کہ اجل لوگوں کے لیے مجہول اور نامعلوم ہے اور انسان متعارف علوم اور معارف کے ذریعے اس کا تعین نہیں کر سکتا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ (سورۂ عنکبوت آیت نمبر 57) "اجل" سے مقرر مدت، معین مدت یا مدت کا آخری حصہ مراد ہے اور یہاں اس سے زندگی کا آخری حصہ مراد ہے نہ کہ تمام زندگی۔

اجل دو قسم کی ہے 1۔ایک اجل مبہم 2۔اجل مسمّٰی یعنی اللہ کے ہاں معین ہے اور یہ دوسری وہی اجل حتمی ہے جو تبدیل نہیں ہوتی سورۂ عنکبوت آیت نمبر 5:

يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾

اجل مسمّٰی کی اجل مبہم سے نسبت ایسے ہے جیسے مطلق کی نسبت مشروط سے اور معلق کا معنی یہ ہے کہ ممکن ہے اجل غیر مسمّٰی شرایط پوری نہ ہونے کی وجہ سے محقق نہ ہو اور معین وقت پر نہ آئے لیکن اجل مسمّٰی سے راہ فرار نہیں ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں بن سکتی۔ (حتمی موت سے گریز ممکن نہیں لیکن اجل غیر مسمّٰی میں ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کا وقت کسی چیز سے مشروط ہو مثلاً اگر اس نے صدقہ دے دیا تو اس کی عمر چالیس سال بڑھ جائے گی اور اگر نہ دیا تو چالیس سال کم ہو جائے گی تو یہ گویا کہ اجل غیر مسمّٰی ہے)

سورۂ رعد کی آیت ۳۸۔۳۹:

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ کے مطابق اجل مسمّٰی ام الکتاب میں لکھی جا چکی ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں لیکن اجل معلق یا مبہم لوح محو اور اثبات میں درج ہے اور ام الکتاب کے ساتھ قابل انطباق ہے ان حوادث کے ساتھ جو خارج میں ہیں اور جو عام اور تخلف ناپذیر اسباب سے مستند ہے اور لوح محو و اثبات انہی حوادث پر قابل انطباق ہے لیکن اسباب عامہ کے استناد کی خاطر نہیں بلکہ ان اسباب ناقص کی

وجہ سے جن کو بعض جگہوں پر مقتضی سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے کسی رکاوٹ سے ٹکرا جائے اور اپنی تاثیر چھوڑ دے اور ممکن ہے اثر کر بھی دے۔

جیسے سورج کی روشنی کے متعلق ہمیں اطمینا ن ہے کہ رات کے بعد سورج طلوع ہو گا لیکن ممکن ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد چاند، بادل یا کوئی اور چیز سورج اور زمین کے درمیان حائل ہو جائے جو زمین کو روشن ہونے سے روک دے اور اسی طرح ممکن ہے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور سورج طلوع کر لے اور زمین کو روشن کر دے۔ لہٰذا سورج کا طلوع ہونا زمین کے روشن کرنے میں ناقص سبب ہے اور ہماری بحث میں لوح محو و اثبات کی مانند ہے۔ اور سورج کے طلوع ہونے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو تو اس کے زمین کو روشن کرنا علت تامہ بن جائے گی جس کو ہماری بحث میں لوح محفوظ کہا جاتا ہے۔ یعنی موانع نہیں ہوگے تو سورج طلوع ہوتے ہی زمین کو روشن کردے گا لیکن اگر موانع ہوں گے تو سورج طلوع ہونے کے باوجود زمین کو روشن نہیں کر سکے گا۔

انسان کا بدن مخصوص ترکیب کے ساتھ تشکیل پاتا ہے۔ اس کے بدن کو تشکیل دینے والے ارکان کے لحاظ سے اس کی عمر 100 سال یا 120 سال ہو سکتی ہے۔ یہ مدت لوح محو و اثبات میں لکھی ہوئی ہے۔ لیکن جہان ہستی کے وہ تمام اجزاء جو انسان کے بدن کے ساتھ مربوط ہیں جو اس میں تاثیر رکھتے ہیں جن کا گننا بھی ممکن نہیں، ممکن ہے ان کا انسان کے بدن کے ساتھ ٹکراؤ کی وجہ سے انسان اپنی عمر کی طبیعی حد تک نہ پہنچ سکے اور اس کی موت واقع ہو جائے، اس قسم کی موت کو "مرگ ناگہانی" یا اچانک موت کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر کچھ اور اقوال بھی ہیں و درست نہیں اور پھر بحث بھی لمبی ہو جائے گی اس لیے ہم نے ان اقوال کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ انسان کی محدود عمر ان اقوال کے متعلق گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

یہاں پر تعجب سے کہا جارہا ہے اور انسان کی سرزنش کی جارہی ہے کہ اس سب کے باوجود تم شک اور تردید کرتے ہو؟ یعنی بالفرض اگر تم عالم کبریٰ کی خلقت سے غافل ہو تو تمہارے پاس اپنے پرودگار کے بارے میں شک اور تردید کرنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے جس نے تمہیں خلق کیا ہے اور تمہارے لیے ایک اجل مقرر کی ہے جس کا علم فقط اسی ذات کے پاس ہے پھر تم کس طرح اسے بھلا بیٹھے ہو؟

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳

"اور وہی ایک اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمہارے ظاہر اور چھپے سب حال جانتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

آسمانوں اور زمین پر اللہ کا اختیار

پہلی دو آیات اس بات پر مشتمل تھی کہ اللہ معبود یکتا ہے، کائنات کی خلقت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ان سب دلائل کے باوجود مشرکین نے اللہ کی مخلوقات کو خدا بنا رکھا تھا اور مختلف امور کی تدبیر کے واسطے خداؤں کے قائل تھے۔ یہ جن کو اپنے مختلف کاموں کے لیے شفیع اور سفارشی سمجھتے تھے جیسے زندگی اور دینے والا معبود (الہ حیات)، روزی دینے والا معبود (الہ رزق) خشکی کا معبود (الہ خشکی) اور الہ دریا اور اس کے علاوہ دوسرے الہ جن کو انہیں نے خدا بنا رکھا تھا۔ جب کہ آسمانوں اور زمین کا معبود ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس گفتار سے مشرکین کے بنایے ہوئے خداؤں اور شرکاء کی نفی کی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اعمال جن کو تم خفا اور چھپا کر انجام دیتے ہو اور وہ اعمال جن کو تم بے پردہ انجام دیتے ہو ان سب کو اللہ جانتا ہے اور جو تم کماتے ہو اس سے

بھی اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے نفس کی اس حالت سے آگاہ ہے جو مختلف اعمال انجام دینے کے نتیجے میں اس میں وجود میں آتی ہے چاہے وہ اعمال ظاہری ہوں یا باطنی، کھلے ہوئے ہوں یا چھپے ہوئے۔ یہ دو صفتیں یعنی پوشیدہ ہونا اور ظاہر ہونا انسان کے خارجی اور بدنی اعمال کے حوالے سے ہے اور تیسری صفت یعنی جو تم کسب کرتے ہو یہ انسان کے روحانی اور معنوی اعمال کے حوالے سے ہے۔ کیونکہ انسان کے خارجی اعمال جس طرح شکل میں مختلف ہیں اسی طرح معنوی اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ اسی لیے لفظ یعلم دو بار ذکر ہوا ہے۔ یہ آیت مقدمہ ہے بعد والی آیت کے لیے جن میں نبوت اور معاد کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ④

"ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انہوں نے منہ نہ موڑا ہو"۔

کفار کا مستکبرانہ مزاج

اس آیت میں کفار کے مستکبرنہ مزاج کو بیان کیا گیا ہے جس نے ان کے دلوں میں رسوخ کرلیا ہے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے ان آیات سے منہ موڑا ہوا ہے جو حق اور حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ ان کا مزاج ایسا بنا ہے کہ اب وہ کسی بھی قسم کی آیات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کی آیات ان کے دلوں میں ایمان اور رہدایت کو وجود میں نہیں لاتی کیونکہ ان کے دل ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ ان آیات سے وہی لوگ ہدایت پاتے ہیں جو حق کے پیروکار ہیں، ان آیات سے ان کی ہدایت اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵

''اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انہوں نے جھٹلا دیا، عنقریب کچھ خبریں ان کو پہنچیں گی اس چیز کے متعلق جس کا اب تک وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں''۔

حق کو جھٹلانا اور اس کا مذاق اڑانا

واضح سی بات ہے کہ جب انہوں نے حق کا انکار کر دیا جو اصل اور اساس ہے تو جو آیات حق پر دلالت کرتی تھیں ان کا جھٹلانا ان کے لیے نہایت آسان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ عنقریب تم ان آیات کے مذاق اڑانے کا نتیجہ جلد دیکھ لوگے کیونکہ ان آیات کا مذاق اڑانا حق کا مذاق کا اڑانا ہے ،ظاہر ہے حق نے ایک دن ظاہر ہونا ہے،اور خبر کے مقام سے نکل کر واقع اور ظاہر میں آنا ہے۔ وہ کتنا برا وقت ہو گا ان کے لیے جن کو ڈرایا گیا ہے(سورۂ صٓفّٰت، آیت نمبر 177) '' فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۱۷۷ ''دنیا میں انہوں نے حق کا مذاق اڑایا جس کا نتیجہ آخرت میں عذاب کی شکل میں انہیں بھگتنا پڑے گا۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

''کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے بھی کتنی امتیں ہلاک کر دیں ہم نے انہیں زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا اور ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارشیں برسائیں، اور ان کے نیچے نہریں بہادیں پھر ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے بعد اور اُمتوں کو پیدا کیا''۔

سابقہ اُمتوں میں عبرت کا سامان

''قَرْنٍ'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ایک زمانے میں اکھٹے رہے ہوں، ''مِّدْرَارًا'' ''در'' کی اصل سے ہے جس کا معنی دودھ ہوتا ہے اور بارش کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہا ہے ہم نے تم سے پہلے تمہاری طرح کی بہت ساری اقوام کو خاک سے خلق کیا تھا جن کو ہم نے ایسی شان و شوکت عطا کی تھی جو تمہیں عطا نہیں کی۔ البتہ یہ بات مہلت دینے کے حوالے سے تھی، ہم نے آسمان اور زمین ان کے اختیار میں دیا تھا اور ان کو بے حساب نعمتیں دی تھیں۔

ان سب نعمتوں کے باوجود وہ اللہ اور اس کی آیات پر ایمان نہ لے آئے۔ اس کی وجہ ان کا گناہ میں غوطہ ور ہونا تھا۔ آخر کار ہم نے انہیں ان گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ یقینی طور پر مصائب اور مشقتوں کے آنے میں گناہوں کا عمل دخل ہے جس طرح حسنات اور نیکیاں نعمتوں اور برکات کے ملنے کا سبب ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ان کی جگہ دوسری امت کو خلق کیا۔ پس یہ اللہ کا قانون ہے جو جاری ہے کہ وہ لوگوں کو زمین پر اقتدار اور نعمت عطا کرتا ہے، ان کے لیے خوشحالی کے اسباب فراہم کرتا ہے اگر وہ ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو ٹھیک! لیکن اگر ایمان نہ لے آئے، تقویٰ اختیار نہ کیا تو جو نعمتیں اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں ان کو ان سے چھین لیتا ہے۔ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے سب اللہ کے قدرت کے پنجے میں ہوتے ہے اور خدا کو اپنے فیصلے پر عمل کرنے

سے روک نہیں سکتے اور نہ ہی اللہ عاجز ہے اس طرح دوسری آیت میں فرمایا: (سورۂ محمد، آیت 38) ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝۳۸﴾ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آتا ہے جو تمہاری طرح نہیں ہیں۔

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۷

''اور اگر ہم تم پر کوئی کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی کافر یہی کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے''۔

ایمان نہ لانے کے لیے کفار کے بہانے

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کافروں کا تکبر اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ اگر یہ قرآن لکھی ہوئی کتاب اور کاغذوں کی شکل میں اُتارا جاتا اور یہ اپنی آنکھوں سے اس کے اترنے کو دیکھتے، اپنے ہاتھ سے اُسے مَس کرتے تو پھر بھی وہ یہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے (معاذ اللہ) لہٰذا اُن کی گفتگو کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے (سورہ اسراء، آیت ۹۳) آیا ہے: ترجمہ: ''تیرے آسمان کی طرف اوپر جانے کو ہم قبول نہیں کرتے اور اس پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ ہمارے اوپر ایک کتاب اُتارو کہ جس سے ہم خود پڑھیں''۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ ان کی گفتگو ہے جو ایک قسم کا بہانہ اور عذر تراشی ہے۔ اُن کا ایمان لانے کا ارادہ ہی نہیں ہے اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کھلا جادو ہے؛ یہ بھی ان کا بے ہودہ بہانہ ہے کیونکہ وہ چاہتے ہیں حق کو ٹھکرا دیں ورنہ اگر یہ سحر و جادو ہوتا اور اُن پر جادو کیا جاتا تو سحر کے نتیجے میں وہ تو ایمان سے فرار ہی نہیں کر سکتے تھے بلکہ اُس سحر کے اثر کرنے پر وہ

ایمان لے آتے۔ معلوم ہوا کہ جو ہم نے بھیجا ہے وہ جادو نہیں ہے کیونکہ اُس کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں ان کو اختیار حاصل ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝۸

''اور کہتے ہیں اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا، اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو اب تک فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی''۔

فرشتے کا نہ اُتارا جانا

کافر کہتے تھے کہ ان کے پاس فرشتہ آئے تو کفار کی اس گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کو ایسی بات پر اُبھارنا چاہتے تھے جس کو انجام دینے سے وہ عاجز ہو۔ جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کو خبر دی تھی کہ جو ان آیات کو میرے پاس لاتا ہے وہ ایک مکرم فرشتہ ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی اس درخواست کی دو جہات ہو سکتی ہیں جو دوسری آیت سے بھی استفادہ ہوتی ہیں۔ 1۔ پہلی جہت وہ عذاب ہو سکتا ہے کہ جس سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو ڈرایا تھا کہ اگر اُنہوں نے ایسا کیا تو ان کو عذاب ملے گا۔

'' انہیں بتاؤ اگر ان کے پاس فرشتہ آیا اور پھر انہوں نے قبول نہ کیا تو وہی بجلی ان پر گرے گی جیسے عاد اور ثمود پر'' (سورہ فصلت، آیت: ۱۳)

رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس عذاب سے ڈرا رہا ہوں۔ اگر فرض محال ایسا ہو جائے کہ فرشتہ ان کے سامنے آئے اور کتاب دے اور وہ ایمان نہ لائیں تو اس تکبر کی وجہ سے جو ان کے دلوں میں راسخ ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ اُن کی ہلاکت کا فرمان جاری کر دے گا

اور ان کے لیے کوئی مہلت باقی نہ رہے گی۔ جبکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان سے عذاب کو دور کیا ہوا تھا۔

فرشتوں کے نزول سے اُن کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے ایک فرد کی جگہ فرشتے رسالت اور اللہ کی طرف دعوت دینے کا کام انجام دیں یا کم از کم ایک فرشتہ پیغمبر اکرم ﷺ کی مدد کرے اور اُن کی صداقت اور حقانیت کا گواہ ہو۔ (سورہ فرقان، آیت: ۷) ترجمہ: کیوں فرشتہ ان پر نازل نہیں ہوا، وہ فرشتہ ڈرانے کے مسئلے میں ان کا مددگار ہو" اس سب کا جواب اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت میں دیا ہے:۔

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

"اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور انہیں اسی شبہ میں ڈالے رکھتا جس میں اب مبتلا ہیں"۔

کفار کے بہانوں کا جواب

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اگر فرشتہ بھی اتارتے تو فرشتہ بھی آدمی ہی کی شکل میں ہوتا اور آدمیوں کی طرح ہی لباس پہنتا اور جس طرح پہلے اشتباہ کا شکار ہوئے فرشتہ آنے کے بعد بھی اسی طرح کے اشتباہ کا شکار ہوتے۔ "لَبس" ایسی چیز کے چھپانے کو کہتے ہیں جسے پر پردہ ڈالنا ضروری ہو۔ اور "لُبس" حق کو چھپانے اور حق کو دوسرے پر مشتبہ بنانے کو کہا جاتا ہے جیسے جھوٹے پروپیگنڈے ہوتے ہیں جہاں غلط قسم کی تبلیغات علماء سو اور بدکردار علماء کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کی جہالت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، حق کو باطل بنا کر اور باطل کو حق بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح جابر اور مستکبر حکمران بھی اپنی رعیت کے ساتھ ایسا ہی عمل کرتے ہیں۔ اپنے اوپر حق کو مشتبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ذہن میں ایسا خیال کرنا کہ حق باطل ہے اور باطل حق ہے؛ اور اسی بنا

پر حق کے بجائے باطل کی پیروی کرنا۔ جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے (سورہ شمس، آیت: ۷) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”انسان کو فجور اور تقویٰ کا الہام کیا“۔

انسان کا اپنی نفسانی خواہشات کو مضبوط بنانا اور شہوات اور غضب کو تقویت دینا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ اس کے اندر گردن کشی اور تکبر کا ملکہ پیدا ہو جائے اور جب ایسا ہو جائے تو یقینی طور پر آدمی اپنے باطل عمل پر بھی مغرور ہوتا ہے اور حق کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ حق اور باطل اس کی نظر میں مشتبہ ہو جاتے ہیں جیسا کہ فرعون نے بنی اسرائیل اور مصر کے لوگوں سے کہا تھا: (سورہ زخرف، آیت ۵۴) : ترجمہ: ”اے قوم کیا مصر کی سلطنت اور اقتدار میرے پاس نہیں ہے، کیا اس میں دریا نہیں چل رہے میرے پاؤں کے نیچے، کیا یہ فقیر اور بے حیثیت آدمی بہتر ہے جو صحیح سے بول بھی نہیں سکتا یا میں؟ اس کے اوپر سونے کے زیورات کیوں نہیں آتے، یا فرشتے اس کے ساتھ اس کی مدد کے لیے کیوں نہیں آتے؟ فرعون ان باتوں سے اپنی قوم کو اپنا گرویدہ بناتا اور ان سے اپنی اطاعت کرواتا“۔ اسی طرح (سورہ مومن، آیت: ۲۹) میں آیا ہے: ” میں اس کے سوائے کچھ نہیں، جو صحیح ہے اس کو دکھاتا ہوں اور جو راہ ہدایت کے سوا کچھ اور نہیں ہے میں اس کی راہنمائی کرتا ہوں“۔

اگر ہم اپنے نفس کے حالات اور اس کی کیفیات کا جائزہ لیں اور انصاف کریں تو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ اگر بری عادات ہمارے نفس میں راسخ ہوں تو وہ ہمیں گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں، حق کو ہمارے اوپر مشتبہ بنا دیتی ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں انسان کو اختیار حاصل ہے وہ یہاں پر چاہے تو حقیقی سعادت کو حاصل کرنے کے درپے ہو اور اگر چاہے تو اپنے نقصان اور گھاٹے کا سامان مہیا کرے۔ اس دنیا میں حقیقی سعادت فقط اختیار کے راستے سے ہی حاصل ہوتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس بارے (سورہ دہر، آیت: ۳) میں آیا ہے: ترجمہ: ”ہم نے تو اسے ہدایت کر دی سبیل راستے کی، شکر

گذار رہے یا انکاری، کفران کرے"۔ لہٰذا انسان کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس کا اپنے عمل اور کوشش سے ہوتا ہے اور وہ بہت جلد اپنے عمل کے نتیجے کو دیکھے گا۔ (سورہ النجم، آیت: ۴۱): "انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہ کہ جس کی اس نے کوشش کی ہے اور اپنی کوشش کو بہت قریب سے دیکھے گا"۔ (سورہ شوریٰ، آیت: ۲۰): ترجمہ: "جو بھی دُنیا میں آخرت کی کاشت کے لیے کوشش کرے تو ہم اسے دُنیاوی اجر بھی دیں گے اور اگر کوئی دُنیاوی اجر کے لیے کرے، دنیاوی فائدے کے لیے تو اس کے لیے بس دنیاوی فائدہ ہی ہے، آخرت میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

یہی وجہ ہے کیونکہ اللہ کی دعوت کو قبول کرنا بندوں کے اختیار سے ہے، اس میں کسی قسم کا جبر نہیں، اللہ کے رسول اور پیغمبر بھی انسانوں ہی میں سے آئے تاکہ وہ انہی کی زبان میں ان سے بات کریں اور ان کو اطاعت کے ساتھ جوڑ سکیں اور شقاوت و بدبختی سے نجات دلا سکیں۔ اب انسان کا اختیار ہے کہ وہ سعادت والا راستہ اختیار کرے یا بدبختی والا۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ آسمان سے فرشتہ بھیج کر ان کو اپنی دعوت قبول کرنے پر مجبور کرے۔ اس بنا پر:

۱۔ اگر آسمان سے فرشتہ بھی نازل ہوتا تو وہ بھی آدمی ہی کی شکل میں ہوتا اور اگر فرشتہ اسی ملکوتی آسمانی شکل میں ہوتا تو اس کا لازمہ یہ ہوتا کہ عالم غیب، عالم شہادت میں تبدیل ہوتا اور پھر اجبار اور زبردستی درمیان میں آجاتی۔

۲۔ اگر خدا نے انہیں گمراہ کیا ہے تو یہ گمراہی اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے لیے گمراہی کو اختیار کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ خدا نے انہیں گمراہ کیا ہو۔ انہوں نے گمراہی کے اسباب اپنائے تو خدا نے انہی اسباب کا اثر ان کے لیے دے دیا۔ اللہ کسی کو ابتدائی طور پر گمراہ نہیں کرتا، اللہ کا نظام ہے کہ جیسا سبب اختیار کرو گے اسی کا نتیجہ ہی ملے گا۔

۳۔اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں کفار پر احتجاج کرنا چاہتا ہے اسی لیے فرمایا کہ اگر خداوند تبارک و تعالیٰ فرشتہ بھی ہدایت کے لیے بھیجتا تو پھر بھی تمہارے حال پر کوئی فائدہ نہ دیتا کیونکہ فرشتے نے بھی آدمی ہی کی شکل میں آنا تھا اور انسان کی جنس سے ہی ہوتا لہٰذا اس میں فرق نہیں ہے کہ تمہاری ہدایت کے لیے ہماری طرف سے تائید شدہ رسول آئے یا فرشتہ آجائے، فرشتے کے آنے سے بھی تمہارے حال پر کوئی تبدیلی نہیں آنی۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

''اور تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے پھر جن لوگوں نے ان سے مذاق کیا تھا انہیں اسی عذاب نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کی پیغمبر اکرمؐ کو تسلی

''حیق'' حلول کرنے اور وقت کے پہنچ جانے کو کہا جاتا ہے۔ ''استھزاء'' مذاق اڑانا۔ کفار پیغمبروں کا اس طرح مذاق اڑاتے تھے کہ پیغمبر انہیں جس عذاب سے ڈراتے تھے کہ اگر اللہ کے احکام کی مخالفت کروگے تو تمہیں یہ سزا ملے گی، تمہارے اوپر عذاب آئے گا۔ اس بات کو سن کر کفار پیغمبر کا مذاق اڑاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہی عذاب ان پر اترتا جس کا پیغمبرؑ نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ اور اب ان کو کہا گیا کہ تمسخر اڑانے کا مزہ چکھو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ آپ مشرکین کو ڈرا رہے ہیں اور انہیں بتا رہے ہیں کہ اللہ کے شریک بنانے کی یہ سزا ہے تو مذاق اڑاتے ہیں تو انہیں بھی اس مذاق کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

"کہہ دو کہ ملک میں سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔

عبرت کے لیے سابقہ اقوام کے حالات کا مطالعہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نصیحت اور موعظہ سننے کے بارے فرمان جاری کیا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ گزر چکے ہیں اُن کے حالات کا مطالعہ کرو، ان کے بارے تحقیق کرو اور ان سے عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ کون سی اقوام تھیں، کتنی طاقتور تھیں ان کے اعمال کیا تھے اور کس طرح وہ ہلاک ہوئیں اور ان کی ہلاکت کی وجوہات کیا تھیں۔ان کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا، سوائے ایک کہانی کے کہ یہ ایسے لوگ ہوتے تھے، بس!۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

"ان سے پوچھو آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے، کہہ دو سب کچھ اللہ ہی کا ہے، اس نے اپنے اوپر رحم لازم کر لیا ہے، وہ قیامت کے دن تم سب کو ضرور اکھٹا کرے گا جس میں کچھ شک نہیں، جو لوگ اپنی جانوں کو نقصان میں ڈال چکے وہ ایمان نہیں لاتے"۔

معاد کے بارے ثبوت

اس آیت میں سوال و جواب کی صورت میں معاد کے متعلق دلیل دی جا رہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا مالک کون ہے؟ اس سوال کے جواب بھی خود دیا اور فرمایا کہ ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جیسے چاہے ان

میں تصرف کر سکتا ہے۔ خداوند عالم نے رحمت کو اپنے اوپر لازمی قرار دیا ہے۔ رحمت، محتاجوں کی حاجت روائی کرنے اور مستحق تک اس چیز کو پہنچانے کو کہتے ہیں جس کا وہ حقدار ہے۔ دوسری طرف اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے اور اس میں سعادت مند زندگی کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا پہلا مقدمہ جس میں کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جس کی مالکیت ہوتی ہے وہی اپنے ملک میں تصرف کر سکتا ہے لہٰذا انسان کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان میں زندگی جاوید کی قابلیت اور صلاحیت موجود ہے جس میں وہ ہمیشہ سکون اور آرام سے رہے۔ دوسرے مقدمے کا تقاضا یہ ہے جس میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر رحمت کرنے کو اپنے اوپر لازمی قرار دیا ہے، کہ وہ انسان کو اس کے لیے ہی مبعوث کرے۔

اس بنا پر برہان کی شکل کچھ اس طرح بنے گی۔ اس برہان کا پہلا مقدمہ یہ جملہ ہے ''ان سے کہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ کس کا ہے؟'' البتہ یہ خود ایک مستقل دلیل بھی بن سکتی ہے۔ برہان کا دوسرا مقدمہ یہ جملہ ہے ''اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کرنا لازمی قرار دیا ہے''۔ اور '' لَيَجْمَعَنَّكُمْ '' اس برہان کے نتیجہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ اگلی آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ ہی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں پایا جاتا ہے '' اس برہان کا تیسرا مقدمہ ہے جو اس پہلے والی آیت کی دلیل کو مکمل کر رہی ہے۔ اگرچہ وہ خود اپنی جگہ پر بھی مکمل برہان اور دلیل ہے۔ پہلے مقدمے میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کو دستور دے رہا ہے کہ کافروں سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ یہ سوال سائل کی نگاہ میں اور جس سے سوال کیا گیا ہے اس کی نگاہ میں واضح امر ہے یعنی خود مخالف بھی اس بات کا معترف ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی مالکیت اللہ کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ وہ خود اس کی جگہ جواب دیں اور اس طرح دلیل کو مکمل کریں۔ اس طرح کے سوال و جواب یعنی دشمن کی

جانب سے جواب دینا اور خود سائل کا جواب دینا یہ کلام کی بدیع سلیقوں سے ایک ہے اور یہ براہین اور دلائل کی تنظیم و ترتیب میں استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے مقدمہ میں کتابت، کسی چیز کو ثابت کرنا یا حتمی حکم کے معنی میں ہے۔ رحمت کے بارے کہا گیا کہ یہ نعمت عطا کرنا، مستحق کو جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے وہ حق دینے کے معنی میں ہے۔ یہ اللہ کی صفات فعلیہ سے ہے لہٰذا جائز ہے کہ خدا اپنے اوپر کسی چیز کو لازم قرار دے لیکن جو صفات ذاتیہ ہیں جیسے علم و حیات ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے بعد ''لَيَجْمَعَنَّكُمْ'' کے ذریعے اس برہان کا نتیجہ لیا گیا ہے۔ اس نتیجہ کا ان مقدمات سے حاصل ہونا بلکل واضح ہے۔ اس مقدمے میں تاکید کے لیے لام قسم بھی استعمال ہوا ہے، نون بھی لائی گئی ہے اور آخر میں صراحتاً یہ فرما دیا ''لاریب فیه'' یعنی اس میں کوئی شک نہیں جب ایسا دن آئے گا تو مومنوں کے لیے فائدہ مند ہو گا اور کفار نقصان اٹھائیں گے۔ آخرت میں مومنین کے لیے خسارہ نہیں ہے، کافروں کے لیے خسارہ ہے کیونکہ اُنہوں نے گمراہی اپنا کر ہدایت ہاتھ سے دے دی ہے اور اپنی عمر کا سرمایہ ضائع کر دیا ہے اور اپنے نفس کو نقصان پہنچایا ہے۔ انہیں فائدہ نہیں ہوا بلکہ اصل سرمایہ بھی ضائع کر بیٹھے۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں پایا جاتا ہے، اور وہی سننے والا جاننے والا ہے''۔

رات اور دن میں موجود سب اللہ ہی کا ہے

اس آیت میں دن اور رات میں پائی جانے والی اشیاء سے عالَم طبیعت میں موجود چیزیں مراد ہیں۔ ظاہر ہے یہ سسٹم نور کا محتاج ہے۔ لہٰذا شب و روز ایک عمومی گہوارہ کی مانند ہیں کہ عالم کے بسیط عناصر اور موالید اور اُن کی ترکیب اس گہوارے میں تیار ہوتی ہے۔ اس

گہوارے میں عالم کلی کے اجزاء کی ہر جزئی اپنے غرض کی جانب اور اپنے مطلوب اور تکامل کی طرف جاری ہوتی ہے۔ ان پر خداوند تبارک و تعالیٰ کا عجیب احاطہ ہے اور شب و روز کے خالق نے اس سسٹم کو ایسا ہی بنایا ہے اور اس میں رہنے والے سب خالق شب و روز کے وسیع تر نظام کے تحت ہیں اور ان سب پر حقیقی مالکیت اسی ذات کی ہے اور ایک وسیع نظام ہے جو بہت ہی شگفت انگیز ہے جو پورے عالم میں جاری ہے۔ یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، اللہ ہی ہر بات کو سننے والا ہے، اشاروں کو بھی سمجھتا ہے، تمام اعمال اور افعال اور حرکات و سکنات سے آگاہ ہے۔ اس طرح وہ ذات اپنی مخلوقات کی بدبختی اور سعادت سے بھی آگاہ ہے۔ کیوں نہ وہ سب سے آگاہ ہو؟ جبکہ سب کچھ اُس کے ملک میں ہے اور اس کے اذن اور ارادے سے ایجاد ہوا ہے اور ہمارے تمام اقوال و اعمال اُسی کے اذن سے انجام پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ان سب کا علم رکھتا ہے، سمع و علم یعنی شنوائی اور دانائی؛ یہ دونوں ایسی صفات ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے عین ہیں۔ سمیع، علیم اللہ کی ذاتی صفات سے ہیں اور یہ ذات کے علاوہ کسی اور امر پر متفرع نہیں ہوتی۔ البتہ ایک قسم کی شنوائی اور دانائی صفات فعلیہ سے بھی ہے، صفات ذاتی سے نہیں ہے۔

لہٰذا اُس کا ثبوت متوقف ہے متعلق کے ثبوت پر نہ کہ اُس کی ذات مقدس پر۔ جیسے خلق، رزق، احیاء، یہ سارے اوصاف مخلوق کے وجود پر متوقف ہیں۔ رزق، یعنی روزی دینا اُس وقت یہ صفت وجود میں آئے گی جب روزی لینے والا ہو، خلق کی صفت اس وقت ہو گی جب ایسی چیز موجود ہو جس کو خلق کیا جائے۔ صفت محیی یعنی زندہ کرنے والا اس وقت ہو گی جب زندہ ہونے والا ہو۔ صفت ممیت یعنی مارنے والا یہ صفت اس وقت صدق آئے گی جب مرنے والا ہو۔ اس قسم کا علم بھی اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ سے ہے اور یہ اس علم متوقف ہوتا ہے اس فعل کے متحقق ہونے پر۔ یعنی خالق اس وقت ہوتا ہے جب خلقت ہوتی ہے، رازق

اس وقت ہوتا ہے جب رزق لینے والا ہوتا ہے۔ ممیت اس وقت ہوتا ہے جب مرنے والا ہوتا ہے اور محی اس وقت ہوتا ہے جب زندہ ہونے والا ہو ہے۔

پس یہ آیت شریفہ اس مقام میں ہے کہ شنوائی اور دانائی دونوں اللہ کا ملک ہیں۔ یہ آیت پچھلی آیت میں بیان شدہ برہان کے لیے ایک طرح کا مقدمہ ہے۔ کیونکہ ابتدائی نگاہ میں ذہن اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے موجودات پر اللہ کی مالکیت کا لازمہ یہ ہے کہ اس میں علم اور شنوائی کی صفت موجود ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پہلی آیت میں ذکر کیا تھا اس کا تکرار کیا اور واضح کیا کہ اس مالکیت کا لازمہ شنوائی اور دانائی ہے۔ یہ آیت معنی کے اعتبار سے قرآن مجید کی لطیف ترین آیات میں سے ایک ہے۔ دلیل، حجت اور اشارہ کے لحاظ سے دقیق ترین اور منطق اور فکر دینے کے اعتبار سے رساء ترین ہے۔ بہت ہی عمدہ طریقے سے اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ شنوائی اور دانائی اللہ کی مالکیت کا لازمہ ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

''کہہ دو کیا میں اس اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مددگار بناؤں جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا، کہہ دو مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اس کا فرمانبردار ہو جاؤں، اور تو ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو''۔

اللہ کی وحدانیت پر دلائل

اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل دی گئی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ شرک اور بت پرستی کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ عقائد میں دو چیزیں بنیاد تھیں:۔

۱۔ مادی منفعت کا حصول اور ضروریات کو پورا کرنا، کیونکہ انسان ہمیشہ زندگی کو جاری رکھنے کے لیے بہت سارے لوازمات کا محتاج ہے جیسے کھانا، پہننے کے لیے کپڑے، بیوی، اولاد، اقوام اسی طرح زندگی کے دیگر لوازمات۔ انسان اکیلا ان سب ضروریات کو پوری نہیں کر سکتا اور اپنی تمام ضروریات پر مسلط نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو مجبور دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے سبب کا سہارا لیتا ہے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرنے میں اس کے لیے مددگار بنے۔ اس لیے انسان اس کے آگے جھکتا ہے اور اس کی پرستش کرلیتا ہے جو اس کی بات کو مانتا ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

۲۔ دوسری بات اپنے آپ سے نقصان اور ضرر کو دُور کرنا۔ انسان کو ہر طرف سے مختلف حادثات اور نامناسب حالات اور مصائب، آفات و بلیات کا سامنا ہوتا ہے جیسے ناگہانی آفات، سیلاب، زلزلہ، طوفان، قحط، وبا، بیماریاں۔ لہٰذا انسان ہمیشہ ایسے اسباب کو حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے جو اس قسم کی مشکلات اور مصائب میں اس کے لیے مددگار بنیں اور ان آفات کو اس سے دُور کرنے میں معاون ہوں۔ کیونکہ انسان کے خیال میں ان مصائب اور مشکلات کا سبب آسمانی موجودات ہیں، وہ ان کی ناراضگی سے بچنے اور ان سے اپنی بات منوانے کے لیے ان کے آگے جھکتا ہے اور ان کو اپنا معبود بنالیتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ ان کو خوش کروں گا تو جو مصائب اور تکالیف ان کی طرف سے آتی ہیں وہ ٹل جائیں گے اور وہ ان تکالیف سے محفوظ رہے گا۔

یہ دو چیزیں مشرکین اور اور بت پرستوں کے شرک اور بت پرستی کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سے یوں سوال کیا کہ کیا اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود بناتے ہو؟ جبکہ تمہاری ضروریات کو اللہ پوری کر رہا ہے، جو تمہارے کھانے پینے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے، جو تمہیں کھانا دے رہا ہے جو تمہیں روزی دے رہا ہے اُسی کا شکر بجالاؤ، اسی کی عبادت کرو۔ اگر ایسا کروگے تو تمہیں اور زیادہ انعامات ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ سوال و جواب کے انداز میں اُنہیں اُن کی غلطی کی طرف متوجہ کریں اور انہیں سمجھائیں کہ منعم کا شکر ایک برہان اور دلیل ہے اور صحیح سوچ ہے کہ منعم تمہارا اللہ تعالیٰ ہے، یہ بت نہیں ہیں۔ حقیقی منعم اور انسان کی نعمت کا ولی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ وہ ہے جس نے اسے خلق کیا ہے، وہ ہے جو سب کو روزی دیتا ہے اور جسے خود روزی کی احتیاج نہیں ہے وہی ہے جس نے کائنات کو ظلمت کی وادی عدم سے وجود کے نور میں لایا ہے اور اسے نور کی روشنی دی ہے، نعمتِ ہستی اسی کی ہے اور اس کے تحقق کو اسی نے یقینی بنایا ہے، سب اس کے مرزوق ہیں، سب اسی سے روزی لیتے ہے۔

طعام یعنی کھانا پینا جو انسان کی واضح ضرورت ہے جو زندہ موجودات ہیں جن میں انسان بھی ہے اسے اپنی زندگی میں اس کی ضرورت ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور وہی معبودیت کا لائق ہے۔ گویا کفار یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہماری ضروریات کو یہ بت پوری کرتے ہیں اس لیے ہم ان کے آگے جھکتے ہیں۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ تمہاری ضروریات کو اللہ تعالیٰ پوری کرتا ہے، وہی تمھارے وسائل پورے کررہا ہے، اس لیے تمہیں چاہیے کہ اسی کی عبادت کرو۔

گفتگو کے اسی سلسلے کو آگے بڑھتے ہوئے کہا کہ ''قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ'' آیت کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا ﷺ مرتبے اور زمانی اعتبار سے پہلا شخص ہے جو ایمان لایا ہے۔ وہ اللہ کے آگے خاضع اور خاشع ہے اور وہ توحید سے شرک کی طرف نہیں جائے

گا۔ کیونکہ اس برہان کا نتیجہ وجوب عبودیت اور اللہ تعالیٰ کے آگے تسلیم محض ہونا ہے۔ عبودیت ہر قسم کا خضوع اور تسلیم اور خشوع ہے۔ یہاں پر لفظ اسلام لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس لفظ کے ذریعے عبادت کی غرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے خضوع اور اگر اسلام کی بجائے ایمان لایا جاتا تو اس سے یہ معنی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ پہلے تسلیم ہونا محقق ہو جاتا ہے اس کے بعد ایمان کا مرحلہ آتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۱۵

''کہہ دو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

رب کی نافرمانی عذاب آخرت کا سبب

اس آیت میں مشرکین کے دوسرے برہان کا جواب دیا گیا ہے جس میں وہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے اس لیے بتوں کو معبود بنا لیا ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر وہ بتوں کی پرستش نہیں کریں گے تو عذاب اترے گا اور بتوں کی پرستش کو چھوڑنا اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے گا اور یہ کہ بتوں کی پرستش انہیں اللہ کی ناراضگی سے بچاتی ہے۔ اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا کہ تم ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے شرک سے منع کیا ہے فقط حکم تعبدی کے لحاظ سے نہیں بلکہ عقلی لحاظ سے بھی فقط اللہ کی پرستش کرو۔ اس نے حکم دیا ہے کہ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ تاکہ بڑے دن کے عذاب کے ڈر سے محفوظ رہو۔ کیونکہ عالم وجود میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات موثر ہے، اللہ کے علاوہ کوئی اور موثر نہیں ہے۔

شدت اور سختی کے لحاظ سے کوئی بھی عذاب، قیامت کے دن کے عذاب کی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ میں خود کو اس عذاب سے بچاؤں اور اس عذاب سے بچانے کا واحد

ذریعہ یہ ہے کہ اس ذات کی عبادت کروں جو پورے عالم کا مالک، خالق اور رب ہے۔ بنابراین آیت کے اس حصے کے ذریعے مشرکین کے اس دعویٰ کا جواب دیا گیا ہے جس میں وہ سمجھتے تھے کہ بت اثر رکھتے ہے اور ان کی ناراضگی عذاب اترنے کا سبب بنے گی۔ ان کے جواب میں پہلی آیت میں عقل کے راستے سے دلیل قائم کی گئی اور پھر اس دلیل کی تائید وحی کے توسط سے ہوئی کہ اللہ کی طرف سے بھی یہی حکم ہے کہ بتوں کی اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے کچھ بھی تاثیر نہیں ہے۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

"جس سے اس دن عذاب ٹل گیا تو اس پر اللہ نے رحم کر دیا، اور یہی بڑی کامیابی ہے"۔

عذاب آخرت کا ٹل جانا ہی بڑی کامیابی

غافل اور سوچ سے عاری شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ پچھلی آیت میں بیان شدہ دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ شرک کرنے سے منع فقط پیغمبر کے لیے ہے لہٰذا عذاب سے ڈرنا اور عذاب سے بچانے کا وجوب اور توحید کا اقرار بھی پیغمبر سے مخصوص ہے۔ اس برہان کا تقاضا یہ نہیں کہ پیغمبر کے علاوہ دوسروں پر بھی خدا واحد کی عبادت واجب ہو۔ اس آیت کے ذریعے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ کا عذاب رسول ﷺ سے مختص نہیں ہے، اللہ کا عذاب سب پر محیط اور سب کو گھیرے ہوئے ہے کوئی بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا، مگر وہ جو اللہ کی رحمت کے وسیلے سے اس عذاب سے رہائی پا لے۔ لہٰذا ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ ایسے دن کے عذاب سے ڈرے جس دن اللہ نے فیصلہ دینا ہے۔ اس دن کا عذاب بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے لہٰذا خدا واحد کی عبادت کرے تاکہ اس عذاب سے محفوظ رہے۔ اس دن وہی

شخص جہنم کے عذاب سے رہائی پالے گا اور بہشت میں پہنچ جائے گا رحمتِ الٰہی جس کے شامل حال ہو گی اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾

''اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اور کوئی دور کرنے والا نہیں، اور اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی نہیں

اس آیت میں بھی مشرکین کے پچھلے دو برہان کا جواب دیا گیا ہے جس میں وہ بتوں کی پرستش کے واسطے جلب منفعت اور دفع ضرر کو دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ تمام خیرات اور شرور اللہ کی طرف سے ہیں، اللہ کے سوا کوئی بھی انسان کو فائدہ پہنچانے اور اس سے نقصان کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ اگر کسی کو فائدہ اور منفعت پہنچانا چاہے تو کوئی نہیں ہے جو اس منفعت کو روکے یا اگر اللہ کسی کو تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی نہیں ہے جو اس تکلیف کو ہٹا دے۔ اللہ کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا۔

''مسّ'' کی تعبیر اس امر کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ جو کچھ انسان کو ملتا ہے خواہ وہ خیر اچھائیاں ہوں یا مضرات اور اس کی ناپسند کی چیزیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے حقیر اور ناچیز ہیں۔ ''وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ'' کے بعد ''فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۷)'' کی تعبیر بھی اسی مطلب کو بیان کر رہی ہے کہ انسان کو پہنچنے والے مصائب اور مشکلات اور یہ ساری اچھائیاں اللہ کی غیر متناہی قدرت کے مقابلے میں معمولی اور

چھوٹے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١٧) '' درحقیقت ''فلا مانع یمنعه'' کی بجائے استعمال ہوا ہے، گویا جس طرح اگر خدا کسی انسان کو شر پہنچانا چاہے تو خدا کے علاوہ کوئی دوسرا اس شر کو اس سے نہیں ہٹا سکتا ہے اسی طرح اگر خداوند متعال کسی انسان کو اچھائی پہنچانا چاہے تو اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کر نہیں سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ کی قدرت غیر متناہی ہے اور کوئی اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان ایسے پروردگار اور رب کی پرستش کرے جس کا کوئی شریک نہیں جو قادر متعلق ہے۔ نہ ان بتوں اور خیالی معبودوں کی عبادت کرے جو نہ تو کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، وہ کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو فائدہ پہنچانے کی قدرت بھی نہیں رکھتے اور نہ اپنے سے نقصان کو دور کر سکتے ہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝١٨

''اور اپنے بندوں پر اسی کا زور ہے، اور وہی حکمت والا خبردار ہے''۔

اللہ حکمت اور قدرت والا ہے

''قهر'' ایسے غلبے کو کہا جاتا ہے جس میں ایک چیز دوسری چیز پر اس طرح غالب آجائے کہ غالب آنے والی چیز مغلوب ہونے والی چیز پر اثر کرے اور مغلوب ہونے والی چیز غالب آنے والی چیز کے اثر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائے اور اس کا اثر بھی غالب آنے والی چیز کے اثر کے مخالف ہو۔ جیسے پانی آگ پر ڈالا جائے تو آگ خاموش ہو جاتی ہے اور آگ کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے یعنی پانی آگ پر غالب آجاتا ہے اور آگ پر پانی کا قہر ٹوٹ پڑتا ہے لہٰذا آگ اپنا اثر چھوڑ دیتی ہے اور پانی اپنا اثر کرتا ہے۔ عالم وجود کے تمام اسباب اسی طرح ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایجاد کیا ہے اور ان کا اظہار فرمایا ہے کہ یہ واسطے ہوں دوسرے حوادث اور واقعات کے ایجاد کے لیے، لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو مسببات کو اسباب کے آثار سے

متاثر کرتا ہے۔ معلول اس بات پر مجبور ہے کہ وہ علت کے آثار کو قبول کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے ایسا قرار دیا ہے کہ ایک کی طرف سے عمل ہو اور دوسرے کی طرف سے اثر پذیری ہو۔

تمام اسباب اور مسببات اللہ کے آگے مقہور و مغلوب ہیں۔ اللہ کے ارادے کے آگے مقہور ہیں کہ وہی تاثیر ہوگی جو اللہ کا ارادہ ہے۔ اللہ سب پر قدرت رکھتا ہے لفظ ''قاھر'' اللہ کے اسماء میں سے ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور اسباب کے سلسلہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ مگر اللہ کے ''قاھر'' ہونے اور اس کے غلبہ اور اسباب کے ''قاھر'' ہونے اور ان کے غلبے میں فرق ہے کیونکہ عام اسباب میں قاھر اور مقھور مرتبہ وجودی اور درجہ ہستی میں برابر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مخلوقات پر ''قاھر'' ہونا اور اس ذات کا مسبات پر غلبہ ایسا غلبہ ہے جو احاطہ مطلق ہے اور غالب و برتر ہے۔ موجودات پر اللہ کا غلبہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، بغیر ہدف کے نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا فعل جہل اور نادانی پر مبنی ہوتا ہے، اس کا ہر عمل علم و حکمت کے تحت ہوتا ہے، وہاں پر نہ تو کوئی خطا ہے اور نہ ہی اشتباہ۔

قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ۙ شَهِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ ۟ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمۡ لَتَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخۡرٰی ؕ قُلۡ لَّاۤ اَشۡهَدُ ۚ قُلۡ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹﴾

''تو پوچھ کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے، کہہ دو اللہ، میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اور مجھ پر یہ قرآن اتارا گیا ہے تاکہ تمہیں اس کے ذریعہ سے ڈراؤں اور اس کو بھی جس تک یہ قرآن پہنچے، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی

معبود ہیں، کہہ دو میں تو گواہی نہیں دیتا، کہہ دو وہی ایک معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں"۔

اللہ کی وحدانیت پر دلیل

یہ آیات وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر احتجاج اور دلیل پیش کرنے کے درپے ہیں، اگرچہ یہ مسئلہ عقلی ہے اور عقلی طور پر بیان بھی ہو چکا ہے لیکن کسی مسئلہ کے عقلی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو وحی کے ذریعے ثابت نہ کیا جاسکے۔ کیونکہ عقلی برہان اور دلیل کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس چیز پر عقلی دلیل قائم کی جارہی ہے اس کے بارے یقین حاصل ہو۔ وحی الٰہی بھی بطریق اولیٰ یقین پیدا کرتی ہے اور وہ بھی قرآنی وحی کہ جس کی بنیاد چیلنج اور مبارزہ پر ہے کہ کوئی ہے جو اس کے مقابلے میں اس جیسی آیات لے آئے؟ شہادت اور گواہی کا دائرہ حس اور مشاہدہ کے ذریعے خبر کو سننے اور اس کو پیش کرنے سے وسیع ہے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو دستور دیا ہے کہ مشرکین سے پوچھیں کہ کون سی چیز گواہی کے مسئلے میں سب سے بڑی ہے؟ کیونکہ گواہی کی ذمہ داری کو اٹھانا جو اُس ذمہ داری کو لینے والے ہیں ان کی سمجھ کے درجات کے اختلاف اور اس کی پیچیدگی اور بیان کی وضاحت کے حوالے سے اس کی نوعیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے بغیر شک و تردید کے خداوند تبارک و تعالیٰ گواہی کو اپنے ذمہ لینے میں سب سے برتر ہے کیونکہ وہ پورے عالم میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے آگاہ ہے اور بندوں کے جتنے اعمال و افعال ہیں اُن کے بارے میں بھی وہ آگاہی رکھتا ہے، کیونکہ وہی ہے جس نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے، وہی ہے جو سب چیزوں پر محیط ہے۔ غفلت، بھول چوک، خطاء، نیند، اونگھ جیسی چیزیں وہاں پر نہیں ہیں۔ کوئی ذرہ آسمانوں اور زمین میں ایسا نہیں ہے جو اس سے مخفی ہو۔ پس پورے عالم

پر اللہ تبارک و تعالیٰ سب سے بڑا گواہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تمہارے اور میرے درمیان اللہ گواہ ہے۔

یہ جملہ ذکر شدہ سوال کا جواب بھی ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی اس خبر پر مشتمل ہے جس میں آپ نے بتایا کہ خداوند گواہ ہے۔ اور یہ خود جداگانہ شہادت اور گواہی بھی ہے۔ کیونکہ کلمہ ''قُلْ'' سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ خدا نے اُن سے فرمایا ہے کہ مشرکین کو اللہ کے گواہ ہونے کی خبر دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی گواہی رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ہے۔ پس یہ جملہ حقیقت میں تمام چیزوں پر اللہ کی گواہی اور اسی طرح پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت پر بھی گواہی کے متعلق ہے۔

بعد والے جملے میں انذار اور خبردار کرنے کا مسئلہ اور نزول قرآن کا ہدف بیان کیا گیا ہے؟ نبوت کی دعوت انذار اور ڈرانے کے ذریعے آغاز ہوئی۔ کیونکہ انذار اور ڈرانا عام لوگوں کے لیے طمع و لالچ دینے سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔ قرآن لوگوں کو اس عذاب سے ڈراتا ہے جس میں وہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے داخل ہونگے۔ اللہ کی ناراضگی سے ڈراتا ہے، اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہے تاکہ وہ ایمان سے فرار نہ کریں، اللہ پر ایمان لے آئیں۔ ''وَمَنْ بَلَغَ'' سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت عمومی ہے اور قرآن ابدی ہے اور اسلام کی دعوت میں فرق نہیں ہے، اُن کے درمیان جنہوں نے خود پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا اور ان کے درمیان جنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نہیں سنا بلکہ ان کے بعد آنے والے واسطوں سے سنا۔ اسی طرح قرآن کی دعوت میں ان لوگوں کے درمیان جو پیغمبر ﷺ کی حیات میں تھے یا آپ کی حیات طیبہ کے بعد آئیں گے کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن سب کے لیے اللہ کی طرف سے دلیل ناطق ہے اور یہ کتاب نازل ہونے کے دن سے لے کر قیامت تک حق کے فائدے میں اور باطل کے نقصان میں، حق کے ثبوت کے لیے اور باطل کے بطلان کے لیے دلیل ہے۔ قرآن کے الفاظ کو جو بھی سنے اور اس کے معنی کو سمجھے تو اس کے

مقاصد کو پالیتا ہے اور جو عربی زبان نہیں سمجھ سکتا اس کے لیے اگر ترجمہ کیا جائے تو اس کے لیے بھی حجت ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اللہ تعالیٰ کی شہادت اور گواہی کو ذکر کرنے کے بعد جو کہ سب سے بڑا گواہ ہے؛ فرمایا ہمارا نبی لوگوں کو توحید یدین کی طرف دعوت دیتا ہے، اس کے بعد اللہ نے اپنے نبی کو دستور دیا ہے کہ مشرکین سے تعجب اور انکار کے طور پر سوال کرو کہ کیا ان سب دلائل کے باوجود تم الٰہ کے متعدد ہونے کی گواہی دیتے ہو اور اللہ کی وحدانیت کی گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟ اس مطلب کو لفظ "ان" اور "لام" سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے جو تاکید کے لیے ہیں۔ اسکے بعد ان کو دستور دیا گیا ہے کہ وہ ان کی بے جا گواہی کی مخالفت کریں اور اس بے جا گواہی سے برات کا اظہار کریں۔ " قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾ " اور یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی اور شرک اور ان کے شرکاء سے برائت کا اظہار ہے جن کو مشرکین اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ کیونکہ "شرک سب سے بڑا گناہ ہے" (سورہ لقمان، آیت : ۱۳)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے پہچانتے ہیں ایسے ہی جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور جو لوگ اپنی جانوں کو نقصان میں ڈال چکے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے"۔

آسمانی کتب میں پیغمبرؐ کی نبوت کی گواہی

یہ آیت خبر دے رہی ہے کہ اہل کتاب کی آسمانی کتاب میں جو گواہی اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبرؐ کی نبوت کے ثبوت کے متعلق دی ہے اُن کے علماء اس گواہی کے بارے کافی اطلاعات رکھتے تھے۔ کیونکہ ان کتابوں میں سابقہ انبیاء کی طرف سے آئی بشارتیں موجود تھیں۔ یہ بشارتیں ایسی تھیں کہ اُن کے بارے میں شک اور تردید کی کوئی گنجایش نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کی آمد کی گواہی دے رہی تھیں اور ان کے اوصاف بیان کر رہی تھیں۔ اب بھی ان کے پاس یہ چیزیں موجود ہیں۔ لہٰذا وہ پیغمبر ﷺ کے بارے میں اسی طرح علم رکھتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں۔ خصوصاً اہل کتاب کے علماء ان تمام بشارتوں سے آگاہ تھے۔ لیکن انہوں نے اس کو چھپایا اور پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں نقصان اُٹھانے والے قرار دیا اور فرمایا کہ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوگا کہ انسان حق کو پہچانے، حق کو جانے اور پھر اس کا انکار کردے اور حق پر پردہ ڈالے؛ اس سے بڑی بدبختی اور اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے، بے شک ظالم نجات نہیں پائیں گے''۔

بدترین ظلم

ظلم بدترین گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ بلکہ دوسرے تمام گناہوں کی برائی اتنی ہی مقدار میں ہوتی ہے جتنا ان میں ظلم ہوتا ہے۔ ظلم کا معنی ہے عدالت سے نکلنا، انصاف کو چھوڑنا، حد وسط سے نکل جانا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح ظلم، ظالم کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے، اسی طرح مظلوم کے اعتبار سے بھی ظلم کی شدت یا ضعف میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں جن اشخاص کی حیثیت اور شان عظیم تر ہے ان پر ہونے والا ظلم بھی عظیم اور بہت برا کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی آیات قدر اور منزلت کے اعتبار سے سب سے مقدس ہیں جس کی منزلت سب سے بلند تر ہے، جو سب سے عزیز تر ہے وہ ذات پروردگار ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس ذات کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور اس کی آیات کو جھٹلاتا ہے تو ایسا شخص ہر ظالم سے بڑا ظالم ہے اور ایسے شخص نے کسی اور پر نہیں اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

اللہ پر افترا اور جھوٹ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جائے یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے اس کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے اور کہا جائے کہ اللہ نے مجھے نبی بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جو صادق الوعد ہے اس کی دعوت کو جو کہ الٰہی آیات و معجزات کے ساتھ ملی ہوئی ہے اس کو جھٹلایا جائے یا دین حق کا انکار کیا جائے یا کلی طور پر کائنات کے خالق کا انکار کر دینا یہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں کہ انہوں نے اللہ پر ظلم کیا ہے۔ یعنی اس ذات اقدس کی شان میں گستاخی کی ہے۔ فلاح سعادت و خوش بختی کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ جو شخص ظالم ہے وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ یعنی ظالم اپنی آرزوں اور امیدوں کو نہیں پا سکے گا۔ جن مقاصد کے لیے وہ کوشاں ہوتے ہیں وہ انہیں حاصل نہیں ہو سکیں گی اور اپنے اہداف و مقاصد میں ناکام رہیں گے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظلم سعادت تک پہنچنے میں مانع و رکاوٹ ہے۔

سعادت اس وقت ہی سعادت کہلائے گی جب حقیقت میں مطلوب ہو، خیالی اور تصوراتی نہ ہو۔ فلاح کا مطلب ہے کسی چیز کا کھل جانا اور سعادت تک پہنچنا۔ دنیاوی سعادت دنیا کو پانا ہے۔انسان کی دنیاوی سعادت اس کی بقاء، دولت اور عزت میں ہے۔ جبکہ اس کی اُخروی سعادت فنا کے بغیر بقا، فقر کے بغیر غنٰی، ذلت کے بغیر عزت اور جہالت کے بغیر علم ہے۔

پورے عالم کا نظام اس طرح ہے کہ جس مقصد تک پہنچنا چاہتے ہوں تو اس مقصد کا مخصوص راستہ ہوتا ہے اسی راستے سے اپنے ہدف تک پہنچا جاسکتا ہے اس مخصوص راستے کے بغیر ہدف تک نہیں پہنچ سکتے۔ کائنات کے اسی نظام سے ہی عقائد و آراء وجود میں آتے ہیں جو باقی انسانی عقائد کا معیار بنتے ہیں۔ جیسے مبداء و معاد کا عقیدہ۔ یہ وہی راستہ ہے کہ جو انسان کو ابدی سعادت تک پہنچاتا ہے۔ سعادت تک پہنچنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔اس راستے سے منحرف ہو جانا ظلم ہے۔ کیونکہ اگر انسان اس راستے سے منحرف ہو جائے تو اپنی آرزوں کو نہیں پا سکے گا۔ اگر پہنچ بھی جائے تو بھی اس میں دوام یا بقاء نہیں ہو گی۔ پس عقائد ایسے راستے ہیں کہ اگر عدالت پر مبنی ہوں تو انسان کو فلاح و سعادت تک لے جائیں گے۔ اور اگر عدل سے خارج ہو جائیں اور انصاف کے راستے سے ہٹ جائیں تو یہ گھاٹے کا سودا ہو گا۔

ظالم بعض دفعہ غیر مشروع اور ناجائز مقصد تک جانے کے لیے اپنی جھوٹی اور بناوٹی قدرت اور طاقت کو استعمال کرتا ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے عقائد حقہ اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی مخالفت کرتا ہے اور لوگوں کی جان و مال پر تجاوز کرتا ہے، اللہ کی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرے گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے جیسے جھوٹ بولنا، اور دھوکہ دینا، افتراء باندھنا۔ ممکن ہے ان اعمال کے ذریعے وہ ظاہری طور پر اپنے مقصد کو پہنچ جائے لیکن اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے دنیا و آخرت میں اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے پوری عمر سعی و کوشش میں گزار دی اور دنیا میں ہرج و مرج کے نظام میں خلل کا سبب بنا۔ انسان

کا بنایا ہوا نظام اس ظلم کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس نے اس ظلم کو جاری رکھا اور یہ ظلم اسے ناکامیوں کے سوا کچھ نہیں دے گا اور اس کے صحیفہ اعمال میں یہ ظلم درج ہوگا اور قیامت کے دن اسی کے مطابق اس کے اعمال کی سزا دی جائے گی اور وہ سزا بھگتے گا۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾

"اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شرک کیا تھا کہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کا تمہیں دعویٰ تھا"۔

قیامت میں مشرکین کا اپنے شرکاء کا انکار

اس آیت میں قیامت کے دن کی یاد دلائی گئی ہے کہ جو دن رب تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ہوگا۔ وہ ایسا دن ہے جس سے کوئی بھی فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ اس دن سب نے جمع ہونا ہے اور بہت جلد حساب کے لیے سب کو بلایا جائے گا، سب محشور ہونگے۔ اس دن ظالموں اور مشرکوں سے سوال کیا جائے گا وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم اللہ کے شریک بنایا کرتے تھے؟ وہ ان کو موجود نہیں پائیں گے تاکہ انہیں حاضر کر سکیں اس لیے وہ اپنے شرک کا انکار کرینگے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ ظالم لوگ جنہوں نے اللہ کے لیے شریک بنائے تھے اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو اس دن اپنے شرکاء کو موجود پاتے اور اپنے شریک کو نہ جھٹلاتے بلکہ اپنے دعویٰ کے مطابق ان کو اپنا شفیع بناتے اور سفارشی قرار دیتے۔ لیکن ایسا نہیں کر پائیں گے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾

"پھر سوائے اس کے ان کا اور کوئی بہانہ نہ ہوگا کہ کہیں گے ہمیں اللہ اپنے پروردگار کی قسم ہے کہ ہم تو مشرک نہیں تھے"۔

قیامت میں کوئی عذر یا بہانہ کام نہ آئے گا

یہ ان کا جواب ہے جن کو جب امتحان کے مقام پر لایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ بلاؤ اپنے شرکا کو۔ تو وہ ادھر ادھر دیکھیں گے اور ان کو موجود نہیں پائیں گے جن کو انہوں نے دنیا میں اللہ کا شریک ٹھہرایا تھا۔ تو وہاں پر اللہ کی قسم اٹھائیں گے کہ ہم تو مشرکین سے تھے ہی نہیں۔ اور اپنے اس بہانہ تراشی سے عذاب سے بچنا چاہیں گے اور اپنے شرک کو خود ہی جھٹلائیں گے لیکن یہ جھوٹی قسم ہوگی اور ان کے خلاف جائے گی۔ اور وہ گھاٹے میں ہونگے۔ اس دن کا عذر انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔

انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

"دیکھو اپنے اوپر انہوں نے کیسا جھوٹ بولا، اور جو باتیں وہ بنایا کرتے تھے وہ سب غائب ہو گئیں"۔

اپنے خلاف جھوٹ بولنا

قیامت کے دن مشرکین اپنے اوپر جھوٹ باندھیں گے۔ وہ شرکا جو جھوٹے تھے۔ اور اللہ پر افترا باندھ کر اپنے لیے شریک بنائے ہوئے تھے جب ان کو موجود نہیں پائیں گے۔ تو وہ اس وقت قسم اٹھائیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے۔ حالانکہ دنیا میں اس بات کے دعویدار تھے کہ اللہ کے شرکاء ہیں اور کسی دلیل و برہان کو نہیں مانتے تھے اور یہاں پر آکر انکار کریں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے آپ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ جو خود کرتے تھے وہ جھوٹ تھا۔ یہاں آکر قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایسا نہیں کرتے تھے۔ اب یہ بات کہ کس طرح وہ اپنے جھوٹے شرکاء کو قیامت کے دن موجود نہیں پائیں گے وہ اس طرح ہو گا کہ قیامت ایسا دن ہے جس میں سارے حقایق عیاں ہونگے۔ اس دن ملک و قوت سب کے سب اللہ کے لیے ہے اور جو

غیر اللہ ہے اس کے لیے سوائے ذلت، رسوائی، فقر، حاجت مندی اور افلاس کے کچھ بھی نہیں ہے۔

" وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝١٩ " (سورہ انفطار، آیت ۱۹)

"اور اس دن تمام معاملات اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہونگے۔"

اس دن مشرکین پر یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ ان کے شرکاء خیالی تھے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہی نہیں تھے وہاں پر وہ اللہ کے ہاں شفاعت بھی نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی ان کے پاس تدبیر کا اختیار ہوگا۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگا۔ یہ سب مشاہدہ کرینگے۔ظاہر ہے وہ ان شرکاء کو کیسے مشاہدہ کرینگے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٢٥

"اور بعض ان میں سے تیری طرف کان لگائے رہتے ہیں، اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے، اور اگر یہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تو بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو تم سے جھگڑتے ہیں کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہی ہیں"۔

مشرکین کے شرک کی وجہ

''اَکِنَّۃً'' اس چادر اور پردہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپا لے۔ ''وَقْرًا'' کانوں کا بھاری ہونا۔ اور ''اَسَاطِیْرُ'' اسطورہ کی جمع ہے جو جھوٹ، کذب اور دھوکہ اور خیالات پر مشتمل مجموعے کو کہا جاتا ہے۔ ایک منظّم کہانی جس میں سوائے جھوٹ کے کچھ نہ ہو اور افسانہ ہو۔ اس آیت میں مشرکین کی حق کی مخالفت کی وجہ بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے برے اعمال ہی ان کے حق کی مخالفت کا اصل سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کے کان بھاری ہو گئے ہیں حق کا وہ ادراک نہیں کرتے۔ ان کی گندی عادت، تکبر اور غرور کی وجہ سے اللہ نے بھی طے کیا ہے کہ ان کو ہدایت نہ دے۔ ان کی آنکھیں حق دیکھنے سے عاجز ہیں، ان کے کان بہرے ہیں، دل سخت ہیں، حق ان میں نفوذ نہیں کرتا۔ پس وہ جھگڑے اور دشمنی کے لیے اسی کفر پر باقی رہتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے ہیں اور ہدایت کی نیت سے نہیں۔ مجادلہ اور اعتراض برائے اعتراض کے لیے آتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں اور قرآن کی آیات سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سب خرافات، قصے کہانیوں اور پرانے افسانوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اس طرح وہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ انکی ہٹ دھرمی ہے گونگے، بہرے اور اندھے بنے ہوئے ہیں۔

وَ هُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَ يَنۡـَٔوۡنَ عَنۡهُ‌ۚ وَ اِنۡ يُّهۡلِكُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَ مَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝٢٦

''اور یہ لوگ اس (قرآن سننے سے) سے روکتے ہیں اور خود بھی اس (قرآن) سے دور بھاگتے ہیں، اور وہ (اس رویہ سے) نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو ہی اور وہ اس بات کو سمجھتے نہیں''۔

نا سمجھی کی انتہاء

یہ وہی لوگ ہیں جو دوسروں کو قرآن کی پیروی سے روکتے ہیں اور قرآن سے ان لوگوں کو دور کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ لوگوں کو قرآن سے دور رکھنا قرآن کو مٹا دینے اور اللہ کی دعوت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے حالانکہ اللہ خواہ یہ چاہیں یا نہ چاہیں اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ یہ بے نوا لوگ اپنی ہلاکت کا سامان خود مہیا کرتے ہے لیکن یہ خود سمجھتے نہیں کہ ایسے اقدامات سے وہ خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ انتہاء درجہ کے نا سمجھ ہیں۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾

”کاش! تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے، اس وقت کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم واپس بھیج دیے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں“۔

جہنم میں مشرکین کی بری حالت

جب قیامت کا دن ہوگا اور کافروں کو آتش جہنم کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ آگ کے بھڑکتے شعلے دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کاش ایک بار پھر ہمیں دنیا میں پلٹا دیا جاتا تو ہم وہاں جا کر اللہ کی آیات کو نہ جھٹلاتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔ ان کی یہ آرزو ایسے ہی ہے جیسے وہ میدان محشر میں اپنے مشرک ہونے کا انکار کریں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے کہ ہم مشرکین سے نہیں تھے۔ جس طرح جھوٹ بولنا ان کا نفسانی ملکہ تھا جو ان کے باطن میں رچ بس چکا تھا اس لیے بڑی ڈھٹائی سے قیامت کے دن بھی جھوٹ بولیں گے اور قیامت کے دن اچھائی کی آرزو کریں گے جبکہ اس وقت ان کو مہلت نہیں ملے گی۔ اور ان کا یہ نفساتی ملکہ

افسوس اور حسرت کا سبب بنے گا۔ قیامت کے دن وہ اپنی اس دیرینہ بری عادت اور غلطی پر اظہار افسوس کریں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اب محال امر کی آرزو کرنے کا کیا فائدہ اور ایسے وقت میں جب آخرت کی نعمتیں ہاتھ سے جا رہی ہوں اور اپنے اختیار سے ہی سب کچھ دے بیٹھے ہوں اور اپنی تدبیر اور اپنے عمل کی کوتاہی کی وجہ سے سب کچھ ضائع کر بیٹھے ہوں بس اب تو کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ اپنی اس آرزو کو پا سکیں۔ جب اصلاح کا وقت تھا اس وقت کو ٹھیک نہ کیا اور ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے اور قرآن کا انکار کرتے رہے۔ اب جب وقت گزر گیا خواہش کرتے ہیں کہ ہم واپس دنیا میں چلے جائیں اور اللہ کی آیات کو قبول کریں اور مومنین سے ہو جائیں۔ یہ آرزو ہی ہے جو وہ کریں گے جس نے پورا نہیں ہونا۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

”بلکہ جس چیز کو اس سے پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہو گئی، اور اگر یہ واپس بھیج دیے جائیں تب بھی وہی کام کریں گے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ جھوٹے ہیں“۔

قیامت کے دن مشرکین کی حالت

مشرکین جب دوزخ کے کنارے ہونگے اور آگ کے بھڑکتے شعلے دیکھیں گے تو جو کچھ دنیا میں چھپاتے تھے اور نہیں مانتے تھے وہ سب ان پر آشکار ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھے۔ یہی سبب بنے گا کہ وہ دنیا میں واپس جانے کی آرزو کریں گے۔ آیت کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے ان کے لیے جو چیز آشکار ہو گی وہ سوائے آگ کے کچھ اور نہیں ہے، دوزخ کی آگ جو ان کے سامنے آئے گی وہ ان کا عمل ہی ہے جو انہوں نے دنیا میں انجام دیا تھا اور وہی کفر ہے جو انہوں نے دنیا

میں اختیار کیا اور اپنے کفر کے وسیلہ سے حق کا انکار کرتے رہے جو کہ بڑا روشن تھا، حق کو انہوں نے چھپایا اور اسے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کفر کو اختیار کرلیا تو اب وہ آرزو کریں گے کہ دنیا میں واپس پلٹ جائیں۔ یہ حق ظاہر کرنے کے لیے دنیا میں نہیں جارہے بلکہ آتش جہنم کے عذاب کے ڈر سے واپس جانا چاہتے ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ دنیا میں واپس پلٹ جائیں تو پھر وہی غلط کام کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔ کیونکہ گھٹیا، پست اور جاہلانہ رذیلہ صفات ان کے باطن میں رچ بس گئی ہیں اور یہ صفات ان کا ملکہ بن گیا ہے اور انکے دلوں میں برائیوں نے رسوخ کرلیا ہے اور یہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ حق کا جلوہ دنیا میں تھا اس کو انہوں نے ترک کردیا تھا اور حق کو اس کے تمام لوزامات کے ساتھ دیکھنے کے باوجود قبول نہیں کیا۔ جب وہ آگ کو دیکھیں گے تو جو کچھ انہوں نے دنیا میں چھپایا تھا وہ ان کے سامنے آئے گا۔ حق کو دیکھ لیا، حق کے اثرات کو دیکھ لیا اور حق کے انکار کے اثرات کو بھی دیکھ لیا اخروی عذاب کو بھی دیکھ لیا یہ سب سبب بنا ہے کہ وہ دنیا میں جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ انہیں مومنین میں شامل کرلیا جائے تاکہ جو نعمتیں مومنین کو مل رہی ہے وہ بھی ان سے بہرہ مند ہوں۔ لیکن فرض محال یہ دنیا میں واپس پلٹ بھی جائیں تو وہاں ان کے ہاتھ میں اختیار ہوگا تو یہ پھر اپنی نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کے مطابق عمل کریں گے اور معصیت کا ارتکاب کریں گے۔ اور وہی کام انجام دیں گے جو پہلے انجام دیتے تھے۔ کیونکہ استکبار، نفسانی رذائل، غلط صفات اور تکبر وغرور یہ سب اپنی جگہ پر موجود ہے لہٰذا یہ اپنی آرزو میں بھی جھوٹے ہیں۔ کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ اے کاش! ہم پلٹ جاتے تو جھوٹ نہ بولتے اور آیات کو نہ جھٹلاتے۔ یہ نہیں کہہ رہے ہم واپس پلٹیں گے تو پھر وہاں جاکر جھٹلائیں گے نہیں بلکہ کاش! ہم پلٹ جاتے اور آیات کو نہ جھٹلاتے۔

ان دو باتوں میں فرق یہ ہے کہ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم واپس چلے جائیں اور وہاں ہم آیات کو نہ جھٹلاتے، وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ اگر ہم واپس پلٹ گئے تو ان آیات کو نہیں جھٹلائیں گے (دونوں باتوں میں فرق ہے) لہٰذا ان کی گفتگو میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہے وہ موجود ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی اس آرزو میں بھی جھوٹے ہیں کیونکہ یہ آرزو ایسی آرزو ہے جو محال ہے، غیر قابل تحقق ہے اس نے وجود میں نہیں آنا لیکن یہ توجیہ قابل توجہ نہیں۔ مراد وہی ہے جو کہا گیا ہے کہ یہ واپس پلٹ جائیں تو پھر وہی محرمات اور منکرات کا ارتکاب کریں گے کیونکہ یہ اپنی بات میں سچے نہیں بلکہ جھوٹے ہیں۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾

"اور کہتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کے سوا ہمارے لیے اور کوئی زندگی نہیں اور ہم اٹھائے نہیں جائیں گے"۔

معاد کا انکار

یہ آیت معاد کے متعلق مشرکین کے اس واضح انکار کے تسلسل میں ہے جس میں وہ قیامت کا انکار کرتے تھے اور اس بارے گواہوں کو حاضر کرنے کا کہتے تھے اور عقیدہ معاد پر اعتراض کرتے تھے۔ اس انکار کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے والے خود پرست ہیں اور یہی چیز ان کے لیے تباہی کا سبب بنی ہے۔

وَ لَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، وہ فرمائے گا کیا یہ سچ نہیں، کہیں گے ہاں ہمیں اپنے رب کی قسم ہے، فرمائے گا تو پھر اپنے کفر کے بدلے میں عذاب چکھو''۔

کفار کے اعتراض کا جواب

اس آیت میں کفار کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جس میں وہ معاد کا انکار کرتے تھے۔ ان کی گفتگو جو تمنا اور آرزو کی شکل میں تھی اس کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو یہ بات بتا رہا ہے کہ بہت جلد جو یہ کہتے تھے '' مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ '' ہم مرنے کے بعد نہیں اٹھائے جائیں گے اور معاد کا انکار کرتے تھے یہ سب اس کی تصدیق کریں گے اور قیامت کا اعتراف کریں گے اور یہ اس وقت ہوگا جب وہ اپنے رب کی پیش گاہ میں موجود ہونگے اور انبیاء علیہم السلام نے دنیا میں جو کچھ ان کو کہا تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے تو یہ اس کو مشاہدہ کریں گے کہ زندہ ہوگئے ہیں '' اِذْ وُقِفُوْا '' یعنی وہ کھڑے کیے جائیں گے معاد او رحشر میں تو وہ جو بعث کا دن، مرنے کے بعد اٹھائے جانے والا دن، جس کا وہ انکار کرتے تھے ان سے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ کیا یہ وہی دن نہیں ہے جس کا تم انکار کرتے تھے؟ کیا یہ دن حق نہیں تھا؟ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا دن حق نہیں ہے؟ تو وہ قسم اٹھا کے کہیں گے ''قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ '' جی ہاں ہمارے رب کی قسم کہ مرنے کے بعد اٹھایا جانا برحق تھا، ہم اس کا انکار کرتے تھے لیکن یہ برحق تھا۔ پھر اللہ فرمائے گا ٹھیک ہے اگر یہ برحق تھا اور تم اس کا انکار کرتے تھے تو پھر اسی انکار کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَ هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۳۱

''وہ لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے اپنے رب کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان پر قیامت اچانک آ پہنچے گی تو کہیں گے اے افسوس ہم نے اس میں کیسی کوتاہی کی، اور وہ اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے، خبردار! وہ برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائیں گے''۔

رب کی ملاقات کو جھٹلانے والوں کا انجام

کافر معاد اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے منکر ہیں اور یقین کی نعمت ان کے ہاتھ سے چلی گئی اور آخرت پر ان کا یقین نہیں ہے اور انہیں پروردگار کی ملاقات کی امید بھی نہیں ہے۔ اس انکار کے جتنے بھی اثرات ہیں انہوں نے بھگتنے ہیں اور وہ دردناک اخروی عذاب ہے تو حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ جس وقت اچانک ملاقات کا وقت آجائے گا اور قیامت پہنچ جائے گی تو اس وقت ان پر غم کے آثار ہوں گے، پریشانی ہوگی اور جو کچھ ان سے چھوٹ گیا اس پر دکھ محسوس کریں گے اور کہیں گے (واحسرتا) ہائے افسوس! کہ ہم جہالت اور نادانی کی وجہ سے دنیا میں آخرت کے لیے توشہ اور سامان اکٹھا نہ کرسکے اور اس امر میں ہم نے کوتاہی کی۔ قیامت میں ہم گناہوں کا بھاری بوجھ اٹھا کرلے آئے ہیں، کتنا بڑا وزن ہے جو ہم قیامت میں اٹھا کر لائے ہیں۔

یہ آیت پچھلی آیت کا نتیجہ اور اسی سے اخذ شدہ ہے۔ مشرکین آخرت کی راحت اور (لقاء اللہ) کی مسرت کو ہاتھ سے دے بیٹھے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے قبروں سے

اٹھائے جانے کا انکار کیا تھا اور اب وہ اس انکار کا نتیجہ جو دردناک عذاب کی صورت میں ان کو ملا ہے وہ اس عذاب کو جھیل رہے ہیں۔ اس طرح خود انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور خسارہ کمایا، اس نقصان اور خسارے کی وجہ وہ خود ہیں کوئی اور نہیں ہے۔

وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهۡوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

''اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشہ ہے، اور البتہ آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگار ہوئے، کیا تم نہیں سمجھتے''۔

دنیا کی زندگی کھیل، تماشہ ہے

دنیاوی زندگی کیا ہے ؟انسان دنیاوی زندگی کے اعتباری عقائد و خیالات اور نظریات اور وہمی اغراض میں گم ہو کر آخرت کے اہم امور اور اخروی زندگی جو کہ حقیقی اور ابدی زندگی ہے، اس سے رہ جاتا ہے۔ تو گویا دنیاوی زندگی ایک قسم کا لہو ولعب ہی ہے۔ جب انسان کھیل کود میں مصروف ہو جاتا ہے تو اس دوران اس سے بہت سارے ضروری امور چھوٹ جاتے ہیں کیونکہ وہ کھیل کود میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ ''لَعِبٌ'' کا مطلب ہے وہمی چیزوں میں خود کو سرگرم رکھنا یعنی جن کا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ''لَھۡوٌ'' ایسے عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم اور ضروری کاموں سے روک دے۔ اسی لیے اس آیت میں دنیا کو کھیل کود اور تماشا کہا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کو غیر ضروری چیزوں میں مصروف رکھ کر، اہم اور ضروری کاموں سے اس کو روک دیتی ہے۔

آخرت متقین کے لیے خیر اور برکت اور اچھائی کیوں ہے ؟آخرت متقین کے لیے اس لیے خیر اور برکت ہے کیونکہ وہ ایسی حیات ہے جو حقیقی ہے، ثابت ہے اور ہمیشہ کے لیے

ہے۔ یہ زندگی تقویٰ والوں کے لیے ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجالایا۔ لہٰذا آخرت متقین ہی کے لیے خیر ہے کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ دوسرے لوگ تو آخرت کے تھے ہی انکاری تو ان کے لیے خیر کیسے ہو گی؟! انہیں ان کے انکار کی وجہ سے آخرت میں دردناک عذاب کا سامنا کرنا ہو گا، وہ آگ کے بھڑکتے شعلوں کے سامنے کھڑے ہونگے، لہٰذا آخرت کا دن ان کے لیے خیر کا نہیں ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتیں تمہیں غم میں ڈالتی ہیں، سو وہ تجھے نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں''۔

پیغمبر اکرمؐ کو تسلی

یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کا دل خوش کرنے اور آپؐ کے باطن سے غم کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اگر ''يُكَذِّبُوْنَكَ'' کو شد کے بغیر پڑھا جائے ''کذب یکذب یکذبونك'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تیرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کے ذریعہ تجھ پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اگر ''یکذبونك'' کی بجائے اسے ''يُكَذِّبُوْنَكَ'' تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انکا تجھے جھٹلانا اصل میں تجھے جھٹلانا نہیں بلکہ وہ اللہ کی آیات کو جھٹلا رہے ہے۔ لہٰذا آپ کو ان کی باتوں سے غمگین نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تُوں تو فقط اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے کسی اور بات کی طرف تو نہیں بلاتا، تیرا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہے، پیغام لانے والا تو رسول ہے اس کا جھٹلایا جانا حقیقت میں رب تعالیٰ کو جھٹلانا اور اللہ کی آیات پر ظلم کرنا ہے۔ ان کو تسلیم نہ کرکے انکا یہ انکار کرنا ان کے ظلم سے پیدا ہوا ہے جہالت یا اس قسم کی

باتوں سے نہیں ہے بلکہ وہ جانتے ہوئے انکار کر رہے ہیں۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے مقام الوہیت کے ساتھ مقابلہ اور اپنے لیے اس کے مقام پر برتری قرار دینا ہے جبکہ یہ وہ مقام ہے کہ کسی چیز کو اس کے سامنے آکے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

''اور بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے گئے پھر انہوں نے جھٹلائے جانے پر صبر کیا اور وہ ایذا دیے گئے یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچی، اور اللہ کے فیصلے کوئی بدل نہیں سکتا، اور تمہیں پیغمبروں کے حالات کچھ پہنچ چکے ہیں''۔

سابقہ اقوام اور انبیاءؑ کی تکذیب

ان دو آیتوں میں رسول اکرم ﷺ کو گذشتہ انبیاء کی روش اور طریقے کو بیان کیا جارہا ہے کہ ان کی روش اور طریقہ پروردگار کے راستے میں صبر کرنا تھا اس حوالے سے سورۃ انعام آیت نمبر ۹۰ میں فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے تو آپ بھی انہی کی ہدایت کی اقتدا کریں'' اور اس جملے ''حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ'' سے انبیاء کے صبر کرنے کے نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کا ان سے نصرت کا جو وعدہ تھا وہ آگیا۔ یہ جملہ '' وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ'' اس بات کی تاکید ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی نصرت اور تائید حتمی ہے یعنی اس میں کوئی بھی بندہ تبدیلی نہیں لاسکتا، اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے ہیں وہ حتمی ہوتے ہیں، کیونکہ یہ فیصلے خود اس ذات کی جانب سے ہوتے ہیں اور کون ہے جو اس کے فیصلے کو بدلے ؟

مثال کے طور پر اگر حق تعالیٰ کا ارادہ کسی چیز یا قانون کے بارے میں تبدیل ہو جائے تو اسے ثابت کرنے کے بعد نسخ کر دیتا ہے لیکن یہ نسخ کرنا اللہ کے علاوہ کسی اور کی جانب سے نہیں ہو سکتا بلکہ خود اللہ کی طرف سے ہے کچھ امور وہ ہیں جو تبدیل ہی نہیں ہوتے جو لوح محو و اثبات سے باہر ہیں۔ قرآن مجید نے ان امور کے متعلق فرمایا ہے "کلمات اللہ" "قول اللہ" "وعد اللہ" اللہ کی بات، اللہ کا قول، اللہ کا وعدہ یہ اللہ کی طرف سے حتمی احکام ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور اس کا علم اللہ کے پاس ہے یہ جملہ " وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ۝٣٤ " پہلے والی آیتوں کی دلیل اور گواہ کے طور پر ذکر ہوا ہے، رسولوںؑ کی خبر، ان کے واقعات اور ان کے قصے، ان کے حالات وہ سب اللہ کی طرف سے بیان ہوئے ہیں۔ سورہ انعام باقی سورتوں کے بعد اور بعض مکی سورتوں کے بعد اتری ہے جن سورتوں میں انبیاءؑ کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہے جیسے سورۃ شوریٰ، سورۃ مریم۔ البتہ اللہ ہی حقیقت حال سے واقف ہے۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝٣٥

"اور اگر ان کا منہ پھیرنا تم پر گراں ہو رہا ہے پھر اگر تم سے ہو سکے تو کوئی سرنگ زمین میں تلاش کر یا آسمان سے سیڑھی لگا پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لا، اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو سیدھی راہ پر جمع کر دیتا، سو تو نادانوں میں سے نہ ہو"۔

راہ ہدایت اختیار کرنے پر انسان کا مختار ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمارہا ہے کہ اگر وہ تیری بات نہیں مانتے اور گمراہی پر ہی باقی ہیں اور ان کا گمراہی پر باقی رہنا تم پر بہت دشوار ہے اور توں چاہتا ہے کہ سارے ہدایت پا جائیں لیکن وہ ہدایت کے راستے سے منہ موڑ لیتے ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا دائرہ اختیار ہے، یہاں پر انسان کو صاحب اختیار بنایا گیا ہے ان سے اختیار سلب نہیں کیا گیا کہ ان پر سیدھے راستے پر آنے کے لیے زبردستی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حق کا راستہ انتخاب کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لہٰذا اگر آپ چاہو کہ زمین کے اندر سوراخ کرو یا آسمان سے سیڑھی زمین تک لے آؤ اور ان کے لیے ایک ایسا معجزہ لاؤ اور اس معجزہ کی وجہ سے انہیں ایمان پر مجبور کرو تو یہ کام ان کے اختیار کو ختم کرنے کے مترداف ہوگا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت کا راستہ انتخاب کرنے کا اختیار دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ معجزہ چاہتے ہیں تو قرآن خود بڑا معجزہ ہے اور یہ ہدایت کا سامان ہے۔ اگر خدا چاہتا تو سب کو زبردستی ہدایت دے دیتا لیکن ایسی ہدایت خلقت کے نظام کو باطل کر دیتی کیونکہ انسان کی خلقت اختیار کی بنیاد پر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنا کرم ان پر کرتا ہے جو تقویٰ والے ہیں، جنہوں نے اپنے نفس کا تذکیہ کیا ہے۔ اور جو لوگ اپنے رب کے ذکر سے رو گردانی کرتے ہیں، اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں تو یہ چیز ان کے کمال تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہونگے۔ خدا ایسے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

''نفق'' سرنگ کے معنی میں ہے جو زمین کھود کر بنائی جاتی ہے۔ نفاق اسی سے ہے جس کا مطلب ہے ایک دروازے سے دین میں داخل ہونا اور دوسرے دروازے سے دین سے نکل جانا۔ جس طرح ٹنل میں ایک طرف سے داخل ہوتے ہیں اور دوسری طرف سے نکل جاتے ہیں۔

''سُلَّم'' ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے خطرہ کے موقع پر اونچی اور بلند جگہوں سے سلامتی کے ساتھ نیچے اترا جاتا ہے۔ یا اس وسیلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اوپر کی طرف جایا جاتا ہے جسے سیڑھی کہا جاتا ہے۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جانے کا وسیلہ۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

''بس وہی مانتے ہیں جو سنتے ہیں، اور اللہ مردوں کو زندہ کرے گا پھر اس کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

کفار زندہ لاشیں

یہ آیت پچھلی آیت کا بیان ہے اور اسی آیت کے مطلب کو آگے بڑھا رہی ہے کہ تم معجزہ لا کر ان کافروں کی ہدایت نہیں کر سکتے جنہوں نے حق سے منہ موڑا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مردوں کی مانند ہیں۔ ان میں شعور، سننے اور ادراک کرنے کا وسیلہ نہیں تاکہ یہ تیری دعوت کو سمجھ سکیں۔ تم سے ملنے والے لوگ دو قسم کے ہیں: کچھ وہ ہیں جو زندہ ہیں، سنتے ہیں، سمجھتے ہیں اور تیری دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو مُردوں کی مانند ہیں یعنی چلتی پھرتی لاشیں ہیں، بظاہر زندہ ہیں لیکن سنتے نہیں، بات سنی اَن سنی کر دیتے ہیں، وہ اب سمجھتے نہیں ہیں۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا تو اس وقت ان کے لیے حق آشکار ہو جائے گا۔ یہ لوگ اس وقت حق اور حقیقت کو سنیں گے اور سمجھیں گے۔ ان میں جس بات کے سننے اور سمجھنے کی طاقت دنیا میں نہیں تھی وہ وہاں پر حاصل ہو گی، دوسری جگہ اسی مطلب کو اور انداز میں بیان کیا ہے۔

وَ لَوْ تَرٰۤی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ (سورۃ سجدہ، آیت: ۱۲)

ترجمہ ”اور کبھی تو دیکھے جس وقت منکر اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، اے رب ہمارے ہم نے دیکھ اور سن لیا اب ہمیں پھر بھیج دے کہ اچھے کام کریں ہمیں یقین آ گیا ہے“

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

”اور کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، کہہ دو اللہ اس پر قادر ہے کہ نشانی اتارے اور لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے“۔

معجزہ اُتارنے پر اللہ کی قدرت

یہ آیت مشرکین کی گفتگو کو بیان کر رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کو معجزہ لانے سے عاجز قرار دیں، جبکہ بہترین معجزہ قرآن کریم ان کے پاس موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ مانگ رہے تھے۔ چونکہ قرآن ان کی خواہشات کے مطابق نہیں تھا اس لیے وہ قرآن کو قانع کرنے والا اور اطمنان دلانے والا معجزہ نہیں جانتے تھے۔ ''رَّبِّه'' کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اور بت پرستوں کو بتوں اور اپنے معبودوں کے بارے میں تعصب تھا اس لیے وہ پروردگار یا ہمارا پروردگار نہیں کہتے تھے بلکہ پیغمبرؐ کی توہین کرتے ہوئے اور ان کی دعوت کو گھٹیا شمار کرتے ہوئے کہتے تھے اپنے رب کی جانب سے کوئی معجزہ لاؤ، ایسا لگے کہ عالمین کا رب انکا رب نہیں ہے اور یہ بات اور اس قسم کی گفتگو ان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ بت پرستی کے حوالے سے دو باتیں قابل ذکر تھی:

۱۔ مشرکین کی وثنیت اور بت پرستی میں معبودوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسی پر ان کا عقیدہ تھا اور ہر ایک کو کائنات کے امور کو چلانے میں مستقل اور موثر جانتے تھے اور اللہ کو رب الارباب خیال کرتے تھے۔ وہ بتوں کو رب الارباب کے ہاں شفاعت کرنے والے سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رب الارباب ہر گز ان کی شفاعت کو رد نہیں کرے گا بلکہ ان کی شفاعت کو ان کے حق میں قبول کرے گا۔

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اللہ دوسرے خداؤں کی الوہیت کی نفی پر کوئی معجزہ نہیں اتار سکتا اور ان کے اختیارات کو باطل بھی نہیں کر سکتا۔ یہ وہی امر ہے جس کی تشویق یہودی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔

۲۔ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو معجزات پیغمبروں پر اترتے ہیں وہ اسی صورت میں لوگوں کے لیے مفید ہیں کہ خود خدا ان معجزات کو اتارے جیسے موسیؑ کا عصاء یا عیسیؑ کا مردوں کو زندہ کرنا، نہ یہ کہ لوگ معجزے کی درخواست کریں اور ان کی درخواست پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے معجزہ اترے۔ جو معجزات درخواست پر مبنی ہوتے تھے اگر درخواست کنندہ معجزہ دیکھنے کے بعد ایمان نہ لاتا تو خدا تبارک و تعالیٰ بغیر مہلت کے ان کو عذاب دے دیتا ہے جیسے حضرت نوحؑ کا معجزہ ہے، ھودؑ، صالحؑ اور اس قسم کے انبیاءؑ جن سے لوگوں نے معجزہ کی درخواست کی اور ان کی درخواست پر معجزہ آیا اور پھر معجزہ کو دیکھ کر لوگوں نے ایمان نہیں لایا تو ان پر فوراً عذاب نازل ہوا۔

لیکن خدا ہر حال میں قادر ہے جس وقت چاہے معجزہ اتار سکتا ہے۔ کیونکہ قدرت مطلقہ اسی کی ہے اور کوئی بھی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی ۔ یہاں پر رب کی جگہ اسم جلالہ (اللہ) استعمال کیا ہے اور اس کا مطلب الوہیت مطلقہ ہے۔ اس طرح اللہ کے سوا ہر معبود کی نفی کی ہے۔ لیکن اللہ کے مقام الوہیت کے بارے میں ان کا جہل اس بات کا سبب بنا کہ وہ پیغمبر سے ایسے معجزے کا تقاضا کریں جس کو لانے پر وہ قادر نہ ہوں، جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ

اس طرح کا کام ان کی مصلحت میں نہیں ہے۔ یہ بات ان کی جرات کا سبب بنا کہ وہ ایسی بات کہیں جو ان سب کی ہلاکت کا سبب ہو اور ان پر عذاب الہیٰ نازل ہو۔ لیکن کسی درخواست کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ اللہ کے اختیار میں ہے کسی اور کا اختیار نہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ (سورۂ انعام، آیت: 58)

''کہہ دو اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو اس معاملہ میں فیصلہ ہو گیا ہوتا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔

پیغمبرؐ کا مشرکین کو جواب

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی فرماتے ہیں کہ اگر معجزہ اتارنا میرے اختیار میں ہوتا اور میں معجزہ لے آتا اور پھر تم اس کو نہ مانتے تو بس معاملہ ختم ہو جاتا پھر فوراً تمہارے اوپر عذاب آ جاتا۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور ایسا کوئی زمین پر چلنے والا نہیں اور نہ کوئی دو بازوؤں سے اڑنے والا پرندہ ہے مگر یہ کہ تمہاری ہی طرح کی جماعتیں ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے لکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پھر سب اپنے رب کے سامنے جمع کیے جائیں گے''۔

انسانوں کی مانند حیوانات کی اُمتیں

زمین پر چلنے والے حیوان اور ہوا میں اڑنے والے پرندے بھی انسانوں کی طرح امت اور گروہ گروہ ہیں۔ ان کا بھی ایک ہدف ہے جس میں وہ سب شریک ہیں۔ دین یا

شریعت جو اللہ کی طرف سے ہے وہ ایک جیسی ہے زمانی اور مکانی وحدت نے انہیں اکٹھا کیا ہے۔ آیہ شریفہ یہ کہہ رہی ہے کہ زمین پر چلنے والے حیوانات اور آسمان میں اڑنے والے پرندے بھی تمہاری طرح امت ہیں، یعنی ان کے لیے بھی ایک مقصد مقرر کر دیا گیا ہے۔ ان کے بھی واضح مقاصد ہیں جیسے روزی، جفت گری، رہائش اور کس طرح زندگی گزارنی ہے یا ایک دوسرے کے ساتھ شباہت ہے، شکل و صورت میں آراء و عقائد میں اور اجتماعی اور فردی زندگی میں جس کی بنیاد پر معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح ایک اور اشتراک بھی ذکر ہوا ہے کہ سب نے خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ایک دن سارے لوگوں نے اللہ کے پاس اکٹھا ہونا ہے۔ اللہ دوبارہ انہیں ایک جگہ زندہ کرے گا۔

البتہ انسان کی زندگی ارادی اور شعوری ہے اور وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی میں سعادت اور شقاوت کے راستے کو اختیار کر سکتا ہے۔ حیوانات میں بھی شعور ہے لیکن وہ شعور کا نچلا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں اور حیوانوں کو جزا دینے کے لیے قیامت میں مشہور کرے گا۔ اس میں یہ دلالت ہے کہ حشر کے مسئلہ میں انسان اور حیوان برابر ہیں۔ ہاں یہ بات اس میں نہیں ہے کہ وہ شعور اور ارادہ میں برابر ہیں۔ لیکن حساب و کتاب کے معاملے میں وہ سب برابر ہیں۔ وہ یہ کہ اچھے اور نیک کو ثواب دینا اور ظالموں سے انتقام لینا، نیکوکار کو فائدہ پہنچنا اور ستم کار کو سزا دینا یہ بات حیوانات میں بھی ہے۔ حشر کا معاملہ اسی پر دائر مدار ہوگا۔ آیت کے اس حصے '' مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ '' کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آفرینش کی تکوینی کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہر چیز کو درج کیا ہے اور کسی بھی چیز کو ہم نے چھوڑا نہیں ہے۔ یا اس سے یہ مراد ہے کہ قرآن کریم، اللہ کی کتاب ہے جو کامل اور پوری ہے اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت نمبر 89 میں بیان ہوا ہے: '' وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ '' '' ہم نے اس حالت میں کتاب تیرے اوپر اتاری کہ ہر حقیقت کو بیان کرتی ہے ہر چیز کا بیان اس میں موجود ہے''۔

وَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكۡمٌ فِى الظُّلُمٰتِ‌ؕ مَنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضۡلِلۡهُ ؕ وَمَنۡ يَّشَاۡ يَجۡعَلۡهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٣٩

''اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں ہیں، اللہ جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھی راہ پر ڈال دے''۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والے گونگے اور بہرے

اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے جاہل مقلدین گونگےاور بہروں کی مانند ہیں جو صرف علماء کے پیچھے چلتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ جو اظہار حق سے عاجز ہیں یا حق کو چھپاتے ہے دونوں تاریکیوں میں ہیں اور حقیقت کو دیکھ نہیں سکتے، حق کو باطل سے جدا نہیں کر سکتے۔ پس یہ لوگ الٰہی آیات کو جھٹلانے کے سبب گونگے اور بہرے اور اندھے ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کرنے کی نسبت اس لیے اپنی طرف دی ہے کیونکہ خود انہوں نے اپنی گمراہی کے مقدمات کو فراہم کیا ہے۔

جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 26 میں فرمایا:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ۝٢٦

'' وہ گمراہ نہیں کرتا سوائے بدکاروں گنہگاروں، فاسقوں کو''

یہاں پر بہروں، گونگوں کو اضلال اور گمراہ کرنا اور انہیں تاریکی میں ڈالنا اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ کان لگا کر اللہ کی دعوت کو سنتے ہیں لیکن اسے قبول نہیں کرتے، آنکھ سے حق کی نشانیوں کو دیکھتے ہیں لیکن اسے مانتے نہیں ہیں۔ (صراط مستقیم) ان کو نظر آتا ہے لیکن وہ اس پر چلتے نہیں ہیں۔ یہ سب اللہ کی دعوت یا اللہ کے رسولؐ کی

دعوت کو نہ مان کر اپنی ابدی حیات سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے گمراہی کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ ہی نے انہیں گمراہ کیا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٤٠

''کہہ دو کہ دیکھو! اگر تم پر خدا کا عذاب آئے یا تم پر قیامت ہی آ جائے تو کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم سچے ہو''۔

مشکلات میں مدد کرنے والی اللہ کی ذات

یہ جملہ مشرکین کے خلاف احتجاج کی تجدید ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ مجھے بتادو کہ اگر عذاب یا قیامت کی گھڑی آجائے تو اس صورت میں وہ سچ بولتے ہیں تو کس کی پناہ لیں گے اور کس کو آواز دیں گے تاکہ وہ ان سے عذاب کو دور کرے؟ ان سے پوچھو کہ کون ہوگا جو تمہارے لیے چارہ ساز ہوگا؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جو اس وقت ان کی مدد کرسکے گا؟ جن بتوں کے آگے تم جھکتے ہو، جن کو اللہ کا شریک بناتے ہو کیا وہ تمہاری مدد کرسکیں گے؟ کیا ان کو آواز دے سکو گے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فقط اللہ ہی اس بات پر قادر ہے جو تم سے ایسی مصیبت کو دور کردے۔ فقط وہی ہے جس کے پاس قدرت مطلق ہے وہی تمہیں فائدہ پہنچاسکتا ہے اور نقصان پہنچاسکتا ہے۔ کوئی اور نہیں ہے جو تمہیں نفع یا نقصان پہنچاسکے۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے، اس لیے اسی کی طرف رخ کرو۔

یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ جب بھی دنیامیں کسی مشکل میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کی توجہ ایک غیر مرئی ذات اور طاقت کی طرف جاتی ہے اور اسے ہی اپنا سہارا و ملجاء اور ماوا سمجھتا ہے اور اس کو پکارتا ہے۔ اس حوالے سے روایت میں بھی آیا ہے کہ یہ ایک

فطری بات ہے۔ جب ایک دھری امامؑ معصوم کے پاس آتا ہے اور اللہ کے وجود کی دلیل مانگتا ہے تو آپؑ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کبھی دریا میں سفر کیا ہے؟ اور ایسا ہوا ہو کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور آپ ایک تختے پر اکیلے رہ گئے ہوں؟ ہر طرف سمندری لہریں اور موجیں ہوں اور اس وقت تیری توجہ کدھر جاتی ہے، کوئی تجھے نظر آتا ہے جو تمہیں اس حالت سے بچا لے ؟ تو اس نے کہا: ہاں: تو آپؑ نے فرمایا: جس ذات کی طرف تیری توجہ اس حالت میں گئی ہے وہی اللہ ہے۔ یہ انسان کی وہی فطرت ہے کہ سوائے اللہ کے کون انسان کو بچا سکتا ہے اور اس کی دادرسی کر سکتا ہے؟ سوائے اللہ کہ کوئی اور نہیں ہے۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

”بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے جس کے لیے اسے پکارتے ہو اور جنہیں تم اللہ کا شریک بناتے ہو انہیں بھول جاتے ہو“۔

مصیبت میں مدد کرنے والا

جب انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے اور اپنے غیر سے غافل ہو جاتا ہے اور اسے صرف اپنی فکر ہوتی ہے تو اس کا نفس اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے خالق کی طرف توجہ کرے۔ لہٰذا انسان ہر چیز کو بھلا سکتا ہے لیکن اپنی ذات کو اور اپنے رب کو نہیں بھلا سکتا، یہ ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس کیونکہ قدرت مطلقہ ہے اور اس کی قدرت بے انتہا ہے اگر خدا چاہے تو وہ ہر پریشانی اور ہر گرفتاری کو دور کر دیتا ہے، جس پریشانی کو دور کرنا چاہے وہ دور کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ قیامت کا دن، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے وہاں بھی اگر اللہ

تعالیٰ چاہے تو مصیبت کو ٹال سکتا ہے اور اگر نہ چاہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور کوئی بھی اس مشکل کو حل نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ''وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ'' (سورۂ مومن آیت نمبر 60) ''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا'' دعا کی قبولیت کا یہ وعدہ، اللہ کی اس قدرت کو سلب نہیں کر سکتا کہ وہ دعا کو قبول نہ کرے اور نہ ہی اللہ کے ہاتھ کو باندھتا ہے۔ وہ چاہے تو دعا کو قبول کرے اور اگر چاہے تو قبول نہ کرے یعنی وعدے کے باوجود اگر چاہے تو اس کو ترک کر سکتا ہے۔ یہ جو کہا تھا ''وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۠﴿۴۱﴾'' تم بتوں کو یا جو تم نے معبود بنائے ہوئے تھے یا اللہ کے شریک بنائے ہوئے تھے تم سب بھول جاؤ گے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتے کیونکہ وہ جان لیں گے کہ وہ ان کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے اور انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتے تو اس وقت انہیں اپنی فکر ہو گی اور اپنے رب کی طرف توجہ ہو گی لہٰذا وہ ہر دوسری شے کو بھول جائیں گے۔ فقط اپنی ذات کی طرف انکی توجہ ہو گی ایسی ہی حالت میں انکی توجہ غیر شعوری طور پر اللہ کی طرف گھوم جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر واضح دلیل اور برہان ہے کہ اللہ ایک ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور ہم نے تجھ سے پہلے بہت سی اُمتوں کے ہاں رسول بھیجے تھے، پھر ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں پکڑا تا کہ وہ عاجزی کریں''۔

مشکلات کے ذریعے اُمتوں کا امتحان

یہ طے شدہ سنتِ الٰہی اور اللہ کا قانون ہے کہ وہ مصائب و مشکلات کے ذریعے امتوں کا امتحان لیتا ہے۔ وہ پہلے امتوں کے پاس پیغمبروں کو بھیجتا ہے اور وہ امتوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور پھر مصائب و مشکلات کے ذریعے ان کا امتحان ہوتا ہے یہ قانون الٰہی ہے۔ ''الْبَأْسَآءِ'' کا لفظ (بوس) سے ہے جو بہت سخت مشکل اور تکلیف دہ حالت کے معنی میں ہے۔ ''الضَّرَّآءِ'' بد حالی کے معنی میں ہے خواہ روحانی بد حالی ہو یا جسمانی، جیسے بیماری، بدن کا کمزور ہونا بیرونی بد حالی جیسے عنوان یا منصب سے سقوط کر جانا، مال کا ضائع ہو جانا اور اس قسم کی دوسری چیزیں۔ روحانی بدحالی کی مثال نادانی اور غم ہے۔

''تَضَرَّعُوْا'' اللہ کے حضور تذلل اور خواری اور اپنے آپ کو حقیر جاننے کے معنی میں ہے تاکہ اللہ ان مصائب کو ٹال دے۔ اللہ فرمارہا ہے کہ ان مشقتوں اور مصائب کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کے حضور تضرع اور زاری کرے اور اچھے القاب سے خدا کو پکاریں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مشقتوں اور مصائب کے وقت شیطان کے جلوے اور ظاہری اسباب پر تکیہ نہ کرے بلکہ ظاہری اسباب سے منہ موڑ کر حقیقی سبب جو اللہ کی ذات ہے اس کی طرف متوجہ ہو تاکہ وہی ذات ان مصائب اور مشقتوں کو اس سے دور کرے۔ یہ مصائب اور مشقتیں امتوں کے فائدے میں ہیں کیونکہ یہ انسان کے توبہ کرنے اور اللہ کی طرف پلٹنے کا سبب بنتے ہیں اور جب انسان کو یہ فائدہ حاصل ہوگیا تو اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟!

فَلَوْ لَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

”پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو عاجزی کرتے، لیکن ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور شیطان نے انہیں وہ کام آراستہ کر دکھائے جو وہ کرتے تھے“۔

اللہ کی طرف رجوع نہ کرنا

جب انسان کا سامنا ایسے مصائب سے ہو جو اس کے مزاج کے موافق نہیں تو ضروری تھا کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، اس نے اللہ کے حضور تضرع و زاری نہیں کی ان کے دل متاثر نہیں ہوئے، وہ شیطانی اعمال میں سرگرم رہے اور اللہ کے ذکر سے غافل رہے، ظاہری اسباب پر اعتماد کیا اور خیال کیا کہ انہی اسباب سے ان کے امور کی اصلاح ہو جائے گی۔ انہوں نے اسباب کو تاثیر گذاری میں مستقل جانا اور شیطان نے اپنے وسوسے ان کے دل میں ڈال دئے اور ان کے اعمال کو بہترین اور خوبصورت بنا کر پیش کیا اور انہوں نے اپنے پلید اور غلط اعمال اور ظلم کو بہتر سمجھا اور ان بد اعمالیوں میں آگے بڑھتے رہے
۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

”پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر خوش ہو گئے جو انہیں دی گئی تھیں تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا تب وہ ناامید ہو کر رہ گئے“۔

اللہ کے عذاب کی اچانک پکڑ

جب انہوں نے توبہ اور اللہ کی درگاہ میں تضرع و زاری اور رجوع کو بھلا دیا تو ہم نے دنیا کی ساری نعمتیں ان کو دیں۔ دنیا کے مادی لذائذ، مال کی کثرت، اولاد کی کثرت، صحت

وسلامتی آسائش وآرام غرض کہ دنیا کہ ساری نعمات انہیں عطا کردیں یہاں تک کہ وہ اپنی اس حالت پر مغرور ہوگئے اور خود کو مستقل اور پروردگار سے بے نیاز سمجھنے لگے اور دنیاوی لذتوں میں اس طرح غرق ہوگیے اور خوش ہوئے کہ خدا کو بھول گئے تو اچانک ہم نے ان پر عذاب اتار دیا۔ جب ہم نے عذاب اتارا تو پھر سخت غم اندوہ اور پریشانی کی عالم میں ان کی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ عذاب الٰہی کے آنے کے بعد ان کے پاس عذر اور دلیل پیش کرنے کی مہلت بھی باقی نہ رہی اور یہ وہی اللہ کا استدراج ہے کہ جب کافر اللہ کے تذکرات، اللہ کی یاد دہانی کو بھول جاتے ہیں اور اس سے اعراض کرلیتے ہیں، اس سے منہ موڑ لیتے ہیں تو اللہ تعالی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی حالت کا نام استدراج ہے، جس میں انسان نعمتوں کی فروانی کو اپنے لیے اچھی حالت سمجھ بیٹھتا ہے اور جب وہ دنیا کی تمام تر مادی لذات سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے، سرور میں غرق ہوتا ہے اور اپنے پروردگار سے غافل ہو جاتا ہے تو اچانک عذاب الٰہی پہنچ جاتا ہے پھر ان کے پاس عذر پیش کرنے کی مہلت بھی باقی نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کردیتا ہے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۵

”پھر ان ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی، اور اللہ ہی کے لیے سب تعریف ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے“۔

ظالموں کا خاتمہ

”دَابِرُ“ اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کے بعد پہنچتی ہے۔ اس بنا پر اس آیت کا معنی یوں ہوگا کہ ظالموں کے قوم و قبیلہ کو عذاب الٰہی نے گھیر لیا اور ان کا کوئی اثر بھی باقی نہیں نہ رہا۔ اور ان میں سے کوئی بھی نجات نہ پا سکا۔ یہ سب ان کے ظلم کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم کی وجہ سے انہیں ہلاک کردیا اور ان کی نسل بھی ختم کردی۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ (سورۃ الحاقۃ، آیت: 8)

ترجمہ: "سو کیا تمہیں ان کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے"۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان ہوئی ہے کیونکہ انسان پر ان سارے مصائب اور عذاب کے اتارنے کی وجہ خود اس کا ظلم اور کفر تھا، لہٰذا اس عمل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی ملامت کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ وہ تو مدح و ثناء کا لائق ہے کیونکہ اس کے تمام امور حکمت کے تحت ہوتے ہیں۔ ظالمین اپنی کوتاہیوں اور ظلم و زیادتی کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس چیز کی طرف موڑ دیا ہے جس کا انہوں نے خود اپنے لیے انتخاب کیا ہے، پس ہر طرح کی خواری، ذلت، رسوائی اور بدی کافروں کے لیے ہے اور ہر حمد، ثناء اور تعریف عالمین کے رب کے لیے مخصوص ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝۴۶

"ان سے کہہ دو کہ دیکھو! اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے تو اللہ کے سوا کوئی ایسا رب ہے جو تمہیں یہ چیزیں لادے، دیکھ کہ ہم کیونکر طرح طرح کی نشانیاں بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ منہ موڑتے ہیں"۔

اللہ نعمتیں چھین لے تو کوئی عطا نہیں کر سکتا

کان اور آنکھ لے لینے کا مطلب ہے اندھا اور بہرا بنا دینا، دلوں پر مہر لگانے کا مطلب ہے دل کا دریچہ بند کر دینا جس سے باہر سے کوئی بھی چیز اس میں نہ آسکے تا کہ دل اس بارے فکر کرسکے یا دل کو استعمال میں لے آئے اور خیر و شر، نفع دینے والی چیز اور نقصان دینے والی

چیز کی تشخیص دے سکے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکمل طور پر تعقل اور تفکر کی خاصیت ہی جاتی ہے، خاصیت موجود رہتی ہے لیکن ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے لیے برائی اور بھلائی کی تشخیص نہیں دے سکتے۔ خداوند مشرکین کے خلاف دلیل اور برہان پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر اللہ تعالیٰ آنکھ اور کان تم سے لے لے، تمہارے دل پر مہر لگا دے تو اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہے جو تمہارے لیے ان کی حالت واپس پلٹا دے؟

اصولی طور پر مشرکین کا خداوند کے لیے شرکاء قرار دینا، خود اپنی بات کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ ان شرکاء کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تاکہ ان کے وسیلے سے منفعت لے سکیں اور نقصان کو دور کر سکیں اور بت اللہ کی درگاہ میں ان کے سفارشی ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ خدا سبحانہ تعالیٰ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی مخلوق میں تصرف کر سکتا ہے اور ان مخلوقات میں سے انسان کی آنکھ، کان اور دل ہیں۔اگر خدا چاہے تو ان کو ان کے اصلی کام سے روک دے، اللہ اسے نابینا اور بہرہ بنا سکتا ہے اور اس کے دل پر مہر لگا سکتا ہے تو اس صورت میں انہوں نے جو شرکاء بنائے ہوئے ہیں کیا وہ شرکاء اپنے خزانے سے ان کے لیے دوسری آنکھ، کان اور دل دے سکیں گے؟ حالانکہ مشرکین جن کو شفیع بنا رہے ہیں ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ خلق اور ایجاد میں ان کی کوئی دخالت نہیں ہے تو اس صورت میں ان کی الوہیت اور ان شرکاء کی خدائی کا کیا معنی ہو سکتا ہے؟ خدا اس کو کہتے ہیں جو عالم میں موجود ہر چیز کو ایجاد کرے یا اسے معدوم کر سکے، پوری کائنات میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

لہٰذا یہ شرکاء جن کو تم واسطہ قرار دے رہے ہو ان پر الوہیت کا معنی صادق نہیں آتا ،ان کو معبود کہنا انسان کے فائدے میں نہیں ہے اور نہ ہی ان کا کوئی اثر ہے بلکہ یہ ایک لغو اور بے ہودہ بات ہے۔ اسکے بعد فرمایا '' اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ '' دیکھو ہم کس طرح کائنات کے اسباب کو گھماتے ہیں اور انسانوں کے افکار کے اُفق میں اُتارتے

ہیں؟ اس سے واضح ہوا کہ تمام تکوینی اسباب اور وسائل تاثیر میں استقلال نہیں رکھتے۔ ان سارے روشن اور واضح دلائل کے ہوتے ہوئے بھی لوگ تکبر، غرور اور ضد کی وجہ سے حق سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ ہر بشر کی کیفیت ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

''کہہ دو اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک آ جائے یا کھلے عام آ جائے۔ تو کیا ظالموں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا''۔

عذاب الٰہی سے ظالمین کی ہلاکت

یہ آیت شریفہ ظالموں کے متعلق ایک عمومی قاعدہ بتا رہی ہے اور انہیں ایک خطرہ سے آگاہ کر رہی ہے کہ اللہ کا عذاب اپنے نشانے میں خطا نہیں کرتا اور وہ ظالموں کو ہی نابود کر دے گا۔ مزید اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ جو مشرکین ہیں یہ ہی ظالم ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کی دعوت کو ٹھکرا دیا ہے، اللہ کی آیات کو جھٹلانا ہے۔ عذاب کا معنی مجرم کو اس کے عمل کی سزا دینا۔ ظاہر ہے سزا ایسی ہو جو اس کے جرم کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ واضح ہے کہ کوئی بھی جرم ظلم کے بغیر واقع ہی نہیں ہوتا اور ظلم اپنے پیچھے ہلاکت کو لے آتا ہے پس عذاب الٰہی سوائے کافروں کے کسی کو ہلاک نہیں کرتا۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور ہم پیغمبروں کو صرف اس لیے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈرائیں، پھر جو شخص ایمان لے آئے اور اپنی اصلاح کر لے تو ایسے لوگوں پر کوئی ڈر نہ ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے''۔

صالح مومنین کے لیے نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ غم

یہ آیت اور پچھلی آیت اس مطلب کو بیان کر رہی ہیں کہ مشرکین ہی ظالم ہیں۔ ان کے ظلم ہی کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ہلاک ہوتے ہیں۔ یہ آیت پیغمبرؐ کو دستور دے رہی ہے کہ مشرکین پر حجت تمام کرو اور اعلان کرو کہ اگر اللہ کا عذاب نازل ہوگا تو فقط ستمکار ہی ہلاک ہونگے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم ہی ہیں جو اس حجت کو تیرے لیے بیان کر رہے ہیں اور ہم ہی ہیں جو عذاب بھیجتے ہیں۔ پیغمبروںؑ کا بھیجنا فقط بشارت اور ڈرانے کے لیے ہے۔ پس جو بھی عقیدہ کے مرحلے میں ایمان رکھتا ہے اور عمل کے مرحلے میں عمل صالح بجالاتا ہے اس کے لیے کوئی پریشانی اور خوف نہیں اور اسے عذاب کا بھی کوئی ڈر نہیں اور آئندہ اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں ہوگی، پریشانی ظالموں اور مشرکین کے لیے ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٤٩﴾

''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا انہیں عذاب پہنچے گا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے''۔

آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والے کے لیے عذاب

پچھلی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، الٰہی دعوت کو قبول نہیں کیا تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ فسق کا جرم یعنی بندگی اور عبودیت کی

روش سے نکلنا، یہ سبب بنتا ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کی پکڑ میں آجائیں۔ لہٰذا آج ہی کل کی فکر میں رہنا چاہیے اور انہیں پتہ ہونا چاہیئے کہ کس گروہ سے ہیں، ظالموں سے نہ بنیں کیونکہ فسق اور گناہ کرنے کی وجہ سے انسان ظالموں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۟

''کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے، کہہ دو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں، کیا تم غور نہیں کرتے''۔

پیغمبرؐ کی ذمہ داری

اس آیت میں اللہ کے خزانوں سے اللہ تعالیٰ کی تدبیر، رحمت اور الوہیت کے خزانے مراد ہیں۔ یعنی منبع فیض الٰہی جس سے ہستی اور اس کے آثار افاضہ ہوتے ہیں۔ منبع فیض الٰہی کے آثار ہر چیز میں نظر آتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کلمہ ''کُنْ'' کہنے سے ہستی اور اس کے آثار اس کے مقام عظمت اور کبریائی سے صادر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ یٰسٓ کی آیت ۸۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۟

''اس کی تو یہ شان ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اتنا ہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے''۔

اسی طرح سورۂ حجر کی آیت ۲۱ میں فرماتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

''اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور ہم صرف اسے معین مقدار پر نازل کرتے ہیں''۔

پس خزائن الٰہی سے اللہ کے مقامات میں سے وہ مقام مراد ہے جس سے ہر چیز صادر ہوتی ہے۔ بغیر اس کے کہ اس مقام سے کچھ کم ہو یا ختم ہو یا کسی سے اثر کو قبول کرے۔ یہ مقام صرف اللہ کی ذات سے مخصوص ہے۔ کیونکہ غیر خدا یہاں تک رسول اللہ ﷺ کے بھی کمالات محدود ہیں۔ وہ اللہ کے بغیر کسی فقیر کو بے نیاز نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی سائل کو راضی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کمال غیر متناہی اور غیر محدود نہیں ہے۔ ''وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ'' کا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس غیبی اُمور کے بارے علم میں استقلال حاصل نہیں ہے، میرا علم عطائی ہے، اگر مجھے بعض غیبی امور کے بارے علم ہوا ہے تو یہ وحی کے ذریعے حاصل ہوا ہے۔ میرے علم غیب میں میراا ستقلال نہیں ہے بلکہ وحی کا دریچہ میرے لیے عا لم غیب کا دروازہ کھولتا ہے۔

اس بارے سورۂ جن آیت ۲۶ اور ۲۷ میں آیا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

''وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے اس رسولؑ کے جسے اس نے برگزیدہ کیا ہو''۔

اور یہ جو فرمایا: ''وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ؕ'' اللہ کے رسول نے کہا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کی جو خصوصیات ہیں وہ پیغمبرؐ میں نہیں ہیں کیونکہ مادی زندگی کی خصوصیات جیسے کھانا، پینا اور ازدواج فرشتوں میں نہیں ہیں۔ اس جملے میں یہی بتانا چاہتے ہیں کہ میں تو شادی بھی کرتا ہوں کھاتا پیتا بھی ہوں لہٰذا میں فرشتہ نہیں ہوں۔ اس بارے سورۂ کہف کی آیت ۱۱۰ میں فرمایا:

''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ'' اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

''اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ'' میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور جو کچھ مجھ پر وحی ہوتا ہے اسی کی پیروی کرتا ہوں۔ میرا دعویٰ فقط یہ ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں خداوند تبارک وتعالیٰ جو مطلب چاہتا ہے مجھے وحی کرتا ہے اور جو دستورات ہیں وہ سب مجھ تک وحی کے ذریعے پہنچتے ہیں اور میں اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کے ذریعے مجھ تک پہنچتی ہے۔ پیغمبر کی ذمہ داری ابلاغ اور اللہ کے پیغام کو پہنچا دینا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں فرمایا کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہیں۔ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ اگرچہ میں فرشتہ نہیں ہوں اور علم غیب میں استقلال بھی میرے لیے نہیں ہے، اللہ کے خزانے بھی میرے ہاتھ میں نہیں ہیں لیکن میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نمائندہ اور پیغمبر ہوں، میرے اوپر وحی ہوتی ہے۔ لہٰذا میرا بشر ہونا اس چیز کے لیے رکاوٹ نہیں ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان فرق نہ ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان ویسا ہی فرق ہے جو بینا اور نابینا شخص کے درمیان ہے، جس طرح بینا اور نابینا برابر نہیں لیکن انسان ہونے میں مشترک ہیں۔ جس طرح عقل حکم دیتا ہے کہ نابینا شخص کو چاہیے کہ وہ بینا کی پیروی کرے اسی طرح تم لوگ جو وحی سے جاہل ہو تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جس پر وحی نازل ہوتی ہے اور جس کے پاس علم ہے۔ کیونکہ مجھ پر وحی کے ذریعے اللہ کا پیغام پہنچا

ہے تو ضروری ہے کہ تم میری پیروی کرو۔ پس تم لوگ کیوں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور ان کو سمجھتے کیوں نہیں ہو؟

وَ اَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾

''اور اس قرآن کے ذریعے سے ان لوگوں کو ڈرا جنہیں اس بات کا ڈر ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے جمع کیے جائیں گے، اس طرح کہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار اور سفارش کرنے والا نہ ہوگا تاکہ وہ پرہیزگار ہو جائیں''۔

قیامت کا خوف کھانے کا حکم

یہاں پر حشر کے خوف سے ایسا خوف مراد ہے جس کے بارے میں انسان کو یقین ہو، جن کو ڈرانے کی بات کی جا رہی ہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو یوم حشر کے بارے میں اللہ سے ڈرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ یوم حشر ہونا ہے۔ اگرچہ پیغمبر کا ڈرانا عمومی اور سب کے لیے ہے لیکن ان کا ڈرانا فقط متقی اور ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو سننے والے کان رکھتے ہیں اور قیامت کے دن کے بارے میں ان کے دل میں خوف ہے۔ لیکن وہ جو لوگ قیامت کے دن اور عذاب کے قائل ہی نہیں تو ان کے دل میں خوف پیدا ہوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگوں کا عذاب سے ڈرنا انہیں پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کے قریب کر دیتا ہے اور ان کو خدا ترس بنا دیتا ہے۔ اس طرح وہ ان کے حق کے نزدیک تر ہو جاتے ہیں اور ان کے ایمان لانے کی توقع بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ کو چاہیے کہ وہ ایسے افراد کے لیے زیادہ اہتمام کریں۔

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے غیر خدا کی شفاعت اور ولایت کی بلکل نفی کر دی ہے اور کچھ آیات میں شفاعت کو اذن خدا سے مشروط کیا گیا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ ''ایسا کون ہے جو اللہ کی اجازت کے سوا اس کے ہاں سفارش کر سکے''۔

اس آیت میں اس لیے مطلقًا شفاعت کی نفی کی گئی ہے کیونکہ یہاں پر بتوں اور خیالی معبودوں اور شرکاء کی بحث ہو رہی ہے کہ یہ بُت اور مشرکین کے خیالی معبود بلکل واسطہ بننے کے بھی لائق نہیں ہیں اور نہ ہی وہ شفاعت کر سکتے ہیں۔ ''لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾ ''ایسے گروہ کو ڈراؤ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قہر اور غلبہ جیسی صفات کو سن کر اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں اور اللہ کی منع کردہ چیزیں چھوڑ دیں اور جن کے انجام دینے کا حکم دیا ہے انہیں انجام دیں۔

وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَیۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾

''اور جو لوگ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کر جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں، تیرے ذمہ ان کا کوئی حساب نہیں ہے اور نہ ہی ان کے ذمہ تیرا کوئی حساب ہے، لہٰذا اگر تو نے انہیں اپنے سے دور ہٹا دیا تو توں بے انصافوں سے ہوگا''۔

اللہ کو پکارنے والوں کو اپنے سے دُور نہ کرو

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو توقع تھی کہ پیغمبر اکرم ﷺ بیچارے اور فقیر افراد کو اپنے اطراف سے دور کردیں تاکہ مال دار اور پیسے والے با اثر لوگ ان پر ایمان لے آئیں۔ وہ غرور اور تکبر سے یہ چاہتے تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اغنیاء کو فقراء کے اوپر ترجیح دیں اور جو بے نوا، فقیر اور کمزور ہیں اور دل سے ایمان لے آئے ہیں ان کو اپنے سے دور کردیں۔ اس قسم کی بے جا خواہشیں پہلی امتوں میں بھی تھیں جیسے امت نوح علیہ السلام کہ وہ حضرت نوحؑ سے اسی قسم کا مطالبہ کرتے تھے۔

اس آیت کو سورہ ھود کی آیت 31 کو ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان افراد سے مومنین مراد ہیں۔ اگرچہ صریحاً ان کا نام نہیں لیا گیا لیکن ان کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کو سمجھا دیا جائے کہ ان کی دوستی اور ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ایسے امر میں ہے کہ اس میں اللہ کے سوا کسی اور کی دخالت نہیں ہے۔ ''وَجْه'' چہرے کے معنی میں ہے اور ہر چیز کے سامنے والے حصے کو بھی وجہ کہتے ہیں۔ کیونکہ ہر چیز کا اوپر والا حصہ اس کی شناخت بن رہا ہوتا ہے اس لیے اس کو ''وَجْه'' کہتے ہیں۔

یہ مومنین صبح و شام اللہ کو یاد کرتے ہیں اور نیک اعمال بجالاتے ہے اور رب تعالیٰ کے تقرب کا ارادہ رکھتے ہے اور ان کی رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہے۔ آگے فرمایا ''مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ'' حساب یہاں پر عدد کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ بندوں کے اعمال کا حساب و کتاب اور ان کے ثواب اور ان کو بدلہ دینے کے لیے حساب اور عدد ہی استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے اعمال کو حسابِ اعمال کا نام دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اے پیغمبرؐ تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ تم ان سے حساب کرلو اور ان کے اعمال کا جائزہ لو یا پھر ان کو اس کا بدلہ دو۔ آپ ان لوگوں کو اپنے سے دور نہیں کرسکتے جن کی رفتار اور رویہ تمہیں پسند نہیں۔ اسی

طرح ان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ تیرے اعمال کا حساب کرنے والے بنیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس ڈر سے کہ کل تمہارے اوپر اعتراض نہ ہو ان کو اپنے سے دور کر دو۔

یا اس سے حساب کو برداشت کرنا مراد ہو سکتا ہے ان کے برے اعمال کا وبال اور سنگینی اور بوجھ تیرے اوپر نہیں ہے جس طرح تیرے اعمال کا بوجھ ان کے اوپر نہیں ہے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ حساب سے رزق و روزی مراد ہو، ان کا رزق اور روزی تیرے ذمہ نہیں ہے کہ تو ان کو اپنے سے دور کر دے۔ اس طرح کرنے سے تم ظالموں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ گے کوئی ایسا قدم اٹھانا جس سے ظلم اور زیادتی کا تاثر ملے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس مال نہیں ہے اور وہ مالی طور پر کمزور ہیں انہیں اپنے سے ہٹانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس آیت میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کسی کا مالدار ہونا عظمت و کرامت کا سبب نہیں بلکہ ایمان، تقویٰ ہی کرامت کا ذریعہ ہے جیساکہ سورہ حجرات میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ یہ لوگ کہیں کہ کیا یہی وہ ہیں جو ہم میں سے ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہے، کیا اللہ شکر گزاروں کو جاننے والا نہیں ہے"۔

انسانوں کا دوسرے انسانوں کے ذریعے امتحان

''فتنة'' امتحان کے معنی میں ہے۔ آیت کے بیان کی روش سے لگتا ہے کہ یہاں پر مطرح ہونے والا سوال استہزاء اور مذاق اڑانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اور سوال کرنے والے

معاشرے کے وہ امیر لوگ ہیں جن کی نظر میں مال دنیا سے محروم مومنین حقیر اور پست ہیں۔ یہ لوگ جو ظاہری مال و دولت رکھتے تھے قدرت مند تھے اور فقراء کے لیے کوئی عزت و ابرو کے قائل نہیں تھے ان کی قدر نہیں جانتے تھے، ان کے متعلق خدا سبحانہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو خبر دی ہے کہ اجتماعی طور پر مختلف طبقات کا ہونا اور سوسائٹی میں اونچ نیچ افراد کے امتحان کے لیے ہے۔ اس سے لوگوں کو پرکھا جاتا ہے اور ان کی آزمائش ہوتی ہے اور جو ناشکرے ہیں وہ شکر گذاروں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ کفران نعمت کرنے والے مستکبر اپنے تکبر اور غرور کی بنیاد پر ان فقراء کا مذاق اڑاتے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے ہم سب میں سے ان بے نوا، بے سہارا اور فقراء بیچاروں کو نعمت دی ہے؟

'' اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰکِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾ '' ان کے استہزاء اور مذاق اڑانے کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ اللہ کی نعمت کا شکر کو بجالانے والے ہیں، کفران نعمت کرنے والے نہیں۔ خداوند شکر گذار بندوں سے آگاہ ہے، خدا ان کے بارے میں بہتر معلومات رکھتا ہے۔ یقینی بات ہے نعمت عطا کرنے والا اسے نعمت عطا کرتا ہے اور اس پر اپنا احسان بھی جتاتا ہے جو اس کا شکر بجالاتے ہیں۔ اللہ کے ہاں دنیاوی ظواہر اور مادی چیزیں قدر اور احترام کی بنیاد نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کرامت اور قدر کا دار ومدار شکران نعمت ہے۔ حقیقی نعمتیں ولایت الٰہی ہے لہٰذا توحید کا قائل ہونا اللہ تعالیٰ سے شریک کی نفی کرنا یہ شکر الٰہی کا مصدق ہوگا جیسا کہ سورۃ یوسف میں شرک کی نفی کو اللہ کے شکر کا نام دیا ہے۔

وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ مَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِکَ بِاللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ عَلَیۡنَا وَ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (سورۃ یوسف آیت 38)

''میں نے اپنے آباء ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ملت کی پیروی کی ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم کسی کو اللہ کا شریک قرار دیں۔ یہ ہمارے اوپر اللہ کا فضل و کرم ہے اور سارے انسانوں پر بھی اللہ کا فضل ہے لیکن انسانوں کی اکثریت شکر بجا نہیں لاتے۔''

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

''اور ہماری آیتوں کو ماننے والے جب تیرے پاس آئیں تو کہہ دو کہ تم پر سلام ہے، تمہارے رب نے اپنے ذمہ رحمت لازم کی ہے، جو تم میں سے ناواقفیت سے برائی کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیک ہو جائے تو بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

آیات الٰہی پر ایمان لانے والوں کو سلام

سلام ہر برائی سے رہائی اور نجات کے لیے دعا ہے۔ جس پر سلام کیا جاتا ہے یہ اس کے لیے دعا ہوتی ہے۔ '' كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ'' جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود رحمت کو اپنے اوپر فرض کر رکھا ہے۔ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی کام پر رحمت کا عنوان صدق نہ آئے۔ ''اصلاح'' صلاح سے متصف ہونے کو کہتے ہیں، عمل کی اصلاح ضروری ہے۔ اصلاح فعل لازم ہے اگرچہ حقیقت میں یہ متعدی ہے۔ عربی زبان میں فعل کی دو قسمیں ہیں یا لازم ہوتا ہے یا متعدی ہوتا ہے۔ فعل لازم وہ ہوتا ہے جس کا فاعل ہوتا ہے مفعول نہیں ہوتا اور متعدی وہ فعل ہوتا ہے جس کے لیے فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے رابطہ بڑا واضح ہے کیونکہ پچھلی آیت میں

رسول خدا ﷺ کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ مومنین کو اپنے سے دور کرے۔ جبکہ اس آیت میں حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ مہربانی، لطف اور کرم سے پیش آئے اور ان پر سلام کرے ان کے لیے دعا کرے اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ان کو بتادے کہ اللہ رحیم اور غفور ہے، معاف کرنے والا ہے۔ اگر حقیقی توبہ کر لو اور عمل صالح بجالے آؤ تو اللہ تمہارے گناہوں کو مٹادے گا اور گناہ کی سزا تمہیں نہیں ملے گی تمہاری پریشانی کی جگہ تمہیں آرام اور سکون ملے گا۔

اس بنا پر مورد بحث آیت میں سب سے پہلے توبہ کے بارے گفتگو ہو رہی ہے اور وہ بھی گناہ سے توبہ نہ کہ کفر اور شرک سے توبہ اس لیے فرمایا ''مَنۡ عَمِلَ مِنۡکُمۡ'' مومنین سے سرزد ہونے والے گناہ کی بات ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ گناہ جہالت اور غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ جو مومن صبح وشام اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو رب کی رضا کے حصول کے درپے ہوتا ہے وہ کبھی بھی جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ اگر گناہ کر بیٹھتا ہے تو یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یا شہوت اور غصے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ توبہ اس وقت قبول ہو گی جب حقیقی ہو اور وہ آدمی اس غلطی کی اصلاح پر توجہ دے، نیک بنے، خدا کی طرف پلٹ آئے اور پھر دوبارہ خود کو گناہ کی نجاست سے آلودہ نہ کرے۔ زبانی توبہ قبول نہیں ہے اور زبانی توبہ انسان کو بہشت میں نہیں لے جائے گی
۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقتاً کسی زمانے سے مقید نہ ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت کرنا اپنے اوپر واجب قرار دیا ہے لیکن رحمت کا اثر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب بندہ حقیقی توبہ کرے اور دل میں کفر نہ ہو، اگر اس سے جہالت کی وجہ سے گناہ سرزد ہوا ہے اور توبہ کر لے، اور عمل صالح بجالائے تو

ایسی صورت میں اللہ کی مغفرت اور رحمت کا اثر ظاہر ہوگا اور اس شخص کو عفو و درگذر نصیب ہو جائے گی۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٥٥﴾

"اور اسی طرح ہم آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ گناہگاروں کا راستہ واضح ہو جائے"۔

معارف الٰہی کی شرح

آیات کی تفصیل سے مراد معارف الٰہی کی شرح دینا اور ان سے ابہام اور پیچیدگی کو دور کرنا ہے۔ اس آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ معارف الٰہی کی شرح دی گئی ہے اور ایک دوسرے سے ہم نے ان کو جدا کیا ہے تاکہ ان میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ اس امر کے مہم اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ مجرمین کا راستہ آشکار ہو جائے تاکہ ان کی رسوائی واضح ہو جائے اس کے نتیجے میں مومنین اس راستے سے دوری اختیار کرلیں۔ مجرمین کا راستہ کیا ہے؟ وہی اللہ کی آیات کا انکار رہے، اللہ کی نعمتوں کا کفران ہے، سرکشی اور عناد ہے اور الٰہی دعوت سے دوری ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿٥٦﴾

"کہہ دو مجھے منع کیا گیا ہے اس بات سے کہ میں ان کی بندگی کروں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کہہ دو میں تمہاری خواہشات کے پیچھے نہیں چلتا، کیونکہ میں پھر گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ رہوں گا"۔

بتوں کی پرستش سے منع

یہ آیت رسول خدا ﷺ کو امر کر رہی ہے کہ مشرکین کو خبر دے دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو ان کے شرکاء اور بتوں کی پرستش کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ نہی ان بت پرستوں کے بتوں کی پرستش سے بھی ضمنی طور پر منع کر رہی ہے۔ اس کے بعد اس نہی کے معیار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان شرکاء کی عبادت نفسانی خواہشات کی پیروی کا نتیجہ ہے اور میں تمہاری نفسانی خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا۔ پھر فرمایا کہ میں نفسانی خواہشات کی پیروی اس لیے نہیں کرتا کہ انسان خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے ہدایت کے راستے سے دور ہو جاتا ہے اور ہدایت پانے والوں کی صف سے دور چلا جاتا ہے۔ کیونکہ نفسانی خواہشات کی پیروی اور ہدایت ایک جگہ اکھٹے نہیں ہو سکتے اور نور توحید کی تپش دل پر اثر نہیں کرتی اور نہ ہی دل کو روشن کرتی ہے اور نہ ہی اُس میں قرار پکڑتی ہے۔ ایسے نور سے ہی نتیجہ لیا جاسکتا ہے اور اُس سے بہرور ہوا جاسکتا ہے جو نور ہدایت ہے۔ تو اس بات سے یہ سمجھا دیا گیا کہ رسول پاکؐ جو بھی کر رہے ہیں وہ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں، اللہ کا حکم ہے کہ ان بتوں کی پرستش نہیں کرنی۔

قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ کَذَّبۡتُمۡ بِہٖ ؕ مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقُصُّ الۡحَقَّ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡفٰصِلِیۡنَ ﴿۵۷﴾

''کہہ دو میرے پاس تو میرے رب کی طرف سے ایک دلیل موجود ہے اور تم اس کو جھٹلاتے ہو، جس چیز کو تم جلدی چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے، اللہ کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چلنا، وہ حق بیان کرتا ہے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔

رسول خداؐ کے پاس رب کی دلیل

''بَیِّنَۃٍ'' واضح اور روشن راہنمائی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے حق کو باطل سے جدا کیا جاسکے اور باآسانی حق کو باطل سے پہچانا جاسکے۔ ''کَذَّبْتُمْ بِہٖ ط'' میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع قرآن مجید ہے اور بینہ کو جھٹلانے سے مراد اس دلیل کو جھٹلانا ہے جو رسول خداؐ کے پاس ہے قرآن مجید کو جھٹلانا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ کو دے کر بھیجا ہے، جو آپؐ کی رسالت کی دلیل ہے، کفار اور مشرکین اس کو جھٹلاتے ہیں اور دوسرا معجزہ مانگتے ہیں۔ ان کے جواب میں رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا اختیار نہیں ہے۔ میرے پروردگار نے اپنے امر کو میرے حوالے نہیں کیا لہٰذا تمہارے اور میرے درمیان کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جس پر ہمارا اتفاق ہو۔ کیونکہ جو دلیل پروردگار نے مجھے واگزار کی ہے وہ یہی قرآن ہے جس کو تم قبول نہیں کرتے اور جو دلیل تم مانگتے ہو وہ میرے سپرد نہیں کی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ حکم فقط اللہ کے اختیار میں ہے، غیر اللہ مستقلاً حکم صادر کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ صرف خدا ہے جس کو حکم بیان کرنے کا حق ہے اور وہی ہے جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہی ہے جو حق کے قاعدے کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور حق پر مبنی فیصلہ صادر کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا اور قضاوت کرنے والا ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ ط وَ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾

''کہہ دو اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو اس معاملہ میں فیصلہ ہوگیا ہوتا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔

ہر بات کا اختیار اللہ کے پاس ہے

خداوند اپنے پیغمبرؐ سے فرمارہاہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر میں تمہاری بے جا خواہشات کو پوری کرنے پر قادر بھی ہوتا اور جو معجزہ تم مجھ سے مانگ رہے ہو اس کو عملی جامہ پہناتا تو پھر میرے اور تمہارے درمیان معاملہ ہی ختم ہو جاتا اور ہم میں سے ایک نجات پالیتا اور دوسرا ہلاک ہو جاتا۔ معلوم ہے کہ تم لوگ ظالم ہو اس لیے عذاب الٰہی تم ہی پر نازل ہوتا۔ کیونکہ خداوند اس بات سے منزہ ہے کہ ستمگار کو غیر ستمگار سے جدا نہ کرے اور اس پر معاملہ مشتبہ ہو۔ خدا پر کوئی بھی بات مشتبہ نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری جگہ تمہیں عذاب دیا جائے یا تمہاری جگہ مجھے عذاب دیا جائے۔ کیونکہ تم ہی ظالم ہو لہٰذا عذاب الٰہی تمہارے شامل حال ہوگا۔

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

"اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ ہی جانتا ہے جو کچھ زمین میں اور جو کچھ سمندروں میں ہے، اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر یہ کہ سب کچھ ایک روشن واضح کتاب میں موجود ہیں"۔

غیب کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ خدا ظالموں کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ اس آیت میں بیان کیا جارہا ہے کہ غیب کے خزانے اور غیب کی چابیاں رب تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ ہی چھوٹی بڑی سب چیزوں کو جانتا ہے۔ وہ جیسے چاہے ان میں تصرف کر سکتا ہے۔ خدا حکم اور فیصلے دینے میں اشتباہ نہیں کرتا۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے خواہ وہ غیب ہو یا شہود۔ جو امور زمانہ کی حدود میں آتے ہیں قبل اس کے وہ موجود ہوں، خدا کے ہاں ثابت اور قائم تھے۔ غیب کے خزانوں میں ان کا مبہم نوعیت اور غیر مقدر قسم کا ثبوت تھا۔ اگرچہ اس وقت کے ثبوت کی کیفیت ہمارے لیے مبہم ہے اور ہم اس کا احاطہ نہیں رکھ سکتے۔ شاید بہت ساری چیزیں اس عالم میں موجود ہوں جو زمانی موجودات سے ہی نہ ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ کے غیب کے خزانے دو طرح کے ہیں:

1۔ایسی غیبی چیزیں جو شہود اور ظہور کے مرحلے تک پہنچی ہیں۔

2۔ایسی غیبی چیزیں جو شہود و ظہور کے مرحلے تک نہیں آئی بلکہ غیب مطلق ہیں۔

اگرچہ پہلی قسم کی بازگشت بھی دوسری قسم کی طرف ہے لیکن جب تک وہ امور ہمارے علم میں نہ آئیں انہیں غائب نسبی کہا جاتا ہے۔ مثلاً درخت کے پتوں کا گرنا، زمین سے دانے کا اگنا چاہے وہ خراب ہو یا صحیح، اسی طرح ہر خشک و تر کے بارے میں علم جو کہ محدود امور ہیں محال نہیں ہے۔ لہٰذا یہ چیزیں غائب مطلق نہیں ہیں۔ لیکن یہ چیزیں کثرت کی وجہ سے انسان کے احاطے میں نہیں۔ انسان اس لیے ان امور کے بارے علم حاصل کرنے سے عاجز ہے کیونکہ وہ محدود ہے، محدود میں لامحدود نہیں آسکتا۔ لیکن ان کا احاطہ کرنا انسان کے لیے ذاتاً محال نہیں ہے۔

اس کے بعد اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ سارے امور کتاب مبین میں موجود ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جو غیب اور شہود کے لحاظ سے کتاب میں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کتاب مبین اسی عالَم وجود ہی میں ہے جس میں سارے موجودات اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ شاید اس سے مراد یہ ہو کہ یہ موجودات صرف غائب ہونے کے لحاظ سے اس کتاب مبین میں موجود ہیں۔ کتاب مبین سے مراد ایک ایسی کتاب ہے جس میں تمام موجودات مخصوص طریقے سے لکھے گئے ہیں۔ اس آیت میں پہلا معنی مراد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ موجودات جہان ہمیشہ حرکت و تبدیلی کی حالت میں ہیں، جبکہ قرآن مجید اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لوح محفوظ اور ام الکتاب قابل تغیر و تبدل نہیں ہیں۔

اس بنا پر کتاب مبین، غیبی خزانوں کے علاوہ دوسری کوئی چیز ہے۔ کتاب مبین ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس لیے خلق فرمایا ہے تاکہ باقی موجودات کو اس میں ضبط کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ باقی تمام چیزوں کو اپنے خزانوں سے باہر نکالنے اور عالم وجود تک پہنچانے سے پہلے اور وقوع کے بعد اسی کتاب مبین میں محفوظ کرتا ہے۔ ان تمام موجودات پر اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ ان کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد میں بھی اور عالَم میں رونما ہونے والی تمام تبدیلیاں علم الہیٰ میں محفوظ ہیں اور اللہ سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے اس آیت میں یہی بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۠﴿۶۰﴾

"اور وہ وہی ہے جو تمہیں رات کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کر چکے ہو وہ جانتا ہے پھر تمہیں دن میں اٹھا دیتا ہے تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو مقرر ہو چکا ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے پھر تمہیں خبر دے گا اس کی جو کچھ تم کرتے تھے"۔

موت اور نیند کی حالت میں روح کا قبض کیا جانا

''تَوَفّی'' کسی چیز کو پوری طرح لے لینے کو کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں اسی طرح سورۃ زمر کی آیت نمبر 40 میں یہ کلمہ نیند کی حالت میں روح کو لے لینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت اور نیند دونوں میں بدن اور روح کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ جس طرح "بعث" نیند سے بیدار کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زندہ کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں وجہ اشتراک یہ ہے کہ اس حالت میں روح کا بدن کے ساتھ دوبارہ رابطہ برقرار ہو جاتا ہے۔ نیند کو رات سے اور بیداری کو دن سے قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ معمولاً لوگ رات کو سوتے ہیں اور دن کو بیدار رہتے ہیں، وگرنہ اس کی کوئی اور خصوصیات نہیں۔

یہ جو فرمایا تمہیں لے لیتا ہے نہیں فرمایا کہ تمہارے نفس کو لے لیتا تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ انسان کی حقیقت اس کی روح ہی ہے۔ روح انسان کا ایک جزء یا اس کی صفت یا حالت وہیت نہیں ہے جو اس پر طاری ہوتی ہے، بلکہ انسان کی حقیقت روح ہی ہے، وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ ''جَرَحَ'' اعضاء بدن کے ساتھ کام کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں پر اس سے کام کاج اور کمائی کرنا مراد ہے۔ اس آیت میں فرمایا خدا رات کے وقت تمہاری جان کو پوری طرح لے لیتا ہے اور وہ تمہارے دن کے اعمال سے پوری طرح آگاہ ہے اور پھر تمہیں

دن کو بیدار رکھتا ہے یہاں تک کہ تمہاری اجل آجائے۔ جب تمہاری معین اجل آجائے گی تو اپنے پروردگار کی طرف واپس پلٹ جاؤ گے یہ وہی اجل ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے سورۃ اعراف کی آیت نمبر 36 میں فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾

"اور ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے پس جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی تاخیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی"۔

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾

"اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے، اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اسے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے"۔

انسان کی روح قبض کرنے والے فرشتے

قہر ایسے غلبہ کو کہتے ہیں جو مغلوب کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کو خلق کیا ہے تاکہ وہ حوادث اور واقعات کے وجود میں آنے کا واسطہ بنیں۔ پس وہ سب اللہ کے آگے مقہور ہیں۔ اور اللہ ان سب پر محیط ہے۔ نیز وہی خدا ہے جو ایسے نگہبانوں کو بھیجتا ہے جو انسان کی پوری زندگی میں آنے والے تمام مصائب اور آفات سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیونکہ دنیاوی زندگی میں تمام حالات و کیفیات میں تضاد اور تعارض ہے اور اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھاتی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے مزاحم ہو رہی ہوتی ہیں۔ دنیا کی تما

م اشیاء تکامل کی طرف رواں دواں ہیں، پہلی حالت سے اگلی حالت کی جانب سفر کر رہی ہیں جو کہ اس سے بہتر ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر شئی اس بات کی خواہاں ہے کہ وہ ہستی کے زیادہ حصے کو حاصل کرے، لیکن وہ اسی صورت میں ہستی کے زیادہ حصے کو حاصل کر سکتی ہیں جب دوسروں کے حصہ کو کم کریں۔ کیونکہ انسان بھی اسی عالم ہستی کا ایک جزء ہے اور جسمانی لحاظ سے موجودات عالم میں لطیف ترین موجود ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس کی حفاظت پر مقرر کیا ہے تاکہ وہ انسان کی ولادت سے اس کی موت تک اسے ان حوادث و واقعات سے محفوظ رکھیں۔

اس بارے سورۃ انفطار آیت نمبر ۱۰ تا ۱۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

”جبکہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز لکھنے والے، جو تمہارے اعمال کو جانتے ہیں“۔

یہ حفاظت ہر فرد کے لیے اس کی موت تک جاری ہے جب اس کی موت کا وقت آجاتا ہے تو پھر اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا سے چلا جائے۔ اس وقت وہ فرشتے آجاتے ہیں جن کی ذمہ داری اس کی روح قبض کرنا ہے اور اس کی روح قبض کرتے ہیں اور اس امر میں وہ کوتاہی نہیں کرتے اور نہ ہی کسی قسم کی رعایت کرتے ہیں بلکہ جو امر ان کو ہوا ہے وہ اسے انجام دیتے ہیں۔ اس بارے سورۂ نحل کی آیت نمبر 50:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

”وہ اپنے رب سے جو ان پر بالادستی رکھتا ہے ڈرتے ہیں اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔“

اور سورۂ تحریم کی آیت 6 میں آیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، اس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں''۔

ملک الموت کے اعوان وانصار

یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کارکنان ملک الموت کے اعوان وانصار ہیں۔ قرآن کریم میں ایک مرتبہ روح قبض کرنے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (سورۂ زمر آیت نمبر 42)

''موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے'' دوسری جگہ موت کی نسبت ملک الموت یعنی عزرائیلؑ کی طرف دی گئی ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ (سورۂ سجدہ، آیت: ۱۱)

''کہہ دیجئے: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹائے جاؤ گے''

اور یہاں پر موت کو فرشتوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ سب پر اللہ کا حکم چل رہا ہے۔ جب اللہ کا نمائندہ کوئی کام کرتا ہے تو وہ اللہ ہی کا ہوتا ہے۔ پھر ان سب کی ذمہ داری اللہ نے لگائی ہے۔ عزرائیل ملک الموت ہے اور پھر ملک الموت کے آگے اعوان وانصار ہیں جن کو رسل اور فرشتوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان سب کے اوپر اللہ کی ذات ہے جو سب پر محیط ہے اور اس کے بعد ملک الموت ہے اس کے بعد ملک الموت کے اعوان وانصار ہیں جو روح قبض کر لیتے ہیں۔

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

''پھر اللہ کی طرف پہنچائے جائیں گے جو ان کا سچا مالک ہے، خوب سن لو کہ فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا اور بہت جلدی حساب لینے والا ہے''۔

سب کی بازگشت اللہ کی طرف

یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا اور سب کو اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو مولاء حق کہا گیا ہے۔ اس صفت کے ذریعے ان تصرفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پہلے ذکر ہوئے ہیں۔ اگر خدا نیند دیتا ہے، پھر بیدار کرتا ہے یا مارتا ہے اور پھر زندہ کرتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ حقیقی مولا ہے، وہی صاحب اختیار ہے اور اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور انسان کا کنٹرول بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ صفت سرپرست ہونے میں اللہ کی اولویت اور بالادستی کو بھی بیان کر رہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔ یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ کا مولا ہونا ایسا نہیں ہے کہ اس میں زوال آئے، زوال کے لیے وہاں راستہ نہیں ہے۔ حق اللہ کے اسماء حسنیٰ سے ہے اور کیونکہ یہ ذات ثبوت سے عبارت ہے اور صفات کے ثبوت سے عبارت ہے۔ پھر فرمایا کہ حکم صرف اللہ کا ہے وہی ہے جو دوسروں کے لیے قانون اور ضابطہ جاری کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مولا ہے اور اسی کے لیے ولایت مطلقہ ہے۔ وہی حقیقی مولا ہے لہٰذا اسے ملک میں ہر طرح کے تصرف کرنے کا اختیار ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے تمام امور کا مدبر اور مدیر ہے۔

اس بات کو جاری رکھتے ہوئے اس بحث کے نتیجہ کے طور پر فرمایا: اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ پس خدا لوگوں کے عمل کا حساب کو مناسب وقت سے موخر نہیں

کرتا۔ وہ اگر کسی شخص کو مہلت دیتا ہے تو یہ حساب لینے میں مشکل کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ مہلت اس کے نقصان میں ہے کیونکہ وہ گناہگار کو مہلت دے کر اس کے جرم اور نتیجے میں اس کے عذاب میں اضافہ کرنا چاہتا ہے جس کو قرآن کی اصطلاح میں استدراج اور امہال کہا جاتا ہے۔ جب مناسب موقع آجاتا ہے اور حجت اور دلیل مکمل ہو جاتی ہے اور گنجائش ختم ہو جاتی ہے تو پھر موت آجاتی ہے اور حساب کا وقت آجاتا ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

''کہہ دو تمہیں خشکی اور دریا کے اندھیروں سے کون بچاتا ہے جب اسے عاجزی کے ساتھ اور چھپا کر پکارتے ہو، کہ اگر ہمیں اس آفت سے بچالے تو البتہ ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہوں گے''۔

خشکی اور دریا کے اندھیروں سے بچانے والی ذات

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کون ہے جو تمہیں سختیوں سے نجات دلاتا ہے؟ جب تم زمینی اور دریائی سفر کرتے ہو سخت سردی ہوتی ہے، سخت گرمی ہوتی ہے، بارش ہوتی ہے، برف ہوتی ہے، راہزن ہوتے ہیں، طوفان ہوتا ہے تو ان حالات میں کون ہے جو تمہیں رہائی دلاتا ہے اور تمہیں ہلاکت سے بچاتا ہے؟ واضح ہے یہ ساری پریشانیاں، مشکلات اگر رات میں آئیں تو بہت زیادہ تکلیف دیتی ہیں، لہٰذا اس آیت میں '' ظُلُمٰتِ '' کا لفظ استعمال ہوا ہے تاریکیوں میں جو مصیبت آتی ہے جو مشکل ہوتی ہے اس کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔ عمومیت کے معنی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے '' ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ '' سمندر اور خشکی کی تاریکیوں کو استعمال کیا ہے۔ '' تَضَرُّعًا '' اپنے دردمند کا اعلان اور اس کا اظہار کرنا۔ '' خُفْيَةً '' خفا اور

پوشیدہ حالت میں۔ یہ دو لفظ مصیبت کے بڑے یا چھوٹے ہونے کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں۔

مصیبت چھوٹی ہو تو انسان دل ہی دل میں اللہ کو پکار رہا ہوتا ہے لیکن جب مصیبت بڑی اور عمومی ہو اور نا امیدی چھا جائے تو وہ بے پردہ ہو کر اور علنی طور پر شیون و گریہ وزاری اور واویلا اور ہائے ہائے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ خداوند انسان کو ہر پریشانی سے نجات دیتا ہے چاہے وہ پریشانی خشکی اور زمین کی ہو، چاہے وہ سمندر کی ہو، چاہے مصیبت اور مشکل چھوٹی ہو یا بڑی، انسان ہر مصیبت میں اللہ ہی کو پکارتا ہے۔ انسان مصیبت اور مشکل کے وقت وعدہ بھی کر رہا ہوتا ہے کہ اگر اللہ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو میں اس کا شکر گزار بندہ ہوں گا، اس کا شکر بجا لانے والوں میں سے ہوں گا اور کفران نعمت نہیں کروں گا اور اس کی نعمت کو نہیں جھٹلاؤں گا۔ اس وعدہ کی بنیاد اور جڑ انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے کہ انسان جب دوسرے انسانوں کے ساتھ ٹکراتا ہے تو اپنے لیے منفعت چاہتا ہے اور ایسے موقع پر بھی وہ اس قسم کے وعدے دوسروں کو دیتا ہے کہ تم نے میرا یہ کام کر لیا تو میں آپ کا پوری زندگی ممنوں رہوں گا اور اسی عادت کو جب اللہ سے توسل کرتا ہے تو وہاں بھی استعمال میں لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خداوند تبارک وتعالیٰ نے مجھے اس مصیبت سے نکال دیا اور میری رخواست قبول کر لی اور میری مشکل ٹل گئی تو میں اس کا شکر بجا لاؤں گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس طرح کی چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾

''کہہ دو کہ اللہ تمہیں اس سے اور ہر سختی سے بچاتا ہے تم پھر بھی شرک کرتے ہو''۔

اللہ کی مہربانیاں

''کَرْبٍ'' غم و اندوہ کے معنی میں آتا ہے، بہت زیادہ غم اور بہت زیادہ پریشانی۔ اس لفظ کو ''کرب الارض'' یعنی زمین کو تہ و بالا کرنے سے لیا گیا ہے۔ جب انسان کے دل میں غم و اندوہ ہو تو اس کو تشویش میں ڈال دیتا ہے، وہ پریشانی میں آجاتا ہے اور ایسے غم کو کرب کہتے ہیں ''کل کرب'' تمام نامناسب حالات جو انسان کو پیش آتے ہیں اور اس کی پریشانی کا سبب بنتے ہیں یہ لفظ ان سب کو شامل ہے۔ اس بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ تم ہمیشہ دریاؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں اور خشکیوں کی تاریکیوں میں بہت سارے مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوتے ہو اور تمہیں نامناسب حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ظاہری اسباب سے تمہاری امیدیں کٹ جاتی ہیں اور تمہیں ان حالات سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں نظر آتا تو اس وقت تم صرف خدا کی طرف رجوع کرتے ہو۔ اس وقت تمہاری فطرت جاگ جاتی ہے اور اس فطرتِ انسانی کے مطابق تم اللہ کو پکارتے ہو۔ اللہ ہی ہے جو تمہیں ان مصائب سے نجات دلاتا ہے اور تمہیں ہلاکت سے بچاتا ہے، تمہاری پریشانی کو دور کرتا ہے۔ اور ایسی حالت میں تم وعدہ کرتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دی تو ہم اس کا شکر بجالائیں گے، کفران نہیں کریں گے۔ لیکن جب تمہیں مشکل سے نجات ملتی ہے اور پریشانی دور ہو جاتی ہے تو اپنے وعدے کو توڑتے ہو اور پھر سابقہ عادت اپنا لیتے ہو اور کفران نعمت کرتے ہو۔ اس بنا پر اس آیت اور پچھلی آیت میں مشرکین کی عہد شکنی پر سرزنش کی گئی ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵

''کہہ دو وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب اوپر سے بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف فرقے کرکے ٹکرا دے اور ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے، دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں''۔

اللہ تم پر عذاب اتارنے پر قادر ہے

''بعث'' کسی چیز کو ابھارنے یا ایک چیز کو دوسری چیز کی طرف دھکیلنے کے معنی میں ہے۔ بعث کے دو معنی ہیں:

1۔ بعث بشری، جیسے کسی چیز کو بپا کرنا یا اونٹ کو راستے میں ڈالنا یا کسی انسان کو کسی مقصد کے لیے روانہ کرنا۔

2۔ بعث الٰہی، یہ دو قسم کی ہوتی ہے:

1۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اشیاء کو نیستی اور عدم کے بعد ہستی اور وجود عطاء کرنا۔ اس قسم کی بعث اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہے اور اس قسم کی بعث کی قدرت اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا نہیں کی ہے۔

2۔ دوسری قسم: مردوں کو زندہ کرنا۔ یہ اللہ کے علاوہ اولیاء اللہ بھی کرتے تھے جیسے حضرت عیسیٰؑ۔ لیکن یہ سب اللہ کی اجازت سے ہوتا ہے۔

بعثِ عذاب کا مطلب ان لوگوں کے لیے عذاب بھیجنا ہے جو عذاب کے مستحق ہیں۔ اگر آج تک ان پر عذاب نہیں آیا تو اس کی وجہ یا تو ان کا ایمان تھا یا ان کا اللہ کی اطاعت کرنا عذاب الٰہی کے ٹلنے کا سبب بنا ہوا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی تو وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے اور خداوند اس بات پر قادر ہے کہ وہ ان کے اوپر سے عذاب لے آئے یا زمین سے لے آئے یا تمہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دے۔ آسمانی عذاب جیسے خوفناک آواز کا آنا،

بادو باران کا طوفانی ہونا جیسے قوم عاد، ثمود، لوط، شعیب پر عذاب آیا۔ زمینی عذاب یہ ہے کہ زمین کا پھٹنا اور زمین کے اندر چلے جانا جیسے قارون زمین میں دھنس گیا، زلزلہ آجانا۔

بعض نے کہا کہ اوپر کے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو سلاطین اور مستکبر لوگوں کی جانب سے اپنی رعیت پر ہوتا ہے اور نیچے کے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو انسان کو نوکروں اور غلاموں کی طرف سے ملتا ہے۔

بعض نے کہا کہ عذاب فوق سے مراد وہ عذاب ہے جنہیں اسلحہ کی صورت میں انسان نے اس آخری دور خود ایجاد کیا ہے اور آسمان سے بم برسائے جاتے ہے، سنگین توپ خانہ چلایا جاتا ہے، میزائل پھینکے جاتے ہیں، جنگی بحری بیڑے ہیں۔ لیکن اگر حقیقت دیکھی جائے تو یہ آیت تمام مصادیق پر صادق آسکتی ہے۔

اگر دقت کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جو انسان کو عذاب کا مستحق ٹھہراتی ہے وہ آپس کا اختلاف اور تفرقہ ہے۔ انسان جب پیغمبروںؑ کی دعوت پر اتفاق نہ کریں تو وہ عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ''یَلْبِسَكُمْ شِيَعًا'' ''لبس علیہ الامر'' سے ہے اور یہ کسی معاملہ کے مشتبہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لبس اشتباہ امر، بات کا اس انداز سے ہونا کہ حقیقت سمجھ میں نہ آئے۔ ''شِيَع'' گروہ اور فرقہ کے معنی میں ہے۔ شیعہ پیرو اور تشیع پیروی ہونا اور دین داری کی شکل میں، ولایت کی شکل میں کسی کے ماتحت رہ کر اس کی پیروی کرنے کو تشیع کہا جاتا ہے۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد ہونے والی گروہ بندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ گروہ بندی اور اسلام میں مختلف فرقے، جن میں سے ہر فرقہ اپنے اعمال پر تعصب کرتا ہے اور اپنے خیالات کی جاہلانہ حمایت کرتا ہے یہاں تک کہ برادر کشی پر اتر آتا ہے، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کا قتل جائز سمجھتا ہے اور اس طرح دین کی حرمت اور اسلام کی سرحد کو عبور کر جاتا ہے۔ اس عبارت ''وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ

بَعۡضٍ ؕ" سے ان ہی مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ تفرقہ ایک تو عذاب ہے اور دوسرا تفرقہ کے بہت سارے آثار ہیں جو امت کے درمیان جنگ و خون ریزی، اجتماعی کمزوری کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوسرا جملہ عام کے بعد خاص یا مقید کے بعد مطلق کو ذکر کرنے کے عنوان سے ہے۔ اور یہ قرآن کی فصاحت سے دور ہے کیونکہ یہاں پر کوئی خاص عنایت موجود نہیں ہے لہٰذا دونوں عبارتیں ایک ہی عذاب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اے محمد ﷺ لوگوں کو سمجھاؤ کہ اتحاد کو توڑنا اجتماعیت کا خاتمہ اور توحید کے پرچم سے انحراف اور وحدت کو ٹکڑوں میں بدلنا اور دعوت حق سننے کے بعد اس پر پابند نہ رہنے کا انجام بہت خطرناک ہو گا۔ اس طرح تم ایک دوسرے سے الجھ جاؤ گے ایک دوسروں کو قتل کرو گے، ایک دوسرے کا خاتمہ کرو گے، ایک دوسرے کے ٹکرے کرو گے۔ یہ بہت بڑا عذاب ہے۔ شاید تم اس بات پر غور و فکر کرو، گہرائی میں جا کر سوچو اور اوامر الٰہی کی پابندی کرو تاکہ اس تفرقہ کے عذاب سے بچ سکو۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُكَ وَهُوَ الۡحَقُّ ؕ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ؕ﴿۶۶﴾

"اور تیری قوم نے اسے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ حق ہے، کہہ دو میں تمہارا ذمہ دار نہیں بنایا گیا"۔

قریش کا حق کو جھٹلانا

قوم رسولؐ سے قریش یا پوری امتِ عرب مراد ہے۔ یہ جملہ ایک خبر کے مقدمہ کے طور پر بیان ہوا ہے۔ یہ انذار مشتمل ہے گویا امت اسلام کو دعوت دی جا رہی ہے کہ پرچم توحید کے نیچے جمع ہو جاؤ، اس کی پیروی کرو، کلمہ حق پر متفق رہو ورنہ تمہارے لیے عذاب الٰہی سے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس کے بعد رسول خدا ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا یہ تمہاری قوم ہی ہے جس نے تمہارے دین کو جھٹلایا، لہٰذا اب یہ لوگ عذاب چکھنے کے لیے

آمادہ ہو جائیں۔ آخر میں پیغمبرؐ کو کہا گیا کہ ایسی قوم سے اعراض کرو، رخ موڑ لو اور ان سے کہہ دو کہ تمہارا اختیار مجھے نہیں دیا گیا ہے تاکہ خیر خواہی کے طور پر تمہیں اس جھٹلانے والے رویہ سے روک سکوں۔ میں تو فقط اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں حق کی طرف دعوت دوں جو کہ دی ہے۔ جب تم نے دعوت قبول نہیں کی ہے تو اس تکذیب کے نتیجے میں آنے والے سخت عذاب سے تمہیں خبردار کر رہا ہوں جس سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

"ہر خبر کے ظاہر ہونے کا ایک وقت مقرر ہے، اور عنقریب جان لو گے"۔

ہر خبر کا مقرر وقت

اس آیت میں یقینی طور پر آنے والے عذاب کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بات کہ کس طرح مسلمانوں کو دی جانے والی دھمکی اور تفرقہ میں پڑنے پر سرزنش اور اس کے نتیجہ میں آنے والے عذاب سے مشرکین کو ڈرایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ساری بدبختیوں کا سبب اور علت مشرکین اور منافقین تھے۔ کیونکہ امت واحدہ ایک بدن کی مانند ہے، اس کے ایک عضو کا انحراف سارے بدن کو متاثر کرتا ہے اور معلوم ہے کہ امت کے سابقہ افراد کے گناہوں کے برے آثار اور نتائج سے آئندہ آنے والی نسلیں دوچار ہونگی۔

آج اگر فلسطین میں امت اسلام مشکلات کا شکار ہے یا اندلس میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے تو اس کی وجہ ان کا آپس کا اختلاف اور افتراق ہی تھا اور حکمرانوں کی آرام طلبی، مادی اور گھٹیا کاموں اور دنیاوی لذتوں میں غرق ہونا اور اللہ کے راستہ سے انحراف اور مشرکین کو اپنے معاملات میں شریک کرنے کے نتیجہ کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی؟ جبکہ ہم اب بھی دیکھ رہے ہیں کہ امتِ عرب کس طرح خیانت پر خیانت کرتی جا رہی ہے اور اسرائیل جو غدہ سرطانی ہے جو ہر روز فلسطینوں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور ان کا قتل عام کر رہا ہے، عرب

ممالک ان کو تسلیم کرتے جا رہے ہیں۔ متحدہ عرب امارات، بحرین، تیونس، سوڈان اور سعودی نے آشکارا طور پر اسرائیلیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور باقی حکمرانوں کو بھی آمادہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ترکی کے بھی اسرائیل کے ساتھ روابط ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت مسلمہ ذلت اور خواری کی طرف جا رہی ہے۔ ذلت و رسوائی کا سبب خود امت ہی ہے۔ اس میں عوام سے زیادہ مسلمان حکمران ذمہ دار ہیں۔

وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۶۸﴾

''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ یہاں تک کہ کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں، اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے پاس نہ بیٹھو''۔

آیات الٰہی میں جھگڑنے والوں سے دوری

''خوض'' پانی میں داخل ہونے اور اس کو عبور کرنے کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ کنایہ کے طور ناپسندیدہ اور برے کاموں کو انجام دینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی برحق آیت کا مذاق اڑانا۔ ایسے افراد سے دور رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عمل میں شرکت نہ کی جائے۔ اور اگر ان کے درمیان میں ہو اور وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑا رہے ہوں تو ان سے علیحدہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بلکل ان کے ساتھ ہم نشینی نہ کرو، بلکہ جس وقت وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑا رہے ہوں، دین کا مذاق اڑا رہے ہوں،

اس وقت ان کے ساتھ بیٹھے رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔ اور اگر یہ بات بھول جاؤ تو جیسے یاد آجائے اسی وقت اس مجلس سے اٹھ جاؤ اور ستمگار گروہ کے ساتھ نہ بیٹھو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کا مذاق اڑانا ظلم ہے۔ اس گفتگو میں اگرچہ بات تو مشرکین کے احتجاج کے متعلق ہے لیکن اس میں جو معیار بتا دیا گیا ہے وہ عمومی ہے۔ آیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ ظالموں کے ظلم میں شریک ہونا جائز نہیں چاہے ظلم کرنے والا مشرک ہو یا غیر مشرک۔ اس بات کی تصدیق اور تائید سورۂ نساء کی آیت نمبر 140 میں کی گئی ہے: ''اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ'' نافرمان اور ظالم لوگوں کے ساتھ بیٹھو گے تو تمہارا شمار بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ خطاب اگرچہ پیغمبر کو ہے لیکن پیغمبر تو معصوم ہے، اس لیے اس سے مقصود ان کی امت ہے۔ جیسا کہ فارسی محاورہ میں ہے "دروازہ کو کہہ کر دیوار کو سنانا" جس کے مانند سرائیکی کا محاورہ ہے "بیٹی کو سنا رہی ہوتی اور مقصود بہو ہے"۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾

"اور جھگڑنے والوں کے متعلق پرہیزگاروں کے ذمہ کوئی چیز نہیں لیکن نصیحت اور یاد دہانی کا عمل جاری ہے شاید کہ وہ ڈر جائیں اور تقویٰ اختیار کر لیں"۔

نصیحت اور یاد دہانی

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کا گناہ اور وبال خود ان کے اپنے لیے ہے اور خود انہی کو اس برے عمل کی سزا ملے گی۔ مگر یہ کہ جو لوگ ان کے اس عمل اور رویہ سے راضی ہوں تو پھر وہ بھی اس گناہ میں ان کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اہل تقویٰ جنہوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی سے روکا ہے ان پر کسی قسم کا گناہ

نہیں ہے۔ آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کی مجلس میں بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر ان کی مجلس میں بیٹھو گے تو تم بھی ان میں سے ہو جاؤ گے۔ دینی قواعد کی رو سے جو فرد گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دوسرا اس کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔ اس بناپر اس حکم کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ نشست و برخواست سبب بن جاتی ہے کہ انسان بھی اس قسم کے اعمال کے ارتکاب کی جانب مائل ہو جائے اور ان کے برے اعمال کی برائی اس کے ذہن سے جاتی رہے۔ '' ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝٦٩ '' اس سے مراد یہ ہے کہ اہل تقویٰ کے لیے تذکر اور یاد دہانی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچا کر رکھیں ورنہ اس گروہ کا گناہ ان ہی کے ذمہ ہے اور اس کی سزا بھی ان ہی کو ملے گی، اہل تقویٰ کو نہیں ملے گی۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝٧٠

''اور انہیں چھوڑ دو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکہ دیا ہے، اور انہیں اس (قرآن) کے ذریعہ نصیحت کرو تاکہ کوئی اپنے کیے میں گرفتار نہ ہو جائے، کہ اس کے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست اور سفارش کرنے والا نہ ہوگا، اور اگر دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے گا تب بھی اس سے نہ

لیا جائے گا، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے کیے میں گرفتار ہوئے، ان کے پینے کے لیے (کھولتا ہوا) گرم پانی ہوگا اور ان کے کفر کے بدلہ میں دردناک عذاب ہوگا‘‘۔

دین کو کھیل تماشا بنانے والوں سے قطع تعلق

’’بسل‘‘ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانے یا منع کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں اس سے مراد ثواب اور خیر سے محروم ہونا ہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے وہ لوگ جو دین کو بے ہودہ چیز اور کھیل تماشہ قرار دیتے ہیں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کے گرویدہ ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی بنیاد پر دین کو کھیل تماشہ اور لہو ولعب قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کی بنیاد پر صحیح اور دین حق کا انتخاب تو کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے دین کو کھیل تماشہ خیال کیا ہے اور اس کو اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق گھماتے ہیں۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ دنیا سے دھوکہ کھا جاتا ہے۔ کیونکہ جب انسان مادی لذت میں گھیر جاتا ہے تو اپنی باگ ڈور کھو دیتا ہے، اس کا سارا ہم و غم مادیت ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے لیے کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے سہل انگاری کرتا ہے، لاپرواہی کرتا ہے اور دین کو کھیل تماشہ قرار دیتا ہے اور اسے سنجیدگی سے نہیں لیتا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ سے فرمایا ہے کہ قرآن کے ذریعہ انہیں یاددہانی کراؤ اور وعظ و نصیحت کرو اور ان سے کہہ دو گناہ اور برے اعمال کے نتیجے میں ثواب سے محروم ہو جاؤ گے اور عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ ان کو خبردار کرو اور ان کو سمجھاؤ کہ خدا کے سوا کوئی یار و یاور نہیں اور عذاب سے بچانے والا کوئی ذریعہ نہیں ہے نہ رشوت، نہ اعوان و انصار اور نہ ہی فدیہ، نہ معاوضہ۔ قیامت کا دن ثواب و عقاب کا دن ہے وہاں پر نہ سودا بازی ہوگی اور نہ ہی کاروبار۔ وہاں ایسے لوگ ثواب الٰہی سے محروم ہوں گے اور عذاب کے مستحق ہوں گے

جنہوں نے دین کا کفر کیا، دین کے بارے میں بے پرواہی کی، قیامت کے انکاری رہے۔ وہاں انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جس سے ان کا باطن کھولنا شروع ہو جائے گا۔ وہ ایسے دردناک عذاب کے لائق ہیں یہ اسی کے مستحق ہیں اور اس عذاب سے ان کو نجات ملنا ممکن نہیں۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾

"انہیں کہہ دو کہ کیا ہم اللہ کے سوا انہیں پکاریں جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان دے سکیں اور کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں سیدھی راہ دکھائی ہے اس شخص کی طرح جسے زمین میں جنوں نے راستہ بھلا دیا ہو تو وہ بھٹک گیا ہو، اس کے ساتھی اسے راستے کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس چلا آ، کہہ دو کہ اللہ نے جو راہ بتلائی وہی سیدھی ہے، اور جو ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پروردگار عالم کے تابع رہیں"۔

سعادت کا حامل، الٰہی نظام

یہ آیت استفہام انکاری کی شکل میں مشرکین سے احتجاج ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ کسی کو اس لیے معبود بنایا جاتا ہے تاکہ اس سے کوئی فائدہ ہو یا اپنے سے شر اور نقصان کو دور کر سکے۔ مشرکین کے خیالی معبود نہ تو انسانوں کو کوئی فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے کسی ضرر اور نقصان کو دور کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اس چیز کے لائق ہی نہیں کہ ان کی

عبادت اور پرستش کی جائے۔ ایسا عمل پہلے والے کفر کی طرف پلٹ جانا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کر دی ہے۔ اب دوبارہ اپنے کفر کی طرف رجوع کریں گے تو اس صورت میں اس سرگرداں شخص کی مانند ہوں گے جو بیابان میں پہنچا ہو اور راستہ گم ہو گیا ہے۔ ایک طرف سے شیاطین اسے غلط راستے پر ڈال دیں اور دوسری طرف اس کے دوست اس کو دوسرے راستے کی طرف دعوت دے رہے ہوں اور وہ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے! دوستوں کے راستے پر جائے یا شیاطین کے راستے پر جائے؟ اس میں اس بارے کوئی فیصلہ کرنے کی قوت نہیں ہے۔ وہ دوراہے پہ کھڑا ہے۔

''اسْتَهْوَا'' سقوط کرنا اور بلندی سے نیچے گر جانے کے معنی میں ہے۔

''رَدٌّ'' پیچھے کی طرف پلٹنے کو کہتے ہیں یعنی ہدایت ترک کر کے گمراہی کی طرف پلٹ جانا۔

فرمایا اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دو ہدایت فقط خدا ہی کی ہدایت ہے، خدا کی طرف جانا کیونکہ یہ انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس ہدایت کو قبول کرے اور شیاطین کی دعوت کو ٹھکرا دے کیونکہ دنیا اور آخرت کے تمام امور کا مرجع، بازگشت اور پناہ گاہ فقط اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امر ہے کہ لوگ مسلمان ہوں اور یہی ہدایت الٰہی کا مصداق ہے۔ ہمیں غیب کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کے سامنے تسلیم ہو جائیں کیونکہ وہ عالمین کا پروردگار ہے۔ اسلام سے مراد صرف توحید و نبوت کا اقرار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان تمام امور میں اللہ کے حضور تسلیم ہو۔ کیونکہ خدا کے ایک ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ دین بھی ایک ہو اور وہ دین اسلام ہے یعنی خدا کے سامنے عقائد اور عمل میں تسلیم ہونا۔ دین ایسا نظام الٰہی ہے جو انسان کی دنیاوی اور اخرویسعادت کے لیے بنایا گیا ہے، اس نظام میں انسان کی ساری ضروریات اور احتیاجات موجود ہیں۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِیْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۷۲

"اور یہ کہ نماز قائم رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو، وہی ہے جس کے سامنے اکٹھے کیے جاؤ گے"۔

اللہ کے حضور تسلیم ہونا

پچھلی آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ عالمین کے رب کے آگے تسلیم ہو جاؤ، نماز قائم کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ "وَاتَّقُوْهُ" اس ایک لفظ میں تمام عبادات اور دین کے اعمال کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان سب میں نماز کا خصوصی طو رپر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ نماز کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور قرآن نے نماز کے بارے میں بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ سب کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، تم سب نے اسی کی طرف جانا ہے اور وہی سب بندوں کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ اسی کے آگے تسلیم ہوں اور اس کے عذاب سے ڈریں اور خود کو اس کے عذاب سے بچائیں۔

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۷۳﴾

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر بنایا ہے، اور جس دن وہ کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گا، اس کی بات سچی ہے، اور اسی کی بادشاہی ہو گی جس دن صُور میں پھونکا جائے گا، چھپی اور ظاہر باتوں کا جاننے والا ہے، اور وہی حکمت والا خبر دار ہے"۔

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے اختیار میں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کچھ اسماء و صفات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا مقصد پچھلی آیات کی علت کو بیان کرنا ہے۔ کیونکہ ہدایت فقط اللہ کی ہدایت ہے اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں اور نماز قائم کریں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہی اللہ آسمانوں اور زمینوں کا خلق کرنے والا ہے، اس کی خلقت حق پر مبنی ہے اور اس نے کوئی چیز بے ہودہ خلق نہیں کی اور ہر مخلوق میں کوئی نہ کوئی غرض مد نظر رکھی گئی ہے اور غرض یہ ہے کہ اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور یہی بات قطعی دلیل اور دندان شکن ثبوت ہے اور اسی لیے سورۂ ص کی آیت: 27 میں فرمایا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے بے مقصد پیدا نہیں کیا''۔

اس دن سے جس کو اللہ تعالیٰ کلمہ ''کُنْ'' کے ذریعے ایجاد کرے گا روز حشر مراد ہے جو کہ حق ہے۔ اللہ کی بات حق ہے اور حق ثبوت کے معنی میں ہے۔ اللہ کا قول وہی اللہ کا فعل اور اس کی ایجاد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول عین ثبوت اور عین وجود اور تحقق خارجی ہے درمیان اللہ تعالیٰ کے قول اور کسی چیز کے وجود میں آنے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ حق ہے اور اس کا قول بھی عین حق ہے۔ قیامت کے دن تمام اسباب اور وسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس دن ملک و سلطنت تنہا اللہ کے لیے ہوگی اور وہی ذات پوشیدہ اور ظاہر سے آگاہ ہے۔ ''عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ'' اللہ تعالیٰ کا ایسا نام اور اسم ہے کہ جس سے حساب اور جزا و سزا کا مسئلہ مترتب ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ کے دو نام بیان ہوئے ہے ''حکیم'' حکمت والا اور دانا ''خبیر'' باخبر، جو حکیم و خبیر ہے وہ سب کے اعمال کا حساب لے گا

تو اس حوالے سے لے گا کہ اسے ظاہر اور باطن سب کا پتہ ہے، وہ ظاہر اور باطن کی ہر چیز سے آگاہ ہے اور حکمت و دانائی پوری دقت کے ساتھ اور محکم کاری سے اپنی مخلوقات کا حساب لے گا اور اس کا جائزہ لے گا، سزا اور جزا میں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ سزا اور جزاء میں ہر ایک کو اس کا حصہ ملے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، کوئی بے ہودگی نہیں ہوگی، کچھ بھی بے مقصد نہیں۔ چھوٹا بڑا کوئی بھی کام اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا سب کچھ وہاں عیاں ہوگا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾

"اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا توں بتوں کو خدا جانتا ہے، میں تجھے اور تیری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں"۔

حضرت ابراہیمؑ کا استدلال

علماء نے "آزر" کے لفظ کے بارے میں اختلاف کیا کہ یہ ابراہیم کے باپ کا لقب تھا یا اگر مدد لینے والے کے معنی میں ہو تو اس کی مدح کو بیان کر رہا ہے اور اگر ٹیڑھا، الٹا یا معذور کے معنی میں ہو تو اس کی مذمت کو سمجھاتا ہے۔ تورات میں ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارح یا تارخ بیان ہوا ہے۔ "اب" کا لفظ باپ، چچا اور قوم کے سربراہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عقل بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ "آزر" چونکہ مشرک تھا اس لیے وہ حضرت ابراہیم کا باپ نہیں ہو سکتا چونکہ حضرت ابراہیم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجداد میں سے تھے وہ سب توحید پرست تھے جس کی طرف قرآن کی آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ لغوی اعتبار سے " اب" باپ کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ والد صرف باپ

کے لیے بولا جاتا ہے لیکن ''اب'' چچا اور نانا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق آزر حضرت ابراہیمؑ کے نانا یا ان کے چچا تھے۔ بہر حال ان موارد کے اختلاف سے آیت کے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس آیت میں مشرکین پر حضرت ابراہیم کے اعتراض کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ بت پرستوں میں سے نہیں تھے۔

''صنم'' ایک ایسا جسم جسے چاندی یا تانبے یا لکڑی یا پتھر یا کسی دوسری جنس سے گھڑا جاتا ہے تاکہ اس کی پرستش کی جائے اور اس کے وسیلے سے ان کے خیال سے رب تعالیٰ کی درگاہ میں حاضری دی جاتی ہے یا ہر وہ معبود جو غیر محسوس ہے اس کا قرب حاصل کیا جاسکے۔ ''اَصْنَامًا'' کو بتوں کی حقارت و پستی بیان کرنے کے لیے نکرہ لایا گیا ہے، کیونکہ ان میں علم و قدرت جیسی ربوبیت کی صفات نہیں پائی جاتیں۔ اس کے بعد فرمایا میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں کیونکہ تم ایسے بتوں کی پرستش کرتے ہو جو حقیر، پست اور بے قدر ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے آگے جھکنا اور ان کی پرستش کرنا بہت بڑی گمراہی ہے۔ کیونکہ خدائی کا مقام وہ عالی ترین مرتبہ ہے جس کی نسبت ان چند پتھروں یا لکڑیوں کی طرف نہیں دی جاسکتی۔ اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان پست اور حقیر بتوں کی عبادت کی جائے اور ان کے آگے جھکا جائے جن کے پاس نہ علم ہے اور نہ ہی قدرت ہے۔ اور یکتا صانع اور ساری کائنات کو بنانے والے کو چھوڑا جائے جو تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

''اور ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھائے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے''۔

ابراہیمؑ کو ملکوت آسمان وزمین کا دکھایا جانا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو جس طرح مشرکین اور آزر کے ساتھ استدلال کی روش بتائی اسی طرح ان کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات بھی دکھائے۔ ملکوت کو مُلک سے لیا گیا ہے اور مُلک تصرف پر قدرت رکھنے کے معنی میں ہے، لیکن اس لفظ میں تصرف پر زیادہ تسلط کا معنی پایا جاتا ہے۔ خداوند حاکم بھی ہے اور مسلط بھی ہے، تمام ملک و ہستی پر اسی کا تصرف ہے۔ سارے امور زائل ہونے والے ہیں اور خداوند تبارک وتعالیٰ سرمدی اور باقی رہنے والا اور اشیاکے وجود کا ملکوت ہے، یہ اس اعتبار سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے ذریعہ سب اشیاء کا ثبوت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے جانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان اشیاکے مشاہدہ کے ذریعے اور جتنی بھی مخلوقات ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور اللہ تعالیٰ ان سب کا خالق ہے اپنا دیدار کرایا۔ کیونکہ جب کوئی دیکھ لے گا کہ ان سب چیزوں کی نسبت ایک ذات کی طرف ہے تو وہ بلا فاصلہ فیصلہ دے گا کہ ان سارے موجودات کا مربی فقط ایک ہے اور ان سب کے نظام کا مدبر اور تدبیر کرنے والا بھی ایک ہے۔

ربوبیت ایک طرح کی ملکیت اور تدبیر ہے جو دوسرے کے سپرد نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ دوسری طرف منتقل ہوسکتی ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے ان سب چیزوں کا مشاہدہ کیا اور اپنے خالق کے ساتھ ان چیزوں کی نسبت دیکھی تو متوجہ ہوئے اور اہل یقین سے ہوگئے۔ یقین ایسا علم ہے کہ جس میں کوئی شک وتردید نہیں۔ علم یقین پردے کا اٹھنا اور ماورائے حس وحسیات اور محسوسات کے پیچھے کی آگاہی حاصل ہونا، ہستی کے حقائق سے واقف ہوجانا۔ اللہ تعالیٰ اس علم کو جسے چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے عطا کرتا ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾

''پھر جب رات نے اس پر اندھیرا کیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو کہا میں غائب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

غائب ہونے والی شئ رب نہیں ہو سکتی

''جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ'' رات اس پر چھا گئی اور رات کا پردہ آگیا۔ یہ فقط غروب آفتاب کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ ابراہیم اپنی ملکوتی نگاہ سے جان گئے تھے کہ بت کسی قسم کی تاثیر کا منشا اور منبع نہیں لہٰذا ان کی پرستش نہیں کی لیکن جب ایک ستارہ کو دیکھا تو کہا کہ اس ستارے کی خصوصیات کو جانتے ہیں، اب یہ کہ ستارہ زھرہ تھا یا کوئی اور ستارہ یہ بیان نہیں ہوا کیونکہ حضرت ابراہیم کے احتجاج میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہے لہٰذا ان کا استدلال کسی بھی غروب کرنے والے ستارے کو شامل ہے۔ چونکہ آپ کی قوم صابی اور ستارہ پرست تھی لہٰذا انہوں نے اس بیان سے یہ چاہا کہ صابیوں پر احتجاج کرے۔ یہاں رب سے مالک اور مدبر مراد ہے جو اپنے مربوب جس کا وہ مالک ہے اور جس کی تدبیر کر رہا ہے۔ یہاں پر رب سے آسمانوں اور زمین کا پروردگار مراد نہیں ہے جس نے ان کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ کیونکہ خداوند جسم اور جسمانی نہیں ہے اور ظرف زمانی میں بھی نہیں آتا اور نہ ہی اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم کو ان تمام موارد کا علم تھا اور جانتے تھے کہ اللہ اشارہ جسمانی سے منزہ ہے لہٰذا فرمایا ''هٰذَا رَبِّيْ'' یہ اشارہ تھا کہ یہ میرا رب ہے یہ اس لیے تھا کہ خود کو ایسی موقعیت پر قرار دے اور ان لوگوں کی زبان سے بات کرے اور جب ان کی رائے کا فاسد ہونا

ثابت ہو جائے تو پھر ان کے خلاف احتجاج کرے۔ پس جب ستارہ غروب ہوا تو حضرت نے فرمایا میں تو غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا چونکہ غروب ہونا اس ستارے کی ربوبیت کے بطلان کو بیان کرتا ہے۔ حضرت نے اس بیان سے ستارہ پرستوں کی گمراہی اور ان کے عمل کے باطل ہونے کو بیان کیا کیونکہ ربوبیت اور پرستش کا قیام اس بات سے ہے کہ جو رب ہے اسے محبت کی جاتی ہے، جو شخص کسی چیز سے محبت نہیں کرتا تو وہ اس کی عبادت بھی نہیں کرتا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس بارے فرمایا: ''ان الدین الا الحب'' کیا دین محبت کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے۔ پس پرستش ایک حقیقی رابطے کا نام ہے جو مربوب اور رب کے درمیان محبت کا سبب بنتا ہے۔ اجرام فلکی میں ایسی کشش نہیں ہے اور ان کا جمال اور ان کی خوبصورتی عارضی، متغیر اور زوال پذیر ہے لہٰذا ایسی چیز کے سامنے مجذوب ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ افراد جو دنیا کی ناپائیدار اور ختم ہونے والے جمال اور خوبصورتی میں جذب ہو جاتے ہیں حقیقت میں وہ ان کی ناپائیداری اور زوال پذیری سے غافل ہیں۔ وہ ان امور میں سرگرم ہونے کی وجہ سے ان کے زوال اور فنا کو بھول جاتے ہیں۔ یہ بات معقول نہیں ہے کہ پروردگار عالم اس قسم کے ظاہری تجملات اور ناپائیداریوں، مرنا، جینا، ثبوت، زوال، طلوع، غروب، ظہور، خفا، جوانی، بڑھاپا اور اس قسم کے تغیرات اور تبدیلیوں کا شکار ہو۔ توحید کے مسئلہ کے بارے یہ ایک قطعی برہان ہے جس کو عوام بھی سمجھتے ہیں اور خواص بھی۔ اللہ کی ذات ثابت ہے اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، وہ سرمدی، دائمی اور باقی ہے اور اس کو زوال نہیں ہے تو اسی ذات سے محبت کرنی چاہیے۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾

''پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو کہا اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرے گا تو میں ضرور گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا''۔

ہدایت الٰہی ہی گمراہی سے بچاتی ہے

''بزوغ'' طلوع کے معنی میں ہے۔ ''هٰذَا رَبِّيْ'' جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ یہ اس عنوان سے ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا کہ فرض کرو میں اس بات کو مانوں۔ کیونکہ انہوں نے دشمن کے ساتھ بحث کرنی تھی اور چونکہ وہ چاند اور ستارہ پرست تھے تو انہوں نے ان لوگوں کو لاجواب کرنے کے لیے چاند کو دیکھ کر کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ اور جب چاند نے غروب کیا تو پھر کہا کہ میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ یہ اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ غروب کرنا ایک عمومی ملاک و معیار ہے کہ غروب کرنے والا رب نہیں ہو سکتا۔ غروب کرنے والے کی پرستش چاہے وہ چاند ہو یا ستارہ گمراہی ہی ہو گی۔

حضرت ابراہیمؑ کی اس گفتگو سے درج ذیل نکات استفادہ ہوتے ہیں:۔

1۔ آپؑ کے زمانے میں کچھ لوگ چاند اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے اور وہ گمراہ تھے۔

2۔ حضرت ابراہیمؑ ان بیانات کے ذریعے صحیح اور یقینی ہدایت الٰہی کی جستجو میں تھے، خواہ ان کے کلام کو حقیقی معنوں پر حمل کریں یا ظاہری معنی پر، ہر صورت میں حضرت ابراہیم کا مقصد ہدایت ہی تھا۔

3۔ حضرت ابراہیمؑ کو یقین تھا کہ ہدایت اور دوسرے سب امور ان کے رب ہی کے ہاتھ میں ہی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو یہ بات سمجھائیں کہ جو ان سب امور کا ذمہ دار ہوگا وہی رب ہو گا جو آسمانوں اور زمین کا مدبر ہے جو ان سب کا خالق ہے وہی معبود والٰہ ہے، وہی رب ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

''پھر جب آفتاب کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو کہا اے میری قوم! میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ کا شریک بناتے ہو''۔

مشرکین کے اعمال سے بیزاری کا اعلان

گفتگو کا انداز وہی ہے جو پہلے بیان ہوا مشرکین کے عمل کے خلاف استدلال۔ ''هٰذَآ اَكْبَرُ'' کی قید ان کی بہانہ تراشی کے حوالے سے لگائی ہے کیونکہ دوبار ان کے فرض کے غلط ہونے کو ثابت کر چکے تھے اب کوئی موقع نہیں تھا کہ خورشید کے بارے میں بھی اسی مفروضہ کو تکرار کرتے کہ یہی میرا رب ہے۔ لہٰذا اس دفعہ بہانے اور عذر کے لحاظ سے کہا کہ یہ حجم میں بڑا ہے۔ قرآن کریم اس بات کو سمجھانا چاہتا ہے کہ ابراہیمؑ اس بحث میں یا تو سورج کو نہیں جانتا تھا یا خود کو ایسے شخص کی جگہ فرض کیا جس نے بلکل ہی سورج کو نہیں دیکھا اور یہ نہیں جانتا کہ یہ آسمانی جرم (موجود) ان کے آغاز میں طلوع کرتا ہے اور اس کے آخر میں غروب کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم کا دنیا میں آنے کا قصہ حضرت نوح کے دنیا میں آنے کی مانند ہے کیونکہ ان دونوں کے بارے ستارہ شناسوں نے پیش گوئی کر دی تھی کہ انہوں نے آنا

ہے۔ لہٰذا ان کی ماں نے کئی سال تک انہیں غار میں چھپائے رکھا اور اس کی دیکھ بھال کی۔[1]
لگتا یہ ہے کہ پہلی دفعہ جب غار سے باہر آئے تو چاند اور سورج اور ستارے دیکھے تو اس وقت انہوں نے یہ باتیں کہی ہوں گی۔ یا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کی یہ گفتگو اس عنوان سے ہے کہ جب انسان کسی کے سامنے دلیل پیش کرتا ہے یا اس کے کسی عمل پر استدلال کرنا چاہتا ہے تو کچھ باتیں فرض کر لیتا ہے، یہاں بھی اسی طرح ہے۔ عربی گرامر کے اعتبار سے شمس مونث مجازی ہے اسے لفظ ہذا کے ساتھ کیوں بیان کیا ہے جو کہ مذکر ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہی توجیہات بیان کی گئی ہیں۔

بہر حال اس دفعہ سورج بھی غروب کر گیا تو ابراہیمؑ نے اپنی پچھلی دلیل کو دوبارہ نہیں دہرایا بلکہ اس کو مفروض اور ثابت شدہ فرض کرتے ہوئے اپنی قوم سے بیزاری کا اعلان کیا۔ کیونکہ سب اجرام (اجسام) آسمانی نے غروب ہونا ہے اور ایک دن انہوں نے مرنا ہے اس لیے ان کی عبادت نہیں کی جا سکتی اور ان کو خدائے یکتا کا شریک نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مشرکین سے بیزاری کا اعلان کیا اور مشرکین پر اپنی حجت اور دلیل مکمل کر دی۔

اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿ۚ۷۹﴾

"سب سے یکسو ہو کر میں نے اپنے منہ کو اسی کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں"۔

---

[1]۔ (گفتار مترجم)

ابراہیمؑ کا توحید پرست ہونے کا اعلان

''فَطَرَ'' کسی چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف چیرنے کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا خالق اس چیز کو عدم سے باہر نکلتا ہے اور اسے وجود میں لے آتا ہے اس لیے اسے ''فَاطِر'' کہا جاتا ہے۔ لٰہذا ''فَطَر'' خلق کرنے سے کنایہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حجت اور دلیل مکمل کرنے کے بعد مشرکین سے برائت کا اعلان کیا اور فرمایا کہ میں اپنا رخ عبادت کے لیے آسمان اور زمین کے رب کی جانب کرتا ہوں۔ یہاں پر آپؑ نے واضح طور پر اللہ کا نام لیا اور اللہ کے ایسے اوصاف بیان کئے جن کے بارے میں مشرکین کو بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ وصف زمین اور آسمانوں کا خالق ہونا ہے کیونکہ مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ آفرینش کا ایک آغاز ہے اور ہر چیز کا ایک پایان ہے اور جو خدا انہوں نے بنا رکھے تھے ان کا مافوق بھی ہے اور وہ ایک ہی ذات ہے وہ اللہ ہے۔

اس کے بعد ''حَنِيْفًا'' کے لفظ کے ذریعے مشرکین کے مختلف شرکاء کی نفی کی اور یہ بات سمجھائی کہ میں ان شرکاء سے منہ موڑ رہا ہوں اور رب تعالیٰ کی طرف رخ کر رہا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ اس آیت میں غیر خدا کی معبودیت کی نفی کی ہے اور اللہ سے شریک کی بھی نفی کی ہے اور یہ معنی کلمہ طیبہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کے نزدیک ہے۔ یہاں پر ''فاطِر'' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دین ابراہیمؑ دین فطرت ہے چونکہ توحید ایسی شریعت ہے کہ اس کے تمام معارف انسان کی فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس کی ذاتی خصوصیات ہرگز تبدیل نہیں ہو سکتیں یہ وہی طریقہ ہے جو انسان کو حقیقی کمال و سعادت تک پہنچا سکتا ہے۔

وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۸۰

"اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، اس نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑتے ہو اور اس نے تو میری راہنمائی کی ہے، اور میں ان سے نہیں ڈرتا جنہیں تم شریک بناتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کچھ (تکلیف پہنچانا) چاہے، میرے رب نے اپنے علم سے سب چیزوں پر احاطہ کیا ہوا ہے، کیا تم سوچتے نہیں"۔

ابراہیمؑ کا اپنی قوم کو جواب

اس آیت میں اور بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی قوم کی گفتگو بیان نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بتوں سے ڈرنے کی وجہ سے مشرک ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ نقصان پہنچانے کے ڈر سے تم جن کی عبادت کرتے ہو میں ان سے نہیں ڈرتا۔ جیسے پہلے بھی کہا گیا کہ کلی طور پر دو چیزیں بتوں اور خیالی معبودوں کی پرستش کا سبب تھیں:

1۔ احتمالی ضرر کو دور کرنے کے لیے، اگر ان کے سامنے نہ جھکیں تو ان کی طرف سے کوئی نقصان پہنچنے کا خوف ہو۔

2۔ منفعت، برکت اور سعادت کی امید۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ بتوں سے فائدے کی امید رکھتے تھے اس لیے ان کی عبادت کرتے تھے، لیکن یقینی طور پر پہلا سبب قوی تر اور طاقت ور تھا۔

اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جب احتجاج کر رہے تھے اور حضرت ابراہیمؑ سے جھگڑ رہے تھے تو انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بتوں سے ڈرایا تو حضرتؑ نے جواب دیا کہ مجھے ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ آپؑ کے جواب میں دو نکتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

ا۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو ثابت کرنا۔

۲۔ بتوں کی پرستش کے عقیدے کو باطل کرنا۔

پہلے نکتے کی جانب اپنی گفتگو کے اس حصے سے اشارہ کیا کہ ''میں اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہوں، خدا نے مجھے ایسے دلائل کی تعلیم دی ہے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ اور یہ کہ میں غیر اللہ کی ربوبیت کی نفی کروں۔ یہی ہدایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ میرے رب کے علاوہ کوئی رب نہیں ہے اور بندوں کی ہدایت رب کے شؤنات میں سے ہے۔

دوسری طرف خدا نے مجھے جو دلائل تعلیم دیئے ہیں اور آسمانوں اور زمین کا ملکوت مجھے دکھایا ہے، اس سے میں یہ بات سمجھ گیا ہوں اور یقین کی حالت میں ہوں کہ پروردگار ایک ہی ہے۔ اس لیے میں تمہارے دلائل کو سننے سے بے نیاز ہوں۔ اور مجھے تم سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بحث کا مقصد ہدایت پانا ہے اور میں ہدایت پاچکا ہوں۔

دوسرے نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے میں ان سے نہیں ڈرتا کیونکہ یہ سب مخلوقات ہیں، یہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، نہ یہ کسی کو نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی ضرر۔ نہ خود کو نفع دے سکتے ہیں نہ خود کو نقصان۔ ان کا مدبر کوئی اور ہے۔ جب ایسا ہے تو تمہاری دلیل کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور تم جو اعتراض پیش کر رہے ہو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ممکن تھا مشرکین یہ اعتراض کرتے اور کہتے کہ

جس چیز کو تم دلیل کہتے ہو یہ گمراہی ہے۔ اور اس گمراہی کا سبب ہمارے خداؤں کا تم سے ناراض ہونا ہے۔ جس کے نتیجے میں تم ان کی ربوبیت کی نفی کررہے ہو۔ یہ جملہ ان کے اعتراض کا جواب ہے اور خود ایک مستقل برہان بھی ہے جو بتوں کی ربوبیت کی نفی کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ مگر یہ کہ میرا پروردگار کچھ چاہے۔ یہ اللہ کی ربوبیت میں توحید کی ایک اور دلیل اور نشانی ہے یعنی فرض کرو میں ان بتوں سے ڈرتا تو یہ ڈر دوسری دلیل ہے ربوبیت اللہ تعالیٰ کی اور توحید اللہ تعالیٰ کی کیونکہ اس نے چاہا ہے کہ میں تمہارے شرکاء سے ڈروں۔ میرا ان سے ڈرنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ تمہارے شرکاء کسی امر پہ قادر ہیں بلکہ اس وجہ سے تھا کہ میرے پروردگار نے ایسا چاہا ہے۔ پھر فرمایا کہ علم کے لحاظ سے میرے پرودگار کا تمام چیزوں پر احاطہ ہے لہٰذا ہر حادثہ اور واقعہ چاہے خیر کا ہو یا شر کا ہو جو اس کی مملکت میں رونما ہوتا ہے وہ اس سے آگاہ ہے۔ اس نے تمام چیزوں کو صحیح اہداف کو مد نظر رکھ کر ایجاد کیا ہے۔ اس بنا پر کیسے ممکن ہے کہ اللہ کے ملک میں کوئی چیز ایسی ہو جس میں منفعت ہو اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس چیز سے استفادہ کرنے کی اجازت نہ دے۔ یا ایسی اشیاء ہوں جو بندوں کے لیے نقصان دہ ہوں اور رب تعالیٰ نے بندوں کو ان سے منع نہ کیا ہو۔ پس کیوں تم اس بات کو سمجھتے نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے کہ تم عقل میں جو چیز آتی ہے اس کو نہیں لیتے اور تمہاری فطرت کے مطابق جو حقائق ہیں ان حقائق کے پیچھے کیوں نہیں چلتے اور ان کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟! یہ استفہام انکاری کی صورت میں ایک قسم کی سرزنش ہے اور فطری دلیل بھی ہے کہ عقل اور فطرت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ثابت کرتے ہیں اور شرک کو باطل سمجھتے ہیں۔

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اور کیوں ڈروں تمہارے شرکاء سے حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو اس چیز کو جس کی اللہ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری، تم سوچو کہ دونوں جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اگر تمہیں سمجھ ہو تو''۔

مشرکین کے عقیدے کی رد میں دوسری دلیل

اس آیت میں حضرت ابراہیم نے مشرکین کے خلاف ایک اور دلیل پیش کی ہے اور فرمایا کہ تمہارے گفتار و کردار میں تناقض ہے۔ ایک طرف سے تم مجھے ایسی چیزوں سے ڈراتے ہو جن سے ڈرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور دوسری طرف خود تم رب العالمین سے نہیں ڈرتے جس سے حقیقتاً ڈرنا چاہیے۔ لہٰذا میں بتوں سے نہ ڈرنے میں تم سے زیادہ امن میں ہوں۔ میں اس لیے تمہارے جھوٹے خداوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ بتوں کے استقلال پر کوئی دلیل و ثبوت نہیں۔ وہ نہ تو کسی سے نقصان اور ضرر کو دور کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو فائدہ دے سکتے ہیں۔ اگر منفعت پہنچانا اور نقصان کو دور کرنا ان کے اختیار میں ہوتا تو پھر ان سے ڈرنے کا جواز تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ خداوند سے ڈرو لیکن تم اس سے نہیں ڈرتے ہو۔ جبکہ تمہارے پاس اللہ کا شریک ٹھہرانے کے لیے نہ تو آسمانی برھان ہے اور نہ قابل قبول عقلی دلیل۔ جبکہ تم جانتے ہو کہ تمام امور کی تدبیر صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ ایجاد اور خلقت اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان میں سے بعض امور کی تدبیر تمہارے فرضی خداؤں کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ اس کو بیان کرتے اور اس کے لیے معجزات

بھیجتے تاکہ ان کی پرستش ہمارے اوپر واجب ہو جاتی حالانکہ انہوں نے اس قسم کی کوئی نشانی نہیں اتاری اور نہ ہی وحی اتاری ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے لہٰذا تمہاری بات سرے سے ہی باطل ہے اور اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

دلیل کا پہلا حصہ کہ ہم میں سے کون زیادہ امن میں ہے؟ تم نے اللہ کی پرواہ نہیں کی بلکہ اللہ کا شرک کیا اور میں نے تمہارے خیالی خداوں کو ٹھکرا دیا، اس حوالے سے ہم میں سے کون زیادہ امن میں ہے؟ یہ نہیں فرمایا کہ ہم میں سے کون زیادہ امن میں ہے بلکہ یہ فرمایا کہ دو گروہوں میں سے کون زیادہ امن میں ہے یہ اس لیے ہے کہ ان کی غیرت اور تعصب کو نہ ابھارا جائے۔ اس طرح اس میں یہ نکتہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان جو اختلاف ہے یہ اختلاف عقائد اور دینی معارف کی اصلیت میں ہے۔ اس لیے ہمارے درمیان کسی قسم کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں جو قیاس استعمال ہوا ہے اس کو قیاس استثنائی کہتے ہیں۔ اس میں نقیض مقدم استثناء ہوئی ہے تاکہ اس کا نتیجہ نقیض تالی ہو۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے اگر بتوں اور تمہارے بنائے ہوئے خداوں کی قدرت اور اختیار پر کوئی دلیل ہوتی کہ وہ نقصان دے سکتے ہیں تو یقینی طور پر ان سے ڈرنے کا جواز بنتا تھا لیکن ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے پس تمہارے بتوں کے ضرر پہنچانے سے ڈرنا اور اس لیے ان کی پرستش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں شرک نہیں ملایا انہیں کے لیے امن ہے اور وہی راہ راست پر ہیں“۔

مومنین ہی کے لیے امن ہے

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے اس سوال کا جواب بیان ہوا ہے جو پچھلی آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا تھا۔ اس سوال کا جواب اتنا واضح ہے کہ دشمن بھی اسے قبول کرتا ہے اس لیے اس قسم کے سوال کا جواب خود سوال کرنے والا ہی دے سکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مطلب کی تاکید کے لیے جواب کو جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ آپؑ نے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ امن اور ہدایت ان مومنین کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے اپنے ایمان کے چراغ کو ظلم کے پردے میں نہیں چھپایا۔ پس امن و ہدایت ایمان کے خواص سے ہے، لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس چراغ کو ظلم کے پردے کے پیچھے نہ چھپایا جائے یعنی اس پر ظلم کا پردہ نہ ڈالا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم ایمان کی بنیاد کو باطل نہیں کرتا اس لحاظ سے کہ ایمان انسانی فطرت کا جزء ہے اس لیے وہ سرے سے کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہو سکتا، لیکن ظلم ایمان کے چھپانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ ظلم ایمان کا صحیح اثر ظاہر کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ظلم کے بھی درجات ہیں، ظلم کا سب سے بڑا درجہ شرک ہے۔ جیسے کہ ہم نے پہلے کہا کہ جس شخص پر ظلم ہوا ہے وہ جتنا بلند مرتبہ پر ہو اتنا ہی ظلم بھی بدتر ہوگا، اللہ تعالیٰ ہر شئی سے بلند مرتبہ ہے اور اس کی بلندی اور مقام و مرتبے تک کوئی بھی چیز نہیں پہنچ سکتی لہٰذا کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا بزرگ ترین اور سخت ترین ظلم ہے۔

بہر حال ظلم کا دایرہ بہت وسیع ہے۔ اس کی بہت ساری اقسام ایمان پر فاسد اثر نہیں رکھتیں۔ کیونکہ جو ظلم گناہ اور اللہ تعالیٰ کے امر مولوی کی مخالفت کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ بھول چوک اور جہالت سے سرزد ہوتے ہے وہ ایمان پر فاسد اثر نہیں رکھتے۔ اس قسم کے ظلم، ایمان کے اثر کو زائل نہیں کرتے جس کا نتیجہ انسان کو سعادت و کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے قریب کرنا ہے۔ ایمان کی تاثیر ان مظالم کے نہ ہونے سے مشروط نہیں ہے۔ لہٰذا

گر کوئی شخص آسمان اور زمین کے رب کی پہچان رکھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی زندگی کے تمام امور کو چلانے والی ذات وہی ہے تو اسی ایمان کے ساتھ وہ سعادت اور کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ شرک کے ظلم میں کبھی نہیں پڑتا کیونکہ شرک سے جو بدبختی اور عذاب ہوتا ہے وہ دائمی اور ہمیشہ کا ہے اگر کوئی مشرک ہے تو خداوند فرماتا ہے اسے بلکل معاف نہیں کروں گا لیکن دوسرے مظالم جیسے گناہ کبیرہ یا چھوٹے گناہ ہیں، اگرچہ ان کی سزا ہے، بدبختی ہے، درجات میں کمی ہے لیکن شفاعت کے ذریعہ، توبہ کے ذریعہ ایسے فرد کی معافی کی امید موجود ہے۔

شرک کی معافی نہیں ہے پس جو شخص موحد ہے اور جس نے اپنے آپ کو شرک سے دور رکھا ہوا ہے اگر اس کے لیے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے شرایط مہیا ہوں اور وہ ان گناہوں سے دوری کرے جیسے والدین کی نافرمانی، یتیم کا مال کھانا، محترم نفس کو قتل کرنا، شراب پینا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے فرد کے بارے واضح فرمایا ہے کہ اس کے گناہ صغیرہ کو معاف کرے گا:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾

(سورۂ نساء، آیت: ۳۱)

"اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے"

لہٰذا جس شخص کا تقویٰ اور اپنے رب کی معرفت زیادہ ہو اتنا ہی وہ ظلم کے مصادیق سے بچ جائے گا۔ اس آیت میں تین نکتے بیان ہوئے ہیں:۔

1۔ اس آیت میں ایمان سے ربوبیت پر مطلق ایمان مراد ہے۔

2۔آیت میں ظلم سے مطلق ظلم مراد ہے جو ایمان کے لیے نقصان دہ ہے اور اس کے اثر کو فاسد اور بے اثر کرتا ہے۔ امن اور ہدایت بھی مطلق ہیں یعنی امن ہر طرح کی بد بختی اور عذاب سے دور ہونا اور ہدایت کا معنی ہے ہر طرح کے عذاب سے چھٹکارا اور دوری اگرچہ اس بحث میں خصوصی طور شرک کے عذاب سے رہائی مراد ہے۔

3۔ ظلم کا اطلاق ایمان کے مراتب کے اختلاف کے تحت مختلف ہوتا ہے اور اس کے شدت اور ضعف کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتا ہے۔سب سے بڑا ظلم اللہ کا شرک کرنا ہے۔ دوسرا ظلم اللہ کے اوامر کی مخالفت ہے جس پر گناہ کا عنوان صادق آتا ہے۔

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

''اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی، ہم جس کے چاہیں درجے بلند کرتے ہیں، بے شک تیرا رب حکمت والا جاننے والا ہے''۔

ابراہیمؑ کے لیے اللہ کی دلیل

اس دلیل کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ''تِلْكَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ دور کے اشارے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ ذکر ہوا کہ یہ ایک قطعی برہان ہے جس کے سارے مقدمات فطریات سے لیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ برہان ہم نے ابراہیمؑ کو دیا ہے تاکہ وہ اپنی قوم پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ خداوند جس کو چاہے اس کے درجات کو بلند کرتا ہے اور اسے معنوی کمالات اور حقیقی فضائل تک پہنچاتا ہے جیسے علم اور تقویٰ جو اختیار سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ خاص مصلحت

کے تحت جس کو وہ خود ہی جانتا ہے غیر اکتسابی امور کے حصول کی توفیق دیتا ہے جیسے رسالت اور نبوت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے درجات میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ ہدایت آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کرانا ہے جو ایک قسم کا قلبی یقین اور قطعی دلیل ہے جو دوسروں کی دلیل کا توڑ ہوتا ہے۔ یہ سب علم کے مراتب و درجات ہیں۔ پس حضرت ابراہیم سورۂ مجادلہ کی آیت : ۱۱ کا مصداق ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ ---

”تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے اور وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے ان کے درجات کو اللہ بلند فرمائے گا“۔

آخر میں فرمایا کہ اے محمد ﷺ! تیرا پروردگار حکیم اور علیم ہے۔ خدا نے جو امتیازات اور برتریاں ابراہیمؑ کو دئے ہیں وہ علم اور حکمت کے تحت تھیں کیونکہ اللہ اپنے علم سے تمام امور کی آگاہی رکھتا ہے۔ یہاں پر پیغمبرؐ کو مخاطب کرنے کی وجہ آپ کو حوصلہ اور تسلی دینا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ۸۴

”اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب بخشا، ہم نے سب کو ہدایت دی، اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی، اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون ہیں، اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں“۔

انبیاءؑ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ پر کئے گئے احسانات کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر احسان جتایا ہے۔ ان بڑی نعمتوں میں توحید فطری پر پیدا ہونا، ہدایت الٰہی سے بہرہ مند ہونا اور اللہ کی حفاظت میں ہونا شامل ہے جس کے ذریعے انبیاءؑ کرام فطرت کے ضائع ہونے اور خواہشات نفسانی اور شیطانی وسوسے کی پیروی کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ کیونکہ فطرت انسانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اللہ کی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسحٰقؑ، ابراہیمؑ کے بیٹے تھے اور یعقوبؑ، اسحٰقؑ کے بیٹے تھے۔ ''كُلًّا هَدَيْنَا'' کی عبارت میں ''كُلًّا'' کو اس لیے لایا گیا ہے تاکہ یہ دلالت کرے کہ ہدایت الٰہی مستقل طور پر ان تمام انبیاءؑ کے لیے ثابت ہے جن کا نام لیا گیا ہے، نہ کہ یہ ہدایت اسقلالی طور پر فقط ابراہیمؑ کے لیے ہو اور باقی انبیاءؑ ابراہیمؑ کی وجہ سے ہدایت یافتہ ہوں۔ بعد والی عبارت اس مطلب کو اور واضح کرتی ہے کہ فرزندان آدمؑ میں ہدایت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہدایت کا سلسلہ ابراہیمؑ کے زمانے سے شروع ہوا ہو۔ کیونکہ ان سے پہلے حضرت نوحؑ بھی ہدایت یافتہ تھے اور نوحؑ کی نسل سے تھے داوٗدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ اور یوسفؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پیغمبروں کو نبوت اور رسالت کے علاوہ سلطنت، بادشاہی اور حکومتی منصب اور سرداری بھی عطا کیا تھا۔ اس لیے خصوصی طور پر ان کا نام بھی لیا گیا ہے۔ پھر ہدایت الٰہی کی اہمیت بتانے کے لیے ''كَذٰلِكَ'' کے لفظ سے اشارہ کیا ہے یعنی اسی طرح ہم نیکوکاروں کو جزا اور بدلہ دیتے ہیں۔

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾

''اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس، سب نیکوکاروں میں سے ہیں''۔

پیغمبروںؑ کی توصیف

اس آیت میں ان پیغمبروںؑ کا ذکر کیا ہے جنہوں نے زہد کی وجہ سے دنیا سے منہ موڑا جس وجہ سے وہ باقی انبیاءؑ سے ممتاز ہوئے۔ اس آیت میں عیسیٰؑ کو نوحؑ کی ذریت سے شمار کرکے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں بیٹی کی اولاد بھی اس کے باپ کی حقیقی اولاد ہے۔ کیونکہ عیسیٰؑ کا نسب ماں کی طرف سے حضرت نوحؑ سے ملتا ہے۔ اس لیے ان کو حضرت نوحؑ کی ذریت کہا گیا ہے۔ زکریاؑ، یحییٰؑ اور الیاسؑ کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے کہ انہوں نے دنیاوی لذات کو ترک کرکے آخرت سے تعلق جوڑ لیا۔ اور اللہ کے خاصان سے ہو گئے۔

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۶﴾ۙ

''اور اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط، اور ہم نے سب کو سارے جہان والوں پر بزرگی دی''۔

لوگوں پر انبیاءؑ کی فضیلت

یہاں بظاہر اسماعیلؑ سے ابراہیمؑ کے بیٹے اور اسحٰقؑ کے بھائی مراد ہیں۔ اور ''الْیَسَعَ'' ایک پیغمبرؑ تھے جن کا تذکرہ سورہ ص کی آیت نمبر 48 میں بھی ہوا ہے۔ لیکن قرآن میں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بیان نہیں ہوا۔ ''عالَم'' کا لفظ انسانوں کی ایک جماعت پر بولا جاتا ہے جیسے عالَم عرب، عالَم عجم، عرب کے لوگ، عجمی لوگ۔ پیغمبروں کو عالمین پر برتری دینے کا مطلب یہ ہے منزلت اور مقام کے اعتبار سے وہ دوسروں پر مقدم ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ہدایت کے ذریعے بغیر واسطے کے ہدایت پا گئے ہیں جبکہ باقی انسانوں نے پیغمبروںؑ کے واسطہ سے ہدایت پائی ہے۔ یا اس برتری کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کو

یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی ہدایت فطری تھی اور ان کو دوسری ہدایت کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ایک نعمت ہے جس کی وجہ سے ان کو باقی سب لوگوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔

ان آیات میں جن سترہ انبیاءؑ کا ذکر ہوا ہے ان کے زمانی اور مقام و مرتبے کے اعتبار سے ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مفسرین نے اس امر کی توجیہ کے لیے کچھ مسائل بیان کیے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ ان تمام توجیہات میں سب سے زیادہ صحیح توجیہ یہ ہے کہ کہا جائے:

دستہ اول: پہلے چھ انبیاءؑ وہ ہیں جن کے پاس نبوت کے ساتھ ساتھ مملکت اور ریاست بھی تھی، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون علیہم السلام۔

دستہ دوم: یہ چار انبیاءؑ وہ ہیں جن کی واضح صفت زہد اور دنیا سے منہ موڑنا تھی، زکریا، یحییٰ، عیسی اور الیاس علیہم السلام۔

دستہ سوم: ان چار انبیاءؑ کی کوئی خصوصی صفت مشترکہ نہیں ہے لیکن ہر ایک بڑے امتحان سے گزرا ہے، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام۔ بہر صورت ان کی ترتیب میں موجود حکمت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ وَ اِخۡوَانِہِمۡ ۚ وَ اجۡتَبَیۡنٰہُمۡ وَ ہَدَیۡنٰہُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۸۷﴾

"اور ان کے باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بعضوں کو، ہم نے پسند کیا اور ہم نے انہیں ہدایت دی سیدھی راہ کی طرف"۔

انسان کی ہدایت کا مسلسل انتظام

"ذُرِّیَّات" آنے والی نسل اور "اٰبَآء" گزاری ہوئی نسل کو کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں آنے والی اور گذشتہ نسل کو اکھٹا ذکر کرنا ہماری پچھلی بات کی صحت کی دلیل ہے کہ

نسل بشر میں ہدایت الٰہی کبھی منقطع نہیں ہوئی اور ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔

''اجْتَبَاء'' انتخاب کرکے اکھٹا کرنے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انتخاب کرنا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنے فیض سے خاص کرتا ہے اور اسے نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت انبیاءؑ کے ساتھ خاص ہے اور بعض صدیقین اور شہدا جو انبیاءؑ کے ہم مرتبہ ہیں ان کے لیے بھی ہے۔ انبیاء میں اجتباء اور انتخاب کا معنی یہ ہے کہ خدا نے ان سب کو ایک ہی ہدایت پر اکٹھا رکھا اور انہیں صراط مستقیم پر چلایا، ایسا راستہ کہ جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، نہ شرائط کے لحاظ سے اور نہ زمانے کے لحاظ سے اور نہ ہی اجزاء، اشخاص اور مقصد کے لحاظ سے۔

اللہ تعالیٰ اس بارے سورۂ روم آیت: 30 میں فرماتا ہے: ''فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا'' ''پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں''۔ دین حنیف دین الٰہی ہے جو انسانی معاشرہ کی بنیاد ہے اور جو ہمیں فطری ہدایت دیتا ہے اور ہماری ذاتی خلقت اسی کی طرف مائل ہے۔ کیونکہ انسان کی فکری اور عملی سعادت اسی کے مرہون ہے۔ یہ وہی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق کیا ہے لہٰذا دین فطری میں شرائط، مقاصد، اہداف کے حوالے سے کوئی تغیر و تبدل اور تبدیلی نہیں۔ کیونکہ سب معارف اور شرعی احکام اور اخلاقیات کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ اور یہی صراط مستقیم ہے جس پر چلنے والا کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

''یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں جسے چاہے اس پر چلاتا ہے، اور اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو البتہ سب کچھ ضائع ہو جاتا جو کچھ انہوں نے کیا تھا''۔

اللہ جسے چاہے اپنی ہدایت سے نوازتا ہے

یہ جملہ بیان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت انبیاءؑ کو دی ہے وہ اللہ کی خاص ہدایت تھی۔ اللہ چاہے تو یہ ہدایت غیر انبیاءؑ میں سے جسے چاہے اس کو بھی دے سکتا ہے۔ حقیقی ہدایت رب کی طرف سے ہے جو آدمی کو صراط مستقیم کی طرف لے جاتی ہے۔ انبیاءؑ کے ہمراہ لے کر چلتی ہے۔ اس ہدایت کی نشانی یہ ہے کہ اس کے تمام دستورات کی بازگشت توحید اور دعوت حق کے قیام اور معبودیت اور تقویٰ کی طرف ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر وہ شرک کرتے تو ہم ان کے اعمال کو ہبط اور ختم کر دیتے۔ یہاں پر شرک سے مراد یہ ہے کہ انسان کتاب خدا کے ایک حصہ پر ایمان لے آئے اور دوسرے حصہ کا کافر ہو یا الٰہی احکام اور شریعت کے درمیان فرق ڈالے یعنی بعض احکام کو مانے اور بعض احکام کو رد کرے یا اللہ تعالیٰ کے وضع کئے ہوئے احکام اور قوانین میں تبدیلی لے آئے۔

اس صورت میں وہ لوگ جو ایسے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں ان کے اعمال کا اثر باطل ہو جاتا ہے اور وہ گمراہی میں غرق ہو جاتے ہیں اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور ہدایت الٰہی سے دور ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا باقی رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ انسان توحید اور ربوبیت کے لوازمات پر عمل کرے اور اپنے عقیدے میں استوار ہو اور خالص رہے۔ وگرنہ وہ عطا شدہ نعمت اس سے واپس لے لی جاتی ہے۔ پس جن افراد کو ہدایت ملی ہے وہ اس وقت تک ہدایت پر قائم رہتے ہیں جب تک وہ عبودیت کے لوازمات کو ترک نہ کریں لیکن جب وہ شرک کریں تو خدا ان سے اس توفیق کو چھین لیتا ہے اور ان کے اعمال کو باطل قرار دیتا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾

"یہی لوگ تھے جنہیں ہم نے کتاب اور شریعت اور نبوت دی تھی، پھر اگر یہ لوگ (مکہ والے) ان باتوں کو نہ مانیں تو ہم نے ان باتوں کے ماننے کے لیے ایسے لوگ مقرر کر دیے ہیں جو ان کے منکر نہیں ہیں"۔

انبیاءؑ کے لیے اللہ کی خاص ہدایت

"أُولَٰئِكَ" کا لفظ دور کے اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر "أُولَٰئِكَ" مقام نبوت کی برتری کو بیان کر رہا ہے۔ اگرچہ عبارت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ کو کتاب، حکم اور نبوت دی ہے لیکن یہ عبارت مجموع کے وصف کو بیان کرنے کے باب سے ہے اس اعتبار سے اس مجموعے میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ یہ امر اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان میں سے بعض میں یہ صفت نہ پائی جاتی ہو۔ کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ کتاب سب انبیاءؑ کو نہیں دی گئی۔ جہاں بھی قرآن میں کتاب کی نسبت انبیاءؑ کی طرف دی گئی ہے اس سے مراد وہ نبی ہیں جن کو دین اور شریعت اور قوانین دئے گئے تھے۔ ان شرائع اور قوانین کے تحت انبیاءؑ لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ دیتے تھے۔ "حکم" اجزاء کلام کے درمیان تصدیق کی نسبت کو برقرار کرنے کے معنی میں ہے اور یہ جھگڑوں میں قضاوت کے معنی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور عدالتی احکام کو شامل ہے۔ "نبوت" اللہ کی خاص عنایت کے واسطے غیب سے خبروں کو وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ معلومات محسوسات سے ماوراء ہوتی ہیں جیسے اللہ کی یگانگی، فرشتے، قیامت کا دن اور قبر کے سوال وجواب وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے ان تین کرامتوں کتاب، حکم اور نبوت کو ان آیات کے ضمن میں بیان کیا ہے جن میں ہدایت الٰہی کا تذکرہ ہوا ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تین کرامتیں اللہ کی خاص ہدایت کے آثار میں سے ہیں۔ پھر فرمایا یہ قوم یعنی حضرت رسول ﷺ کی قوم

الٰہی ہدایت یا نبوت یا کتاب کے کافر ہوئے تو اس صورت میں اللہ اپنے بندوں میں سے ایک ایسی قوم لے آئے گا جو اس سے انکار نہیں کرے گی۔ مفسرین کے درمیان اس قوم کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اس سے مراد انبیاءؑ ہیں کچھ نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے بعض نے کہا کہ مومنین مراد ہے لیکن مومنین کے درمیان منافقین موجود ہیں۔ بعض نے اس سے مہاجرین یا انصار کو مراد لیا ہے یا سب مراد لیے ہیں اور کچھ مفسرین نے اس سے اصحاب پیغمبرؐ مراد لیے ہیں جبکہ ان میں ایسے بھی تھے جو مرتد ہو گئے تھے۔

بہر حال آیت سے ایسے لگتا ہے کہ ہر زمانے میں اللہ کے ایسے بندے موجود ہوتے ہیں جو ہدایت الٰہی کو سمجھانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور صراط مستقیم کو لے کر چل رہے ہوتے ہیں اور انبیاءؑ کی شریعتوں کو جس میں کتاب ہے حکم ہے نبوت ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خدا ان کے وسیلے سے اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی ہدایت کو زائل نہیں ہونے دیتا، ختم نہیں ہونے دیتا یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے بارے میں کبھی بھی کفر یا شرک کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خدا نے ان کے دل پر اعتماد کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دین کی حفاظت پر مامور ہیں۔

اس لحاظ سے اس آیت سے معصومین ہی مراد ہوں گے یعنی انبیاءؑ اور ان کے اوصیاء اور اگر اس کے دائرہ کو بہت زیادہ وسعت دینا چاہیں تو اس سے صالح اور نیک مومنین کو بھی مراد لے سکتے ہیں جو تقویٰ کے اس مرتبے تک پہنچے ہوئے ہیں جو عصمت کے قریب ہے اور ان کا ایمان ہر قسم کے شرک اور ظلم سے خالص ہے۔ اس بارے سورۂ نحل آیت: 99 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

"شیطان کو یقیناً ان لوگوں پر کوئی بالادستی حاصل نہ ہوگی جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں"۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٠﴾

"یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کے طریقہ پر چل، کہہ دو کہ میں تم سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا، یہ تو جہان والوں کے لیے محض نصیحت ہے"۔

انبیاءؑ کے راستے پر چلنے کا حکم

اس عبارت میں ایک دفعہ پھر ہدایت الٰہی کے وصف کو بیان کیا ہے کہ ہدایت الٰہی کا اثر مختلف نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی شان تبدیل ہوتی ہے۔ یہ وہی اللہ کی ہدایت ہے جو انسان کو ہدف تک پہنچاتی ہے۔ اس کا اثر جو کہ مطلوب تک پہنچانا ہے ہرگز اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو دستور دیا گیا ہے کہ ان کی ہدایت کی پیروی کرے نہ کہ خود ان کی یا ان کی شریعت کی پیروی کرے کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کو نسخ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ہدایت وہی ہدایت خدا ہے۔ اگر یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کی ہدایت کی پیروی کرو تو یہ ان انبیاءؑ کے احترام کے لیے کہا گیا ہے و گرنہ اصلی ہادی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

آخر میں فرمایا کہ میں تمہیں جو پیغام پہنچا رہا ہوں اس کی مزدوری اور عوض کچھ نہیں مانگتا۔ یہ اس لیے ہے کہ لوگوں کی اس پریشانی کو دور کرے اور انہیں پتہ چل جائے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ان سے کوئی اجرت نہیں چاہتے۔ اور اگر لوگ یہ جان لیں کہ آپ اس دعوت کے

بدلے ان سے کچھ نہیں مانگتے تو آپ کی دعوت کے بارے میں ان میں حسن ظن پیدا ہو جائے گا اور حضرت کی دعوت بہت جلد ثمر آور ہو گی۔ اس کے بعد فرمایا: میری نبوت عالمین کے لیے سوائے یاد آوری کے کچھ اور نہیں ہے۔ "ذِکْرٰی" یہاں پر تذکر اور یاد دہانی کے معنی میں ہے لیکن یہ لفظ تذکر سے زیادہ بلیغ اور رسا ہے۔ یہ عبارت حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی عمومیت پر دلالت کرتی ہے کہ آپؐ کی نبوت تمام عالمین کے لیے ہے۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

"اور انہوں نے اللہ کو صحیح طور پر نہیں پہچانا جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری، ان سے کہو کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی جو موسیٰ لے کر آئے تھے وہ جو لوگوں کے واسطے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم نے ورق ورق کرکے رکھا جو تم دکھاتے ہو اور (اس کی) بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو، اور تمہیں وہ چیزیں سکھائیں جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا نہیں جانتے تھے، تو کہہ دو کہ اللہ ہی نے وہ کتاب اتاری تھی، پھر انہیں چھوڑ دو کہ اپنی بحث میں کھیلتے رہیں"۔

لوگوں کو اللہ کی صحیح معرفت نہیں

''قَدْر'' کسی بھی چیز کی مقدار کو کہتے ہیں۔ کسی بھی چیز کی تقدیر عام طور پر اس توصیف کے ساتھ ملی ہوتی ہے جو ہمیں اس کے حال سے آگاہ کرتی ہے۔ لہٰذا قدر اور تقدیر کسی

چیز کے اوصاف پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی معرفت اور آگاہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس جملہ کا معنی اس طرح ہوگا کہ لوگوں میں یہ استطاعت نہیں ہے کہ وہ خدا کو اس طرح پہچان سکیں جس طرح وہ پہچانے جانے کا لائق ہے۔ وہ اللہ کی اس طرح تعظیم نہیں کر سکے جس کا وہ لائق ہے۔ کیونکہ انسان کے وہم و عقل اور اس کے حواس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس ذات کا کامل احاطہ کر سکے۔ بلکہ انسان اللہ کے افعال اور اس کی آیات کے مشاہدہ کی حد تک خالق کے اوصاف کو پہچان سکتا ہے۔ اس بناء پر اللہ کی عظمت، عزت اور کرامت اور برتری اور دوسری طرف مخلوقات کی پستی اور ذلت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی بھی مخلوق اللہ کی عظمت تک نہیں پہنچ سکتی۔

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا اس ذات باری تعالی کی ویسی معرفت حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی ذات کا وصف بیان کر سکتے۔ لہٰذا وحی کا انکار کرنا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار ہے جو اس کے بندوں کے متعلق ہے کیونکہ ربوبی تسلط کے لوازمات میں سے ایک لوگوں کی ہدایت ہے۔ اعتقادی اصولوں کی مخالفت اس وقت ہوتی ہے جب شرک کی پلیدی اور نجاست کو توحید کی طہارت پر مقدم ہو جائے۔ مقام ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی ہدایت کی خاطر اور ان کی سعادت اور کامیابی کے لیے ان کے ہاں پیغمبرؑ بھیجے اور آسمانی کتاب بھیجے۔

بعد والے جملوں میں یہودیوں اور مشرکین کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔

اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابیں ان کے درمیان موجود تھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیمات الٰہی لوگوں کے درمیان موجود رہی اور یہ تعلیمات انسان کے افکار کی پیداوار نہیں تھی۔ کیونکہ انسان نفسانی خواہشات کی وجہ سے پستی میں جا گرتا ہے، ہرگز اس قسم کی تعلیمات فکر اور سوچ سے نہیں نکل سکتیں۔

" قَرَاطِيْسَ " قرطاس کی جمع ہے جس کا معنی ہے کاغذ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تورایت کا ایک حصہ تم نے ظاہر کیا اور اس کے بہت سارے حصوں کو تم نے چھپایا۔ یہ خصوصیات صرف یہودیوں پر ہی صادق آتی ہیں۔ لہٰذا یہ خطاب انہی کے لیے ہے، عرب مشرکین کے لیے نہیں ہے۔ یہودیوں نے اپنے غلط مقاصد کی خاطر پیغمبر اسلام ﷺ اور آسمانی کتاب کا انکار کردیا۔ اگرچہ یہ انکار خود ان کے نقصان میں گیا کیونکہ آسمانی کتاب کا انکار خود ان کی آسمانی کتاب تورایت کو بھی شامل ہے جس کے حصے ان کے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں اور جو ان کی خواہشات نفسانی کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن جو مسائل ان کے نفسانی خواہشات سے متصادم تھے تو وہاں انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کردی اور اللہ کے کلمات کو تبدیل کردیا اور حکم اصلی کو جو تورات میں تھا اس کو چھپادیا جیسے زنا کے مورد میں سنگسار کے حکم کو انہوں نے تحریف کیا۔

آیت کے اگلے حصے میں فرمایا:

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ

"اور تمہیں وہ چیزیں سکھائیں جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا نہیں جانتے تھے"

اس میں علم سے مراد عادی اور معمولی علم مراد نہیں ہے کیونکہ گفتگو کا انداز مدعی پر استدلال اور احتجاج ہے۔ اس بنا پر اس علم سے مراد ایسی تعلیم ہے جو عادی اور معمولی مادی وسائل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہی حقائق ہیں جنہیں خداوند انبیاءؑ اور اوصیاء پر وحی کرتا ہے چاہے کتاب کے وسیلے سے ہو یا کتاب کے بغیر کسی دوسرے ذریعے سے ان تک یہ تعلیمات پہنچی ہوں۔ یہ تعلیمات محسوسات اور عقل بشریٰ کے ذریعے ان تک نہ پہنچی ہوں۔ اس لیے یہ خطاب یہودیوں سے ہے نہ کہ مشرکین سے کیونکہ مشرکین کو ایسے حقائق کا علم نہیں تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس نہ تو انبیاءؑ آئے تھے اور نہ ہی وہ انبیاءؑ کی شریعتوں سے بہرہ مند تھے۔ وہ لوگ بالکل جاہل اور چٹے ان پڑھ تھے۔

اس لیے یہ خطاب یہودیوں سے ہے کیونکہ یہ کلام عناد اور غرور و تکبر کی وجہ سے انہوں نے کہہ دیا کہ خدا نے کسی انسان پر کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمہاری یہ بات صحیح ہے تو کس طرح تورایت موسیٰؑ پر اتری اور دیگر آسمانی تعلیمات تمہارے اور تمہارے آباء و اجداد کے پاس آئیں جسے تم جانتے نہیں تھے۔ فردی حکومتیں زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتی ہیں کہ لوگوں پر اپنا تسلط برقرار رکھیں اور اپنی حکومت کی بقاء کو جاری رکھ سکیں۔ اور اجتماعی حکومتوں کا سب سے بڑا کام یہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق معاشرے کو منظم رکھیں۔ اب اس میں کوئی فرق نہیں کرتا کہ لوگوں کی اکثریت فضائل چاہتی ہے یا رذائل، حقیقی سعادت اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا سبب بنتی ہے یا اس کے برعکس بدبختی اور شقاوت کا سبب بنتی ہو۔

لہٰذا معاشروں پر حاکم انسانی عقل اور مادی شعور کسی بھی صورت میں انسان کو معارف الٰہی اور معنوی فضائل تک پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اصولی طور پر مادی امور اور معنوی فضائل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دے رہے ہیں کہ اس حجت اور دلیل کے ذریعے ان کی باطل گفتگو اور دعوی کو رد کریں۔ ان کے سوال کا جواب کیونکہ پوری طرح واضح ہے اس لیے حکم دیا ہے کہ آپ خود ان کا جواب دے دیں یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ خدا نے تورایت اور باقی آسمانی کتابوں کو نازل کیا ہے اور یہ معارف انسان کو القاء کیے ہیں۔ چونکہ ان کی بات لغو، بے ہودہ اور بغیر دلیل کے صادر ہوئی ہے اور ایسی بات کا ان لوگوں سے صادر ہونا جن کا تورایت پر ایمان ہے اور وہ تورات پر فخر کرتے ہیں کھیل تماشہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو تاکہ اپنے کھیل تماشہ میں مگن رہیں۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

”اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے برکت والی ہے ان (کتابوں) کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے تھیں تاکہ توں ڈرائے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو، اور جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لاتے ہیں، اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں“۔

قرآن اللہ کی برکت والی کتاب

گذشتہ آیات اس بات کو ثابت کرنے کا مقدمہ تھیں کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو اسی رب تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے جس نے اس سے پہلے بھی کتابیں اتاریں اور یہ کتاب پیغمبر ﷺ کی خود ساختہ کتاب نہیں ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں برکت اور خیر کثیر ہے۔ یہ کتاب لوگوں کو استوار ترین، صحیح اور محکم راستہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے واسطے ان لوگوں کی سلامتی اور نجات کی راہوں کی جانب راہنمائی کرتا ہے جو اس کی رضا حاصل کرنے کے درپے ہیں اور انہیں دنیاوی زندگی اور آخرت میں سعادت کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

یہ کتاب آسمانی برحق کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر قرآن کریم اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو اتنی ساری معنوی اور الٰہی برکات اس پر مرتب نہ ہوتیں۔ کیونکہ جو شرک کے راستے پر ہوتا ہے وہ سوائے شرک کے کسی اور چیز کی راہنمائی نہیں دیتا اور اس کے اثرات فساد کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا اے محمد ﷺ! ہم نے یہ کتاب اس لیے

اتاری ہے تاکہ تم مکہ والوں اور دوسرے شہروں کے لوگوں کو ڈراؤ اور ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ کے دستورات کی مخالفت کرنے والوں نے عذاب جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ کتاب ان کے اخروی مسائل کو حل کرتی ہے اور دائمی امن کی ضمانت دیتی ہے اور ابدی عذاب سے ڈراتی ہے۔ ان مومنین کی صفت یہ ہے کہ وہ نماز اور دیگر عباداتان کی محافظت کرتے ہیں جن کے ذریعے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں نماز کی محافظت سے نماز کو خشوع و خضوع کے ساتھ اور باطنی طور پر اللہ کی عظمت سے متاثر ہوتے ہوئے عبودیت کے مقام پر کھڑا ہونا مراد ہے۔

لیکن کچھ مفسرین نے نماز کی محافظت سے نماز کے اوقات کی محافظت مراد لیا ہے، جیسا کہ سورۂ مومنون آیت نمبر 1۔2 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾

''وہ ایمان والے یقینا فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں''۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ قَالَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ وَ لَمۡ یُوۡحَ اِلَیۡہِ شَیۡءٌ وَّ مَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوۡۤا اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ کُنۡتُمۡ عَنۡ اٰیٰتِہٖ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۹۳﴾

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ اس پر وحی نہ اتری ہو اور جو کہے میں بھی ایسی چیز اتار سکتا

ہوں جیسی کہ اللہ نے اتاری ہے، اور اگر توں دیکھے گا جس وقت ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھانے والے ہوں گے کہ اپنی جانوں کو نکالو، آج تمہیں ذلت کا عذاب ملے گا اس سبب سے کہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کی آیات کے ماننے سے تکبر کرتے تھے''۔

سب سے بڑے ظلم کے مصادیق

جیسا کہ پچھلی آیات میں کہا گیا ہے کہ بدترین ظلم اللہ کا شرک کرنا ہے۔ اس آیت میں بھی دو اور مورد بیان ہوئے ہیں جو ظلم کے شدید ترین مراتب کو بیان کر رہے ہیں۔ عقل کی رو سے ان کی برائی اور بدی میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان دو موارد کو سوال کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

1۔ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا، یہ طے ہے کہ جس پر وحی نازل نہیں ہوئی اس کا یہ دعویٰ کرنا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے، اللہ کے حکم کا مذاق اڑانا اور آیات الٰہی کا تمسخر کرنا ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔

2۔ کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا کہ بہت جلد قرآن کی مانند میں بھی قرآن اتاروں گا۔ یہ بات بھی قرآن کا مذاق اڑانا ہے اور ایک قسم کا تکبر اور غرور ہے اور برتری طلبی ہے، خود کو بڑا بنانا ہے اور اللہ کی طرف اور اللہ کی آیات کی طرف جھوٹی نسبتیں دینا ہے اور خود کو اللہ کے مقابلے میں کھڑا کرنا ہے۔ یہ تین موارد یعنی اللہ کا شرک کرنا اور بتوں کو اللہ کی درگاہ میں شفیع سمجھنا اور نبوت کا دعویٰ کرنا اور تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کے مانند کتاب کے نازل کرنے کی توانائی کا دعویٰ کرنا یہ بدترین ظلم کے موارد میں سے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ''غَمَرَ'' اس طرح چھپانے کے معنی میں ہے کہ اس کا اثر باقی نہ رہے لہٰذا گہرا پانی اور جہالت اور مصیبت اور مشکل میں پڑنے کو ''غَمَرَ'' کہتے ہیں۔

''غَمَرٰتِ الْمَوْتِ'' اسی آخری معنی میں ہے کہ جب موت کی شدت غالب آتی ہے تو کہتے ہے کہ موت کی شدت میں ہے۔ یعنی موت کی سختی نے اسے گھیر لیا ہے۔ ''وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا'' کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے گناہگاروں اور ستم گاروں کو عذاب دینا شروع کردیتے ہیں۔ یہ وہی عذاب ہے جسے بعد والے جملے میں بیان کیا ہے کہ جب ان کی جان لی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اپنی روح کو نکالواور بڑی سختی کے ساتھ اسکے جسم سے رُوح کھینچتے ہیں۔ اس طرح وہ جان دینے کی سختی کا عذاب چکھتاہے۔ جبکہ برزخ اور قیامت کا عذاب اس کے سامنے ہے۔

''اَلْيَوْمَ'' سے مراد موت کے وقت کا آجانا ہے۔ ظالمین وہ لوگ ہیں جو ان تین گناہوں میں سے ایک کے مرتکب ہوئے ہیں جو بدترین مظالم میں سے ہے۔ اس بات کی تائید بعد والے جملوں سے ہوتی ہے جن میں کہا گیاہے کہ یہ تمہارا عذاب اس وجہ سے ہے کہ تم نے اللہ کے بارے میں ناحق بات کہی یعنی اللہ کا شرک کیا یا نبوت کا دعویٰ کیا یا اللہ کی آیات قبول کرنے میں استکبار اور تکبر کیا یا اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا اور دعویٰ کیا کہ ہم بھی ایسی کتاب لے آئیں گے جیسے خدا نے نازل کی ہے۔ اس جگہ ایک نکتہ ان کی جانوں کے نکلنے کے متعلق ہے۔ روح کا بدن سے نکلنا ایک تکوینی امر ہے کیونکہ موت اور حیات انسان کے اختیار میں نہیں ہے تاکہ شریعت میں جسم سے رُوح کو خارج کرنے کا حکم دیا جائے۔ اس لیے یہ تعبیر یعنی اپنے بدن سے روح کو نکالو، یہ روح کا بدن سے تعلق کٹ جانے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ سورۂ نجم آیت: 44 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿٤٤﴾

''اور یہ کہ وہی مارتا اور وہی زندہ کرتا ہے''۔

وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ تَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ وَرَآءَ ظُهُوۡرِکُمۡ ۚ وَ مَا نَرٰی مَعَکُمۡ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ اَنَّهُمۡ فِیۡکُمۡ شُرَکٰٓؤُا ؕ لَقَدۡ تَّقَطَّعَ بَیۡنَکُمۡ وَ ضَلَّ عَنۡکُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۹۴﴾

''اور البتہ تم ہمارے پاس ایک ایک ہو کر آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا وہ اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے ہو، اور ہم تمہارے ساتھ ان سفارش کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جنہیں تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملے میں شریک ہیں، تمہارا آپس میں قطع تعلق ہو گیا ہے اور جو تم خیال کرتے تھے وہ سب جاتا رہا''۔

اللہ کے حضور انسان کی عاجزانہ حاضری

''فُرَادٰی'' فرد کی جمع ہے یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے سے ایک لحاظ سے منفصل اور جدا ہو۔ جدائی یعنی اکیلا ہونا اور غیر جیسا نہ ہونا، یہ لفظ زوج کا مخالف ہے، زوج یعنی دوئیت اور فرد یعنی یکتائی، اکیلا ہونا۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن جداگانہ اور فرد فرد ہو کے ہمارے پاس آؤ گے جس طرح پہلے تم ایک ایک (اکیلے) خلق ہوئے۔ اور جب تم ہمارے پاس آؤ گے تو اپنا دنیاوی مال اور اس کے لوازمات اپنے پیچھے چھوڑ آؤ گے۔ لہٰذا ان اسباب کی سببیت اور علل کی علیت جنہوں نے دنیا میں تم کو تمہارے رب کی یاد سے غافل کر رکھا تھا وہ سب ختم ہو جائیں گے۔

اس حالت میں انسان حقیقت امر سے واقف ہو گا اور دنیا میں اس کے جو خیال تھے جن خیالات میں وہ مشغول تھا، جن خیالات نے اس کو سرگرم کر رکھا تھا وہ سب باطل ہو جائیں گے اور وہ سمجھ جائے گا کہ یہ سب اسباب اوہام تھے اور ان کا کوئی مستقل اثر نہیں تھا۔

جن کو وہ اپنے لیے سفارشی سمجھتے تھے وہاں ان کو سمجھ آئے گی کہ ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ سب بے صلاحیت ہیں۔ کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتے، انسان وہاں پر سمجھ جائے گا کہ عالم کے تمام اجزا اور حصے اللہ واحد و یکتا کی تدبیر کے تحت ہی چل رہے ہیں۔ وہ وہاں پر اس غایت اور غرض سے آگاہ ہو گا جس کی خاطر اللہ تعالی نے سب انسانوں پیدا کیا۔ موجودات عالم میں سے کوئی بھی اللہ کی حکومت اور اللہ کی پورے جہان کے امور کی تدبیر میں داخلت نہیں رکھتا۔ دنیا میں اسے دنیاوی اسباب موثر نظر آتے تھے لیکن ان کی تاثیر اللہ کے حکم اور ارادے سے ہی تھی، تاثیر گذاری میں کسی کا کوئی استقلال نہیں۔ لہٰذا اس دن فرضی شرکاء سے انسان کا رابطہ کٹ جائے گا وہ اس بات کو جان جائے گا کہ وہ سب چیزیں خیالی تھیں اور یہ ایک کھیل تماشہ تھا جس نے اسے خدا سے غافل کر رکھا تھا اور اسے اپنے آپ میں مصروف کر رکھا تھا لیکن یہ علم اس وقت ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾

”بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا ہے، مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالنے والا ہے، یہ ہی تو تمہارا اللہ ہے، پھر تم کدھر الٹے پھرے جارہے ہو“۔

قادر مطلق خدا کو چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟

لہٰذا خدا ہے جو اپنی قدرت مطلقہ کے ذریعے نباتات کو ان کے دانوں اور گٹھلیوں کو چیر کر باہر نکالتا ہے اور ان سے گھاس، درخت اور پودے اگاتا ہے اور لوگوں کو ان کے دانوں، ان کی اجناس اور میووں سے روزی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی نے تولید مثل کی قدرت

ان میں قرار دی ہے۔ کیا ان کے فرضی شرکاء میں سے کوئی ہے جو ایسا عمل انجام دے سکے؟ لہٰذا یہ آیت بھی پچھلے بیان کی تاکید ہے یعنی مسباب پر اسباب کی تاثیر میں استقلال نہیں ہے یہ تاثیر اللہ کی طرف سے ہے۔ وہی ہے جو زندہ کو مردہ خاک سے وجود دیتا ہے اور زندہ کو مارتا ہے اور پھر اسے دوبارہ مٹی بنا دیتا ہے۔ پس تمہارا خدا ہی ایسا خدا ہے کوئی اور خدا اس طرح کا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے علاوہ کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس حقیقی خدا کو چھوڑ کر کہاں کا رخ کیے جا رہے ہو؟ اور کس طرف جا رہے ہو؟ تم نے باطل کی طرف منہ موڑ رکھا ہے جبکہ اللہ جو قدرت مطلقہ کا مالک ہے، وہی حیات بخش ہے وہی زندگی لینے والا ہے کوئی اس امر میں اس کا شریک نہیں ہے اس سے منہ موڑ لیا ہے؟!

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۹۶﴾

”وہ صبح کا نکالنے والا ہے، اور اس نے آرام کے لیے رات بنائی ہے اور سورج اور چاند کا حساب مقرر کیا ہے، یہ ہے غالب اور جاننے والے کا طے شدہ نظام بنایا ہوا ہے“۔

دن رات، سورج چاند، الٰہی نظام کا منہ بولتا ثبوت

پس خدا ہی وہ عزیز، مقتدر اور دانا ذات ہے جو صبح کو رات کی تاریکی سے نکالتا ہے اور جس نے رات کو سکون اور آرام کا ذریعہ بنایا ہے۔ سورج اور چاند کی حرکت اور شب و روز کو ماہ و سال کے بننے کے لیے قرار دیا ہے۔ یہ چیز انسانی زندگی اور اس کے نظام کو مرتب کرنے کے لیے ضروری انتظام ہے۔ اللہ تعالی ان سب پر غالب ہے، وہی دانا اور حکیم ہے، کوئی قدرت اس پر غالب نہیں آسکتی۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر اس کی نظر ہے وہ اپنے ملک کی

مصلحتوں سے جاہل نہیں ہے لہٰذا اس کی مملکت میں کہیں بھی تباہی اور انہدام نہیں ہے ہر شے ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے اور اپنا اثر بھی دکھا رہی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

”اور اسی نے تمہارے لیے ستارے بنائے ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے خشکی اور دریا کے اندھیروں میں راستہ معلوم کر سکو، تحقیق ہم نے کھول کر نشانیاں بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں“۔

دریا اور خشکی میں ہدایت کے لیے ستاروں کی آفرینش

آسمان پر گردش کرنے والے ستاروں کو خلق کرنے کا مقصد اور اس کا نتیجہ انسان کی دنیاوی زندگی کی خوش بختی اور سعادت کو فراہم کرنا ہے۔ یہ امر اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے مستقل ارادے کے تحت ہو کیونکہ بات مختلف ہے۔ اس لحاظ سے پوری ہستی کے اجزا پر حاکم وابستگی اس امر کے منافی نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کے مستقل ارادے سے وجود میں آیا ہو۔ ”تفصیل آیات“ سے مراد یا تکوینی اور خلقت کے لحاظ سے تفصیل مراد ہے۔ ان کا فصل فصل ہونے، یا جدا جدا ہونا یا لفظی لحاظ سے آفاقی اور انفسی آیات کے ذریعے اللہ کی وحدانیت کا ادراک کرنا مراد ہے۔ ان کی معرفت صرف ان ہی لوگوں کو حاصل ہوگی جن کو علم کا کچھ حصہ عطا کیا گیا ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم ان آیات کو (جدا جدا کر کے) تفصیل سے ان لوگوں کے لیے بیان کیا ہے جو جانتے اور سمجھتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

''اور اللہ وہی ہے جس نے ایک شخص سے تم سب کو پیدا کیا پھر ایک تو تمہارے ٹھکانے کی جگہ ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی جگہ، تحقیق ہم نے کھول کر نشانیاں بیان کر دی ہیں ان کے لیے جو سمجھتے ہیں''۔

انسانوں کی خلقت، اللہ کی وحدانیت کی دلیل

اتنی ساری کثرت اور پراکندگی کے باوجود بنی نوع انسان کی ابتدا ایک آدمی سے ہوئی ہے اور وہ حضرت آدمؑ ہیں۔ ''مُسْتَقَرٌّ'' سے وہ افراد مراد ہیں جو اپنے آباء واجداد کی صلبوں کا سفر طے کر کے پیدا ہو چکے ہیں اور زمینپر آئے جو نوع بشر کی قرار گاہ ہے۔ اس بارے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 36 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ'' ''اور ایک مدت تک زمین پر تمہارا قیام ہو گا''۔ ''مُسْتَوْدَعٌ'' سے وہ افراد مراد ہیں جنہوں نے ابھی اپنے آباء و اجداد کی صلبوں کے سفر کو طے نہیں کیا اور ابھی پیدا نہیں ہوئے بلکہ بعد میں پیدا ہونگے۔ پس اس آیت کا معنی یہ ہو گا کہ وہ ذات ہے کہ جس نے تم کو یعنی نوع بشر کو ایک فرد سے خلق کیا ہے اور زمین کو معین مدت کے لیے تمہارے اختیار میں دے دیا ہے تاکہ جب تک نسل بشر باقی ہے یہ زمیں تمہارے اختیار میں رہے۔ واضح سی بات ہے کہ فقط اہل تفکر لوگ ہی انسانی نفوس کے نظام کے واسطے سے اللہ کی یگانگی اور یکتائی کا ادراک کر سکتے ہیں اور وہ وہ لوگ ہیں جو بات کی گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّ غَیۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَ یَنۡعِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾

''اور اسی نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز اگنے والی نکالی پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی جس سے ہم ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے شگوفوں میں سے پھل کے جھکے ہوئے گچھے ہیں، اور باغ ہیں انگور اور زیتون اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی، دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو، ان چیزوں میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں''۔

پانی اور نباتات کا نظام اللہ کی وحدانیت کی دلیل

''السَّمَآءِ'' سے کسی بھی چیز کا اوپر والا حصہ مراد ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جو انسان کے سر پر سایہ کرے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے آسمان سے بھیجے گئے پانی کے ذریعے سے سارے نباتات اگائے ہیں اور اسی سے ہی نباتات، درخت، آدمی اور حیوانات رشد و نمو کرتے ہیں۔ ''خَضِرًا'' سبز کے معنی میں ہے۔ ''تراکب حب'' ایک دوسرے کے اوپر ہونا جیسے گندم کے خوشے ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوتے ہیں۔ ''طَلۡع'' کھجور کے خوشوں کے ظاہر ہونے کے پہلے مرحلے کو کہا جاتا ہے۔ ''قِنۡوَانٌ'' خرما

کے خوشے کو کہتے ہے۔ ''دَانِیَةٌ'' نزدیک کے معنی میں ہے۔ ''مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ'' ہم شکل اور شکل میں مختلف ہونا۔ ''یَنْعِ'' پھل کا پک جانا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اُن موارد کی جانب اشارہ کیا ہے جن کو اپنے دست قدرت سے خلق کیا ہے تاکہ صاحبان عقل و بصیرت ان پر غور و فکر کرکے اللہ کی یگانگی اور وحدانیت کا ادراک کر سکیں۔ ان میں سے بعض موارد زمین سے مربوط ہیں جیسے نباتات کا دانوں کو چیر کر باہر نکلنا اور درختوں کا گھٹلیوں کو پھاڑنا اور بعض امور آسمان سے مربوط ہیں جیسے شب و روز کا وجود میں آنا، سورج و چاند کا وجود اور بارش کا اترنا اور بعض امور انسان سے مربوط ہیں جیسے نوع بشر کا ایک تن سے وجود میں آنا اور بعض کا تعلق ان تمام امور سے ہے جو ذکر ہوئے ہیں جیسے بارش کا اترنا اور اس سے نباتات، حیوانات اور انسانوں کا رشد کرنا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو عقل مند اور سمجھدار لوگوں کے لیے نشانی قرار دیا ہے۔ نفوس کے ایجاد کرنے کو تفقہ کرنے والوں کے لیے نشانی قرار دیا ہے۔ اور زمین سے اگنے والی چیزوں کو اہل ایمان کے لیے نشانی قرار دیا ہے۔ اس کہ وجہ یہ ہے کہ نباتات کے نظام اور ان کے اگنے پر جو تکوینی قوانین کارفرما ہیں ان پر تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے عام افراد بھی ان کے خالق کے متعلق علم حاصل کر سکتے ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ ان کا دل ایمان کے نور سے روشن ہو اور گناہوں کی آلودگی نے اس کی فطرت اور عقل پر پردہ نہ ڈالا ہو۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَصِفُوْنَ ۠﴿۱۰۰﴾

''اور اللہ کا شریک جنوں کو ٹھہراتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے، اور وہ اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرتے ہیں (بغیر کسی علمی بنیاد کے) جہالت سے، وہ پاک ہے اور ان باتوں سے بلند ہے جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں''۔

الٰہی صفات میں مخلوق، خالق کے برابر نہیں

مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے لیے جنات سے اللہ کے شرکاء بنائے جبکہ جن خود اللہ کی مخلوق ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ مخلوق الوہیت اور معبودیت میں اپنے خالق کے ساتھ شریک ہو جائے۔ جنات سے یا تو شیاطین مراد ہیں یا وہی معروف جنات مراد ہیں جو انس کے مقابلے میں ہیں۔ قریشیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے جنات سے ایک لڑکی کو اپنی زوجہ بنایا ہے اور اس لڑکی سے اللہ نے فرشتے خلق کیے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی کی ہے اور فرما رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت دی ہے یا مثال کے طور پر فرشتوں کو اپنے خداؤں کی بیٹیاں قرار دیا ہے یا ان کو اللہ کا بیٹے خیال کرتے تھے جبکہ اللہ ایسی باتوں سے پاک و منزہ ہے، اس کی شان ان چیزوں سے اعلیٰ ہے۔ مشرکین خدا پر جو جھوٹ باندھ رہے ہیں اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ وہ جن صفات کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہے اللہ ان صفات سے بلند تر ہے۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

''اللہ آسمانوں اور زمین کو از سر نو پیدا کرنے والا ہے، اس کا بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں، اور اس نے ہر چیز کو خلق کیا ہے اور بنایا ہے، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''۔

مشرکین کے باطل عقیدے کا جواب

یہ آیت مشرکین کے عقیدے کا جواب ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ اللہ کی اولاد ہے، بیٹے ہیں یا بیٹیاں ہیں۔ اولاد اسی کی ہو سکتی ہے جس کی کوئی بیوی ہو اور یہ بات معقول نہیں

ہے کہ خدا کسی کو اپنی بیوی بنائے۔ کیونکہ وہ خالق اور فاطر ہے، ہر چیز کو ایجاد کرنے والا ہے۔ لہٰذا کوئی اس کی اولاد نہیں بن سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ خالق اپنے بیٹے کا خالق ہو کیونکہ بیٹا باپ کا جزء ہوتا ہے جو جنسی ملاپ کے عمل سے ماں کے رحم میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ معقول نہیں ہے کہ مخلوق اپنے خالق کا جزء ہو۔ اس مختصر جملہ میں یہ دو دلیلیں ذکر ہوئی ہیں بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ"۔ کیونکہ خداوند آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے تو پھر کون سی چیز لیاقت رکھتی ہے کہ وہ اللہ کے برابر ہو یا اللہ کی زوجہ ہو یا اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہوں۔ کائنات کی کوئی بھی چیز اس کا جزء نہیں ہو سکتی کیونکہ جزء ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مثل اور مانند ہو اور کوئی بھی چیز اللہ کی مثل اور مانند نہیں ہے۔ کیونکہ سارے موجودات اللہ کی مخلوق ہیں وہی ان سب کو خلق کرنے والا ہے، وہ دانا ہے اور سب پر اس کا احاطہ علمی ہے اور سب کے بارے اس کی آگاہی ہے ان میں سے کون اس کا مثل ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مشرکین کے خیالات باطل اور فاسد ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

"یہی اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے پس اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی صفات جمالیہ

اس آیت کا پہلا حصہ "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ" پچھلی آیات میں بیان شدہ مطالب کا نتیجہ ہے۔ یہ جملہ توحید کی طرف اشارہ ہے اور اس کے بعد والا جملہ اسی کی تشریح ہے اور اس میں وجہ بھی بتائی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی رب ہے اس کے علاوہ کوئی رب نہیں ہے اللہ ہی نظام

دینے والا ہے اور وہی اس نظام کو چلانے والا ہے، تدبیر اسی کے پاس ہے وہی مدیر اور مدبر ہے کیونکہ وہی معبود ہے، اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رب ہو؟ رب، الٰہ اور معبود وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو ''خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ'' اس جملے میں پہلے والے جملے کی وجہ بتائی گئی ہے۔ پہلے والے جملے ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ'' میں بتایا گیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ الوہیت اور معبود ہونا اللہ تعالیٰ ہی سے مخصوص ہے۔ اب دوسرے جملے میں اس کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس لیے الٰہ اور معبود فقط اللہ ہے کیونکہ تمام موجودات اسی کی آفرنیش ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے پس تنہا اسی کی پرستش ہونی چاہیے۔

''اعْبُدُوْهُ'' یہ سابقہ بیانات کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ سب چیزوں کا رب ہے، سب چیزوں کا خالق ہے تو وہی ان کا معبود ہے، فقط اسی کی پرستش ہونی چاہیے۔ پورے عالم میں اس کا ہم پلہ اور اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پر وکیل ہے یعنی ہر چیز پر وہ کھڑا ہے ہر چیز کا مدبر ہے زندگی کا نظام اسی کے تحت ہے اور وہی سب امور کو انجام دے رہا ہے۔ لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ اسی کی پرستش کریں۔ اس کی عبادت سے انحراف نہ کریں کیونکہ وہ سب کا وکیل ہے اور سب کے اعمال سے آگاہ اور واقف بھی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

''اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے، اور وہ نہایت باریک بین خبر دار ہے''۔

اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا

یہ آیت ایک توہم کو دور کر رہی ہے۔ ممکن ہے مشرکین یہ گمان کرلیں کہ جب خدا سب کا وکیل ہے تو وہ ایک جسمانی اور مادی وجود ہوگا اس لیے اس کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا

ہے۔ ان کے اس وہم کو دور کرنے لے لیے فرمایا کہ آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ وہ جسم اور جسمانیت سے بلند تر ہے۔ وہ اس کے لوزامات سے بھی بلند و بالاتر ہے۔ دوسرے جملے کے ذریعے ایک اور وہم کو دور کیا ہے '' وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ '' کیونکہ پہلے جملے کے بعد اس بات کا احتمال تھا کہ مشرکین مادیت میں غرق ہونے کی وجہ سے یہ خیال کریں کہ اللہ جو محسوس نہیں ہے تو اس میں بینائی کی بھی صلاحیت نہیں ہے اور اس کا اپنی مخلوقات سے رابطہ نہیں ہے اور وہ کسی موجود کو دیکھ نہیں سکتا! لہٰذا اس وہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے لیکن اس کا ادراک ہمارے ادراک جیسا نہیں ہے جس کا تعلق اشیا کے ظواہر سے ہوتا ہے بلکہ '' وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾ '' باریک بین اور آگاہ ہے۔ لطیف کسی شے کی گہرائی تک جانا اور خبیر کا معنی ہے آگاہ، مطلع اور باخبر ہونا۔ جب خدا سارے موجودات پر محیط ہے اور اس کا احاطہ حقیقی احاطہ ہے تو حتمی طور پر وہ ہر چیز پر شاہد بھی ہے اور ناظر بھی ہے۔ ہر چیز کے ظاہر اور باطن سے وہ آگاہ ہے۔ کوئی چیز اس کے سامنے مخفی نہیں ہے۔ اس کے اور مخلوقات کے سامنے فاصلہ نہیں ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے درمیان اور پوری کائنات اور اشیاء کے درمیان واسطہ نہیں ہے۔ کوئی بھی چیز ان کے درمیان جدائی ڈالنے والی نہیں ہے۔ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے اور جو آنکھیں درک کرتی ہے اس کو بھی دیکھتا ہے لیکن آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ ایک مختصر اور دقیق عبارت ہے جس سے عقلیں حیران ہیں کیونکہ اس میں اجمال کے ہوتے ہوئے مطلب پوری دقت اور گہرائی اور وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾

''تحقیق تمہارے ہاں تمہارے رب کی طرف سے نشانیاں آ چکی ہیں، پھر جس نے دیکھ لیا تو خود ہی نفع اٹھایا، اور جو اندھا رہا سو اس نے اپنا نقصان کیا اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں''۔

اللہ کی واضح نشانیوں سے عبرت لینا

اس آیت کا مخاطب مشرکین ہیں۔ ''بَصَآئِرُ'' بصیرت کی جمع ہے اور یہ ایسی واضح دلیل کو کہتے ہیں جس کے وسیلے سے ہر چیز کو اسی طرح دیکھا جائے جس طرح وہ ہے۔ بصیرت کی دل سے وہی نسبت ہے جو بینائی کی آنکھ سے ہے۔ بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے دلائل اور بصیرتیں آئی ہے اگر تم اپنی بصیرت کو اپناؤ تو اس کا فائدہ خود تمہارے لیے ہوگا اور اگر نادانی اور جہل کا انتخاب کروگے تو اس کا نقصان تمہارے لیے ہے۔ پس اس آیت میں دیکھنا یا نہ دیکھنا جہل سے کنایہ ہے یا پھر ایمان اور کفر سے کنایہ ہے۔ بہر صورت مقصد یہ ہے کہ اپنے نفس کی طرف رجوع کیا جائے۔ آخر میں پیغمبرؐ سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو تمہارے دلوں کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیحت کرنے والے ہیں، دلوں کے مالک نہیں ہیں۔ وہ انہیں اللہ کی اطاعت کا شوق دلا سکتے ہیں۔ ان کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بصیرت کی بنیاد پر اللہ کی بات سننے کی تشویق دلائیں۔ لیکن ایسا بلکل بھی نہیں ہے کہ سب کے دل رسول کے ہاتھ میں ہوں اور وہ جس طرح چاہیں ان کی توجہ اسی طرف مبذول کرائیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ وہ کہیں کہ تو نے کسی سے پڑھا ہے اور تاکہ ہم سمجھداروں کے لیے واضح کر دیں''۔

آیات الٰہی پر مشرکین کی حیرانگی

''نُصَرِّفُ'' ایک معنی کو کئی شکلوں میں گھما پھیرا کر بیان کرنے کے معنی میں ہے تاکہ اس کا فائدہ کامل ہو جائے۔ ''دَرَسْتَ'' اگر درس سے ہو تو اس کا معنی پڑھنے پڑھانے کے ذریعہ تعلیم اور تعلم ہو گا۔ اور اگر یہ دروس سے لیا گیا ہو تو اس کا معنی ہو گا اثر کا زائل ہونا، اثر کا مٹ جانا ہے۔ دوسرے معنی کی بنا پر اس آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات پرانی ہو گئی ہے اور اس کا اثر ختم ہو گیا ہے، آج کے زمانے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ معنی دوسری آیت میں بھی بیان ہوا ہے جیسا کہ سورۂ نحل آیت نمبر 24 میں آیا ہے '' قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۴﴾ '' ''کہتے ہیں یہ تو داستانہائی پارینہ ہیں''۔ اور اگر تعلیم سے ہو تو اس کا معنی اس طرح ہو گا کہ ہم اپنی آیات کو مختلف شکلوں میں گھما پھرا کر پیش کرتے ہیں تاکہ شقی اور بے چارہ لوگ کہیں کہ تم نے یہ باتیں اہل کتاب سے سیکھی ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اس گفتار سے ہمارا دوسرا ہدف یہ ہے کہ دانا لوگوں کے دلوں کو پاک کیا جائے اور انہیں شرح صدر عطا کیا جائے۔ جس طرح سورۂ اسراء کی آیت نمبر 82 میں فرمایا:

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ وَ لَا يَزِيۡدُ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

''اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے''

ظاہر ہے ستمگاروں کا خسارہ ان کی اپنی وجہ سے ہے کہ انہوں نے قرآن کی باتوں کو تسلیم نہیں کیا تو قرآن سے انہیں خسارہ ہی ملے گا اور کچھ نہیں ملے گا۔ قبول کر لیتے تو فائدہ ان ہی کا تھا۔

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

''تو اس کی تابعداری کر جو تیرے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے منہ پھیر لے''۔

پیغمبرؐ کو وحی کی پیروی کا حکم

اس آیت میں رسول خدا ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جو کچھ تم پر وحی ہوا ہے اس کی پیروی کرو۔ توحید اور دین کے قوانین و اصول کے متعلق جو بیان ہوا ہے اسی پر چلو۔ ''من ربك'' میں ایک خاص عنایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے لیے منتخب کیا ہے اور روح کے ذریعے ان کی تائید کی ہے۔ ان کی پیروی لوگوں پر واجب قرار دی ہے۔ اس کے بعد کلمہ توحید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ''۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے یہ فرمایا کہ مشرکوں سے رخ موڑ لو، تو پیغمبرؐ کا ان سے منہ موڑ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ رہے ہوں جو ایک طرح سے بت پرستی کی تائید ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معبود کیونکہ ایک ہے تو تیرا وظیفہ فقط اس ایک معبود کی تبلیغ کرنا اور اسی کا پیغام پہنچانا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تم ان کے وکیل بنو اور ان کے نگہبان بنو، بلکہ حفیظ اور وکیل تو صرف اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے استکبار اور غرور کی وجہ سے ان کے حال پر چھوڑ رکھا ہے تاکہ وہ اپنی گمراہی پر باقی رہیں۔

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَكِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے، اور ہم نے تجھے ان پر نگہبان نہیں بنایا، اور تو ان کا ذمہ دار نہیں ہے''۔

رسول خدا مشرکین کے اعمال کے ذمہ دار نہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر مشرکین کو ان کے شرک سے نکالنے کے لیے اور ان کو ہدایت کی طرف لانے کے لیے آپ کی زحمتیں نتیجہ نہیں دے رہی تو تم اس سے پریشان نہ ہو کیونکہ ہدایت اور ضلالت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی مشیت سے وابستہ ہیں۔ اگر انہوں نے پیغمبرؐ کو عاجز کر دیا ہے تو وہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کو محدود کر سکتے ہیں۔ اگر اللہ کا اردہ نہ ہوتا کہ ایک مخلوق ایسی ہو جو صاحب اختیار ہو تو اسباب و مسببات کا نظام باطل ہو جاتا۔ جس کے نتیجے میں کائنات کا نظام تکوین درہم برہم ہو جاتا۔ کیونکہ نظام تشریع یعنی قانون سازی، اللہ کی طرف سے ہے تو اس کی باز گشت تکوینی نظام کی طرف ہے اور جب تشریعی نظام درہم برہم ہو جائے تو اس کا اثر تکوینی نظام تک جا پہنچتا ہے۔

ہم نے ان مطالب کی توضیح پچھلی آیات میں بیان کی ہے کہ خدا نے انسان کو ہرگز اس بات پر مجبور خلق نہیں کیا کہ وہ ہدایت قبول کرلے بلکہ اس کا معاملہ ان کے اختیار میں رکھا ہے۔اس میں پیغمبرؐ کا وظیفہ بات کو پہنچانا اور پیغام رسانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے وجودی امور اور شؤن اور حالات کے معاملات پر وکیل و حفیظ نہیں بنایا ہے۔ان کو انسانوں کی زندگی اور موت اور روزی پر وکیل نہیں بنایا۔ ان کا اعمال کو فائدہ حاصل کرنے اور نقصان کو دور کرنے کے لیے انجام دینا پیغمبر اکرم ﷺ کے اختیار میں نہیں ہے۔ حیات سے متعلق تکوینی اور غیر تکوینی امور پیغمبرؐ کے ذمہ نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عام طور پر حفیظ کا لفظ تکوینی امور میں استعمال ہوتا ہے اور وکیل کا لفظ غیر تکوینی امور کے لیے استعمال

ہوتا ہے۔اس میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ رسولؐ نے اپنا کام کر دیا جو پیغام دینا تھا وہ دے دیا وہ پیغام، دعوت توحید دینا تھا جو انہوں نے نہیں مانا، تکوینی لحاظ سے اللہ ہی ان کے معاملات پر حفیظ ہے لہٰذا وہ اللہ کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں ہیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

"اور جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں انہیں برا نہ کہو ورنہ وہ بے سمجھی میں زیادتی کر کے اللہ کو برا کہیں گے، اس طرح ہر ایک جماعت کی نظر میں ان کے اعمال کو ہم نے آراستہ کر دیا ہے، پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر آنا ہے تب وہ انہیں بتلائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے"۔

مشرکوں کے جعلی خداؤں کو برا نہ کہو

''سبّ'' گالی دینا۔ ''عدو'' یعنی تجاوز کرنا یا دشمنی کرنا اور حد سے بڑھنا۔ یہ آیت اس بنیاد پر ہے کہ بشر کی فطرت ہے کہ وہ اپنے مقدسات کی حفاظت کرتا ہے۔اس میں مومنین کو ایک دینی ادب سکھایا گیا ہے کہ وہ دینی معاشرے کے مقدسات کا خیال رکھیں تاکہ ان کی اہانت نہ ہو اور ان کے مقدسات کا مذاق نہ اڑایا جایا۔ کیونکہ اگر مومنین مشرکین کے بتوں کو گالی دیں گے اور ان سے جاہلانہ تعصب رکھیں گے تو مشرکین بھی حقیقی الہ کی کرامت پر حملہ آور ہوں گے۔ خدا کے متعلق غلط الفاظ استعمال کریں گے۔ لہٰذا دوسروں کے مقدسات کا خیال رکھنے سے مومنین کی اپنی حرمت کی بھی حفاظت ہوگی اور مقام کبریائی اور رب تعالیٰ کی شان میں جسارت بھی نہیں ہوگی۔

اس عبارت کی عمومیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دینی مقدسات کی نسبت ہر برائی کی طرف دینا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہر گروہ اور ہر جماعت اپنے اعمال سے عشق کرتی ہے جن کو وہ پسندیدہ جانتی ہے انکا وہ احترام کرتی ہے۔ انسان وہی اعمال انجام دیتا ہے جس سے وہ لذت اٹھاتا ہے خواہ وہ مادی ہوں یا تکوینی۔ جیسے کھانا پینا، نکاح، اگر نکاح نہ ہوتا تو نسل انسان ختم ہو جاتی۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰ (سورۂ طہ، آیت نمبر 50)

یا فکری لذت جیسے ترقی، فخر، تعریف، امن۔ فکری لذتیں دو طرح کی ہیں، ایک وہ لذتیں ہیں جو انسان کی دنیا کی بہتری کا سبب ہیں اور ان کی وجہ سے آخرت کا کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا جیسے ایمان۔ اور دوسری قسم کی لذتیں وہ ہیں جو آخرت کو نقصان دیتی ہیں جیسے باطل کی عبودیت، فسق و فجور کا ارتکاب، نفسانی خواہشات کی پیروی۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو مومنین کے دلوں کا محبوب بنایا ہے اور ان کے لیے اسے خوبصورت اور دلربا بنایا ہے، اس بارے سورۂ حجرات کی آیت 7 میں آیا ہے:

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۟ۙ

سورۂ نحل آیت 63:

فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ۔۔۔

آخر میں فرمایا کہ ''ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ'' اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تزین مطلق ہے اور تمام باطنی اعمال کو شامل ہے جیسے ایمان، کفر اور تمام ظاہری اعمال کو بھی شامل ہے جن کو انسان انجام دیتا ہے۔ انسان ہر کام کو کسی ہدف کے تحت انجام دیتا ہے جو اس کی نظر میں محبوب اور مطلوب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسان کا رجوع اللہ کی جانب ہے تو اس کا تقاضا

یہ ہے کہ اولیاء الٰہی فکری لذت کا انتخاب کریں جب قیامت کے دن غفلت کا پردہ ہٹے گا اور انسان کی سمجھ کھل کر سامنے آئے گی تو اس وقت وہ ان لذات کو دیکھیں گے اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ ان کو وہ نعمات ملی ہیں جس کا وہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے اور یہ اولیاءاللہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بنے گا۔اولیاء شیطان کیونکہ دنیا میں فانی لذات میں غرق تھے اور انہوں نے ان کا انتخاب کیا تھا تو آخرت میں ایسے امور ان کے لیے کشف ہونگے جن سے انکو تکلیف ہوگی اور وہ ایسے عذاب میں معذب ہونگے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ پس اعمال کے حقائق کا قیامت کے دن ظاہر ہونا کسی ایک گروہ سے مخصوص نہیں ہے، سب کے لیے ایسا ہونا ہے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

”اور وہ اللہ کے نام کی پکی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو اس پر ضرور ایمان لائیں گے، ان سے کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ کے ہاں ہیں، اور تمہیں کیا خبر ہے کہ جب نشانیاں آئیں گی تو یہ لوگ ایمان لے ہی آئیں گے“۔

مشرکین کی معجزہ لانے کی بے جا درخواست

مشرکین اپنی طاقت اور قدرت کے تحت بڑی سخت قسم کی بھاری بھر کم قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اگر پیغمبرؐ کی صداقت پر معجزہ آجائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دو کہ معجزہ اللہ بھیجتا ہے اور معجزے کا بھیجنا اسی کے اختیار اور تسلط میں ہے۔ معجزہ لانے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے تاکہ تمہاری درخواست قبول کروں۔ دوسری بات یہ کہ مومنو! تمہیں کیا معلوم کہ اگر ان کی مرضی کا معجزہ آ بھی جائے تو پھر یہ

معجزہ دیکھ کر ایمان لائیں گے؟ نہیں یہ ہر گز ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کے اعمال اور ان کا تکبر ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ خدا نہیں چاہتا کہ یہ ایمان لے آئیں کیونکہ ان کی بات جھوٹ پر مبنی ہے یہ اپنی قسموں کے پابند نہیں رہیں گے۔ یہ آیت غیبی خبروں میں سے ایک ہے جو ان کے رویوں کے نتیجہ کو بیان کر رہی ہے۔

وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَ اَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم انہیں ان کی سرکشی میں حیران رہنے دیں گے''۔

مشرکین کی سرکشی

''اَوَّلَ مَرَّةٍ'' سے اس آیت کے نزول سے پہلے کی دعوت مراد ہے۔ یقینی طور پر دوسری دعوت آیات کے نزول کے بعد ہے۔ اس آیت کا معنی اس طرح ہوگا بالفرض ان کی درخواست کے مطابق معجزہ نازل ہو بھی جائے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ہم نے ان کے دلوں کو الٹا کر دیا ہے یہ اب درست سمجھ نہیں سکتے۔ لہٰذا یہ معجزہ کو آتے ہوئے دیکھیں گے تو بھی ایمان نہیں لا سکیں گے۔ کیونکہ اس سے پہلے قرآنی آیات جو کہ معجزہ ہیں ان پر ایمان نہیں لائے۔ اب بھی اگر معجزہ آئے گا تو پھر یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنی نافرمانی اور سرکشی میں باقی رہیں اور حیرت کی وادی میں گھومتے پھرتے رہیں۔ جس کا انتخاب انہوں نے الٰہی دعوت کو ٹھکرا کر کر دیا ہے اب اس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں گمراہی پر باقی رکھا ہے۔

وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیں اور ان سے مردے باتیں بھی کریں اور ان کے سامنے ہم ہر چیز کو محشور بھی کر دیں (قبروں سے اٹھا کر لے آئیں) تو بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں مگر یہ کہ اللہ چاہے، لیکن اکثر ان میں سے جاہل ہیں"۔

اللہ کی مشیت کے بغیر ایمان لانا ممکن نہیں

اگر ہم ان کی عجیب و غریب اور بے جا درخواستوں کو پورا کر دیتے اور ان کے لیے حیرت انگیز معجزات لے آتے اور یہ فرشتوں کو دیکھ لیتے یا مردوں کو زندہ کرتے اور وہ ان سے باتیں کرتے یا تمام موجودات گروہ گروہ ان کے سامنے آتے اور ان سے بات کرتے اور سب زبان حال و قال سے ہمارے نبیؐ کی صداقت کی گواہی دیتے تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے۔ یہ سب کچھ ان پر کوئی اثر نہیں کرے گا مگر یہ کہ جب خدا چاہے تو تب اثر ہوتا ہے۔ ان کا ایمان لانا ایسے علل و اسباب کا محتاج ہے جو اپنی ذات میں غیر مستقل اور سب اللہ کی مشیت کے تابع ہیں۔ یہ سب اسباب اس وقت موثر ہیں جب اللہ تعالیٰ ان کو تاثیر کا اذن دے۔ لیکن کیا کریں اکثر مشرکین (سوائے ان کے ستمگار علماء کے جو علم رکھتے ہوئے بھی آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں) پروردگار کے مقام سے جاہل ہیں اور اسباب و علل ظاہری کو تاثیر میں مستقل سمجھتے ہیں۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر خدا کوئی معجزہ اتارتا تو وہ اس کے ذریعے ایمان لے آتے اگرچہ خدا نہ چاہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک خدا نہ چاہے وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ ان کی

غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقص اسباب کو مستقل سمجھا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو گی تو ایمان لا سکیں گے صرف معجزہ ایمان لانے کا سبب نہیں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شر پسند آدمیوں اور جنوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے کو طمع کی باتیں فریب دینے کے لیے سکھاتے ہیں، اور اگر تیرا رب چاہتا تو یہ کام نہ کرتے، پس تو چھوڑ دے انہیں اور جو جھوٹ وہ بناتے ہیں''۔

انبیاء کے شر پسند دشمن

''شَیٰطِیْنَ'' شیطان کی جمع ہے اور شیطان شریر، بد بخت، بد لحاظ، بد طینت اور بد فطرت کے معنی میں ہے۔ شیاطین یعنی اشرار اور شر پسند موجودات۔ ''جِنِّ'' لغت میں پوشیدہ اور مخفی کو کہتے ہے اور قرآنی اصطلاح میں فرشتوں کے علاوہ موجودات کا ایسا گروہ ہے جس میں شعور اور ارادہ موجود ہے اور ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔ شیطان اسی گروہ سے ہے۔ ''وحی'' اشارہ یا دوسرے ذرایع سے کی جانے والی چھپی ہوئی بات کو کہا جاتا ہے۔ اور ''زُخْرُفَ'' ایسی آرائش اور تزئین کو کہتے ہیں جس سے آدمی کو اشتباہ ہو۔

''زُخْرُفَ الْقَوْلِ'' یعنی ایسی گفتگو جو حق کے ساتھ مشابہت رکھتی ہو لیکن حق نہ ہو جو انسان کے لیے اس چیز کو مشکوک بنا دے۔ ''غرور'' اسی منبع کے ایک فعل مقدر کے لیے مفعول مطلق ہے یا مفعول لہ ہے۔ پس یہ آیت شریفہ کہہ رہی ہے کہ جس طرح ہم نے

تمہارے لیے بدسیرت اور بد طینت انسانوں اور جنوں سے دشمن قرار دیے ہیں جو چھپ کر اور اشاروں سے تیرے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور اپنی دھوکے دینے والی گفتگو سے لوگوں کو اشتباہ میں ڈالتے ہیں اسی طرح ہم نے سارے انبیاء کے لیے ایسے دشمن قرار دئے تھے۔ اگر حکم الٰہی اور ارداہ الٰہی نہ ہوتا تو یہ چھوٹا سا عمل بھی انجام نہ دے سکتے، ان کے سارے کام اذن الٰہی سے ہیں۔ حقیقت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جو کام یہ کرتے ہیں، انبیاءؑ کے خلاف جو منصوبے بناتے ہیں اور سازشیں کرتے ہیں تو ظاہر ہے ہر چیز کا ایک سبب ہوتا ہے اور وہ سبب اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ اگرچہ سبب تیار کرنا خود اس فرد کے اختیار میں ہے لیکن اس کی تاثیر اللہ نے رکھی ہے۔

در حقیقت اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ سے کہنا چاہتا ہے کہ تیرے دشمنوں کے اعمال کی تاثیر ہم نے رکھی ہے۔ اگر ہم چاہتے تو ختم کر سکتے تھے لیکن اسے ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر وہ تاثیر ختم کر دی جاتی تو خود نظام اختیار درہم برہم ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مجبور نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان پر زبردستی کی ہے اس لیے وہ جو بھی منصوبہ بنائیں گے اس کی تاثیر تو ہونی ہے، مگر یہ کہ اللہ اس کی تاثیر روک دے جس طرح آگ کی تاثیر جلانا ہے مگر جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تو اللہ نے اس کی تاثیر کو روک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو خطاب فرمایا کہ جب آپ کو پتہ چل گیا کہ مشرکین کی دشمنی، شر انگیزی، ان کا لوگوں کو دھوکا دینا یہ سب اللہ کے ارادے اور مشیت کے تحت ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے ارادے کے مخالف نہیں۔ لہٰذا مشرکین کی شرارتوں اور ان کے فساد پھیلانے سے غمگین نہ ہو جاؤ۔ بلکہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تاکہ وہ خدا پر جو جھوٹ اور افتراء باندھنا چاہتے ہیں باندھ لیں اور جس کو اللہ کا شریک ٹھہرانا چاہتے ہیں ٹھہرا لیں۔ اس کی سزا انہیں ملے گی کیونکہ اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا ہے۔ یہ بات نبی کریم ﷺ کو تسلی اور حوصلہ دینے کے حوالے سے ہے۔

وَ لِتَصۡغٰۤی اِلَیۡہِ اَفۡـِٕدَۃُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ وَ لِیَرۡضَوۡہُ وَ لِیَقۡتَرِفُوۡا مَا ہُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور تاکہ ان طمع کی ہوئی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جنہیں آخرت پر یقین نہیں اور تاکہ وہ لوگ ان باتوں کو پسند کریں اور تاکہ وہ کریں جو (برے کام) وہ کر رہے ہیں''۔

مشرکین کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم

یہ آیت پچھلی گفتگو کا تسلسل ہے، اللہ تعالیٰ فرمارہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑا ہے اور یہ اپنی دھوکہ دینے والی باتوں سے لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اور چونکہ تم نے بھی ان سے منہ موڑ لیا ہے وہ شیطان کی باتوں کو سن سن کر اس کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور اس کی پسند کے لوگ بن گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں یہ لوگ گناہوں کے مرتکب ہوئے، برے اعمال انجام دئے اور اس طرح بد بختی اور شقاوت کے انتہائی درجے پر پہنچ گئے۔ اس طرح خداوند متعال نہ فقط اہل سعادت کو سعادت پر پہنچانے میں ان کی مدد کرتا ہے بلکہ اہل شقاوت کو بھی شقاوت کے اعلیٰ درجے پر پہنچانے میں بھی اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس مدد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس قسم کا عمل کرتا ہے اس عمل کی تاثیر اللہ کی طرف سے عطاء کردہ ہے، اللہ اس سبب کی تاثیر میں مددگار ہوتا ہے۔ خواہ وہ شقاوت اور بد بختی والے راستے کا انتخاب کرنے والے ہوں یا سعادت والے راستے کو انتخاب کرنے والے ہوں۔

جیسا کہ سورۂ اسراء آیت نمبر 20 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کُلًّا نُّمِدُّ ہٰۤؤُلَآءِ وَ ہٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ

''ہم (دنیا میں) اِن کی بھی اور اُن کی بھی آپ کے رب کے عطیے سے مدد کرتے ہیں
''

اللہ تعالیٰ نے ہر سبب کی تاثیر رکھی ہے، جب کوئی سبب کا انتخاب اپنے ارادے سے کرلیتا ہے تو اس کی تاثیر اللہ تعالیٰ ختم نہیں کرتا بلکہ اس کی تاثیر برقرار رکھتا ہے۔ اس لیے یہ تاثیر ایک قسم کی مدد کرنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسباب کی تاثیر ختم کرے تو پھر اختیار کا نظام ختم ہو جائے گا اور یہ پورا نظام جسے اللہ نے بنایا ہے اس میں خلل واقع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت، ارادے، مصلحت اور حکمت کے تحت ایک مخلوق کو صاحب اختیار اور صاحب ارادہ بنایا ہے اور اس کے ارادے اور انتخاب میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ البتہ اسے یہ سمجھا دیا ہے کہ کونسا راستہ سعادت کا ہے اور کونسا راستہ بدبختی کا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''کیا میں اللہ کے سوا اور کسی کو منصف بناؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح کتاب اتاری ہے، اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ ٹھیک تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، لہٰذا تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بننا''۔

فقط اللہ تعالیٰ ہی حَکَم ہے

''حَکَم''اس پر بولا جاتا ہے جو فیصلہ کرنے کا استحقاق رکھتا ہو اور وہ وہی فیصلہ دے جو صحیح ہو اور قانون کے مطابق ہو۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کو چھوڑ کر تم نے جو

شرکاء اور معبود بنا رکھے ہیں تو کیا ہم اُنہیں حکم بنائیں؟ جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس لائق ہے کہ وہ حکم ہو کیونکہ وہ ہی ہے جس نے اس کتاب کو تمہارے اوپر نازل کیا ہے اور اس کے قوانین اور معارف ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں گڈمڈ ہے، یہ انسانی معاشرے کی سعادت اور آسمانی اور زمینی برکات کا سبب ہیں۔

پھر پیغمبرؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اہل کتاب اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن حق پر مبنی ہے اور تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ آپ مطمئن اور ثابت قدم رہیں۔ یہ قرآن شیطان کی طرف سے نہیں ہے اور نہ ہی اُس کے القائات سے ہے اور نہ ہی اس مطالب کے قصے کہانیاں ہیں نہ ہی یہ اٹکل پچو سے ہے، نہ ہی شیطان نے اس میں تصرف کیا ہے۔آپ اس گروہ سے مت بنیں جو اہل تردید اور دوغلے ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ دوسروں کو سمجھائے کہ اس کتاب کے بارے میں کسی قسم کی تردید اور شک نہیں ہونا چاہیے، یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے پہلی کتابوں میں بھی اس کا حوالہ آیا ہے۔ (سورہ شعراء، آیت ۲۲۲،۲۲۱) ترجمہ: کیا میں تمہیں آگاہ کروں کہ شیطان کس قسم کے لوگوں پر نازل ہوتا ہے، شیاطین ہر وہ جو کہ جھوٹا ہوتا ہے غلط باتیں گھڑتا ہے اور گناہگار ہوتا ہے اس پر اترتے ہیں"۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

"اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور انصاف کی انتہائی حد تک پہنچی ہوئی ہیں، اس کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا، اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے"۔

دین اسلام اللہ کی کامل شریعت

"کلمہ" ایسا لفظ ہے جو معنی تام یا غیر تام پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کبھی کلمہ، قولِ حق پر بولا جاتا ہے جیسے وعدہ ہے اور کبھی کلمہ موجود خارجی پر بولا جاتا ہے جو "کُن" کے لفظ سے محقق ہوتا ہے جیسے مسیحؑ کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے" کلمہ" ہیں۔ " کلمہ" کو مکمل کرنے کا مطلب اسلامی دعوت کا محمد ﷺ کی نبوت اور آسمانی کتاب قرآن کے نزول سے کمال تک پہنچ جانا ہے جو تمام آسمانی کتابوں پر غالب ہے۔ اس سے پہلے جو آسمانی شریعتیں تھیں وہ تدریجاً آگے بڑھتی رہیں اور ان کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور نقص سے کمال کی جانب سفر جاری رہا اور درجہ کمال تک پہنچ گیا اور اسلام ہی دین کامل کا مصداق دین اسلام ہے۔ سچائی کے اعتبار سے کلمہ الٰہی کی تمامیت یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ محقق ہو گا۔ اور عدل کے اعتبار سے اس کی تمامیت یہ ہے کہ اس کے جتنے اجزاء ہیں اس میں جتنا مواد ہے وہ ایک طرح کا ہے، ان میں تضاد نہیں ہے۔

اس کے بعد والی عبارت ''لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ'' پہلی عبارت کی علت اور سبب کے عنوان سے بیان ہوئی ہے۔ کلماتِ الٰہی کا کامل ہونا اور تام ہونا، پورا ہو جانا یہ ہے کہ یہ الٰہی کلمات اور بیانات ہر گز تبدیل نہیں ہوں گے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ جو وعدہ کرتا ہے اسے یقیناً پورا کرتا ہے اور جو اس نے کہہ دیا ہے ویسا ہی ہو گا۔ کوئی خدا کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی نظر کو بدل دے، اپنے فیصلے کو تبدیل کر دے۔ آخر میں کہہ دیا کہ خدا سمیع و علیم ہے جو کچھ لوگ حاجت مندی کی زبان سے اللہ سے مانگتے ہیں، طلب کرتے ہیں تو اللہ اسے جانتا ہے اور اسے قبول بھی کرتا ہے اور تمہارے اعمال سے اللہ آگاہ ہے۔

وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور اگر تو اکثریت کا کہا مانے گا جو دنیا میں ہیں تو تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے، وہ تو اپنے خیال پر چلتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں''۔

گمان کی پیروی الٰہی راستے سے ہٹانے کا سبب

خدا کا راستہ علم اور حکمت کا راستہ ہے اور اس نے جتنے قوانین اور احکام بنائے ہیں وہ انسان کی سعادت کے ضامن ہیں۔ قوانین اللہ کی جانب سے لینے چاہئیں کیونکہ اس میں سوائے علم اور یقین کے کچھ بھی نہیں۔ لیکن انسان کی دُنیاوی زندگی اور اس کی زندگی کے حالات کا آپس میں ارتباط اور انسان کے اعمال اسے اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ تخمینہ، اندازے، اٹکل پچو اور اس طرح کی باتوں پر اعتماد کرے۔ سوائے ان چند کلی نظریات کے جن کی بنیاد خالص علم یقین پر ہے۔ لیکن زمین پر موجود اکثر لوگ ایسی شریعتوں اور احکام کی پیروی کرتے ہیں جو ان کو گمراہی اور ضلالت کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں کیونکہ ظن اور گمان انسان کو کبھی بھی حقیقت تک نہیں پہنچا سکتا۔

'' اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا ؕ'' (سورۂ یونس، آیت 36) ۔انسان کی سعادت اور اس کی فلاح و کامیابی یا اس کے برعکس اس کی ہلاکت ایسی چیز نہیں ہے جسے گمان کے حوالے کر دیا جائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں سے علم اور یقین کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہے اور نہ اس عمل کو پسند کرتا ہے جو علم اور یقین کی بنیاد پر نہ ہو۔ خاص کر وہ امور جو نبوت، کتاب، قانون سے مربوط ہیں جیسا کہ اللہ نے (سورہ اسراء، آیت 39) میں فرمایا: ''وہ چیز جس کا تمہیں علم نہیں ہے اس کی پیروی مت کرو'' ۔

کیونکہ اکثر لوگ گمان اور اندازے پر عمل کرتے ہیں۔ اگر انسان اس کی پیروی کرے گا تو گمراہ ہو گا کیونکہ گمان جہالت کا نتیجہ ہے، عبودیت اللہ تبارک و تعالیٰ کے حوالے سے جہالت کے ساتھ جمع نہیں سکتی۔ اللہ بندے سے ایسا عمل چاہتا ہے جس کی بنیاد علم اور یقین ہو جبکہ عام طور پر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ اندازے اور گمان کو بنیاد بنا کر عمل کرتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کا حکم جاری و ساری ہے اور یہ جو گمراہ لوگ ہیں اور اُن کے قوانین، اندازوں پر ہیں اور گمان پر ہیں، جن کی بنیاد علم اور یقین پر نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس بات سے راضی نہیں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عوام کی اکثریت کی باتوں میں نہ آؤ کیونکہ انکے بیانات کی بنیاد علم و یقین پر نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

''تیرا رب خوب جانتا ہے اسے جو اس کی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے''۔

ہدایت یافتہ اور گمراہ کے متعلق اللہ کا علم

اللہ تعالیٰ گمراہوں اور ہدایت یافتگان دونوں کے احوال کی حقیقت سے واقف ہے اور اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔ خدا ہی اس علم کو دوسروں کے لیے عطا کرتا ہے، کسی کے پاس جو کچھ علم ہے تو وہ اللہ کی طرف سے عطاء شدہ ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''سو تم اس (جانور) میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کے حکموں پر ایمان لانے والے ہو''۔

اللہ کا نام لے کر ذبح کئے جانور کا گوشت ہی حلال ہے

پہلے والے بیانات کے مطابق کیونکہ خداوند تبارک و تعالیٰ، عالمین کا رب ہے اور وہی لائق اطاعت ہے پس جو حکم اور قانون اللہ نے بنایا ہے اس کے سامنے گردن جھکا دو۔ یہاں پر ایسے حیوان کے گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو۔ لہٰذا مومنین فقط اس حلال حیوان کے گوشت کو کھائیں گے جس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ یعنی جس کو اللہ کے نام سے ذبح نہیں کیا گیا تو وہ مردار ہے اس سے نہ کھائیں۔

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ط (سورۂ انعام، آیت ۱۲۱)

"اور جس چیز پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اس میں سے نہ کھاؤ اور بے شک یہ کھانا گناہ ہے"۔

اس حکم کو ایمان سے مشروط کیا گیا ہے کیونکہ مومن ہی کو اس بات کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ط وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

"کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ وہ واضح کر چکا ہے جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے ہاں مگر وہ چیز جس کی طرف تم مجبور ہو جاؤ، اور بہت سے لوگ بہکاتے ہیں اپنے خیالات کی بناء پر بے علمی میں، بے شک تیرا رب حد سے بڑھنے والوں کو خوب جانتا ہے"۔

پاک ذبیحہ نہ کھانے پر تعجب!

اس آیت میں لوگوں سے حیرت اور تعجب کے ساتھ ایک سوال کیا گیا ہے کہ تم اس پاک ذبیحہ کو کیوں نہیں کھاتے جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حرام غذاؤں کو تمہارے لیے بیان کر دیا ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مجبوری کی حالت میں استثناء ہے اور جو حیوان اللہ کے نام سے ذبح ہوا ہے تو وہ محرمات میں سے نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ خواہشات نفسانی کی پیروی کو بنیاد بنا کر دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان کے عمل کی بنیاد جہالت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان زیادتی کرنے والوں سے آگاہ ہے جو اللہ کی حدود کو پھلانگتے ہیں، اللہ ان سے بہتر واقف ہے۔ اور مشرکین جو کچھ مسلمانوں سے کہتے ہیں اللہ اس سے بھی واقف ہے۔ مشرکین کہتے ہیں کہ کیا فرق پڑتا ہے کہ ذبح کرتے وقت حیوان پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو! دونوں ہی ذبح ہوئے ہیں تو دونوں سے کھا سکتے ہیں اور یہ کیا ہوا کہ ایک کو کھا سکتے ہیں اور ایک کو نہیں کھا سکتے۔ یہ اللہ کے احکام کی حدود سے آگے بڑھے ہوئے ہیں اور انہوں نے اللہ کے قوانین کی مخالفت کی ہے، اللہ ان سے واقف اور آگاہ ہے۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

''تم ظاہری اور باطنی سب گناہ چھوڑ دو، بے شک جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے''

ظاہری اور باطنی گناہ سے منع

یہ آیت اگرچہ مطلق گناہ کی نہی کو بیان کر رہی ہے لیکن سیاق کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نہی سے مراد ایسے حیوان کا گوشت کھانا ہے جس پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو۔ ایسے جانور کا گوشت حرام اور گناہ کے مصادیق سے ہے اور یہ فسق، باطل اور جرم ہے، یہ عمل انسان کو خیر تک پہنچنے سے روکتا ہے اور یہ گناہان باطنی میں سے ہے۔ ظاہری گناہ ان گناہوں کو کہا جاتا ہے جن کی برائی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے جیسے شرک اور زمین میں فساد پھیلانا اور دوسروں پر ظلم کرنا۔ باطنی گناہ سے وہ گناہ مراد ہیں جس کی برائی اور بدی سے سب آشنا نہیں ہیں جیسے مردار کا کھانا، خون کا کھانا، خنزیر کا گوشت کھانا۔ اس قسم کا گناہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے ہی پہچانا جاتا ہے اور عقل اس بات کو درک نہیں کر سکتی۔ بعد والے جملے "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ" میں اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کس وجہ سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی اگر تم مخالفت کروگے تو اس مخالفت کی سزا تمہیں دی جائے گی اس سے بچ نہیں سکوگے۔

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

"اور جس چیز پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اس میں سے نہ کھاؤ اور بے شک یہ کھانا گناہ ہے، اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں باتیں ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں، اور اگر تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہو جاؤگے"۔

ذبح شرعی نہ کئے گئے جانور کے گوشت کا حکم

یہ آیت غیر تذکیہ شدہ حیوان کے گوشت کو کھانے سے واضح منع کر رہی ہے۔ عبارت ''وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ'' اس منع کی وجہ بیان کر رہی ہے کہ ایسا کرنا فسق ہے یعنی اس عمل کا ارتکاب اللہ کی طرف سے جو اوامر ہیں اور نواہی ہیں اور جو ذمہ داری انسان کی قرار دی گئ ہے اس سے نکل جانا ہے اور یہ عمل یعنی غیر مذکی کا گوشت کھانا ایسے ذبیحہ کا گوشت کھانا جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو یہ فسق کا مصداق ہے اور ہر فسق سے اجتناب اور دُور رہنا واجب ہے۔ لہٰذا اس سے دُوری اختیار کی جائے اور ایسے گوشت کو کھانا جائز نہیں ہے اس سے دُور رہنا واجب ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ مشرکین کی اپنی بات نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اولیاء اور سرپرست شیطان کی بات ہے۔ شیطان نے یہ بات ان کے دلوں میں ڈالی ہے کہ وہ کہتے ہیں ذبیحہ شدہ اور مردار کے گوشت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے مردار کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کو فسق شمار کیا ہے اور پھر اس نہی کی تاکید کے لیے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا ہے اور ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر مردار کا گوشت کھانے میں تم مشرکین کی بات مانوگے تو یقینی طور پر تم بھی مشرک ہو جاؤگے۔ یہ اس لیے ہے کہ اُن کی سنت اور روش کو ماننے یا ان کی اطاعت کرنے کے حوالے سے تم بھی اُن کے اولیاء کا حصہ بن جاؤگے اور ان جیسے ہو جاؤگے۔ جیسا کہ (سورہ المائدہ، آیت ۵۱) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ''اور تم میں سے جو انہیں حامی بناتا ہے وہ یقیناً انہی میں (شمار) ہوگا، بے شک اللہ ظالموں کی راہنمائی نہیں کرتا''۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''بھلا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے اسے روشنی دی کہ اسے لوگوں میں لیے پھرتا ہے وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو وہاں سے نکل بھی نہیں سکتا، اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے کام آراستہ کر دیے گئے ہیں''۔

گمراہ لوگ چلتی پھرتی لاشیں

اس آیت میں گمراہ انسان کو مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ چلتی پھرتی لاش ہے۔ لیکن جب اللہ اسے ہدایت کر دے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے اور نور ہدایت خیر کو شر سے، مفید کو نقصان دہ سے جدا کر دیتا ہے اور اس کی پہچان ہو جاتی ہے اس وسیلہ سے وہ لوگوں میں زندگی گزارتا ہے لیکن جو شخص کافر ہے تو وہ کیونکہ خیر کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے تاریکیوں میں ہے یا شر کو جدا نہیں کر سکتا اس کو تمیز نہیں دے سکتا، اسے سمجھ نہیں سکتا اس لیے اندھیرے میں ہے۔ لہٰذا اس کو تشبیہ دی گئی ہے جیسے تاریکی میں کوئی سرگرداں ہو اور اس کے لیے نجات کا راستہ نہ ہو، ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا ہو، ایسے شخص کی زندگی و موت سب برابر ہیں۔ موت کے بعد اس کی زندگی میں ظلمت اور اندھیرا ہے، خیر کو شر سے جدا نہیں کر سکتا۔ اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ کافروں کے اعمال ان کی نگاہ میں اس طرح جلوہ گر ہوئے ہیں کہ وہ ان میں جذب ہو گئے اور ان سے باہر نکلنے کے بارے سوچتے بھی نہیں اور خود کو ان

اعمال کی تاریکی میں غرق کر رکھا ہے اور سعادت کی روشن فضاء اور ہدایت کی روشنی کی طرف نہیں جاتا اور ایسے لوگ ستمگار اور کافر ہیں اللہ ان کی ہدایت نہیں کرتا۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور اسی طرح ہر بستی میں ہم نے گناہگاروں کے سردار بنا دیے ہیں تاکہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں، حالانکہ وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں"۔

گناہگاروں کے سرداروں کے مکر و فریب

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ جو لوگ نور ہدایت سے عاری اور گمراہی کی تاریکی اور کفر کے اندھیرے میں ہیں ان کے لیے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اسی طرح ہم نے ہر بستی میں مجرموں کے بڑے قرار دیئے ہیں جو لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ پیغمبروںؑ اور مومنین کی دینی دعوت کے خلاف سازشیں کرتے رہیں۔ جبکہ اُن کی یہ سازشیں اُن کو کوئی فائدہ نہیں دیتیں کیونکہ وہ خود تاریکیوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور خیر و شر کو نہیں پہچانتے اور نہیں جانتے کہ اُن کی ان سازشوں کا ضرر خود ان ہی کو ہے۔

"مکر" ایسے عمل کو کہتے ہیں جس میں شر اور ضرر ہو۔ اور مکر کرنے والا اور سازش کار کا ہدف دوسروں کو نقصان پہنچانا ہو۔ لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ کی جو دینی دعوت ہے اس میں تو کوئی غرض ہے نہیں کہ خود خدا کو کوئی فائدہ پہنچے بلکہ اس میں تو مد نظر یہ ہے کہ لوگ فائدہ اٹھائیں، پس جو خدا کے ساتھ مکر اور حیلہ کرتا ہے اور خدا کے خلاف سازش کرتا ہے اور

نہیں چاہتا کہ اللہ کا ہدف پورا ہو اور دینی دعوت پروان چڑھے تو حقیقت میں وہ اپنا نقصان کر رہا ہے اور خود کو نقصان دے رہا ہے۔ پروردگار کو کوئی نقصان نہیں دے سکتا۔

وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

"جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہمیں نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ پیغمبری کا کام کس سے لے، وہ وقت قریب ہے جب یہ مجرم اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے اپنی مکاریوں کی پاداش میں"۔

ہادیوں کا انتخاب اللہ کا اختیار ہے

اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ہر بستی کے بڑے مجرمین کے پاس جب کوئی آیت اترتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ ہمیں خود نمائندگی کا مقام مل جائے۔ ان کا اس بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ خود رسالت اور پیغام رسانی کے منصب پر فائز ہوں اور اصول وفروع اور دینی معارف ان کے اختیار میں ہوں۔

خداوند تبارک و تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ رسالت اور اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کوئی خرید وفروخت کا سامان نہیں ہے کہ ہر کوئی اس کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بلکہ خدا خود بہتر جانتا ہے کہ کسے اپنا نمائندہ اور پیغمبر بنائے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ اس بیان سے اس دعوے کو رد کرتا ہے کہ اللہ کی نمائندگی کا فیصلہ لوگوں کی مرضی سے ہو۔ یہ اختیار فقط اللہ کا ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو کہنے والے عام مشرکین نہیں تھے بلکہ

مجرموں میں سے بڑے مجرم تھے جنہوں نے اس قسم کی بات کی و گرنہ اگر یہ طے ہوتا ہے کہ خداوند سب کو رسول بنا دے تو پھر تو تبلیغ قبول کرنے کے لیے کوئی باقی ہی نہ رہتا کیونکہ پیغمبر کا کام تبلیغ کرنا ہے، بات پہنچانا ہے۔ کوئی ہوگا تو اسے پیغام پہنچائے گا اور حق کی دعوت دے گا اگر سب رسول اور اللہ کے نمائندے ہوگئے تو پھر پیغام رسانی کا عنوان ہی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا واضح ہوا کہ اس کی بات کرنے والے ان مشرکین کے بڑے تھے۔ انکے پاس اپنی قوم کی سرداری کا عنوان تھا وہ چاہتے تھے کہ اللہ کی پیغام رسانی کا عہدہ بھی انکے پاس ہو۔ جو اختیار رسول کے پاس ہے وہ انکے پاس بھی ہو۔ رسول پر جس طرح کتاب اتری ہے انکے پاس بھی کتاب اتاری جائے۔ پھر فرمایا یہ بڑے مجرم جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے اور حق کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اللہ کے ہاں ذلیل و خوار ہوں گے، انہیں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''سو جسے اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت دے تو اس کے سینہ کو اسلام کے قبول کرنے کے لیے کھول دیتا ہے، اور جس کے متعلق چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کے سینہ کو بے حد تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان (بلندی) پر چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈالتا ہے''۔

ہدایت دینا اور گمراہ کرنا اللہ کا اختیار ہے

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ خدا نے جسے چاہا اسے ہدایت دے دی اور اس کے سینے کو وسیع بنا دیا اور اس کے لیے گنجائش دے دی کہ وہ حق کلمہ کو رد نہ کرے اور اسلام قبول کرے۔ پس اسلام اللہ کی جانب سے حیات اور نور ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت عطا کرتا ہے اور یہ نور دے دیتا ہے اور جسے نہیں چاہتا تو اسے یہ نور نہیں ملتا اور اس کا سینہ تنگ اور سخت ہوتا ہے اس طرح کہ وہ حق اور صدق کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ یہاں پر تضییق وسعت کے مقابلے میں ہے۔ اور حرج تنگی اور سختی کے معنی میں ہے۔ اس کا سینہ سخت کرتے ہیں اس طرح کہ اس کے لیے حق کو قبول کرنے میں دشواری ہو اور وہ بہت سختی سے حق بات سننے کے لیے آمادہ و تیار ہو۔

بعد والی عبارت ''كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ'' آیت کے پہلے حصے ''ضَيِّقًا حَرَجًا'' کی تفسیر کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے۔ یہاں اصل میں بتایا جا رہا ہے ہدایت پانا اور ہدایت سے محرومی اللہ تبارک و تعالیٰ کا اپنا نظام ہے اس نظام کے تحت جو حق کو قبول کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے اس کا سینہ وسیع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حق کو سمجھا ہے اور حق کی طرف مائل ہوا ہے اور کیونکہ جیسا کرو گے ویسا ہی اس کا نتیجہ پاؤ گے۔ اس نے اس راستے کا انتخاب کیا ہے جو حق کا راستہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کی نشاندہی کر دی تھی تو گویا کہ اللہ نے اس کے لیے یہ سب کچھ قرار دیا ہے۔ اور جس نے دوسرے راستے کا انتخاب کر لیا ہے تو اس کی تاثیر ویسی ہی ہو گی اور اس کی تاثیر میں سینے کی تنگی اور سختی شامل ہے اور وہ حق سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

آیت کے اس حصے میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ گمراہوں کے دل جو حق کو قبول نہیں کرتے اس ظرف کی طرح ہیں جس میں ڈالی جانے والی چیز کی مقدار اس ظرف

سے زیادہ ہو اور اس ظرف میں اس چیز کے سما جانے کی گنجائش نہ ہو۔ آج کے علم نے ثابت کر دیا ہے کہ جتنا زمین سے اوپر جاؤ گے ہوا کا دباؤ کم ہوتا جائے گا اس طرح کہ سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ انسان کا سینہ ہدایت اور اسلام قبول کرنے کے لیے بھی اسی طرح کی تنگی محسوس کرتا ہے جس طرح انسان زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے تو سانس لینے میں اسے تنگی محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے اس طرح پلیدی اور نجاست قرار دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ گمراہی کے حوالے سے یہ کلی قانون ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہونے کی روح کا موجود نہ ہونا ہے۔ معارف حقہ اور الٰہی احکام کو قبول نہ کرنا اور ایمان نہ لانا گمراہی میں رہنا ہے اور یہی چیز نجاست اور پلیدی ہے اور یہ نجاست کافروں پر محیط اور ان پر مسلط ہے۔ اس طرح کہ ان کے درمیان اور دوسروں کے درمیان نجاست حائل ہو گئی ہے اور دوسرے ان کے قریب ہونے سے نفرت کرتے ہیں۔ پس ہدایت اور ضلالت اللہ کی جانب سے ہے اگرچہ انسان اپنے باطن اور ظرفیت کے اعتبار سے اس بات پر قادر ہے کہ وہ ایمان یا کفر میں سے ایک کا انتخاب کرے۔ لیکن بہر صورت اعمال خود اس کے اپنے ہیں جو سبب بنتے ہیں کہ خدا اسے لائق ہدایت جانے اور اسے ہدایت دے یا اس کے برعکس اس کے اعمال کی وجہ سے اسے گمراہی پر دیکھ کر اس کی ہدایت نہ کرے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝١٢٦

"اور یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے آیات کو صاف صاف کر کے بیان کر دیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ

کسی کو ہدایت دینے کے موقع پر اس کے سینے کو وسعت دینا یا کسی کو گمراہ کرنے کو موقع پر اس کے سینے کو تنگ کرنا صراط مستقیم اور اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو پورے نظام میں جاری ہے اور اس سنت کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا سینہ کشادہ اور کھلا ہوتا ہے اور وہ حق کے سامنے تسلیم ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی کافر نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا دل حق کے سامنے سخت ہوتا ہے اور وہ حق کو قبول نہیں کرتا۔ حق کو قبول نہ کرنا یا قبول کرنا اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے، جس نے جس چیز کا انتخاب کیا ہے تو وہی چیز اسے دی جائے گی اور اسی کا اثر اسے ملے گا۔ البتہ اس کا اثر اور تاثیر کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا اللہ ہی ہے جو سینوں کو وسعت دیتا ہے، اللہ ہی ہے جو سینوں کو تنگ کرتا ہے لیکن سینے کی وسعت یا تنگی کے اسباب کا انتخاب خود انسان کرتا ہے۔ جب انسان کسی عمل کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کا اثر وہی ہو گا جو اللہ نے اس عمل میں رکھا ہے۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾

”ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے ہاں، اور وہ ان کا مددگار ہے ان کے اعمال کے سبب سے“۔

مومنین کے لیے اللہ کی ہدایت کا نور

”سَلَامٌ“ ظاہری اور باطنی آفات سے دُور ہونے کے معنی میں ہے۔ ”دَارُ السَّلٰمِ“ ایسی جگہ جہاں کوئی آفت نہیں ہے، موت نہیں ہے، بیماری نہیں ہے، فقر نہیں ہے کوئی چیز کھونے والی نہیں ہے، کوئی غم واندوہ نہیں ہے، وہاں وارد ہونے والوں کے لیے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی۔ یہ جگہ بہشت موعود ہی ہے اس کے علاوہ کہیں اور ایسا نہیں

ہو سکتا۔ خصوصاً بعد والے جملے سے جو تاکید کر دی ہے اور اس کو ''عِنْدَ رَبِّهِمْ'' سے مقید کر دیا گیا ہے ان کے رب کے پاس۔ جی ہاں! اولیاء اللہ اس دُنیا میں بھی بہشت اور دارالسلام میں ہیں کیونکہ وہ خدا کو مالک علی الاطلاق سمجھتے ہیں لہٰذا اگر کوئی چیز ان کے ہاتھ سے چلی جاتی ہے تو بھی ان کے لیے کوئی غم و حسرت نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی چیز انہیں مل جاتی ہے تو بھی انہیں خاص خوشی نہیں ہوتی کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سب ان کے پروردگار کی جانب سے ہی ہے۔ وہ دائماً خلوت و جلوت میں اللہ سے رابطے میں ہوتے ہیں۔ خدا ہی ان کا ولی ہے جس کی ہدایت کے نور کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں یہ وہی نور ہے جو ان کے دلوں پر اپنی روشنی ڈالتا ہے اور ان کی چشم بصیرت کو منور کرتا ہے۔ یہ سب مراتب اُن اعمال کے نتیجے میں حاصل ہوئے ہیں جن اعمال کو انہوں نے دُنیا میں انجام دیا ہے۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ۚ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِیْۤ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾

''اور جس دن ان سب کو جمع کرے گا، (فرمائے گا) اے جنوں کی جماعت! تم نے آدمیوں میں سے بہت سے اپنے تابع کر لیے تھے، اور آدمیوں میں سے جو جنوں کے دوست تھے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم اپنی اس میعاد کو آ پہنچے جو تو نے ہمارے واسطے مقرر کی تھی،

فرمائے گا کہ تم سب کا ٹھکانا آگ ہے اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جسے اللہ بچائے، بے شک تیرا رب حکمت والا، جاننے والا ہے"۔

قیامت میں جن وانس کی گفتگو

خداوند تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن سب پر اپنی حجت پوری کرنے کے لیے اُنہیں اکٹھا کرے گا اور جنات کو خطاب ہو گا اے جنات! تم نے بہت سارے انسانوں کو گمراہ کیا اور اُن کے اوپر تمہارا تسلط تھا اور انہیں تم ذلت میں کھینچ کر لے آئے۔ لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ انسانوں پر شیاطین کی ولایت ایک طرفہ اور جبری نہیں تھی بلکہ دونوں طرف سے تھی۔ اس معنی میں کہ اگر انسان کسی کام میں شیاطین کی پیروی کرتے تھے تو اُن فوائد اور منافع کی خاطر کرتے تھے جو انہوں نے اس کام میں تصور کر رکھے تھے اور اگر شیاطین انہیں دھوکہ دیتے تھے تو ان منافع کی خاطر تھا جو ان پر ولایت میں وہ دیکھ رہے تھے اور ان کی زندگی کے امور کو چلانے میں ان کے مد نظر تھے۔ اس بنا پر ولایت کا رابطہ دونوں طرف سے تھا جس سے دونوں طرف ایک قسم کی لذت محسوس کرتے تھے۔

انسان قیامت میں دھوکہ کھانے کا اعتراف کرے گا اور کہے گا کہ وہ دنیا میں شیاطین کی پیروی کرنے کی وجہ سے اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے مادیات میں گھر گیا اور نفسانی لذات میں غرق رہا اور دُنیاوی زینتوں سے بہرہ مند ہوا۔ دوسری طرف شیاطین انسانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے اوپر اپنا تسلط جمانے اور انہیں وسوسوں میں ڈالنے میں مصروف رہے، اس لحاظ سے وہ بھی ایک قسم کی لذت سے بہرہ مند ہوئے۔ قیامت کے دن وہ کہیں گے اللہ نے ہمارے وجود میں جو حد قرار دی تھی ہم اس حد کو پہنچ چکے۔ اعمال کی بنیاد پر ان کے لیے جو درجہ مقرر کیا گیا تھا اس کو انہوں نے پا لیا ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انہوں نے زندگی کی جو مدت تھی اس کو پا لیا ہے۔

اس بنا پر اس آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ ہم میں سے بعض نے اپنے برے انتخاب اور برے اعمال کی وجہ سے بعض دوسروں کی پیروی کی اور یہ روش اس وقت تک جاری رہی جس کو تو نے اے خدا ہمارے لیے مقدر کیا تھا یہاں تک کہ ہم کفر اور ظلم کے مرتکب ہوئے۔ خداوند ان کے جواب میں فرمائے گا کہ تمہارا ٹھکانہ آتش جہنم ہے جس میں تم ہمیشہ رہو گے اور اس سے باہر نکلنا تمہارے لیے ممکن نہ ہو گا۔ البتہ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ یہ چیز قدرت الٰہی سے باہر ہو اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں آگ سے باہر نہ لا سکے، اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے لہٰذا فرمایا سوائے اللہ کے، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو نجات دینا چاہے تو انہیں نجات بھی دے سکتا ہے اور اگر اسی آتش جہنم میں باقی رکھنا چاہے تو باقی بھی رکھ سکتا ہے۔ آخر میں بیان کی تکمیل اس طرح کی ہے کہ اے پیغمبرؐ! تیرا پروردگار حکیم ہے۔ ہر عمل کو اس کی اپنی جگہ پر قرار دیتا ہے اور اس کا ہر فیصلہ ایک مصلحت کے تحت ہوتا ہے اور ہر قانون حکمت کے تحت ہے۔ وہ اپنے بندوں کے اعمال اور ان اعمال پر مرتب ہونے والے آثار سے آگاہ ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں جن سے شیاطین جنی مراد ہیں جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

"اور اسی طرح ہم ملا دیں گے گناہگاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ان کے اعمال کے سبب سے"۔

ظالموں کی پیروی کی سزا

جو ظالموں کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے وسوسوں میں گھر جاتے ہیں، ان کی سازشوں میں آجاتے ہیں اور شیطان کو اپنا مقتداء بناتے ہیں اور اسی سے لذت اٹھاتے ہیں، گناہ کے راستے کا انتخاب کرتے ہیں، ان کی یہ روش جاری رہتی ہے یہاں تک کہ خداوند تبارک و تعالیٰ ان کے اعمال کی وجہ سے شیطان کو اُن کا ولی بنا دیتا ہے اور ان کو اس کی ولایت میں قرار

دیتا ہے۔ اس کی ولایت میں قرار دینا ان کے لیے ایک قسم کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان مظالم کی وجہ سے قرار دی ہے جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔ اس سے مراد ابتدائی سزا نہیں ہے بلکہ کلی طور پر اللہ نے ان کے لیے جو سزا کا تعین کیا ہے وہ ان کی زیادتیوں کی وجہ سے ہے جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔ گفتگو کو غایب سے متکلم کی طرف موڑ لینے کا مقصد حقائق کے بیان کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختص کرنا ہے کیونکہ اس قسم کے حقائق کے ادراک کی لیاقت فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہی ہے کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ راز کو بیان کرنے کے لیے بات کو متکلم کی صورت میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

"اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تمہیں میرے احکام سناتے تھے اور وہ تمہیں ڈراتے تھے اس دن کی ملاقات سے، کہیں گے ہم اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں، اور انہیں دنیا کی زندگی نے دھوکہ دیا ہے اور اپنے اوپر گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے"۔

جنات اور انسانوں کا اپنی کوتاہیوں کا اقرار

یہ سوال و جواب اتمام حجت کے لیے ہے اور اس احتمال کو دور کرنے کے لیے ہے کہ ممکن ہے وہ یہ دعویٰ کریں کہ ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا اور ہم جہالت کی وجہ سے اس طرف چلے

گئے اور اپنے اعمال کے حوالے سے ہم غافل تھے۔ پروردگار کی طرف سے ان کو یہ جواب آئے گا کہ کیا تمہارے پاس ہمارے انبیاءؑ نہیں آئے؟ کیا انہوں نے تمہارے پاس آکر ہماری آیات تمہارے لیے نہیں پڑھیں جو دین کے برحق ہونے پر دلیل تھیں؟ اور کیا تمہیں قیامت کے دن سے نہیں ڈرایا؟ وہاں پر جن وانس سارے موارد کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے خود شیطان کی ولایت اپنے لیے انتخاب کی۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا یہ دُنیا کی زندگی تھی جس نے انہیں دھوکہ دیا۔ ہر وقت حق کی روشنی ان کے اوپر پڑتی رہی لیکن نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس ان پر حملہ آور رہیں اور وہ برے اعمال کی تاریکیوں میں اس طرح گھر گئے کہ حق کا راستہ اُن پر بند کر دیا گیا یہاں تک کہ ان کی آنکھیں حقیقت کو دیکھنے سے اندھی اور عاجز ہو گئیں۔ وہ دوبارہ گواہی دیں گے کہ اُنہوں نے سب کچھ جان بوجھ کر کیا تھا۔ اگر انہوں نے انبیاءؑ کی بات کو نہیں مانا اور دین حق کا کفر کیا تو یہ سب انہوں نے اپنے اختیار سے کیا کوئی جبر نہیں تھا۔ پہلی گواہی اس بارے تھی کہ ہمارے پاس انبیاءؑ آئے اور اللہ کی آیات کو ہم تک پہنچایا اور انہوں نے ہمیں عذاب آخرت سے ڈرایا اور دوسری گواہی بارے ہے کہ ہم نے کفر کا راستہ جان بوجھ کر خود اختیار کیا، اس کے لیے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا۔

ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّ اَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ ﴿١٣١﴾

"یہ اس لیے ہوا کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم کرنے کے باوجود ہلاک نہیں کیا کرتا اس حال میں کہ وہ بے خبر ہوں"۔

اللہ بے خبری کے عالَم میں بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رسولوںؑ کو بھیجنے، آیات پہنچانے اور قیامت کے بارے ڈرانے کا مقصد یہ ہے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ کسی بھی بستی والوں کو، کسی بھی آبادی کو آگاہ کئے بغیر ہلاک نہیں کرتا، جب تک ان کے پاس بات نہ پہنچ جائے اللہ انہیں سزا نہیں دیتا، اللہ اسی

صورت میں ان کو عذاب دیتا ہے جب بات ان تک پہنچ جائے اور وہ اللہ کے حکم کی مخالفت کریں۔ یعنی ہم ہر آبادی کے لوگوں سے چاہتے تھے کہ ہماری اطاعت کریں اور وہ ہمارے اس حکم سے غافل نہیں تھے بلکہ وہ اس بارے پورے طور پر آگاہ تھے۔ انہوں نے بغیر اس کے کہ کوئی انہیں مجبور کرے یا ان کی قدرت سلب کی جائے اپنے اختیار سے شرک، معصیت اور گناہ کے راستے کا انتخاب کیا۔ اس طرح وہ ہمارے انبیاء کے کافر ہوئے۔ لہٰذا خداوند تبارک و تعالیٰ کسی کو غفلت کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا تاکہ وہ یہ کہے کہ میرے حق میں ظلم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عدالت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ظالموں کو دُنیا میں شقاوت اور آخرت کا عذاب نصیب ہوا ہے تو یہ اُن کے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہے۔ یہاں پر ہلاکت سے عذاب دُنیوی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے۔ اور ظلم نہ کرنے سے مراد خداوند تبارک و تعالیٰ کا ان کے حق میں ظلم نہ کرنا ہے نہ کہ اہل قریٰ کا ظلم نہ کرنا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾

"اور ہر ایک کے لیے ان کے عمل کے لحاظ سے درجے ہیں، اور تیرا رب ان کے کاموں سے بے خبر نہیں"۔

انسان اور جنات کے درجات

جن و انس میں سے ہر گروہ کے اپنے اعمال کی بنیاد پر مراتب اور درجات ہیں۔ کیونکہ ان کے اعمال مختلف ہیں لہٰذا اعمال کے نتائج بھی مختلف ہیں اور ان اعمال کے اختلاف کی وجہ سے ان کے درجات بھی مختلف ہیں۔ ہر ایک کو وہی درجہ اور مرتبہ ملے گا جس کا وہ حق رکھتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان سب سے آگاہ ہے اور کسی سے بے خبر نہیں ہے کہ کس کا کیا عمل ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔

وَ رَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ؕ﴿۱۳۳﴾

"اور تیرا رب بے پروا رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو اٹھالے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہاری جگہ آباد کر دے جس طرح تمہیں ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے"۔

اللہ کی ذات ظلم سے پاک ہے

اس آیت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات سے ظلم کی نفی کرنا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ظلم کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی مناسب جگہ پر نہ رکھا جائے یا کسی کا حق ضائع کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ظلم کا سبب دو چیزیں ہو سکتی ہیں:

1۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ظلم کرنے والے کو اس چیز کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے وہ ظلم کر رہا ہے۔ وہ فائدے کو حاصل کرنے کے لیے یا اپنے سے نقصان کو دور کرنے کے لیے ظلم کرتا ہے۔

2۔ ظلم کا دوسرا سبب انسان کے باطن میں موجود شقاوت اور دل کا سخت ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں وہ غنی علی الاطلاق ہے لہٰذا اس اعتبار سے اس ذات مقدس میں ظلم کا انگیزہ ہی موجود نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ اس کی رحمت ساری کائنات کو شامل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات تمام جہات سے ظلم سے پاک ہے۔ اس بات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی بے نیازی کے بنیاد پر ساری مخلوقات کو ختم کر سکتا ہے اور اپنی وسیع رحمت کے بنیاد پر ان کی جگہ دوسری مخلوقات کو

خلق کر سکتا ہے۔ جس طرح عصر حاضر میں موجود اقوام کو گذشتہ اقوام کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ ''مَّایَشَآءُ'' سے اللہ کی وسیع قدرت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾

''بے شک جس چیز کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ ضرور آنے والی ہے، اور تم عاجز نہیں کر سکتے''۔

الٰہی وعدہ کا حتمی تحقق

یہ آیت پچھلی آیات میں بیان کئے گئے وعدوں کی تاکید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنا یقینی امر ہے تاکہ انہیں ان کے اعمال کی جزا یا سزا دی جاسکے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے وعدے پورا کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ اور نہ کوئی اس کو اس بات سے عاجز کر سکتا ہے۔ جو وعدے اللہ کی جانب سے انسانوں کو دیئے گئے ہیں وہ ضرور متحقق ہوں گے اس میں کسی قسم کی گنجائش موجود نہیں کہ جو ان وعدوں کے تحقق میں رکاوٹ بنے۔

قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ تَکُوۡنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

''کہہ دو اے لوگو! تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو اور میں بھی کرتا ہوں، عنقریب معلوم کر لو گے کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے؟ بے شک ظالم نجات نہیں پاتے''۔

اہل ایمان ہی حقیقی سعادت والے ہیں

''مَكَانَتِ'' سے وہ مقام و منزلت مراد ہے جس پر صاحب مقام و منزلت کو ہونا چاہیے۔ ''عَاقِبَةُ'' ہر چیز کے انجام کو کہا جاتا ہے۔ آیت میں رسول خدا ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو تم اپنے ستمگرانہ اعمال کو جاری رکھو، میں بھی توحید کی جانب اپنی دعوت کے سلسلے کو جاری رکھتا ہوں۔ بہت جلد پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کس کی سعی و تلاش نتیجہ دیتی ہے اور سعادت پر پہنچ جاتا ہے اور یقینی طور پر جان لو کہ میں ہی فلاح اور کامیابی پانے والا ہوں گا۔ نہ کہ تم! کیونکہ تم شرک کرکے نہایت ہی بڑے ظلم کے مرتکب ہوئے ہو اور کبھی بھی ظالم کامیاب نہیں ہوتا۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿١٣٦﴾

''اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشیوں میں سے ایک حصہ اس کے لیے مقرر کرتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا حصہ ہے اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا ہے، پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا، اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کی طرف جا سکتا ہے، کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں''۔

مشرکین کے غلط عقیدے کی سرزنش

''ذَرَاَ'' ایجاد اور اختراع کرنے کے معنی میں ہے۔ ''حَرْثٍ'' زراعت کو کہتے ہیں۔ ''اَنْعَامِ'' جانور کو کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ مشرکین اپنے خود ساختہ خداؤں کو اپنے اموال میں شریک سمجھتے ہیں اور اپنے اموال کا کچھ حصہ ان کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ اپنی زراعت اور جانوروں میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ کا حصہ سمجھتے ہیں جبکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو کچھ ہمارے شرکاء کا حصہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں جاسکتا اور اللہ تعالیٰ کا حصہ شرکاء کو جاسکتا ہے۔ یہ ان کا گمان تھا۔ ''زَعْمِ'' اعتقاد کے معنی میں ہے، لیکن معمولاً یہ لفظ اس اعتقاد کے لیے استعمال ہوتا ہے جو حقیقت نہ رکھتا ہو۔ مشرکین کا یہ کہنا سرے سے باطل اور افتراء ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی شان میں توہین اور اس ذات مقدس کو بتوں سے چھوٹا سمجھنا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی ان باتوں کی سرزنش کی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے خیال میں ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ انہیں ہلاکت میں مبتلا کر دیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، سو چھوڑ دو انہیں اور اس افتراء کو جو وہ کرتے ہیں''۔

مشرکین کی کارستانیاں اور اس کا انجام

مشرکین بتوں کی محبت میں اپنے بچوں کو ان کے آگے قربانی کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے ''شرکاء'' کے لفظ سے شیاطین، بت کدوں کے خادم اور گمراہ لوگ مراد لیے ہیں۔ بہر صورت یہ عمل ان کو ہلاک کرنے اور حق و باطل کو ان پر مشتبہ کرنے کی غرض سے انجام پاتا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، کیونکہ سارے اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، کیونکہ کہ ان کا کفر اور ظلم خود ان ہی کی طرف سے ہے اور جس کا نقصان بھی ان ہی کے لیے ہوگا۔

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں، انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم چاہیں اور کچھ جانور ہیں جن پر سواری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے یہ سب اللہ پر افتراء ہے، عنقریب اللہ انہیں اس افتراء کی سزا دے گا۔''

مشرکین کے غلط اقدامات

''حِجْر'' ممنوع اور حرام کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشرکین اپنی زراعت اور جانوروں میں سے کچھ کو اپنے خود ساختہ خداؤں کو پیش کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس

زراعت اور جانوروں کو کوئی بھی استعمال نہیں کر سکتا سوائے ان لوگوں کے جو ان کے مد نظر تھے، ان لوگوں سے ان کی مراد بت کدوں کے مرد خادم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان جانوروں پر سوار ہونا بھی حرام ہے۔ یہ جانور وہی "سائبہ" "بحیرہ" اور "سام" تھے جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیت ۱۰۳ میں کیا ہے اور ان کی نفی کی ہے۔ یا کچھ جانور ایسے تھے جن پر وہ حج کے ایام میں سوار نہیں ہوتے تھے۔ یا کچھ کو بتوں کا نام لے کر ذبح کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ان سب باطل عقیدوں کی نفی کی ہے۔ وہ بہت جلد ان کی جھوٹی باتوں اور بہتانوں کی سزا انہیں دے گا۔ مشرکین اپنے ان غلط اقدامات سے اپنے اوپر ظلم کرتے تھے اور اسکی سزا انہیں بھگتنا ہوگی۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

"اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے، اور جو بچہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں برابر ہیں، اللہ انہیں ان باتوں کی سزا دے گا، بے شک وہ حکمت والا، جاننے والا ہے"۔

مشرکین کی اپنے اوپر حرام کی گئی چیزیں

"مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ" سے ان کی مراد مخصوص جانوروں جیسے "سائبہ" اور "بحیرہ" کے پیٹ میں موجود بچے تھے۔ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر ان جانوروں کے بچے زندہ پیدا ہوں تو ان کا گوشت صرف مرد ہی کھا سکتے ہیں، عورتوں پر ان کا گوشت حرام ہے۔

لیکن اگر ان جانوروں کے بچے مردہ حالت میں پیدا ہوتے تو مرد و عورت سب کے لیے ان کا گوشت حلال سمجھتے تھے۔ بعض مفسرین نے اس سے ان جانوروں کا دودھ مراد لیا ہے اور کچھ نے اس سے ان جانوروں کا دودھ اور ان کے بچے مراد لیے ہیں۔

بہر صورت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ''سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ'' عنقریب ان کی ان باتوں کی سزا انہیں ملے گی۔ قیامت کے دن یہ سب کچھ عذاب کی شکل میں ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، ان کے متعلق اللہ کا حکم حکمت کے تحت ہے اور اللہ تعالیٰ علیم ہے کوئی بھی چیز اس سے مخفی اور اس کے علم کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

''تحقیق خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ پر بہتان باندھ کر اس رزق کو حرام کر لیا جو اللہ نے انہیں دیا تھا، بے شک وہ گمراہ ہوئے اور سیدھی راہ پر نہ آئے''۔

جہالت کی بنا پر اولاد کا قتل بڑا خسارہ

مشرکین نے اپنی اولاد قتل کرکے اپنا خسارہ اور نقصان کیا ہے۔ کیونکہ ان کا یہ عمل جہل اور نادانی کی بنا پر تھا۔ اسی طرح انہوں نے ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کرکے اپنا نقصان کیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال قرار دیا تھا۔ ان کا یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اپنے بندوں کے لیے حلال قرار دے اور پھر اس چیز کو ان کے لیے حرام قرار دے ایسا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں ان کے یہ اعمال

گمراہی اور ضلالت کی بنیاد پر تھے۔ ان اعمال پر ان کے پاس کوئی عقلی دلیل یا انسانی مصلحت یا وحی کی تائید موجود نہ تھی۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی رای و نظر اور اپنی گفتار میں حیران ہیں اور یہ لوگ ہدایت پانے والے نہیں۔ یہ لوگ گمراہ ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ﴿۱۴۱﴾

"اور اسی نے وہ باغ پیدا کیے جو چھتوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن کے پھل مختلف ہیں اور زیتون اور انار پیدا کیے جو ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور جدا جدا بھی، ان کے پھل کھاؤ جب وہ پھل لائیں اور جس دن اسے کاٹو اس کا حق ادا کرو، اور بے جا خرچ نہ کرو، بے شک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

مختلف قسم کے درخت قدرت الٰہی کی نشانی

"مَّعْرُوْشٰتٍ" ایسے درختوں کو کہا جاتا ہے جن کی ٹہنیاں سہاروں کی مدد سے اوپر چلی گئی ہوں اور ایک کے اوپر دوسری ٹہنی لگی ہوئی ہو جیسے انگور کا درخت۔ "عرش" بلندی اور رفعت کو کہتے ہیں۔ "غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ" ایسے درختوں کو کہا جاتا ہے جو اپنے تنے پر کھڑے ہوں نہ کہ سہاروں کی مدد سے۔ "وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ" ان کے دانے اور ان سے بننے والے کھانے ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسے گندم، جو، دالیں اور مٹر۔ "مُتَشَابِهًا

"وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ" کا معنی یہ ہے کہ یہ پھل رنگ، خوشبو اور ذائقے کے لحاظ سے ایک دوسرے جیسے بھی ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ان درختوں کے پھل کھاؤ۔ واضح سی بات ہے کہ یہ امر وجوب پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ان کے مباح اور جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

"اٰتُوۡا حَقَّهٗ" میں حق سے مراد وہ ثابت حق ہے جو ان پھلوں سے مربوط ہے۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان پھلوں میں سے یہ حق فقراء اور مساکین کو دے دو۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال کے حق کو ادا کرو، کیونکہ ان پھلوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔ یہ ایک عقلی حکم ہے جس کی تائید شریعت بھی کرتی ہے، اس کا مقصد زکات کے حکم کو تشریع کرنا نہیں ہے کیونکہ زکات کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ہے جبکہ یہ آیات مکی ہیں۔

لہٰذا اس سے زکات کے علاوہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں پر فقراء کے لیے قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا "وَلَا تُسۡرِفُوۡا" اسراف نہ کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان نعمات کو استعمال کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کرو، اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی حد تک ان سے استفادہ کرو۔ اگرچہ تم ان چیزوں کے مالک ہو لیکن ان کو استعمال کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور ان اموال کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ نہ کرو۔ اسی طرح جو فقیر تم سے صدقہ لیتا ہے وہ بھی اس کو ضائع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس آیت کا خطاب مطلق ہے، جو ان پھلوں، اناج اور درختوں کے مالک کو بھی شامل ہے اور صدقہ لینے والے فقیر کو بھی شامل ہے۔ بلکہ آیت کا مخاطب سب لوگ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے فرما رہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَ مِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَةً وَّ فَرۡشًا ؕ كُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

"اور (پیدا کیے) بوجھ اٹھانے والے مویشی بھی اور زمین سے لگے ہوئے بھی (رینگنے والے)، اور اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، وہ تمہارا صریح دشمن ہے"۔

اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام نہ کرو

"حَمُوْلَةً" بڑے جانور جو بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ "فَرْشًا" چھوٹے جانور جن میں بوجھ اٹھانے کی صلاحیت نہیں ہے، اس قسم کے جانور بچپنے ہی سے فرش کی طرح زمین سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ "كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ" جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا اس عبارت کا مطلب جواز اور اباحت کو بیان کرنا ہے نہ کہ وجوب کو۔ یہ حکم عقل کی تائید ہے کہ ان جانوروں کے گوشت کا کھانا مباح اور جائز ہے۔

اس کے بعد فرمایا: جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے تم پر حلال قرار دیا ہے شیطان کی پیروی کرتے ہوئے اس کو اپنے اوپر حرام نہ کرو۔ اس بارے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے کا مطلب، بغیر علم کے جہل و نادانی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنا ہے۔ گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، یعنی ایسا دشمن ہے جس نے کئی بار تم سے اپنی دشمنی کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا تم اس کی پیروی نہ کرو۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

"(اللہ نے پیدا کیے ہیں) آٹھ جوڑے، بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو، تو پوچھ کہ دونوں نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ جو دونوں مادہ کے رحم میں ہے، مجھے اس کی سند بتلاؤ اگر سچے ہو"۔

حلال جانور

جن جانوروں کو پچھلی آیت میں اجمالی بیان سے حلال قرار دیا گیا تھا، اس آیت میں ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ "تشدید" کا مطلب ان کی سرزنش اور ملامت کرنا ہے۔ "زوج" کا اصلی معنی ایک چیز کا اپنی جوڑی کے ساتھ ہونا ہے اور یہ لفظ دو کے عدد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس آیت میں زوج نر اور مادہ جانور کے جوڑے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت اور بعد والی آیت میں چار قسم کے جانور بیان کئے گئے جو اپنی جوڑی کے ساتھ مل کر آٹھ بنتے ہیں۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ اس بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آٹھ قسم کے جانوروں کو پیدا کیا ہے، ان سے پوچھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے نر کو حرام قرار دیا ہے یا مادہ کو یا ان کے پیٹ میں موجود بچے کو؟ اگر تم سچ بولتے ہو تو اس کی دلیل کے بارے مجھے بھی آگاہ کرو۔ یہ سب حلال ہیں، تم نے بغیر دلیل کے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ تمہارے پاس انکے حرام کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اور (پیدا کیں) اونٹ اور گائے سے دو دو قسمیں، تو ان سے پوچھو کہ دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ جو دونوں مادہ کے رحم میں ہے، کیا تم موجود تھے جس وقت اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا تھا، پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے تاکہ لوگوں کو بلا تحقیق گمراہ کرے، بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

سب سے بڑے ظالم

جیسا کہ پچھلی آیت میں بیان ہوا، اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ان سے پوچھ لو کہ اس نے کن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے؟ اس کے بعد فرمایا: ان سے پوچھ لو کہ کیا تم نے یہ حکم اپنی عقل کی بنیاد پر جاری کیا ہے یا اس پر تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود ہے یا تم نے خود خدا سے اس کے بارے سن لیا ہے کہ اس طرح بڑے یقین کے ساتھ ان جانوروں کو حرام قرار دے رہے ہو۔ البتہ ان شقوں کو کلام کے سیاق سے سمجھا جاسکتا ہے، آیت میں صرف ایک ہی شق ذکر ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ لوگ جواب نہیں دے سکتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے؟ کیونکہ تم نادانی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز منسوب کرتے ہو جس کے ذریعے تم لوگوں کو گمراہ کر سکو۔ واضح سی بات ہے کہ اس طرح کے ظلم کا ارتکاب کر کے تم ہدایت نہیں پا سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زوج سے نر و مادہ کا جوڑا مراد نہیں ہے بلکہ اسے پالتو اور جنگلی جانوروں کا جوڑا مراد ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ
يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا
اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

''کہہ دو کہ میں اس وحی میں جو مجھے پہنچی ہے کسی چیز کو کھانے والے پر حرام نہیں پاتا جو اسے کھائے مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا وہ ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، پھر جو بھوک سے بے اختیار ہو جائے ایسی حالت میں کہ نہ بغاوت کرنے والا اور نہ حد سے گزرنے والا ہو تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے''۔

مفید جانور حلال ہیں

اس آیت کا معنی واضح ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میں اس وحی میں جو مجھے پہنچی ہے کسی چیز کو کھانے والے پر حرام نہیں پاتا جو اسے کھائے جو اس کے لیے مفید ہو مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا وہ ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔ ان موارد کے علاوہ جن کے حرام ہونے کا تم ادعاء کرتے ہو وہ بے ہودہ اور اللہ تعالیٰ پر بہتان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی بھوک سے بے اختیار ہو جائے اور ایسی حالت میں نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس جیسا حکم سورہ مائدہ آیت ۳ اور سورہ بقرہ آیت ۱۷۳ میں بھی بیان ہوا ہے۔ اضطراری حالت میں بقدرِ ضرورت، حرام شدہ چیز کو کھایا جاسکتا ہے۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ٘ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶

''یہود پر ہم نے ہر ناخنوں (پنجوں) والا جانور حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں ان دونوں کی چربی حرام کی تھی مگر جو پشت پر یا انتڑیوں پر لگی ہوئی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہوئی ہو، ہم نے ان کی شرارت کے باعث انہیں یہ سزا دی تھی، اور بے شک ہم سچے ہیں''۔

یہودیوں پر مفید جانور حرام کرنے کی وجہ

''ظُفُرٍ'' ناخن کو کہا جاتا ہے، وہ ہڈی جو انگلیوں کی نوک پر ہوا کرتی ہے۔ ''حَوَایَا'' آنت کو کہتے ہیں جس میں ہاضمے سے اضافی مواد منتقل ہوتا ہے۔ یہ آیت حقیقت میں ایک مقدر سوال کا جواب ہے کیونکہ مشرکین کہہ سکتے تھے کہ اگر سب مفید جانور حلال ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو یہودیوں کے لیے کیوں حرام قرار دیا تھا؟ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہودیوں کے لیے فقراء پر ان کے ظلم کی وجہ سے یہ جانور حرام قرار دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے سزا کے طور پر ان حلال جانوروں کو حرام قرار دیا تھا۔ آخر میں فرمایا کہ ہم ہی سچے ہیں، اور ہم سے بڑا سچا اور کون ہو سکتا ہے؟ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲ (سورۂ نساء آیت ۱۲۲) بیان کے لحاظ سے اللہ سے زیادہ سچ بولنے والا کون ہے؟!

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۴۷

''پھر اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمہارا رب بہت وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب نہیں ٹلے گا گناہگار لوگوں سے''۔

رسولؐ کو جھٹلانے والوں کے لیے واضح بیان

اس آیت میں مشرکین کو اس عذاب سے ڈرایا گیا ہے جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ البتہ ان کو ڈرایا جانا اس طرح بیان ہوا ہے کہ وہ ناامیدی کا شکار نہ ہوں اسی لیے ''ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ'' والی عبارت لائی گئی ہے اور اس کے بعد عذاب الٰہی کا تذکرہ ہوا ہے تاکہ وہ یاس اور ناامیدی کا شکار نہ ہوں اور توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کے درپے رہیں۔ اللہ تو کسی کو آتش جہنم میں نہیں بھیجنا چاہتا وہ تو کریم ہے، رحیم ہے اس لیے اس آیت میں بھی مشرکین کو ان کے اعمال کے نتیجے میں عذاب دیئے جانے کی خبر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا تذکرہ بھی کیا ہے تاکہ اگر کوئی اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہے تو اس کے لیے امید کی کرن موجود ہو۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝١٤٨

''اب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے، اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا، کہہ دو کہ تمہارے ہاں کوئی ثبوت

ہے تو اسے ہمارے سامنے لاؤ، تم فقط خیالی باتوں پر چلتے ہو اور صرف تخمینہ اور اندازہ ہی لگاتے ہو''۔

مشرکین کی دلیل کا جواب

یہ آیت مشرکین، کفار اور اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنے والوں کی دلیل کو بیان کر رہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا شرک کرنا اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنا سب اللہ تعالیٰ کی تائید سے ہوا ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو ہم کبھی بھی ایسا نہ کرتے! ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شرک کرنے اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنے کا اذن دیا ہے۔ حالانکہ ان کی اس دلیل سے وہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا جسے وہ لینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس دلیل سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے شرک چھوڑنے کا نہیں کہا اس لیے انہیں شرک چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ لوگ شرک کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے پر اختیار حاصل ہونے کا انکار نہیں کر سکتے۔

اس بناء پر حجت بالغہ اور قوی دلیل صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور مشرکین جس چیز کو دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں وہ وہم و گمان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ پہلے لوگ نہیں جو اس طرح کی دلیل پیش کرتے ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی بہت سارے لوگ ایسے تھے جو اس طرح کے دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اسی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہوئے۔ آخر میں ایک بار پھر فرمایا کہ اگر تمہارے پاس اپنے مدعا پر کوئی قوی دلیل اور برہان ہے تو لاؤ، لیکن جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی باتیں سوائے گمان اور اندازہ لگانے کے کچھ اور نہیں۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

''کہہ دو پس اللہ کی حجت پوری ہو چکی، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا''۔

اللہ تعالیٰ کی حجت کاملہ

یہ کلام خصم اور دشمن پر حجت تمام کرنے کے عنوان سے بیان ہوا ہے اس لیے فرمایا کہ تمہاری دلیل خود تمہارے مدعا کو رد کر رہی ہے۔ لہٰذا فقط اللہ تعالیٰ کی دلیل ہی حجت بالغہ ہے جو تمہاری دلیلوں کو باطل کر رہی ہے۔ تمہارے پاس شرک اور بہتان پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ہدایت دے دیتا، تمہیں شرک اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنے کو ترک کرنے اور ایمان لانے پر مجبور کرتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت بندوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ اس نے اپنے تکوینی اذن کے تحت ان کو آزاد چھوڑا ہوا ہے اور ان کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قدرت عطا کی ہے۔ اور یہ وہی اختیار ہے جو تکلیف، امر و نہی اور وعد و وعید کا ملاک اور معیار ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ هُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

''ان سے کہہ دو کہ اپنے گواہ لاؤ جو اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو تم ان کا اعتبار نہ کرنا، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں''۔

مشرکین سے گواہ لانے کا مطالبہ

یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی گواہ ہے تو لاؤ۔ یہ امر تعجیزی ہے، نہ تکلیفی کہ وہ اس بارے گواہ لانے سے عاجز ہیں اور اپنا مدعا ثابت نہیں کر سکتے۔ ان کا ادعا افتراء اور بہتان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جانور حرام قرار نہیں دیئے۔ اس کے بعد فرمایا بالفرض اگر کوئی ان کے جھوٹے مدعا پر گواہی بھی دے دے تو تم اس کی گواہی کو قبول نہ کرو۔ کیونکہ خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والوں کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

۱۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں کے اللہ تعالیٰ کی واضح اور آشکار آیات کو جھٹلایا ہے۔

۲۔ آخرت پر ایمان نہیں لائے۔

۳۔ بتوں کو اللہ تعالیٰ کی مثل اور ہمتا قرار دیا ہے۔

اس طرح کے کام صرف خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والے لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں۔

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ‌ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ‌ ۚ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ وَصّٰٮكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾

''کہہ دو آؤ میں تمہیں سنا دوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں اور انہیں رزق دیں گے، اور بے حیائی کے ظاہر اور پوشیدہ کاموں کے قریب نہ جاؤ، اور ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے، (اللہ) تمہیں یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ''۔

شرائع الٰہی میں حرام چیزیں

''تَعَالَوْا'' علو کی اصل سے ہے جو کہ بلندی اور رفعت کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم دینے والا بہت بلند مرتبہ اور عظیم ہے۔ ''اَتْلُ'' تلاوت سے لیا گیا ہے اور قرائت کے قریب المعنی ہے۔ اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ آجاؤ میں تمہیں بتا دوں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کونسی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وحی الٰہی کو ذکر کیا ہے جس میں حرام کی گئی چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ چیزیں کسی خاص شریعت میں حرام قرار نہیں دی گئیں بلکہ سب الٰہی شریعتوں کی رو سے یہ چیزیں حرام ہیں جن میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

1۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا۔

2۔ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کو ترک کرنا۔

3۔ تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل کرنا۔

4۔ بے حیائی کے ظاہر اور پوشیدہ کاموں کے قریب جانا۔

5۔ ناحق کسی جان کو قتل کرنا جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے۔

(اللہ) تمہیں یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ دوسری حرام کی گئی چیزوں کو بعد والی آیت میں بیان کیا ہے۔ شرک کو دوسرے گناہوں سے پہلے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ

شرک دوسرے تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ اس گناہ ہے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی کوئی امید نہیں ہے۔ اور دوسرے سب گناہ کی بازگشت شرک کی طرف ہے۔ جیسا کہ سورہٴ نساء کی آیت ۴۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ''

توحید کے مسئلے کے بعد ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کو بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں بھی ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کو توحید کے مسئلے کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جن میں سے سورہ اسراء آیت ۲۳ اور سورہ لقمان آیت ۱۴ کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین کی جانب سے عاق ہونا اور ان سے نیکی کرنے کو ترک کرنا ہے۔ عقل بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کیونکہ معاشرے کی بقاء خاندان کے افراد کے آپس کے صمیمی رابطے پر موقوف ہے۔

اس کے بعد تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں میں یہ رسم تھی کہ وہ تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل کرنے کی منطق غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا اور تمہارا رزق دینے والا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے اس قبیح عمل کو ترک کریں۔

تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل کرنے سے منع کرنے کے بعد دوسرے بُرے اعمال جیسے زنا، لواط اور پاک دامن اور عفیف مردوں اور عورتوں کی جانب زنا کی نسبت دینے سے منع کیا ہے۔ ''فاحشہ ظاہری'' سے علنی گناہ مراد ہیں اور ''فاحشہ باطنی'' سے پوشیدہ اور سری گناہ اور نامشروع روابط مراد ہیں۔ اس نہی کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ اگر معاشرے میں فحشاء عام ہو جائے تو نسل انسانی کی بقاء خطرے میں پڑ جائے گی۔

اس کے بعد قتل نفس کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے تمہیں ناحق کسی کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ مگر یہ کہ کسی کو جائز وجہ کی بنا پر قتل کیا جائے، جیسے کسی کو شرعی حد اور قصاص کے طور پر قتل کیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ سفارشیں تمہیں اس لیے کی گئیں ہیں تا کہ تم غور و فکر کرو۔ اس بیان کے ذریعے نہی کی علت بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ عقل اور فطرتِ انسان ان چیزوں کے حرام قرار دیئے جانے کو درک کرتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور سوائے کسی بہتر طریقہ کے یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچے، اور ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اور جب بات کہو تو انصاف سے کہو اگرچہ رشتہ داری ہو، اور اللہ کا عہد پورا کرو، (اللہ نے) تمہیں یہ حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو''۔

الٰہی ادیان میں دیگر حرام شدہ اعمال

یہ آیت پچھلی آیت کے مطالب کا تتمہ ہے جس میں الٰہی ادیان میں حرام شدہ چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ اس آیت میں درج ذیل حرام چیزیں بیان ہوئی ہیں:

1۔ یتیم کے مال کے پاس جانا سوائے کسی بہتر طریقہ کے یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچے۔

2۔ ناپ تول میں کمی کرنا۔

3۔ گفتار میں کسی پر ظلم کرنا۔

4۔ اللہ کا عہد پورا نہ کرنا۔

ہمارے اس مدعا کی دلیل کہ یہ محرمات کسی خاص دین سے مخصوص نہیں ہیں دلیل یہ ہے کہ یہی محرمات قرآن کریم کی دوسری آیات میں گذشتہ انبیاءؑ کی زبان سے بھی نقل ہوئے ہیں۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں صریحاً آیا ہے ''جن چیزوں کی سفارش ہم نے اس امت کو کی ہے وہی سفارشیں ہیں جن کو ہم نے سابقہ انبیاءؑ کی امتوں کو بھی کی تھیں'' ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ۔۔۔'' ان دو آیات میں لطیف اشارہ کے ذریعے محرمات الٰہی کی سفارش اور حکم الٰہی بیان کیا گیا ہے۔

ان چیزوں سے نہی کرنے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ، یتیم کے مال کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب اس کی عمومیت کو سمجھانا ہے، نہ فقط یتیم کا مال کھانا حرام ہے بلکہ اس میں ہر طرح کا تصرف کرنا بھی حرام ہے۔ سوائے اس کے کہ یتیم کے مال میں تصرف اصلاح کی خاطر ہو۔ یہ نہی اس وقت تک ہے جب تک یتیم جسمانی اور عقلی اعتبار سے بلوغ کی حد کو نہ پہنچ جائے۔ اور اپنے امور کو سنبھالنے میں کسی کا محتاج نہ ہو۔

اس کے بعد عدالت کے مسئلے کا تذکرہ ہوا ہے۔ زندگی کے امور میں عدالت سے کام لینا اور دوسروں پر ظلم نہ کرنا۔ ''لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' کے ذریعے ایک احتمالی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، وہ یہ کہ ممکن تھا کوئی کہے کہ ناپ تول میں حقیقی اور واقعی عدالت کی رعایت کرنا بشر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے ان امور میں اندازے اور تقریبی حد پر اکتفاء کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے

فرماتے ہیں ''ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے'' شاید آیت کا یہ حصہ، اس سے پہلے والے حصہ کو بھی شامل ہو یعنی اللہ تعالیٰ ناپ تول اور یتیموں کے مال کے بارے میں تم سے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا تمہارے بس میں ہو اور جس کی تم رعایت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ تم پر تمہاری قدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اس کے بعد گفتار میں عدالت کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور فرمایا ہے، اپنی گفتگو میں جو کسی فرد کے فائدے یا نقصان کا سبب بن سکتی ہے، عدالت رعایت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ رشتہ داروں کی محبت کی وجہ سے تم غلط بیانی کرو اور ناحق بات کہو یا بات کو توڑ مروڑ کر پیش کرو اور حق سے تجاوز کر جاؤ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے باندھے گئے عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ''عہد'' کسی چیز کی ہر حالت میں حفاظت کرنے کو کہتے ہیں۔ اس بنا پر یہ آیت شرعی تکالیف پر عمل کرنے پر بھی صادق آتی ہے اسی طرح پیمان، میثاق، نذر اور قسم کو پورا کرنے پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن سیاق آیت کو دیکھا جائے تو مناسب یہی لگتا ہے کہ اس سے مراد دستورات الٰہی کو پورا کرنا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ تمہیں یہ سب سفارشیں اس لیے کی گئی ہیں تاکہ تم نصیحت کو قبول کرو۔ اس عبارت کا مقصد آیت میں بیان شدہ دستورات کی رعایت کی تاکید اور حدود الٰہی کی حفاظت کے لیے سعی و تلاش کرنا ہے۔ ان اوامر اور نواہی کی وجہ عمومی مصلحتوں کا خیال رکھنے کے انسانی معاشرے کے لیے فوائد اور ان کی رعایت نہ کرنے کے نقصانات پر غور کرنے سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اگر کسی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی چیز سے منع کرتا ہے تو اس کا مقصد معاشرے کی بقاء اور اس کی سعادت ہوا کرتا ہے۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

"اور بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے سو اسی کا اتباع کرو، اور دوسرے راستوں پر مت چلو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے، (اللہ نے) تمہیں اسی کا حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار و متقی ہو جاؤ"۔

الٰہی راستے کی پیروی

"صراط" وہی الٰہی راستہ ہے جسے پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو دین کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ اور دینی امور میں منتشر ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے راستوں کی پیروی سے اس لیے منع کیا ہے کیونکہ ان راستوں کی پیروی لوگوں کو راہ خدا سے دور کر دیتی ہے۔ اور ان کے درمیان اختلاف کا سبب بنتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ مکمل طور پر راہ خدا سے دور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا صراط مستقیم میں اختلاف اور تفرقہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی اس راہ کے اجزاء کے درمیان بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس راہ پر چلنے والوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والوں کو جب تک اس راستے پر چل رہے ہوں اپنے مقصد یعنی توحید تک پہنچاتا ہے۔ لیکن شیطانی راستوں کی بنیاد ہی اختلاف اور تفرقہ پر ہے اس لیے ان میں کوئی خاص معیار نہیں ہے جس کی بنا پر وہ راستہ اپنے اوپر چلنے والوں کی حفاظت کر سکے۔ یہ راستے انسانی فطرت کے مطابق بھی نہیں ہیں اس لیے صرف گمراہی اور صراط مستقیم سے دور ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کا ہدف فقط دین الٰہی کو تبدیل کرنا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہ سفارشیں اس لیے کی گئی ہیں تاکہ تم اہل تقویٰ بنو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صراط مستقیم الٰہی جس میں تمام تکالیف الٰہی موجود ہیں کی بنیاد، تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ

اسی صورت میں محقق ہوتا ہے جب دقت اور بصیرت کے ساتھ نواہی الٰہی سے پرہیز کی جائے۔ ان نواہی کی حرمت کو انسانی فطرت بھی درک کر لیتی ہے جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں ہوا۔ البتہ یہ نواہی فطری ہونے میں ایک جیسی نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے بعض کا فطری ہونا زیادہ واضح اور آشکار ہے اور کچھ کا فطری ہونا اتنا زیادہ واضح نہیں ہے۔ اسی لیے مختلف تعابیر کے ساتھ ان کے متعلق سفارش کی گئی ہے۔ ان نواہی کی پہلی قسم میں تعقل اور غور و فکر ضروری ہے۔ دوسری قسم میں اشارہ اور تذکر کافی ہے۔ اور تیسری قسم میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں دین خدا میں تفرقے سے منع کیا گیا ہے اور صراط مستقیم پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ راہ خدا پر چلنا اور راہ شیطان پر چلنا ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ راہ خدا پر اسی وقت چلا جا سکتا ہے جب ان دوسرے راستوں سے اجتناب کیا جائے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

''پھر ہم نے نیکوں پر نعمت پوری کرنے کے لیے موسیٰ کو کتاب دی جس میں ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں''۔

ادیان الٰہی میں مشترک امور

اجمالی طور پر الٰہی ادیان کے کلی امور تمام ادیان الٰہی میں مشترک تھے جن کی جانب سابقہ آیات میں اشارہ کیا گیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے کلیات کو وضع اور تشریع کرنے کے بعد موسیٰؑ پر کتاب کو نازل کیا تاکہ ان اجمالی قوانین پر عمل کرنے والوں کے لیے نواقص کو کامل کریں اور بنی اسرائیل کی ضرورت کے قوانین کی تفصیل بیان کی

جائے۔ اور یہ ان کے لیے ہماری طرف سے ہدایت اور رحمت تھی۔ تاکہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات اور معاد پر ایمان لائیں۔

آخری عبارت بنی اسرائیل کے معاد پر ایمان لانے سے انکار کی جانب اشارہ ہے۔ کیونکہ موجود تحریف شدہ تورایت میں معاد اور قیامت کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد کے عقیدے کو قبول کرنا ان کے لیے بہت سخت تھا اور اس کو قبول کرنے سے وہ انکار کرتے تھے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

''یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری ہے سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قرآن کریم برکت والی آسمانی کتاب

اسی بناء پر قرآن کریم اور موسیٰؑ کی کتاب تورایت کے احکام ایک جیسے ہیں اور قرآن کریم، تورایت کی تکمیل کرنے والی کتاب ہے۔ اس میں تمہاری ہدایت ہے اس لیے اس کی پیروی کرو اور اہل تقویٰ بنو تاکہ رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہو۔ کیونکہ قرآن کریم مومنین کے لیے رحمت اور شفاء ہے۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

''تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے دو فرقوں پر کتاب نازل ہوئی تھی، اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے''۔

سابقہ امتوں پر کتاب نازل ہونے کی بات

''اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا'' ''کراھة اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا'' کے معنی میں ہے۔ یعنی تم ایسا نہ کہو۔ '' طَآئِفَتَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا '' ہم سے پہلے والے دو قبیلے سے یہود اور نصاریٰ مراد ہیں جن پر تورایت اور انجیل نازل ہوئی۔ تورایت اور انجیل سے پہلے پیامبران الٰہی پر نازل ہونے والی آسمانی کتابوں میں شرعی احکام کی تفصیل اور ان کی جزئیات موجود نہیں تھیں بلکہ ان میں صرف کلی امور تھے۔ بہر حال اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو نازل کیا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ آسمانی کتاب صرف تورایت اور انجیل ہی ہیں جو یہودیوں اور نصرانیوں پر نازل ہوئیں اور ہم ان دو کتابوں کی تلاوت سے غافل تھے، اور اس غفلت کی وجہ سے ہم پر کوئی حرج نہیں ہے اور ہم پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

اَوۡ تَقُوۡلُوۡا لَوۡ اَنَّاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا الۡکِتٰبُ لَکُنَّاۤ اَهۡدٰی مِنۡهُمۡ ۚ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةٌ ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنۡهَا ؕ سَنَجۡزِی الَّذِیۡنَ یَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ اٰیٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡدِفُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

''یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ان سے بہتر راہ پر چلتے، سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آچکی ہے، اب اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے، جو لوگ ہماری آیتوں سے منہ موڑتے ہیں ہم انہیں ان کے منہ موڑنے کے باعث برے عذاب کی سزا دیں گے''۔

آیات الٰہی سے منہ موڑنے والے

یہ آیت سابقہ آیت پر عطف ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو اگر ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ان سے بہتر راہ پر چلتے۔ اس آیت میں کتاب کو اس لیے بینہ کہا گیا ہے تاکہ اس کی حجیت اور دلالت اس طرح واضح اور آشکار ہو کہ کوئی عذر اور بہانہ تراشی نہ کر سکے۔ ''یَصۡدِفُوۡنَ'' ''یعرضون'' کے معنی میں ہے یعنی منہ موڑنا۔ وہ لوگ حق سے منہ موڑنے کی وجہ ہی سے سخت عذاب کا شکار ہوئے ہیں۔ اللہ کی کتاب پر عمل نہ کرنا ہی اللہ کی کتاب سے منہ موڑ لینا ہے اور اس جرم کی سزا سخت سزا ہے۔

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤٮِٕكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ‌ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا‌ؕ قُلِ انْتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

''یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی تو کسی ایسے شخص کا ایمان کام نہ آئے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے ایمان لانے کے بعد کوئی نیک کام نہ کیا ہو، کہہ دو کہ انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں''

حق واضح ہونے کے بعد ایمان لانا بے سود عمل

اس آیت میں استفہام، استفہام انکاری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پر وعظ و نصیحت اور حق کی طرف دعوت کا کوئی فائدہ نہ ہو تو جو امور ان کے متعلق آیہ شریفہ میں ذکر

ہوئے ہیں وہ پروردگار کا حتمی حکم اور فیصلہ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ان کو نیست و نابود کرے گا اور زمین کو ان کی پلیدی سے پاک کرے گا۔ ''اتیان الْمَلٰٓئِكَة'' فرشتوں کا آنا، اس سے عذاب کے فرشتوں کا نازل ہونا مراد ہے۔ پروردگار کے آنے سے مراد قیامت کا دن اور پروردگار سے ملاقات کے دن کا آنا مراد ہے جس میں حق اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا جلوہ مکمل طور پر واضح اور آشکار ہو جائے گا۔ لیکن کچھ مفسرین نے پروردگار کے آنے سے، امرِ پروردگار کا آنا مراد لیا ہے۔

'' اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ'' جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی سے ایسی نشانی کا آنا یا ایسے حادثے کا رونما ہونا مراد ہے جس سے نشأۃ حیات تبدیل ہو جائے گی جس کے نتیجے میں ان کا پاس سابقہ قدرت اور اختیار نہ رہے گا جیسے موت کا آجانا یا ایسے عذاب کا آجانا جس سے کسی بھی صورت میں چھٹکارا ممکن نہ ہو۔ جب اس طرح کی آیات آجاتی ہیں تو ایسی صورت حال میں انسان کا اختیار اس سے سلب ہو جاتا ہے اس لیے ایسی حالت میں ایمان لانے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اس سے پہلے ایمان لایا ہو اور نیک عمل انجام دیئے ہوں تو وہی اس کو فائدہ دے سکتا ہے۔ وگرنہ ان آیات کے آنے کے بعد ان کا ایمان لانا ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ آخر میں فرمایا: کہہ دو کہ انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اس عبارت کے ذریعہ ان کو دھمکایا گیا ہے۔ پس یہ آیت استفہام انکاری کے مقام پر ہے نہ کہ استہزاء اور تحکم کے مقام پر۔

اس آیت میں ان کو سنجیدگی کے ساتھ ڈرایا گیا ہے کہ اللہ کا فیصلہ ان کے بارے میں ہو کر رہے گا۔ اس میں ایمان اور اس کے لوازم کے درمیان جدائی ڈالی گئی ہے۔ اس آیت میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایک نہایت ہی لطیف نکتہ استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی تائید کی خاطر ''ربك'' کو تین بار ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مشرکین ہمیشہ اپنے

بتوں پر فخر و مباحات کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ پیغمبر اکرم ﷺ بھی اپنے پروردگار پر فخر کریں اور ان کو اس بات سے حوصلہ ملے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾

"جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی جماعتیں بن گئے تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی انہیں بتلائے گا جو کچھ وہ کرتے تھے"۔

دین میں اختلاف کرنے والوں سے بیزاری

اس آیت میں رسول خدا ﷺ اور ان لوگوں کی زندگی کا تقابل کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے ایجاد کئے۔ یہودی، عیسائی اور مشرکین جو دین حنیف ابراہیم سے دور ہوئے تھے۔ اسی لیے اس آیت میں صرف ان لوگوں کی حالت بیان نہیں کی گئی۔ اس عبارت "لَّسْتَ مِنْهُمْ" تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں، کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے دین خدا کے بارے اختلاف کیا ہے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اس لیے تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور رسول خدا ﷺ ان جیسے نہیں ہیں۔ کیونکہ آپؐ کلمہ حق اور دین توحید کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ جبکہ ان لوگوں نے ظلم و ستم کی بنیاد پر دین خدا میں اختلاف ایجاد کیا ہے۔ جس کے متعلق سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۳ میں آیا ہے " وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ " یہ کلام مطلق ہے جس میں پیغمبر اکرم ﷺ نے یہودیوں، عیسائیوں اور سارے اہل بدعت سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے

کہ ان سب کے امور کا اختیار اللہ کے پاس ہے، وہ قیامت کے دن ان کے اعمال کی حقیقت ان پر ظاہر کر دے گا اور ان کے اعمال کی بنیاد پر ان کو جزاء دے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

''جو کوئی ایک نیکی کرے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے، اور جو بدی کرے گا سوا سے اسی کے برابر سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا''۔

نیکی کا دس گنا بدلہ

اس آیت میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان کا تذکرہ ہوا ہے۔ جس کے مطابق ان کے نیک اعمال کا دس گنا بدلہ ان کو ملے گا۔ لیکن ان کے گناہوں اور برے اعمال کی سزا اتنی ہی ملے گی جتنا انہوں نے گناہ کیا ہے، ان کے گناہ سے زیادہ ان کو سزا نہیں ملے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یعنی نیکی کا اجر کم نہ ہوگا اور برائی کی سزا زیادہ نہ ہوگی بلکہ اسی گناہ کی مقدار میں گناہ انجام دینے والے کو سزا دی جائے گی۔ اس بارے سورہ شوریٰ کی آیت ۴۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے '' وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ '' اور برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہے۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

''کہہ دو کہ میرے رب نے مجھے ایک سیدھا راستہ بتلا دیا ہے، ایک صحیح دین ہے ابراہیم کے طریقے پر جو یکسو تھا، اور مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔

دین حنیف کی پیروی

''قِيَم''،جس میں انسان کی دنیا و آخرت کی فائدے کی چیزیں ہوں۔ ''دین حَنِيْف'' ایسا دین جس کی بنیاد فطرت ہو اور جو شرک کی گمراہی سے توحید کے سیدھے راستے کی جانب مائل ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ سے کہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دو مجھے اللہ تعالیٰ نے اس راستے کی ہدایت دی ہے جس میں انسانوں کی دنیاوی اور آخروی سعادت اور کامیابی ہے۔ جس طرح اس نے ابراہیمؑ کو اسی دین حنیف کی ہدایت دی تھی۔ ابرہیمؑ مشرکین میں سے نہ تھے، یعنی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ کسی کو اللہ کی عبادت میں اس کا شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو انہوں نے اپنا حاکم نہیں بنایا تھا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾

''کہہ دو کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے''۔

جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے

''نُسُك'' مطلق عبادت کے معنی میں ہے لیکن یہ لفظ زیادہ تر قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میری زندگی کے تمام امور بھی اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور میری موت کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے۔ اگر میں کسی کام کو انجام دیتا ہوں یا کسی عمل کو ترک کرتا ہوں تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ سارے جہاں کا مالک اور مدبر ہے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ صرف اپنے معبود کی عبادت و پرستش کرے اور بندے کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اپنے

پروردگار کے آگے تسلیم محض ہو اور جو کچھ اس نے اس سے چاہا ہے اس کو انجام دے۔ پروردگار کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر تسلط قائم رکھے اور ان کے امور کی تدبیر کرے۔

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

"اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا تھا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں"۔

اللہ کا کوئی شریک نہیں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود اور حاکم نہیں اور کوئی اس کا شریک بھی نہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کروں اور اپنی زندگی اور موت کے تمام امور میں اسی کو ملحوظ خاطر رکھوں۔ "وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾" میں اولیّت سے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے اولیت مراد ہے نہ کہ زمان کے اعتبار سے۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی دوسرے پیغمبروں نے اپنے آپ کو مسلمان کہا ہے۔ جیسے نوح، (سورہ یونس، آیت ۷۲)، ابراہیم، (سورہ بقرہ، آیت ۱۳۱) اور لوط (سورہ ذاریات، آیت ۳۶) اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبودیت تام، عبادت میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں تسلیم محض ہونے کے اعتبار سے سب مسلمانوں سے برتر و بالاتر ہیں۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"کہہ دو کہ کیا اب میں اللہ کے سوا اور کوئی رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے، اور جو شخص کوئی گناہ کرے گا تو وہ اسی کے ذمہ ہے، اور کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، پھر تمہارے رب کے ہاں ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے سو وہ تمہیں بتلادے گا جن باتوں میں تم جھگڑتے تھے"۔

توحید پر تین استدلال

اس آیت اور بعد والی دو آیتوں میں تین حجتیں اور دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ جن میں وہ سارے دلائل بیان کئے گئے ہیں جو اس سورہ میں توحید کے مسئلے پر بیان ہوئے ہیں۔ یہ تین حجتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ آفرینش اور خلقت کے آغاز کے ذریعے استدلال۔

۲۔ آفرینش کی انتہاء کے ذریعے استدلال۔

۳۔ ان دو حالتوں کے درمیان انسان کی حالت کے ذریعے استدلال۔

پہلے استدلال میں فرمایا: جب پروردگار ساری چیزوں کا مالک ہے تو یقینی طور پر یہ سب اسی کے مربوب ہونگے اور ان کے امور کو چلانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور رب بن نہیں سکتا جو عبادت کے لائق ہو۔ اس میں آغاز خلقت کے ذریعے استدلال کیا گیا ہے۔

دوسرے استدلال میں آفرینش کے پایان کے ذریعے استدلال کیا گیا ہے۔ بطور مطلق جو بھی برا کام انجام دیتا ہے اس کی سزا اور اس کا بوجھ اسی کام کے انجام دینے والے کی گردن پر ہے۔ کسی کے برے کام کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ یہ آثار اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی طرف واپس نہ پلٹ جائیں اور تب وہ سب کے اعمال کی حقیقت کو بنیاد بنا کر ان کے برے اعمال کی سزا دے۔ واضح سی بات ہے کہ جب برے اعمال کی سزا دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ مالک روز جزاء ہے تو عبادت بھی

اسی ہی کی ہونی چاہیے۔ نہ کہ ان کی جو کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ قیامت کا دن مومن اور کافر کا ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہونے کا دن ہے۔ اس دن حق اس طرح ظاہر ہوگا کہ کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی۔ تیسرا استدلال بعد والی آیت میں بیان ہوا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۧ﴿۱۶۵﴾

"اس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے اور بعض کے بعض پر درجے بلند کر دیے ہیں تاکہ تمہیں آزمائے اس میں جو اس نے تمہیں دیا ہے، بے شک یقینی طور پر ایسا ہے کہ تیرا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

انسانوں کے مراتب آزمائش کا وسیلہ

اس استدلال میں عالم ہستی اور انسان کی معاشی زندگی کے عجیب نظام کو استدلال کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ کا معنی سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ میں بیان ہوا ہے۔ پروردگار ہی نے تمہارے درمیان قوت اور ضعف، مالدار اور غریب ہونے اور حاکم اور رعیت ہونے کے اعتبار سے فرق ایجاد کیا ہے۔ اور تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے۔ یہ امور اگرچہ اعتباری ہیں لیکن ان کا منشاء وہ امور تکوینی ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر منت گذاری کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: اس اختلاف کا مقصد تمہیں آزمانا ہے کہ تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے مقابلے میں شکر کرتے ہو یا ناسپاسی و ناشکری کرتے ہو۔

بہر حال انسان کی دنیا اور آخرت کی سعادت پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سریع العقاب اور جلد حساب کرنے والا ہے۔ کیونکہ وہ بہت جلد لوگوں کے اعمال کا حساب و کتاب کرے گا۔ اور ظالموں کو ان کے برے اعمال کی سزا دے گا اور ان کو جہنم میں ڈال دے گا۔ دوسری طرف وہ اہل تقویٰ اور نیک لوگوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ اور ان کو گروہ گروہ کی شکل میں بہشت میں داخل کرنے والا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم ہے کہ اس نے اس سورہ کو اپنی رحمت اور مغفرت کے بیان پر ختم کیا ہے۔

سورۃ الاعراف

(مکی۔ کل آیات 206)

سورہ کے مطالب

عہد الہیٰ توڑنے کے برے نتائج ، اللہ کے عہد و پیمان کی پاسداری ، اسلامی معارف توحید ، رسالت اور معاد کا بیان، ابلیس کا تعارف ، قیامت کے دن کے بارے معلومات ،اعمال کا تولا جانا ، مواعظ و اخلاقیات ، تربیتی مطالب ، کتاب کا تعارف۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾

"ال م ص۔"

المص: حروف مقطعات سے ہے ،جو اسماء حسنٰی الہی جیسے "اللہ" اور "عالم" پر دلالت کرتا ہے۔ یا الہی نعمات اور اقوام کی بقاء کی مدت اور ان کی موت کی طرف اشارہ ہے۔ حروف مقطعات سورہ میں ذکر شدہ مطالب کی طرف رمزی طور پر اشارہ ہیں اور یہ حروف رموز و اسرار کو بیان کرتے ہے جس کا علم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے پاس ہے۔ "المص" کو اسم الہی بھی قرار دیا گیا ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

"یہ کتاب تیری طرف بھیجی گئی ہے تاکہ تو اس کے ذریعہ سے ڈرائے اور اس سے تیرے دل میں تنگی نہ ہونی چاہیے اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے"۔

قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب

''كِتٰبٌ'' سے قرآن مجید مراد ہے۔ اس کتاب کی عظمت و شان کو بتانے کے لیے اس کو نکرہ لایا گیا ہے۔ ''اُنْزِلَ'' کو مجہول لانے اور فعل کو فاعل کے بغیر ذکر کرنے کا مقصد اس کے نزول دفعی (یکدم) اور اس کی بڑائی کو بیان کرنا ہے۔ اور پھر رسول اللہؐ کو تسلی دی ہے کہ آپؐ کے پاس کتاب موجود ہے لہٰذا تبلیغ کرنے اور دین کی طرف دعوت دیتے ہوئے کسی بھی لحاظ سے پریشان نہ ہوں اور نہ ہی دل تنگ ہوں کیونکہ قرآن ایک مبارک کتاب ہے، اس کے وسیلے سے آپؐ سارے انسانوں کو دین کی دعوت دیں اور اس دین کو قبول نہ کرنے پر انہیں سزا سے ڈرائیں، انہیں نافرمانی کے خطرات سے آگاہ کریں۔ اسی طرح یہ کتاب مومنین کے لیے یاد دہانی اور تذکر کا سرمایہ ہے۔ کیونکہ فقط مومنین ہی ہیں جو الٰہی کلمات کے وسیلہ سے اپنے رب کے مقام الوہیت کو سمجھتے ہیں اور اس سے ان کے دلوں کو سکون ملتا ہے اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

''جو چیز تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتری ہے اس کا اتباع کرو اور اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کی تابعداری نہ کرو، تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو''۔

کتاب ہدایت قرآن کی پیروی

جو کچھ پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس سے مراد قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مصطفیٰ محمد ﷺ پر اتارا جو لوگوں کو حقیقی عقیدہ اور عمل کی دعوت دیتا ہے، چاہتا ہے لوگ حقیقت شناس بنیں، باطل پر عقیدہ نہ رکھیں۔ قرآن کی پیروی کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ قرآن میں درج مطالب کو تسلیم کرنا اور اس میں درج ہدایات پر عمل کرنا حقیقت میں اللہ کی ولایت کے تحت آنا ہے قرآن میں عقیدہ اور عمل دونوں کے بارے واضح اور روشن بیان موجود ہے۔ اللہ کے سوا دوسروں کی پیروی نہیں کرنا کیونکہ وہ تعداد میں تو زیادہ ہیں لیکن سب کے سب خیالی اور بے فائدہ ہیں، وہ کسی کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتے۔ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات کو سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھ جاتے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے، خالق ہے، مالک ہے، تو پھر اللہ کو چھوڑ کر کسی کی پیروی نہ کرتے اور نہ ہی کس کو اپنا سرپرست بناتے، یہ سب کچھ ناسمجھی اور توجہ نہ دینے کی وجہ سے ہے۔

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴

''اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دی ہیں جن پر ہمارا عذاب رات کو آیا، یا ایسی حالت میں کہ دوپہر کو سونے والے تھے''۔

الٰہی قانون

اس جگہ اللہ کا ایک قانون بیان کیا جارہا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں، اس کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرتے ہیں تو گذشتہ اقوام میں ایسا ہی رویہ اپنایا گیا اور اب بھی یہی قانون جاری ہے کہ ایسے لوگوں کو ہلاک کردیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی اور سرپرست بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت یا دن کے وقت جبکہ وہ خواب غفلت میں تھے ان پر عذاب اتار دیا، اس طرح وہ سب ہلاک ہوگئے۔

''بَيَاتًا'' دشمن پر شب خون مارنا، غفلت کے عالم میں دشمن ہر حملہ کرنے کے معنی میں ہے۔ ''قَآئِلُوْنَ'' قیلولہ سے ہے جس کا معنی ہے دوپہر کو آرام و استراحت کے لیے سونا۔ اس جگہ شب و روز کہنے کے بجائے ''بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝'' اس لیے کہا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ ان پر عذاب ایسی حالت میں آیا جب وہ آرام کر رہے تھے اور اس بات سے غافل تھے کہ ان پر عذاب آسکتا ہے، ایسی حالت میں ہم ان پر عذاب لے آئے اور انہیں ہلاک کردیا۔ لہٰذا آج کے مشرکین بھی جان لیں کہ اللہ کا قانون اٹل ہے، ان پر بھی ایسا عذاب آسکتا ہے لہٰذا وہ دعوت حق کو قبول کرلیں تاکہ عذاب اور ہلاک ہونے سے بچ جائیں۔

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

''جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا پھر ان کی یہی پکار تھی کہتے تھے بے شک ہم ہی ظالم تھے''۔

مجرموں کا اعتراف

اس عبارت کے مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے وجدان اور عقل کے ذریعے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دوسروں کو اپنا ولی اور سرپرست بنانا اور کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ظلم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ اگر انسان خود اپنے ظلم کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے توبہ نہ کرے اور اللہ کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے ظلم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر وہ اپنی مرضی اور اختیار سے اس ظلم کا اعتراف نہ کریں تو مجبوراً جب وہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو اس بات کا اعتراف کریں گے کیونکہ ہر شخص توحیدی فطرت پر خلق ہوا ہے لیکن غفلت میں چلا جاتا ہے اور اس فطری تقاضا کو بھلا دیتا ہے اور غیر فطری رویہ اپناتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنا لیتا ہے جب اسے ایسے اولیاء سے مدد نہیں ملتی اور اللہ کا قانون حرکت میں آچکا ہوتا ہے اور عذاب کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر بے ساختہ بول اٹھتا ہے کہ میں نے ظالم کیا ہے یعنی میں توحید پرست نہیں نہ تھا، مشرک تھا، جس کی وجہ سے مجھ پر عذاب آیا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۶﴾

''پھر ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ان پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے''۔

اللہ کی بازپرس

سب سے بازپرس ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی ہدایت کے واسطے رسول بھیجے ہیں۔ سب لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ توحید پر ہوں، الٰہی راستے پر ہوں، اللہ کا شرک نہ کریں، اللہ کے فرضی شرکاء کو چھوڑ دیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایمان لے آئیں، عمل صالح کریں، گفتار میں سچے ہوں، حق پر مبنی بات کریں یہ سب کی ذمہ داری قرار دی گئی اور اس بات کو

سمجھانے اور اپنانے کے لیے اللہ کے رسول ہر قوم کے پاس آئے اور انہیں الٰہی پیغام پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ان لوگوں سے ان کی ذمہ داریوں اور تکالیف بارے بر وقت باز پرس ہوگی، اسی طرح جس رسول کو ان کے درمیان بھیجا تھا اس سے بھی پوچھا جائے گا۔ رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو کچھ تمہاری ذمہ داری تھی کہ دین حق لوگوں تک پہنچاؤ، انہیں توحید الٰہی کا پیغام دو، انہیں شرک سے روکو، عمل صالح کی تلقین کرو۔ ان سے پوچھا جائے کیا تم نے اپنی ذمہ داری انجام دی؟ اسی طرح لوگوں سے سوال ہوگا کہ کیا تم نے انبیاء کی بات پر عمل کیا؟ پچھلی آیت میں بیان ہو چکا کہ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اولیاء بنائیں گے ان پر عذاب اتارا جائے گا تو عذاب اتارنے سے پہلے ان پر حجت پوری کی جائے گی لہٰذا اس جگہ بتادیا کہ ہدایت کے لیے رسول بھیجے گئے۔ اب لوگوں سے بھی سوال ہونا ہے اور رسولوں سے بھی سوال ہونا ہے۔ لوگوں کی ہلاکت اس وجہ سے ہوگی کہ انہوں نے رسولوں کی بات کو نہیں مانا۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

"پھر اپنے علم کی بناء پر ان کے سامنے بیان کر دیں گے، اور ہم کہیں غائب نہ تھے"۔

علم الٰہی کا تقاضا

پچھلی آیت میں ظالموں کے عذاب کا تذکرہ ہوا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ عذاب کا اتارا جانا اس بات پر موقوف ہے کہ عذاب دینے والا ان کے اعمال سے آگاہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ممکن ہے جن سے سوال کیا جارہا ہے وہ سوال کا جواب غلط دے دیں یا ان کا جواب جھوٹ پر مبنی ہو، یا جسے عذاب دیا جارہا ہے وہ عذاب کا مستحق ہی نہ ہو۔ اس توہم کو دور کرنے کے لیے اللہ فرمارہا ہے کہ ہمارا علم تمہارے علم کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کا علم مطلق ہے، کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہمیں آپ کے بارے معلومات نہیں، ان سے سوال تو اس لیے کیا جارہا ہے

کہ وہ خود اپنے بارے بتا دیں کہ انہوں نے ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے حوالے سے کیا گیا ہے اگر جھوٹ بولیں گے تو اس کا ہمیں علم ہے، لہٰذا کسی کو بھی بغیر وجہ اور بغیر ثبوت کے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ علم کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ انسان کے لیے اس علم کی عظمت اور اس کی اہمیت کو بیان کیا جائے۔ اس طرح یہ بھی کہہ دیا کہ نہ فقط ہمیں تمہارے اعمال کے بارے علم ہے بلکہ ہم تمہارے اعمال پر ناظر اور گواہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ فرشتے تمہارے اعمال کو لکھنے پر مامور ہیں۔ تمہارے اعمال پر ہمارا بھی علمی احاطہ ہے اور ہم ایک لمحہ بھی تمہارے حالات سے غافل نہیں۔ لہٰذا سارے لوگ مربوب اور اللہ کے قانون کے تحت ہیں اور سب الٰہی تدبیر کے تحت متحرک ہیں۔ لہٰذا بہت جلد جو کچھ انہوں کیا ہے اسی کی روشنی میں ان سے جواب مانگا جائے گا اور اس کی روشنی میں انہیں سزا یا جزا ملے گی۔ لہٰذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ بلاوجہ کسی کو عذاب دیا جائے گا۔ اگر کسی کو عذاب ہوگا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کی پیروی کی، غیر اللہ سے آس لگائی، غیر اللہ کو اپنا ولی سرپرست بنایا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۸

"اور واقعی اس دن وزن بھی ہوگا، جس شخص کا پلہ بھاری ہوگا سو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے"۔

اعمال کے مطابق کامیابی یا ناکامی

قیامت کے دن اعمال کا جائزہ لینے کے لیے ترازو نصب ہوگا جن کے اعمال کا وزن بھاری ہوگا وہ کامیاب ہو گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے نیک اعمال اور برے اعمال دونوں کا جائزہ لیا جائے گا جن کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے اور برے اعمال کم ہوں گے یا برے اعمال بالکل نہیں ہوں گے تو کہا جائے گا کہ ان کے اعمال کا پلڑا بھاری ہے اور بھاری وزن والے کامیاب لوگ ہوں گے۔ میزان اور ترازو جو قیامت کے دن لٹکایا جانا ہے اس سے مراد

حق ہے حق اعمال کو جانچنے کا معیار ہے۔اس کے لیے ایک حسی مثال دے کر سمجھایا گیا ہے۔ نیک اعمال حق پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے وہ وزنی شمار ہوتے ہیں جبکہ برے اعمال باطل پر مبنی ہیں اور بے حقیقیت ہیں ان کی اصلیت بھی موجود نہیں، اس لیے وہ بے وزن اور ہلکے ہیں۔ہر عمل کا وزن اس حق کی مناسبت سے ہوگا جو اس عمل میں لحاظ کیا گیا ہے۔ [1]

(یا یہ جو کہا گیا کہ ''علی مع الحق و الحق مع علی اللھم ادرالحق حیث دار علی علیہ السلام'' کہ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ اے اللہ حق ادھر پھیر دے جدھر علیؑ جائے۔ اس مقام علیؑ کو حق قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح سارے امام حق کا معیار ہیں اور قیامت کے دن اعمال کی پہچان حق سے ہو گی۔ جو اعمال حق پر مبنی ہیں وہی وزنی ہوں گے۔ حضرت علی اور آئمہ اطہار علیہم السلام حق کا معیار ہیں اس لیے آپ اعمال کو پرکھنے کا بھی معیار ہیں) (مترجم اردو)

وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

''اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا سو یہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس لیے کہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے''۔

---

[1] ۔ روایات میں آیا ہے کہ '' علی علیہ السلام میزان الاعمال'' ''علی اعمال پرکھنے کا پیمانہ و میزان ہیں'' یعنی علیؑ کی ولایت کو سامنے رکھ کر انسان کے اعمال کو پرکھا جائے گا۔

ہلکے پلڑے والے

جیسا کہ پچھلی آیت میں بتایا گیا قیامت کے دن برے اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا کیونکہ برے اعمال میں کوئی بات حق نہیں ہوتی اس لیے ان کا کوئی وزن اور اعتبار نہیں ہوتا، قیامت کے دن برے اعمال انجام دینے والوں کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا کیونکہ وہ سب اعمال بے اعتبار اور بے حیثیت ہوں گے۔ دنیا میں ان کے پاس جو سرمایہ تھا وہ ان کا نفس تھا جسے انہوں نے ضائع کر دیا اس طرح انہوں نے اپنے نفس کو نقصان پہنچایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے الٰہی آیات کی تکذیب کی اور الٰہی آیات کا انکار کرکے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کیا الٰہی آیات کی تکذیب سے آخرت کے بارے کچھ نہ سوچا اس طرح انہوں نے خود کو جہنم اور ہلاکت ابدی کے لائق قرار دیا اور ہمیشہ کا خسارہ ان کو نصیب ہوا۔

وَ لَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلۡنَا لَكُمۡ فِیۡهَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾

"اور ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی اور اس میں تمہاری زندگی کا سامان بنا دیا، تم بہت کم شکر کرتے ہو"۔

ناشکرا انسان

اللہ تعالیٰ اس آیت میں انسان پر اپنی نعمت کا تذکرہ فرمارہا ہے کہ ہم نے تمہیں زمین پر تمکین دی۔ زمین پر تمکین کا معنی زمین پر ٹھہرانا اور زمین کی آبادی کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہونا ہے۔ "معایش" معیشت کی جمع ہے جو ان چیزوں پر بولا جاتا ہے جن سے انسان اپنے زندہ رہنے کا اہتمام کرتا ہے جیسے کھانے پینے کی چیزیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسانوں پر اپنی نعمات کا ذکر کر رہا ہے اور ان پر احسان جتا رہا ہے۔ ان نعمات میں زمین پر سکونت کی نعمت،

زمین کو استعمال میں لانے کے اختیار کی نعمت اور زمین پر زندہ رہنے کے لئے لازم وسائل کی فراہمی کی نعمت، اللہ تعالیٰ نے یہ سب نعمات انسان کو عطاء کی ہیں۔ اس پر انسان کو چاہیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمات کا شکر بجالاتا۔ لیکن انسان بہت ناشکرا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر اعتراض کیا ہے کہ اسے نعمت کا شکر بجالانا چاہیے تھا جو وہ بجا نہیں لایا۔ اس طرح اس نے اپنا نقصان کیا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖۗ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ۝۱۱

”اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، پھر سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا“۔

انسان کے لیے فرشتوں کا سجدہ

یہ آیت انسان کی خلقت کی داستان کا آغاز ہے جو پندرہ آیات میں بیان ہوا ہے۔ پہلی آیت میں جو اجمال ذکر ہوا ہے یہاں سے اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔ اس میں تمام انسانوں (آدم زادوں) کو خطاب کیا ہے۔ پھر عمومی خطاب سے بات کو حضرت آدمؑ کی طرف موڑ دیا ہے، اس میں دو نکات ہیں:۔

1: آدم کی خلقت حقیقت میں تمام انسانوں کی خلقت ہے (اجمالی طور پر) اللہ نے انسان کو خاک سے خلق فرمایا۔

2: فرشتوں نے حضرت آدم کو جو سجدہ کیا ہے تو یہ تمام انسانوں کو ہے۔ کہ یہ آدم زادے (انسان) زمین پر اللہ کے خلفاء ہیں۔

فرشتوں کے سجدہ سے مراد : فرشتوں کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے ان کا انسان کے سامنے خاضع ہونا مراد ہے۔ اور حضرت آدم تمام انسانوں کے نمائندہ ہیں۔

صور تگری سے انسان کی اجمالی خلقت کے بعد اس کی تفصیلی خلقت مراد ہے۔ آدم کے لیے فرشتوں کا سجدہ کرنا زمین پر حضرت آدم کی جانشینی اور خلافت کی فرع ہے۔

ابلیس کا سجدہ نہ کرنا

تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا فقط ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس فرشتوں کے ہمراہ موجود تھا، ان کے ساتھ اس کا کوئی فرق نہ تھا سب کے سب قدس اور احترام کے مقام پر تھے۔ ابلیس کی بغاوت اور حکم سے سرپیچی سے پہلے فرشتوں اور ابلیس میں کچھ فرق نہ تھا۔ لیکن جب ابلیس نے سرکشی کی، الٰہی حکم سے عدول کیا، بغاوت کی تو اس کا حساب فرشتوں سے مختلف ہو گیا۔ وہ سب سے جدا ہو گیا اور قدس اور احترام کے مقام سے نیچے آگیا، راندہ درگاہ الٰہی ہو گیا۔ اس نے اللہ کے حکم کی اطاعت نہ کی، اللہ کی اطاعت سے باہر نکل گیا اور اس نے فسق کیا، گناہ کیا۔

ابلیس کی جنس

ابلیس جنات کی جنس سے تھا۔ اللہ کی نافرمانی کرکے وہ اپنے مقام و مرتبہ سے گر گیا اس نے کوتاہی اور بد بختی کا راستہ اپنایا۔ اس اعتبار سے انسان کی خلقت ابلیس کے فرشتوں کی جماعت سے نکل جانے کا سبب بنی اور ان میں سے ایک قرب کے راستے پر جبکہ دوسرا اللہ سے دوری کے راستہ پر چلنے لگا، ایک سعادت کی راہ پر اور دوسرا شقاوت کے راستہ پر، اس بارے سورۂ کہف آیت ۵۰ میں ارشاد ہے:

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ

ترجمہ: "اور (یہ بات بھی) یاد کریں جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا، پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا"۔

سب فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا وہ جنات سے تھا، تو وہ اپنے رب کے امر سے باہر نکل گیا۔ ابلیس کے بارگاہ قرب سے دھتکارے جانے کا سبب اللہ کے فرمان کی اطاعت نہ کرنا تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

"فرمایا تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا ہے جب کہ میں نے تجھے حکم دیا، کہا میں اس سے بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا ہے"۔

ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کا جواز

اس جگہ ابلیس اور اللہ تعالیٰ کا مکالمہ بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا اے ابلیس! آدم جیسے میں نے اپنے ہاتھوں (اپنی قدرت) سے خلق کیا ہے، تو نے اس کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ (سورہ جن، آیت: ۲۰)

ابلیس: ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب دینا تھا اور خود جواب دینا گستاخی اور پہلی نافرمانی تھی۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ کی پہلی دفعہ نافرمانی ہوئی۔ کیونکہ تمام معصیتوں اور گناہوں کی بازگشت خود خواہی، انانیت اور اللہ کی کبریائی کے مد مقابل آ کھڑا ہونے کی طرف ہے۔ جبکہ کبریائی ایسی رداء (چادر) ہے جو فقط ذات باری تعالیٰ کے لیے ہی سجتی ہے۔ تمام مخلوقات اسکے سامنے ذلیل و خوار ہیں۔ ابلیس نے قیوم و عظیم، کمال و جمال کے مالک، جلال و

فخاریت کے مالک رب تعالیٰ کے سامنے انانیت کا اظہار کیا کہ میں کچھ ہوں۔ اور یہ اعلان کیا کہ جس کے سامنے تو نے مجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے میں اس سے بہتر ہوں۔اس بیان سے ابلیس نے اللہ کی طرف جہالت کی نسبت دی ہے۔ اس میں تکبر ہے، غرور ہے،اپنے خالق پر اعتراض ہے۔ اس کے فرمان کو غلط قرار دینا ہے۔ یہ تکبر اللہ کے مد مقابل ہے نہ آدم پر بڑائی کا اظہار کیونکہ فرشتوں نے جو سجدہ آدم کا کیا تو انہوں نے آدم جس گیلی مٹی سے بنا تھا اس کا سجدہ نہ تھا، بلکہ اس کی روح کی شرافت اور انسانیت کا سجدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے سب پر ممتاز بنایا ہے کیونکہ اللہ نے اپنی روح کو (اپنی خاص مخلوق) اس جسد خاکی میں ڈال دیا۔ لیکن ابلیس نے کہا کہ آدم کی خلقت گیلی مٹی سے ہے اور اس کی خلقت آگ سے ہے۔ اس کا اصل مطلب اپنے رب کی شان میں تکبر تھا۔ اس نے اللہ کی کبریائی کو نظر انداز کیا۔ اس کی خود خواہی اور خود پرستی نے اس کی بصیرت والی آنکھ کو اندھا کر دیا کہ وہ یہ سوچ بیٹھا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ برتر کو کمتر کا سجدہ نہیں کرنا چاہیے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مخلوق روح کو اس پتلے میں ڈالا تھا جسے گیلی مٹی سے بنایا تھا اور ابلیس کو سجدہ کا حکم دیا۔ یہ ایسی شرافت اور منزلت ہے کہ جس کے سامنے سارے فرشتے جھک گئے جبکہ ابلیس نے اپنی ذات کو مستقل قرار دے دیا اور اپنے بڑے ہونے کا اعلان کیا اور خود کو برتر جانا، اس وجہ سے اس نے اللہ کے فرمان سے سرکشی کی اور اس کا تکبر اسے قدس کے مقام سے نیچے لانے کا سبب بنا۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

"اللہ نے کہا تو یہاں سے اتر جا، تجھے یہ لائق نہیں کہ یہاں تکبر کرے، پس نکل جا، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے"۔

ابلیس کا قدسیوں سے ہبوط

''ھبوط'' کا معنی کسی کا اس جگہ سے اتر جانا ہے جس پر وہ ہوتا ہے، یہ لفظ عام طور معنوی امور کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کوئی بلند اور اونچی شان والی جگہ سے پست اور کمتر شان والی جگہ پر اتر جائے۔ ''تکبر'' کا معنی ہے کہ کوئی خود کو دوسرے سے بڑا قرار دے اور دوسرے سے خود کو بلند تر و بہتر ظاہر کرے۔

یہ بات معلوم رہے کہ تمام مخلوقات اپنے خالق کے سامنے خاضع اور ذلیل ہیں، تمام شرافتیں اور بزرگیاں اللہ تک منتھیٰ ہوتی ہیں۔ فقط اللہ تعالیٰ کبیر، سبحان اور متعال مطلق ہے، کبریائی فقط اللہ کی شان ہے۔ کسی بندہ کی جانب سے تکبر کی دو صورتیں ہیں۔:۔

1۔ پسندیدہ تکبر، جو ایک لحاظ سے اللہ تک منتھیٰ ہوتا ہے جیسے اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں تکبر کرنا۔ اللہ کی بندگی پر افتخار ظاہر کرنا اور کافروں کو ذلیل و خوار سمجھنا۔ انہیں حقیر جاننا اور خود کو ان سے برتر قرار دینا یہ اللہ کی اطاعت میں ہے۔

2۔ ناپسندیدہ تکبر، یہ وہ تکبر ہے جو لوگوں کے اندر موجود ہوتا ہے کہ انسان خود کو بڑا تصور کرے، ناحق اپنی برتری ظاہر کرے، دوسرے مومن و مسلمان کو اپنے سے حقیر جانے۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ جو مقام اور مرتبہ اور بڑی شان آسمان میں اور بہشت میں ہے یا فرشتوں کے درمیان جو بڑا مقام اور بڑی مسند تھی اس سے اب تو نکل جا۔ اب یہ تیرا مقام نہیں رہا۔ جس میں دوبارہ واپسی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ شیطان اب صاغرین سے ہوگیا تھا۔ ''صاغر'' ذلیل و خوار کے معنی میں آتا ہے، یہ آخری جملہ اسی فرمان کی تاکید ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تو اس وقت جس بلند مقام پر تھا اس سے نیچے چلا جا۔ شیطان کا اپنے

سابقہ مقام اور منزلت سے نکلنا پستی میں جانے کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ نے اسکے تکبر کی سزا دی۔

قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۴﴾

"ابلیس نے کہا: مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے"۔

شیطان کا مہلت مانگنا

اس سزا کو سننے کے بعد ابلیس نے اللہ سے درخواست پیش کر دی کہ ٹھیک ہے اب جبکہ مجھے یہ سزا دے دی ہے تو پھر مجھے وقت معلوم تک مہلت دے دی جائے۔ "معلوم وقت" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سے سب انسانوں کے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا وقت مراد ہے اور شیطان نے اللہ تعالیٰ سے اس دن تک کی مہلت مانگ لی تاکہ انسان کو دنیا اور برزخ میں گمراہ کر سکے جو اس کی ذلت کا سبب بنا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست کو پورا قبول نہ کیا اسے فقط دنیا میں مہلت دی لیکن برزخ میں انسان کو گمراہ کرنے کی رسائی نہ دی۔ دنیا میں انسانوں پر اس کا جادو رہے گا لیکن برزخ میں اس کا اثر نہیں ہوگا۔

قَالَ اِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۱۵﴾

"اللہ نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی ہے"۔

ابلیس کی درخواست کی قبولیت

ابلیس نے مہلت مانگی تھی اس کی درخواست کا ایک حصہ قبول کر لیا گیا کہ جب تک انسان دنیا میں ہوگا اس وقت تک اسے انسان کو گمراہ کرنے کی مہلت دی جائے گی لیکن مرنے کے بعد برزخ میں اور دوبارہ اٹھائے جانے والے دن تک کی اس کی درخواست قبول نہیں کی

گئی۔اس جگہ فرمایا گیا ہے کہ اے ابلیس تم ان میں سے ایک ہو جن کو مہلت دی گئی ہے ۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابلیس کے علاوہ بھی کچھ ایسی مخلوقات ہیں جن کو مہلت دی گئی ہے لیکن اس کی یہ مہلت قیامت کے دن تک نہیں بلکہ ایک معلوم وعدہ گاہ تک ہے۔ لیکن یہ مہلت عالم برزخ کو شامل نہیں ہے کیونکہ عالم برزخ میں شیطان کے لیے راہ نہیں ہے اگرچہ اس نے قیامت کے دن تک مہلت مانگی تھی۔

اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۸۱﴾ (سورۂ ص، آیت: ۸۱)

ترجمہ: ''معین وقت کے دن تک۔''

قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۱۶﴾

''کہا جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا''۔

ابلیس کا گستاخانہ اعلان

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے مقام سے گرا دیا اور اسے ایک وقت تک کی مہلت دے دی۔جب اسے مہلت مل گئی تو اب اس میں مزید گستاخی کی جرأت پیدا ہو گئی۔ اس نے کہا کہ اب تو نے مجھے مہلت دے دی ہے تو میں اب اس کا بدلہ تیرے بندوں سے چکاؤں گا اور انہیں اغواء کروں گا اور ''اغواء'' عربی زبان میں کسی کو غلط راہ پر لگانا، دھوکہ سے کسی کو اپنے ٹھکانہ سے اٹھالینا یا کسی کو اس کی اصلی جگہ سے اٹھالینے کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ابلیس نے اسی طرح کہا کہ اے اللہ تو نے مجھے دھوکہ سے میرے مقام سے ہٹا دیا ہے اور پستی میں گرا دیا ہے، میری ضلالت کے اسباب تو نے بنائے ہیں جس سے میری ہلاکت و بربادی ہوئی ہے میرا مقام و منزلت ختم ہو گئی ہے تو میں بھی تیرے سیدھے راستہ پر کھڑا رہوں گا جو کوئی اس طرف آئے گا اسے دھوکہ سے منحرف کردوں گا تاکہ وہ تیری درگاہ تک نہ پہنچ سکے اور اس

طرح وہ سعادت سے محروم ہو جائے۔ صراط مستقیم پر بیٹھنے کا معنی یہ ہے کہ انسانوں پر نظر رکھوں گا جو بھی تیرے راستہ پر آنا چاہے گا اس کے دل و دماغ میں ایسے وسوسے ڈالوں گا کہ وہ اس راستہ سے منحرف ہو جائے گا اور میری طرح برباد ہوگا۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَ عَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ‌ؕ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾

''پھر ان کے پاس ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے آؤں گا، اور تو ان اکثر کو ان میں سے شکر گزار نہیں پائے گا''۔

ابلیس کا طریقہ واردات

پچھلی آیات میں بیان ہوا کہ ابلیس نے کہا میں صراط مستقیم کی نگرانی کروں گا جو بھی اس طرف آرہا ہوگا اسے دھوکہ سے اس راہ پر نہ آنے دوں گا اس کی مزید تفصیل اس طرح بیان کردی کہ میں آدم زادوں کے آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں ہر طرف سے گھروں گا، اے اللہ! اتنا ان کے پیچھے لگا رہوں گا کہ انہیں سیدھے راستہ سے باہر نکال دوں گا جس طرح تو نے مجھے اپنے دربار سے باہر نکال دیا ہے۔ اس جگہ جہات اور جوانب سے مراد معنوی جہات ہیں۔ اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ ابلیس اپنی پوری سعی صرف کرے گا کہ آدمی زادے کو اللہ کے راستہ پر نہ چڑھنے دے۔ سورۂ نساء آیت نمبر 120 میں ہے: يَعِدُهُمۡ وَيُمَنِّيۡهِمۡ‌ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲۰﴾ ''وہ انہیں وعدوں اور امیدوں میں الجھاتا ہے اور ان کے ساتھ شیطان کے وعدے بس فریب پر مبنی ہوتے ہیں''۔

''مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ'' سے وہ واقعات مراد ہیں جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں ان میں سے کچھ واقعات اس کی آرزوؤں کے مطابق ہوتے ہیں جبکہ بعض حالات و

واقعات اس کے لیے ناخشگوار ہوتے ہیں۔ شیطان ایسے مواقع پر انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرنے اور اس کی گمراہی کا سبب بنتا ہے۔

'' وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ '' سے انسان کی اولاد مراد ہے کیونکہ انسان اپنی اولاد کے حوالے سے بہت ساری خواہشات اور امیدیں رکھتا ہے۔ ان کی بقاء، ان کے روشن مستقبل اور ان کی سعادت وخوش بختی کو اپنی سعادت اور خوش بختی سمجھتا ہے اور ان کی تکالیف اور مصیبتوں کو اپنی تکلیف اور مصیبت سمجھتا ہے، اسی لیے انسان اپنی اولاد کے لیے ہر حلال و حرام کے راستے سے مال جمع کرنے پر لگا رہتا ہے۔ شیطان اس طریقہ سے اسے گناہ کے راستہ پر لے جاتا ہے جس سے اس کی ہلاکت کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔

'' وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ '' انسان کی دائیں جانب بابرکت ہے آدمی کی سعادت اور اس کا دین اس میں ہے۔ انسان کو شیطان دین داری کے راستہ سے روکتا ہے یا اس کے برعکس دین میں افراط اور بدعت گذاری پر لگا دیتا ہے۔

'' وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ '' بائیں جانب بے دینی اور انحراف سے کنایہ ہے، اس معنی میں کہ شیطان آدمی کے سامنے فحشاء اور برائیوں کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اسے گناہ کے ارتکاب پر ابھارتا ہے، وہ ایسے کام کرتا ہے کہ انسان نفسانی خواہشات کی پیروی کرے اور نفسانی خواہشات میں پھنسا رہے۔

ابلیس کی ان تمام حرکات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو اللہ کے شاکر بندے ہوں گے۔ دوسری آیات کو سامنے رکھ کر بھی یہ مطلب سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ ص آیت نمبر ۸۲۔۸۳ میں آیا ہے: قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۸۳﴾ ''کہنے لگا: مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکا دوں گا ان میں سے سوائے تیرے خالص بندوں کے''۔

''شٰكِرِيْنَ'' سے مخلصین مراد ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اللہ کی عبودیت میں خالص ہیں اللہ کے سواء ان کی توجہ کسی اور جانب نہیں ہے تو ان کے دلوں میں شیطان کے وسوسوں کی جگہ نہیں۔ یہ ایسے افراد ہیں جو حقیقت میں الٰہی نعمات پر شکر بجالانے والے ہیں۔ شاکرین کے وجود میں شکر مستقر ہو چکا ہے، چنانچہ وہ ہر نعمت کے ملنے پر منعم (انعام دینے والے کو) بھولتے نہیں۔ جو شخص اللہ کے سواء ہر چیز کو بھلا دیتا ہے تو وہ حقیقی شاکر اور مخلص ہے۔ اگر ہم شکر کے معنی کا جائزہ لیں تو اس کی بازگشت اخلاص کی طرف ہے۔ شیطان کا مخلصین کی جماعت کو استثناء کر دینا اس وجہ سے نہیں ہے کہ ابلیس ان پر مہربان ہو رہا ہے اور اسے ان پر ترس آگیا ہو۔ بلکہ اس نے مخلصین کو اس لیے استثناء کیا ہے کیونکہ ان پر اس کا بس نہیں چلتا اور وہ شیطان کے چال میں نہیں آئیں گے۔ اس بارے اللہ بھی فرماتا ہے کہ ''وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾'' اور میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی ہیں جو شاکر ہیں۔ (بہت کم شکر کرنے والے ہیں) یہ مقام افسوس ہے کہ انسان اللہ کی تمام تر نعمات سے بہرہ مند ہونے کے باوجود اللہ کا شاکر بندہ نہ بنے۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

''اللہ نے فرمایا: یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا، جو شخص ان میں سے تیرا کہا مانے گا میں تم سب کو جہنم میں بھر دوں گا''۔

شیطان کا مقام قرب سے نکالا جانا

"مَذْءُوْمًا" ذام کے مادہ سے ہے جو عیب دار ہونے کے معنی میں ہے، قابل مذمت ہونا۔ "مَّدْحُوْرًا" دحر کے مادہ سے ہے جو ذلت کے ساتھ دھتکارے جانے اور ذلت و اخواری کے معنی میں ہے۔ "لَمَنْ تَبِعَكَ"، میں "لام" کو قسم کے لیے لایا گیا ہے جواب قسم "لَاَمْلَـَٔنَّ" ہے۔ ابلیس نے کہا تھا کہ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ بنی آدم کو راہ مستقیم سے گمراہ کروں گا، انہیں عبادت اور شکر سے بہکاؤں گا جو ان کی غرض خلقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے کہ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ جو تیری پیروی کریں گے انہیں اور تجھے جہنم میں ڈالوں گا۔ اس میں ابلیس کے سارے پیروکاروں کی بجائے یہ کہا ہے کہ تم میں سے بعض کو جہنم میں ڈالوں گا، اس میں اللہ کا ترحم اور مہربانی کا عنصر شامل ہے کہ کچھ وہ ہوں گے کہ جنہوں نے ابلیس کی پیروی کی ہو گی لیکن پھر بھی شفاعت اور مغفرت کے وسیلہ سے جہنم میں جانے سے بچ جائیں گے۔ اس آیت میں واضح ہو گیا کہ ابلیس کو بلند مقام سے پستی کی طرف دھکیل دیا گیا ابلیس مقام قرب سے دھتکارا ہوا ہے۔

ابلیس ذلت اور خواری کی حالت میں مقام قرب سے نیچے آیا۔ ابلیس خود بھی جہنمی ہے اور اس کے پیروکاروں کی دو حالتیں ہیں کچھ تو وہ ہیں جو بخشش و مغفرت اور شفاعت کو نہ پا سکیں گے اور ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈالے جائیں گے اور کچھ ایسے گناہگار ہوں گے جنہیں

شفاعت نصیب ہو گی اور اس طرح وہ مغفرت و بخشش کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے اور جہنم جانے سے بچ جائیں گے یہ ان پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہوگا۔[1]

وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

”اور اے آدم! تو اور تیری عورت جنت میں رہو پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے“۔

جنت میں حضرت آدمؑ و حوا کی سکونت

اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا سے پیار اور محبت کا خطاب کیا کہ تم دونوں اس جنت میں رہ جاؤ اور یہاں کی تمام نعمتوں سے استفادہ کرو اور ہر قسم کی خوراک سے بہرہ مند ہو جاؤ۔ اور ایک مخصوص درخت کی نشاندہی کی گئی کہ اس کے قریب نہ جانا اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر تم نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور اس درخت کے قریب چلے گئے تو پھر تم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے اور تمہارا شمار ستمگاروں میں سے ہوگا۔

(مفسرین کا اس درخت کے بارے زیادہ اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس سے گندم کا پودا مراد تھا، بعض نے کہا انگور مراد تھا۔ بعض نے اسے معرفت یا حسد سے کنایہ قرار دیا ہے۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ معقول ہے وہ یہ ہے کہ شجرہ ممنوعہ سے مراد ارادہ اور اختیار ہے۔ معصیت انجام دینے پر قدرت رکھنا۔ حضرت آدمؑ اور حواء کو اس قدرت کے استعمال سے روکا گیا تھا کہ تم اپنے ارادہ کو معصیت کے لیے استعمال نہ کرنا۔

---

[1] ۔ بعض لوگ توبہ اور کچھ شفاعت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی وجہ سے جہنم جانے سے بچ جائیں گے۔ (مترجم)

فرشتوں اور انسان کے درمیان یہی فرق ہے کہ فرشتوں کے پاس معصیت کا اختیار نہیں ہے انہیں فقط نیک عمل انجام دینے کا اختیار ہے۔ آدم اور حواء سے کہہ دیا گیا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جاؤ اور جس بات سے منع کیا گیا ہے اگر اپنے اختیار سے اس کا ارتکاب کروگے تو یہ معصیت ہے اور جب معصیت کروگے تو پھر ظالموں میں سے ہو جاؤگے۔)

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

"پھر انہیں شیطان نے بہکایا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے، اور کہا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ کہیں تم فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ رہنے والے بن جاؤ"۔

شیطان کا بہکاوا

"فَوَسْوَسَ"، کسی امر کی طرف پنہانی طریقے سے اور چالاکی سے دوسرے کو مائل کرنے کو کہا جاتا ہے۔ "موارات" چھپانے کے معنی میں ہے، پردہ کے پیچھے لے جانا۔ "سَوْاٰتِهِمَا" سے وہ عضوء مراد ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ شیطان نے آدم اور حوا کے دل میں وسوسہ ڈالا اور چاہا کہ ان کی شرمگاہ کی بدصورتی کو جو کہ ان سے مخفی تھی اسے آشکار کیا جائے۔ وہ لباس سے باہر آجائیں اور ننگے ہو جائیں۔ شیطان نے ان کے دل میں یہ بات بٹھائی کہ اس درخت کے قریب جانے سے اللہ نے اس لیے روکا ہے کہ تم دائمی طور پر اس جنت میں رہائش پذیر نہ ہو سکو یا فرشتے نہ ہو جاؤ۔ گویا اس وقت آدم اور حوا کو یہ بات سمجھائی گئی کہ فرشتہ تم سے برتر ہے اور یہ بھی کہ آدم اور حوا جس جگہ ٹھہرے تھے

وہ دائمی نہیں تھے اس لیے انہیں یہ شوق پیدا ہوا کہ ہم فرشتے بن جائیں اور یہ بھی کہ ہم دائمی اس میں رہیں، لہٰذا ان سے اشتباہ ہوا اور شیطان کے بہکاوے میں آگئے۔[1]

(اس بیان سے واضح ہوا کہ جس جگہ آدم اور حوا کو ٹھہرایا گیا تھا اس جگہ ابلیس بھی موجود تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنت سے مراد ایک تو بہشت جاودانی نہیں کیونکہ ابلیس کو آسمان سے گرادیا گیا ہے، مقام قرب سے نیچے کردیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ جنت وہ نہیں تھی جس میں مومنین صالحین داخل ہوں گے اور پھر اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ حضرت آدم و حوا کو بھی معلوم تھا کہ یہ جگہ ان کی عارضی رہائش کے لیے ہے، دائمی نہیں اس لیے انہیں دائمی رہائش کی فکر ہوئی اور شیطان کے کہنے پر شجرہ ممنوعہ کے قریب چلے گئے۔ایسا نہیں کہ ابلیس نے پہلے حوا کو آمادہ کیا ہو اور پھر آدم کو بلکہ دونوں کو اکٹھا بہکایا۔دونوں سے بات کی۔ کیونکہ وہ دونوں اکٹھے رہتے تھے اور پھر اس کی بات کو مان کر شجرہ ممنوعہ کے پاس دونوں چلے گئے اور اس کے بعد والے مراحل سے گذرنا پڑا جن کا تذکرہ بعد والی آیات میں کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ پہلے حضرت حوا کو بہکایا ہو اور حضرت حوا نے شیطان کے کہنے پر حضرت آدمؑ کو بہکایا ہو)۔ (اردو مترجم)

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾

''اور ان کے روبرو قسم کھائی کہ یقین کریں میں تمہارا خیرخواہ ہوں''۔

---

[1] ۔ شجرہ ممنوعہ کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے گندم اور بعض نے اسے انگور کا درخت اور کچھ نے اسے معرفت یا حسد سے کنایہ مراد لیا ہے۔ لیکن اس بارے سب سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ اس سے ارادہ اور اختیار مراد لیا جائے، یعنی گناہ انجام دینے کی قدرت۔ یہ امر فرشتوں اور انسان کے درمیان مابہ امتیاز ہے۔ (مترجم)

ابلیس کا آدمؑ و حوا کو دھوکہ دینے کا طریقہ

ابلیس نے جب حضرت آدمؑ اور حواء کو یہ کہا کہ تم اس درخت کے قریب جاؤ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ اس کے کھانے سے تم فرشتے ہو جاؤ گے یا تم ہمیشہ کے لیے جنت الفردوس میں رہ پاؤ گے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواء نے اس کی بات کو فوراً قبول نہیں کیا اس لیے اس نے قسمیں اٹھا اٹھا کر انہیں یقین دلایا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ یہ ہر ابلیس کا طریقہ ہے کہ جب بھی وہ انسان کو اللہ کا نافرمان بنانا چاہتا ہے تو بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں، بڑے بڑے سبز باغ دکھاتے ہیں، جب بات نہ مانی جائے تو اپنی بات منوانے کے لیے قسمیں اٹھاتے ہیں۔ اس طرح حضرت آدمؑ اور حضرت حوا نے ابلیس کی بات کو مان لیا۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

"پھر انہیں دھوکہ سے مائل کر لیا، پھر جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور اپنے اوپر بہشت کے پتے جوڑنے لگے، اور انہیں ان کے رب نے پکارا کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہیں کیا تھا اور تمہیں کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

ابلیس کی دھوکہ دہی میں کامیابی

ابلیس اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس نافرمانی کا نتیجہ کیا ہو گا۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواء دونوں اس کے جھانسے میں آگئے اور اپنی جگہ سے اٹھے اور اس درخت کے قریب چلے گئے۔اس درخت کی نشاندہی بھی خود شیطان نے کی اور انہیں درخت کے قریب لے گیا۔

''غُرُوْرِ'' کا معنی ہے دوسرے کے لیے خیر خواہی کا اظہار کرنا لیکن باطن میں اس شخص کو نقصان پہنچانے کا قصد کرنا۔

''خصف'' اکٹھا کرنا اور منظم کرنے کے معنی میں ہے۔

جب حضرت آدم اور حضرت حواء اس درخت کے قریب گئے اور اس سے کچھ لے کر کھالیا تو ان کی شرمگاہ آشکار ہو گئی، جیسے ہی انہوں نے خود کو ننگا دیکھا تو بہشتی پتوں کو اکٹھا کرکے انہیں بڑی ترتیب سے اپنے جسم پر چپکانا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان کے جسم پر کرامت و شرافت کا لباس موجود تھا۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو ان کے جسم سے وہ لباس اتر گیا اور وہ دونوں خود کو بے لباس دیکھ کر شرمندہ ہوئے لہٰذا اپنے بدن کی ستر پوشی کے لیے بہشتی درختوں کے پتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ابلیس اس منظر کو دیکھ کر خوشحال تھا کہ اس نے پہلی کامیابی حاصل کر لی اور حضرت آدمؑ اور حوا سے اللہ کی نافرمانی کروادی۔

آدمؑ و حوا کو اللہ کی نداء

اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے حضرت آدمؑ اور حضرت حواء مقام قرب الٰہی سے دور ہو چکے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو نداء دیتے ہوئے خطاب کیا جو کہ دور سے کسی کو بلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور فرمایا کہ تم نے یہ کیا کر دیا؟ اسی لئے اسم اشارہ ''

تِلْكُمَا" استعمال کیا جو دور کے لیے ہے۔اور کہا کہ کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا اور تمہیں نہیں بتا دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر تم نے اس کی بات کیوں مان لی اور کیوں میرے فرمان کی مخالفت کی ؟اس نداء میں سرزنش بھی ہے اور اظہار ناراضگی بھی اور حضرت آدمؑ و حوا پر احتجاج بھی ہے اور ان کے غلط اقدام کی ملامت بھی ہے۔[1]

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

"ان دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے"۔

آدمؑ اور حوا کی اللہ سے معافی کی درخواست

جب اللہ کی طرف سے آدمؑ و حوا کو ندا دے کر سرزنش کی گئی تو فوراً آدم و حوا نے ملکر اللہ کے حضور امر ارشادی کی مخالفت کا اعتراف کیا اور کہا کہ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا ہے۔ تیرے حکم کی نافرمانی سے ہم نے اپنے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اب ہمارے اس جرم کی ہمیں معافی دے دیں، اپنی مغفرت ہمارے اوپر قرار دے۔ ہمیں اپنی رحمت سے نواز دے۔ کیونکہ اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہمارے اوپر رحمت نہ فرمائی تو ہم خسارہ میں ہوں گے۔ اس بیان سے ایک اور امر واضح ہوتا ہے کہ نافرمانی کی صورت میں مرد اور عورت دونوں کے لیے

---

[1] ۔ اس بیان سے یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ کا خطاب دونوں کو تھا۔ حکم دونوں کے لیے تھا۔ دونوں کو شیطان نے گمراہ کیا تھا۔ جبکہ تورات میں گمراہ ہونے کی نسبت حضرت حوا کی طرف دی گئی ہے۔ (مترجم)

سزا بھی برابر ہے۔ اور دونوں کے لیے ثواب بھی برابر ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو برتری حاصل ہے تو وہ عمل کی بنیاد پر ہے۔ تکالیف دونوں کے لیے ہیں اس مطلب کو ان آیات سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ ابلیس حوا کے ذریعے آدم کے پاس آیا اور پہلے جناب حوا علیہا السلام کو فریب دیا اور پھر حضرت آدمؑ کو تو یہ بات غلط اور خلاف حقیقت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دونوں نے مل کر معافی کی درخواست کی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں نے ملکر خطاء کی تھی۔ اور دونوں مستقل طور پر آزاد تھے کہ وہ ابلیس کی بات مانیں یا نہ مانیں ۔دونوں نے اپنے ارادہ اور اختیار سے ابلیس سے دھوکہ کھایا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی خطاء کا ذمہ دار نہ تھا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

"اللہ نے فرمایا: یہاں سے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک وقت تک نفع اٹھانا ہے"۔

اللہ کا آدمؑ و حوا کے لیے نیا فرمان

حضرت آدم اور حضرت حوا نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے لیے اپنا نیا فرمان جاری فرمایا۔ یہ خطاب ابلیس کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ تینوں اکٹھے وہی تھے۔ ایسے کہا گیا ہے کہ مقام قرب سے جب شیطان کو نیچے پھینکا گیا تو وہ برزخی جنت میں آیا اور حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو بھی برزخی جنت میں سکونت دی گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کو زمین پر لانے کے لیے مقدمہ تھا۔ بہر حال ان سے کہا گیا کہ اب تم نے زمین پر رہنا ہے زمین پر ایک دوسرے سے دشمنی بھی کروگے،

لڑائی جھگڑے بھی ہوں گے، تم نے زمین پر ہی مرنا ہے، وہی پر ہی جینا ہے اور مرنے کے بعد تمہیں اسی زمین سے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ ایک معین عرصہ تک تم دنیاوی زندگی میں زندہ رہوگے۔ ابلیس اور آدم و حوا کا اختلاف اور دشمنی کا آغاز ہو چکا تھا اور زمین پر بھی اس دشمنی نے برقرار رہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کی خبر دے دی اور بتادیا کہ یہ اختلاف ان کی طبیعت میں موجود ہے۔ یہ فیصلہ اللہ کی جانب سے ہے۔ آدمؑ و حوّا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ زمین ان کے لیے مستقر اور سکونت کی جگہ ہے۔ برزخی جنت سے زمین پر ھبوط (اترنا) معنوی ھبوط تھا۔ فقط ایسا نہیں تھا کہ آسمان سے زمین پر اتار دیا گیا ہو بلکہ ان تینوں کا جو مقام اوپر تھا اس مقام سے نیچے آگئے تھے تاکہ اپنے اختیار سے کمالات حاصل کرکے پھر اپنے پہلے والے مقام تک پہنچ جائیں۔

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝٢٥

”(اللہ نے) فرمایا تم اسی میں زندہ رہوگے اور اسی میں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤگے“۔

زمین پر رہنے کی تفصیل

اللہ تعالیٰ کا تیسرا فیصلہ یہ تھا کہ قیامت تک اس نے انسان کو خاک نشین کیا ہے۔ اس عبارت میں خطاب فقط آدم اور حوّا علیہما السلام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے فرزندان بھی شامل ہیں۔ نوع انسان کو خطاب ہے۔ کیونکہ اگر یہ خطاب حضرت آدمؑ و حضرت حوا علیہما السلام کیساتھ ابلیس کو بھی شامل ہوتا تو اس جگہ دوبارہ ”قال“ کہنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سابقہ بیان ہی کافی تھا اور یہ قیامت تک خاک نشینی اسی فیصلے کا حصہ قرار پاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے لیے قیامت تک کے لیے مہلت نہیں ہے بلکہ وقت معلوم تک مہلت ملی ہے جیساکہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ برزخی زندگی میں اسکا تسلط نہیں ہے۔ (بعض نے کہا

ہے کہ وقت معلوم سے مراد آخری زمانہ میں اللہ کے ولی حضرت امام مہدی علیہ السلام کی روئے زمین پر حکومت کا وقت مراد ہے جس میں ظلم و ستم کا خاتمہ ہوگا، گناہ کا خاتمہ ہوگا اور پوری زمین پر عدل الٰہی کا قیام ہوگا۔ ان کے دور حکومت میں ابلیس ہلاک ہو گا اور پھر قیامت آئے گی۔ (واللہ العالم)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٢٦﴾

''اے آدم کی اولاد ہم نے تم پر پوشاک اتاری جو تمہاری شرم گاہیں ڈھانکتی ہے اور آرائش کے کپڑے بھی اتارے، اور پرہیزگاری کا لباس تو وہ سب سے بہتر ہے، یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں''۔

انسانوں پر اللہ کا احسان

''لباس'' مصدر ہے اور اس جگہ اس سے ایسی چیز مراد ہے جس میں بدن کو چھپانے کی صلاحیت موجود ہو۔ ''ریش'' سے ہر وہ پوشش اور لباس مراد ہے جو زینت اور حسن و جمال اور خوبصورتی کا سبب ہو۔ اس لحاظ سے کہ ہر امر جو عالم غیب سے عالم شہود و محسوسات میں اترتا ہے اس کی خلقت کو انزال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لباس کے اصلی مواد و میٹریل کو ہم نے خلق کیا ہے جس سے انسان اپنے بدن کی پردہ پوشی کر سکتا ہے، اسے ڈھانپ سکتا ہے، اسی طرح وہ لباس جو زینت، بناؤ سنگھار کا وسیلہ ہے اس کا مواد بھی ہم نے خلق کیا ہے تاکہ یہ لباس تمہاری ظاہری ناپسندیدہ کیفیات کو چھپا دے۔ بہر حال لباس بدن کے ظاہری اور بیرونی عیوب کو چھپاتا ہے۔

تقویٰ کا لباس

بدن کی ظاہری ستر پوشی کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کے باطن کی ستر پوشی کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے فرمایا ہے کہ تقویٰ کا لباس جس سے انسان کی باطنی اور اندرونی خرابیاں، عیوب چھپتی ہیں، وہ بہتر ہے کیونکہ تقویٰ سبب بنتا ہے کہ انسان کے گناہ اور رذائل ، کمینگیاں چھپ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ ظاہری اور باطنی لباس دونوں کا ذکر کرکے متوجہ کر رہا ہے کہ باطنی لباس انسان کو شرک اور گناہ جو اس کی رسوائی کا سبب بنتا ہے اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور اس کی اہمیت بتائی ہے کہ دنیاوی اعتبار سے، ظاہری بدن کا بے پوش ہونا انسان کے لئے رسوائی ہے لیکن یہ عارضہ قابل برداشت ہے لیکن شرک وگناہ اور معصیت کی رسوائی جو قیامت کے دن منظر عام پر ہونی ہے وہ بہت بڑی اور انمٹ ہے لہٰذا جو لباس اس رسوائی سے بچالے تو وہ ظاہری لباس سے یقیناً بہتر ہے اور وہ تقویٰ ہے یعنی اللہ کے اوامر اور نواہی پر عمل کرنا اور اللہ کی معصیت کا ارتکاب نہ کرنا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

"اے آدم کی اولاد تمہیں شیطان نہ بہکائے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو بہشت سے نکال دیا ان سے ان کے کپڑے اتروائے تاکہ تمہیں ان کی شرمگاہیں دکھائے، وہ اور اس کی قوم تمہیں دیکھتی ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے، ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے"۔

شیطان کے دھوکے کا خطرہ

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو واضح بتادیا کہ دیکھو:

- شیطان تمہارا دشمن ہے۔
- شیطان نے تمہارے باپ اور تمہاری ماں کو جنت سے باہر نکالا۔
- انہیں ان کے بدن پر جو پوشش تھی اس سے عریاں کر دیا اور ان پر ان کے بدن کے وہ حصے ظاہر ہوگئے جن کے ظاہر کرنے سے انسان شرم محسوس کرتا ہے۔

لہٰذا تم اس سے چوکنا رہو کیونکہ وہ ایسی جگہ سے تم پر چڑھائی کرے گا جس سے تم آگاہ نہیں ہو اور وہ تمہیں معصیت اور میری نافرمانی پر اکسائے گا تاکہ تمہیں تقویٰ کے لباس سے عاری کر دے۔ جب تقویٰ کا لباس تمہارے معنوی بدن پر نہ ہوگا تو تمہارے عیوب وگناہ کھل کر سامنے آجائیں گے اور تمہاری رسوائی کا سبب بنیں گے۔ لہٰذا خود کو رسوائی سے بچانے کے لئے شیطان سے چوکنا رہو۔ شیاطین ان لوگوں کے سرپرست اور دوست ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کو تسلیم نہیں کیا تو اللہ فرماتا ہے ہم نے ان کا سرپرست شیطان کو قرار دیا ہے۔

آدمؑ وحوا کے لباس اُتارے جانے کا مطلب

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہ السلام کے تن سے لباس کو اُتارے جانے کا بیان تمثیل ہے کہ ان کے لباس کے اترنے سے ان کے عیوب ظاہر ہوگئے۔ کیونکہ جب تقویٰ کا لباس آدم زاد سے شیطان اپنے دھوکہ سے چھین لے تو ان کے گناہ اور عیوب نمایاں ہو جائیں گے اور وہ رسوا ہوں گے۔ جب تک انسان شیطان سے دھوکہ نہ کھائے تو وہ سعادت کی بہشت میں موجود رہے گا لیکن جیسے ہی وہ شیطان کا فریفتہ ہو جائے اس سے دھوکہ کھا جائے تو

اللہ اسے سعادت کی بہشت سے نکال دے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کا فتنہ انسان کو اس کی منزلت و کرامت سے نکال دیتا ہے۔

شیطان اور اس کے اعوان و انصار

شیطان اور اس کے اعوان و انصار اور چیلے اپنی طبیعت کی خباثت اور بدکاری کے لحاظ سے ایسے انداز میں انسان کے قریب ہوتے ہیں اور اسے اس طرح دھوکہ دیتے ہیں کہ خود انسان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اس بات پر زور دے کر انسان کو سمجھایا ہے گیا ہے کہ ابلیس کے فتنوں سے بچنے کے لیے بہت زیادہ دقت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انسان اپنے سوا کسی کو نہیں پہچانتا کہ جو اسے شر کی دعوت دے رہا ہوتا ہے اور اسے شقاوت کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ شیطان اور اس کے اعوان و انصار بڑی چابکدستی اور باریک بینی سے دھوکہ دیتے ہیں کہ انسان کو سمجھ ہی نہیں آتا۔ اس لئے شیطان سے بچو اس کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ شیطان کی ولایت اور اس کی انسان کو گمراہ کرنے کی قدرت اس حد تک ہے کہ وہ انسان کو برائی کی طرف بلاتا ہے۔ اگر انسان اس سے دھوکہ کھا جائے تو شیطان اس پر غلبہ کرتا ہے اور اس میں تصرف کرتا ہے۔ پھر جیسے چاہے اسے گھماتا ہے۔ لیکن معلوم رہے شیاطین کا ایسا کنٹرول اور تسلط فقط ان پر ہے جو اہل ایمان نہیں۔ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ جس کا اللہ پر ایمان ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں مانتا، اللہ ہی کو سب کچھ مانتا ہے وہ غیر اللہ کی پیروی نہیں کرتا، جیسا کہ اللہ نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔: اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ ﴿۴۲﴾ ”جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالادستی نہ ہو گی سوائے ان بھکے ہوئے لوگوں کے جو تیری پیروی کریں گے“ (سورہ حجر، آیت: ۴۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو اپنے بندوں پر

غلبہ اور تسلط دیا ہے لیکن جو اللہ کے خالص بندے ہیں، مومن ہیں تو وہ شیطان کے اختیار میں نہیں ہیں اور شیطان انہیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

"اور جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اسی طرح اپنے باپ دادا کو کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے بھی ہمیں یہ حکم دیا ہے، کہہ دو بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، اللہ کے ذمہ وہ باتیں کیوں لگاتے ہو جو تمہیں معلوم نہیں"۔

انسان کی اپنے جرائم کے لیے عذر تراشیاں

اس جگہ اللہ تعالیٰ کا خطاب عمومی حالت سے رسول اللہ ﷺ کی جانب منتقل ہوا ہے اور فرمایا ہے کہ نافرمان انسان جب برائی انجام دیتے ہیں تو اپنے اس برے عمل کے لیے جواز پیش کرنے کے لئے دو عذر پیش کر دیتے ہیں پہلا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے آباء و اجداد کو اسی طرح کے اعمال انجام دیتے ہوئے پایا تو ہم نے ان کی پیروی کی اور یہ اس لئے کہا کہ خود اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ تم اپنے آباء و اجداد کی اطاعت کرو۔

ان نافرمانوں کی اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیا اللہ برائی کا حکم دیتا ہے؟ اللہ تو برے کام سے روکتا ہے، وہ اسی کام کے کرنے کا حکم کیسے دے گا؟ تم اللہ کی طرف کس طرح کی غلط اور جھوٹی نسبت دے رہے ہو؟ البتہ یہ پہلا مقام نہیں جہاں مجرموں کے اس عذر کا جواب دیا گیا ہے بلکہ سورہ البقرۃ، آیت ۱۷۰ میں بھی فرمایا: ترجمہ: "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے

اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے، خواہ ان کے آبا و اجداد نے نہ کچھ عقل سے کام لیا ہو اور نہ ہدایت حاصل کی ہو۔"

اس جگہ مجرموں کے پہلے عذر کا جواب دیا ہے کہ تم کس طرح اپنے آباء کی پیروی کرتے ہو اگرچہ وہ بے عقل اور غیر ہدایت یافتہ ہوں۔ جبکہ اس آیت میں ان کی دوسری بات کا جواب دیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آباء واجداد کی پیروی کا حکم ہمیں اللہ نے دیا تو اللہ نے فرمایا کہ تم یہ کیسی بات کرتے ہو کیا اللہ ایک کام سے منع کرکے پھر اسی کے کرنے کا حکم دے گا؟ اللہ تعالیٰ فاحشہ، بدی اور برائی کا حکم نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ اسی کا حکم دیتا ہے جو صحیح اور اچھا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں "فَاحِشَةً" سے اس بری رسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھی کہ لوگ ننگے (مادر زاد) ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ یہ رسم فتح مکہ تک جاری تھی۔ البتہ فحشاء کا کلمہ مطلق ہے تو اس کا انطباق ہر برے عمل پر ہو سکتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت میں حسن و قبیح کے عقلی ہونے کے خلاف جو شبہ ڈالا جاتا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اچھا وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اچھا کہا ہے اور برا وہ ہے جسے اللہ برا کہہ دے جبکہ اللہ نے اس جگہ فرمایا ہے اللہ قبیح و فاحشہ اور برے عمل کا حکم نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک برائی ہے جسے ہر انسان سمجھتا ہے لہٰذا فرمایا اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا۔ اسی طرح انسان کو اچھائی کا پتہ ہے تو وہ اسے اچھائی کا حکم دیتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اللہ کا جو بھی حکم ہے وہ اچھائی ہوتی ہے اور جس سے روکے تو روکنے سے وہ برائی ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ برائیوں "فحشاء" کا حکم نہیں دیتا؛ جس طرح اللہ تعالیٰ نے جب شجرہ ممنوعہ کے قریب جانے سے روکا تو وہ بھی فحشاء تھا تو اس سے روکا تھا لہٰذا ان کا یہ قول افتراء ہے

جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں اس کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝۲۹

''کہہ دو میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے، اور ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے کرو اور اس کے خالص فرمانبردار ہو کر اسے پکارو، جس طرح تمہیں پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ پیدا ہوگے''۔

عدل پر مبنی اللہ کے احکام

پچھلی آیت میں جو ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فحشاء کا حکم نہیں دیتا، یہ بیان اسی کے تسلسل میں ہے کہ اللہ جو حکم دیتا ہے وہ عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ ''قسط'' حد وسط اور میانہ روی کے معنی میں ہے۔ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس فحشاء سے روکا ہے وہ حد وسط سے منحرف ہونا اور افراط یا تفریط تھا۔

''قسط'' عادلانہ رویہ اپنانے، انصاف کرنے، اور جور کے معنی میں بھی ہے اسی طرح دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے معنی میں بھی ہے۔ اس بناء پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا: میرا رب میانہ روی کا حکم دیتا ہے لہٰذا تمہیں بھی میانہ رو ہونا چاہیے۔ اپنے رُخ کو ہر مسجد کی جانب پھیرو کہ جس جگہ اللہ کی عبادت کی جاتی ہے؛ اسے دین میں رہتے ہوئے اخلاص کی حالت سے پکارو۔ اللہ کے علاوہ ان معبودوں کی پرستش مت کرو، جن کی پرستش تمہارے آباء واجداد کرتے تھے۔ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دو اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور غیر اللہ کی جانب توجہ نہ دو۔ اللہ کے سواء ہر شئی سے انقطاع کامل کر لو۔ اللہ کے سواء ہر شئی سے غافل ہو کر اللہ کے آگے جھکو۔ اللہ کو اس طرح اخلاص سے پکارو کہ غیر اللہ کا تصور

تک نہ ہو کیونکہ تم سب نے اللہ کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔ جس طرح اللہ نے تمہیں آغاز میں خلق کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں مارنے کے بعد دوبارہ اٹھائے گا۔

(سورہ الانعام، آیت: ۹۴) ''اور لو آج تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آگئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھ رہے ہیں جن کے بارے میں تمہارا یہ خیال تھا کہ وہ تمہارے کام بنانے میں تمہارے شریک ہوں گے، آج تمہارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے اور تم جو دعوے کیا کرتے تھے وہ سب ناپید ہو گئے'' اپنی ابتدائی خلقت کو یاد رکھو جب تم کچھ نہ تھے تو ہم نے تمہیں خلق کیا اسی طرح جب تم مار دیئے جاؤ گے تو پھر دوبارہ تمہیں ہم ہی واپس لائیں گے، تم میں سے ہر ایک ہمارے پاس آئے گا۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

''ایک جماعت کو ہدایت دی اور ایک جماعت پر گمراہی ثابت ہو چکی، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست بنایا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں''۔

آخرت میں انسانوں کے دو گروہ

جس طرح خلقت کی ابتداء میں دو گروہ تھے ایک ابلیس اور دوسرا گروہ انسان۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی دو گروہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اپنے تمام معاملات میں میانہ رو رہو اور خود کو اللہ کے لئے خالص کر دو تاکہ تم ہدایت یافتہ گروہ سے قرار پاؤ۔ اس گروہ سے نہ بنو جن کی گمراہی حتمی ہے، ان کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے شیاطین کی پیروی کی اور شیاطین کو اپنا سرپرست بنالیا اور جو بھی شیاطین کو اپنا سرپرست

قرار دے اور ان کی راہنمائی میں اپنے اعمال انجام دے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کے بارے فرمایا ہے:

وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ (سورہ حج، آیت: ۹)

"اس کے لیے دنیامیں خواری ہے اور قیامت کے روز ہم اسے آگ کا عذاب چکھائیں گے"

غیر ہدایت یافتہ کا خود کو ہدایت یافتہ خیال کرنا

غیر ہدایت یافتہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں؛ یہ جملہ عطف تفسیری ہے، یہ سمجھایا جارہاہے کہ جب انسان باطل کا راستہ اپنالیتاہے اور حق سے دُور ہو جاتا ہے جب تک حق کی حقانیت کا اعتراف تھا اور اس اعتراف کو بھلایا نہیں تو اس میں حق کی طرف پلٹنے کی اُمید ہوتی ہے۔ حق ہونے کو باطل سمجھ لے اور یہ خیال کرے کہ ہدایت یہی ہے تو اس صورت میں وہ گمراہی میں ہی پڑا ہوتا ہے تو اس کی گمراہی حتمی ہے۔اس کی کامیابی کی اُمید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ جب انسان گمراہ ہو جائے تو اس وقت وہ فطرت سے انحراف کر چکا ہوتا ہے اپنے ہوائے نفس کو معبود قرار دے دے عدل اور عالم ملکوت سے چشم پوشی کرلے۔ زمین اور مادی دُنیا سے دل وابستہ کرلے اور دُنیا کے جھوٹے بتوں کی زینت سے دھوکہ میں آچکے اور وہ دھوکہ دینے والے زائل ہونے والے متاع سے دھوکہ کھا جائے تو اس کے لئے خسارہ ہے، رسوائی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱

"اے آدم کی اولاد تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ اور پیؤ اور حد سے نہ نکلو، بے شک اللہ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

مساجد میں اچھا لباس پہننا اور اسراف سے منع

مساجد میں جب حاضر ہوں تو اپنی زینت و زیبائش کو لے کر آؤ۔ اس زینت سے جہاں ظاہری زینت و آرائش مراد ہے وہاں پر باطنی اور معنوی آرائش بھی مراد ہے جو نماز، طواف کعبہ اور دوسری عبادات میں موجود ہونی چاہیے۔ یہ آیت عید کی نماز، یومیہ نمازوں، نماز ہای جماعت اور دیگر عبادات کی کیفیات کو شامل ہے کہ ہر ایک کی مناسبت سے زینت کرکے عبادت کرنا ہوگی۔ بعد والے دو جملوں میں دو امر اِباحی اور ایک نہی تحریمی ذکر ہوئی ہے۔ امر کھانے اور پینے کے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کھانے پینے کی اجازت دی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک نہی فرمادی ہے کہ کھانے پینے میں اسراف اور زیادہ روی نہ کرو۔ کھانے پینے کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ روی کرنے والے اور اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ امر و نہی حضرت آدمؑ و حوّا کی اس داستان کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں جب وہ بہشت میں تھے اور وہ اس جنت سے سب کچھ استعمال کر سکتے تھے فقط ایک درخت کے قریب نہیں جانا تھا۔ اب زمین پر انسان سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری روزی کا انتظام اس زمین میں کر دیا گیا ہے تم نے اس پر ایک معین مدت تک رہنا ہے۔ تمہیں اس زمین پر کھانے پینے کی کھلی اجازت ہے لیکن اس میں میانہ روی رکھنا ہے، اسراف سے اجتناب کرنا ہے۔ تمام انسان اس خطاب میں مد نظر ہیں کسی ایک دین یا مسلک والوں کو مخاطب قرار نہیں دیا، اس سے نوع انسان مراد ہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

"کہہ دو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی ہے اور کس نے کھانے کی ستھری چیزیں (حرام کیں)، کہہ دو دنیا کی زندگی میں یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے لیے ہیں قیامت کے دن خالص ان ہی کے لیے ہو جائیں گی، اسی طرح ہم آیتیں مفصل بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں"۔

ایمان لانے والوں کا اعزاز

"زِین" کا لفظ "شین" کے مقابل آتا ہے۔ زینت اسے کہتے ہیں جو عیب اور نقص کو دُور کرے۔ اس آیت میں استفہام، استفہام انکاری ہے۔ زینت کے اخراج سے زینت کا اظہار مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور الہام سے فطری طور پر انسان کی سرشت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ انواع و اقسام کی زینتیں استعمال کریں تاکہ اسے معاشرہ میں پسندیدہ بنائے اور دلوں کے اس کی طرف مائل ہونے کا سبب بنیں۔ اسی طرح لوگوں کی نفرت کو خود سے دُور کرے۔ کیونکہ انسان انفرادی طور پر زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ اجتماع اور مشترکہ زندگی گزارتا ہے لہٰذا حتمی طور پر اس کا ارادہ، کرامت، مجبوری، رضایت اور ان جیسے امور سے خواہ مخواہ پالا پڑتا ہے کہ کچھ کو پسند کرتا ہے اور کچھ کو ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے غیبی الہام کے وسیلہ سے اس کی فطرت میں یہ تعلیم دے دی ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی اصلاح کی طرف توجہ کرے، اپنے عیبوں کو دُور کرے، خود کو زینت دے۔ اللہ تعالیٰ نے زینت کرنے کو حلال اور جائز قرار دیا ہے۔

"طیب" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کی طبیعت کے مناسب ہو۔ اس جگہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے آدمی اپنی زندگی اور اپنی بقاء کے لیے مدد لیتا ہے۔ اس میں انسان اِفراط و تفریط نہ کرے کیونکہ غذا کے استعمال میں زیادہ روی جسمانی بیماریوں کا سبب بنتی ہے،

دوا کی ضرورت ہو گی، جس وجہ سے بدن میں فاسد مواد پیدا ہو جائیں گے اور فکر بھی فاسد ہو جاتی ہے لہٰذا ان ارزاق اور روزیوں کے مباح ہونے میں فطرت ہی قوی ترین انگیزہ ہے۔ کیونکہ اِفراط و تفریط معاشرہ کے اجتماعی ستونوں کو توڑنے کا ذریعہ بنے گا اور انسان کی زندگی میں فساد رونما ہو گا۔ یہ بظاہر سادہ دستورات انسان کی سعادت اور سلامتی کی بنیاد ہیں۔ غذا میں اگر تفریط ہو گی تو بدن کو ضروری غذا مہیا نہ ہو گی جس سے بدن بیمار ہو گا اور اس کی فکر فاسد ہو جائے گی۔ اسی طرح کھانے پینے میں افراط بھی بدن میں مختلف قسم کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔

مومن اور کافر کا امتیاز

دُنیا میں کافر اور مومن تمام دُنیاوی نعمات سے برابر فیضاب ہوتے ہیں، ہر شخص اپنی استعداد اور قابلیت سے جتنا چاہے ان نعمات کو اپنے استعمال میں لاتا ہے لیکن جب قیامت ہو گی تو وہ دن مومنوں کے لئے خاص ہے۔ وہاں پر اللہ کی دی ہوئی نعمات سے فقط مومنین ہی فیضیاب ہوں گے۔ کافروں کو ان نعمات سے کچھ بھی نصیب نہ ہو گا کیونکہ اُخروی زندگی دُنیاوی زندگی کی مانند نہیں ہے کہ اس میں سب انسان من حیث الانسان شریک ہوں بلکہ جو دُنیا میں اللہ پر ایمان لایا، صحیح عقیدہ اختیار کیا تو قیامت کے دن اس کے لئے ساری نعمات وافر مقدار میں دی جائیں گی۔ اس کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے اہل علم پر اپنے احسان کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم تو اہل علم کے لئے اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ، ایک ایک کرکے بیان کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل علم ہی بات کو سمجھتے اور حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الۡاِثۡمَ وَ الۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ اَنۡ تُشۡرِکُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

''کہہ دو میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ، اور ہر گناہ کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو بھی، اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ پر وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزیں

''فَوَاحِشَ'' ایسے گناہ جو اپنی برائی اور گھٹیا پن کی انتہاء پر ہوں جیسے زنا، لواط۔

اور ''اثم'' سے مراد وہ گناہ ہیں جو پستی، انحطاط، ذلت اور زندگی میں سقوط کا ذریعہ بنتے ہیں جیسے شراب خوری، جواء کھیلنا۔

فاحشہ آشکار سے مراد زنا اور لواط جیسے جرائم کا ارتکاب ہے جنہیں علنی طور پر انجام دیا جائے۔ اور فاحشہ باطنی سے مراد پوشیدہ عشق بازی اور ایسے جرائم مراد ہیں جنہیں چھپ کر کیا جائے جیسے چھپ کر زنا کرنا۔

''بغی'' سے ایسا ظلم و زیادتی مراد ہے جس میں ایک شخص کسی سے ایسی چیز کا مطالبہ کرے جو اس کا حق نہیں ہے، جو کسی اور کا ملک ہے۔ ''بغی'' کے ساتھ غیر الحق کی قید اس عنوان سے لگا دی گئی ہے کہ یہ قید اس عنوان کا لازمہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغی کی دو قسمیں ہوں ایک قسم حق ہو اور دوسری قسم ناحق۔

جس طرح شرک کی تقلید کے بارے بیان ہوا کہ (مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا) کہ جس کے لئے کوئی دلیل نہیں اُتری۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی تقلید بھی ہے جس کے بارے دلیل موجود ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم جس تقلید کا سہارا لے کر اللہ کا شریک قرار دے رہے ہو تو تمہارے اس تقلیدی عمل پر کوئی دلیل تمہارے پاس موجود نہیں۔ جس طرح بغی اور ظلم کی ساری اقسام ناحق ہیں، اسی طرح ہر شرک بغیر دلیل اور بغیر برہان کے ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اللہ پر افتراء بھی ہے کہ اللہ نے جسے حرام قرار دیا ہے اسے حلال سمجھا جائے اور جسے حلال و جائز قرار دیا ہے اسے حرام قرار دیا جائے۔

دینی محرمات کا حکم

اس آیت میں تمام دینی محرمات کو اکٹھا کر کے بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ جب طیبات کے استعمال کا مباح ہونے کا حکم دیا گیا تو اس حکم کو سننے والا چاہے گا کہ وہ غیر طیبات اور محرمات کو بھی جانے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں اقسام کو بیان کیا ہے:۔

۱۔ وہ گناہ جن کا تعلق افعال سے ہے اور یہ پہلے تین ہیں۔

۱۔ فواحش ۲۔ اثم ۳۔ بغی

ایسے گناہ جن میں حق الناس مد نظر ہے لیکن دوسری دو اقسام میں وہ قبیح اعمال ہیں جنہیں فاحشہ سے تعبیر کیا ہے۔

۲۔ دوم وہ گناہ جن میں مفسدہ ہے اور ان کے ارتکاب میں انسان کے لئے ضرر ہے۔

یہ وہ گناہ ہیں جو اقوال اور عقائد میں آتے ہیں جیسے خدا کا شریک بنانا یا اللہ پر افتراء باندھنا۔

وَ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۴﴾

''اور ہر ایک گروہ کے لیے ایک معیاد معین ہے، پھر جب وہ معیاد ختم ہو گی تو اس وقت سے نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے''۔

ہر شخص کی موت کا مقررہ وقت

یہ آیت اس معنی کو بیان کر رہی ہے کہ تم اسی خاک (زمین) پر زندگی گزارو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے ہی مرنے کے بعد تمہیں نکال لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کے افراد کی موت کا وقت مقرر ہے اسی طرح انسانی معاشروں، اقوام اور اُمتوں کی بھی ایک محدود اور معین مدت ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ نوع بشر (سب انسان) بالکل اس روئے زمین سے ختم ہو جائیں گے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ معین عرصہ پہلے سے طے شدہ ہے اور اس طے شدہ وقت سے آگے پیچھے نہ ہو گا۔ یہ آیت حضرت آدم علیہ السلام کی اس داستان کے تسلسل میں ہے جو ان کے بہشت میں قیام سے متعلق تھی۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵

''اے آدم کی اولاد اگر تم میں سے تمہارے پاس رسول آئیں جو تمہیں میری آیتیں سنائیں، پھر جو شخص ڈرے گا اور اصلاح کرے گا ایسوں پر کوئی خوف نہ ہو گا اور نہ وہ غم کھائیں گے''۔

رسولوں کا بھیجا جانا

''اِمَّا'' اصل میں ''اِنَّ مَا'' ہے۔ اِن شرطیہ اور ما زائدہ ہے۔ ''يَاْتِيَنَّكُمْ'' میں نون تاکید ثقلیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر نے ہر صورت واقع ہونا ہے۔ یہ مطلب حتمی اور یقینی ہے کہ اللہ کی طرف سے رسولوں نے انسان کی نوع سے ہی انسان کے لئے ہادی

بن کر آنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ انسانوں پر اللہ کی حجت تمام ہو تاکہ قیامت کے دن یہ نہ کہیں کہ ہم کیا کرتے ہمیں تو برائیوں سے روکنے اور ان اعمال کی برائیوں سے آگاہ کرنے والا ہی کوئی نہ آیا جو ہمیں حقائق سے آگاہ کرتا۔

"یَقُصُّونَ" تفصیل سے حقائق کو بیان کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ آیت عمومی خطاب ہے اور سب انسانوں کے لئے ہے۔ یہ آیت بھی حضرت آدم کی داستان کا تسلسل ہے جس کا آغاز اس سے ہوا کہ آدم کو بہشت میں ٹھہرایا گیا پھر وہاں سے زمین پر اُتار دیا گیا۔ اس آیت میں عمومی قانون بیان کیا جا رہا ہے کہ تمام انسانوں پر فرض اور واجب ہے کہ وہ اللہ کے نمائندوں (رسولوں) اور الٰہی وحی کی پیروی کریں۔ انسان کو بتا دیا گیا ہے کہ یہ اس پر اللہ کی خاص عنایت اور مہربانی ہے کہ اس نے وحی کے ذریعہ انسان کی ہدایت اور راہنمائی کا انتظام کر دیا ہے۔ پھر اس کے بارے بتا دیا کہ جو بھی وحی شدہ مطالب کو قبول کرے گا، انبیاء کے بیانات کے مطابق زندگی گزارے گا تو وہ اہل تقویٰ ہوگا۔ تمام مخلوقات نے اللہ کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے اور جنہوں نے بہترین عمل کیا ہوگا وہاں پر انہیں بہترین اجر سے نوازا جائے گا اور اس جگہ ان کے لئے کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی انہیں کوئی پریشانی ہو گی اور نہ ہی وہ وہاں پر پریشان ہوں گے۔ اس بارے سورۂ توبہ آیت ۱۲۱ میں فرمایا: "لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۲۱" ترجمہ: "تاکہ اللہ انہیں ان کے اچھے اعمال کا صلہ دے"

وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۶

"اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا وہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے"۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا انجام

اس جگہ دوسرے گروہ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے تھے، انبیاء کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے، تکبر کرتے تھے، راہ تقویٰ سے انحراف کرتے تھے تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کے پاس پہنچنا ہے اور وہاں پر ان کے جرائم کی انہیں سزا ملے گی، انہیں آتش جہنم میں پھینکا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

''پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے، ان لوگوں کا جو کچھ نصیب ہے وہ ان کو مل جائے گا، یہاں تک کہ جب ان کے ہاں ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو کہیں گے کہ وہ کہاں گئے اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے تھے، وہ کہیں گے کہ وہ تو ہم سے سب غائب ہو گئے اور اپنے کافر ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے''۔

کافروں کا انجام

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو یہ بات خود پہنچا دی تھی کہ تمہاری راہنمائی اور ہدایت کے لئے اپنے رسولوں کو بھیجوں گا، وہ میری آیات اور پیغامات تمہارے پاس لے کر

آئیں گے۔ جن لوگوں نے میرے اس پیغام کو نظر انداز کیا اور مقام عمل میں میری آیات کو جھٹلایا تو ان کا انجام نہایت ہی برا ہوگا۔ ان سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھے اور توحید کا انکار کرے، اللہ کے رسولوں کی رسالت کا انکار کرے، اللہ کے احکام کا انکار کرے۔ جب ان کی موت کا وقت آئے گا اور موت کے فرشتے آئیں گے تو ان سے کہیں گے کہ اب تم ان کو بلاؤ جن کی تم اطاعت کرتے تھے۔ اب وہ کہاں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے لئے منفعت، صحت و سلامتی، دولت اور اولاد کو طے و معین کیا ہے، ہر ایک کی زندگی کا وقت معین ہے۔ رسولوں کا بھیجا جانا یہ بھی طے شدہ ہے۔ جب موت کے وقت ان سے پوچھا جائے گا تو اس وقت وہ لاجواب ہوں گے، شرمندگی کے عالم میں کہیں گے کہ وہ تو موجود نہیں ہیں اور خود ہی اس بات کا اعتراف کریں گے ہم تو کافر ہو گئے تھے۔ اپنے خلاف گواہی دیں گے اور اعتراف کریں گے کہ ان معبودوں کی طرف دی جانے والی نسبتیں اور ان کو شفیع سمجھنا سب جھوٹ تھا اور ہم ہی غلطی پر تھے۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۸

"فرمائے گا جنوں اور آدمیوں میں سے کہ جو امتیں تم سے پہلے ہو چکی ہیں ان کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ، جب ایک امت داخل ہو گی تو دوسری پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب اس میں سب گر جائیں گے، تو ان کے پچھلے پہلوں کے متعلق

کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں تو انہوں نے گمراہ کیا سو توں انہیں آگ کا دگنا عذاب دے، اللہ فرمائے گا کہ دونوں کیلئے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے"۔

گمراہوں کا ایک دوسرے سے اعلان بیزاری

یہ کلام اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہے جس میں کافروں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار سے کہے گا تم اپنے سے پہلے گروہوں کے ہمراہ جہنم میں وارد ہو جاؤ۔ انسان و جنات سے پہلے گروہ آتش جہنم میں ہوں گے اس طرح سب کے سب اکٹھے آتش جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ اگلے پچھلے سب ایک دوسرے کو دیکھیں گے، بعد والے گروہ اپنے سے پہلے والے گروہوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں گمراہ کیا، اسی طرح وہ رب تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا انہیں دوگنا عذاب دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ سب کے لئے چند برابر عذاب ہے لیکن تم اس سے آگاہ نہیں ہو۔ اس آیت میں دوزخیوں کے آپس میں جھگڑے کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ کس طرح ایک دوسرے پر اپنے آپ کو گمراہ کرنے کی ذمہ داری ڈالیں گے اور ایک دوسرے سے بیزاری کا اعلان کریں گے۔ (سورۂ ص، آیت: ٦٤) " اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ " ترجمہ: " یہ جہنمیوں کے باہمی جھگڑے کی حتمی بات ہے " یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابلیس جسے وقت معلوم تک زندہ رہنے کی مہلت ملی ہے اس کے برعکس باقی جنات کی موت کا وقت مقرر ہے اور جب وقت معین آجائے گا تو وہ مر جائیں گے۔ یہ آیت اور بعد والی آیت مومنوں اور کافروں کے حالات کا بیان ہے تاکہ اس آیت کا مقدمہ فراہم ہو جائے۔ " لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤١﴾ " (سورہ اعراف، آیت: ۴۱) ترجمہ: "ان کے لیے جہنم ہی بچھونا اور اوڑھنا ہو گی اور ہم ظالموں کو ایسا بدلہ دیا کرتے ہیں "

اللہ تعالیٰ نے ایمان کو عمل صالح سے مشروط قرار دیا ہے۔ واضح ہے کہ اس طرح بہت کم مومنین اعمال صالح بجالانے میں کامیاب ہوں گے کہ جن میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ لہٰذا مومنوں کے دلوں کو تقویت دینے اور ان کی پریشانی کو دُور کرنے کے لئے فرمایا: ہر ایک کو اس کی استطاعت اور قدرت کے مطابق تکلیف دی گئی ہے کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دی گئی۔ اس لئے وہ اپنی طاقت اور وسعت سے زیادہ خود کو مشقت و تکلیف میں نہ ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال صالح اور ایمان کی وجہ سے بہشت میں وارد کر دے گا اور وہ جنت میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔

وَ قَالَتۡ اُوۡلٰىهُمۡ لِاُخۡرٰىهُمۡ فَمَا كَانَ لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ۝۳۹

"اور پہلے پچھلوں سے کہیں گے کہ پس تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں پس لہٰذا اپنی کمائی کے سبب عذاب چکھو"۔

بعد والوں کے ساتھ پہلے والوں کی گفتگو

جب وہ اللہ تعالیٰ کا جواب سنیں گے تو گذشتگان بعد والوں سے (یا رہبر اور راہنما اپنے پیروکاروں سے) کہیں گے تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے اور تمہارا عذاب ہم سے کم نہیں ہے۔ لہٰذا تم ان گناہوں کے عذاب کا مزہ چکھو جو تم نے دنیا میں انجام دئے تھے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑیں گے۔ چنانچہ جہنم میں آگ میں تو جل رہے ہوں گے لیکن اس کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے کو برا کہہ رہے ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنمی ایک دوسرے کو پہچانیں گے، عذاب کی حالت میں ان میں گویائی اور سنوائی کی صلاحیت موجود ہو

گی۔ جہنم میں عذاب کے ساتھ لڑائی، جھگڑا، شور شرابا بھی ہو گا کسی بھی حوالے سے آرام و سکون نہ ہو گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۰﴾

"بے شک جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے، اور ہم گناہگاروں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں"۔

آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والے بہشت سے محروم

جن لوگوں نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور حق کے سامنے اپنے آپ کو بڑا جانا اور حق کی پیروی نہیں کی، ان کے لیے کبھی بھی آسمان کے دروزے نہیں کھولے جائیں گے۔ ان کی دعائیں اور ان کی عبادات اللہ تعالیٰ کے حضور نہیں پہنچتیں اور ان کی روحیں بھی عالمِ ملکوت تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ اور وہ کبھی بھی بہشت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں تک کہ موٹی رسی سوئی کے چھوٹے سوراخ میں داخل ہو جائے۔ ان کے بہشت میں داخل ہونے کو ایک محال امر پر موقوف کیا گیا ہے اور ان کے بہشت میں داخل ہونے کو اس امر محال پر موقوف کرنا اس بات سے کنایہ ہے کہ یہ امر کبھی بھی محقق نہ ہو گا۔ ان کو چاہیے کہ بہشت میں داخل ہونے سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہی رہیں۔ آخر میں فرمایا: ہم اس طرح گناہگاروں کو سزا دیتے ہیں۔ وہ کبھی بھی آتش جہنم سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۶۷)

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

"ان کے لیے دوزخ کا بچھونا اور اوپر سے اوڑھنا ہے، اور ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں"۔

گناہگاروں کیلئے جہنم

" جَهَنَّمَ " آخرت کی کیفیت کے بیان میں ایک حالت جہنم ہے اور جہنم آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جہنم بہت گہرے کنویں کے معنی میں ہے۔ " مِهَادٌ " بچھائے جانے والے بسترے کو کہا جاتا ہے۔ " غَوَاشٍ " غاشیہ کی جمع ہے جو ساتر اور ڈھانپنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ آیت اس بات سے کنایہ ہے کہ جہنم کی آگ دوزخیوں کو اوپر اور نیچے سے گھیر لے گی۔ آخر میں فرمایا: ہم اس طرح ستمگاروں کو سزا دیتے ہیں، ہر طرف آگ ہی آگ ہو گی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ ؗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

" اور ایمان لانے والے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بجالائے تو وہ ہی اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، ہم کسی کو (نیک اعمال کی بجاآوری میں) اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ دار نہیں ٹھہراتے"۔

نیک عمل انجام دینے والے بہشتی مومنین

یہ آیت اور بعد والی آیت، آیت: ۴۴ ''وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ'' کے مقدمے کے طور پر بیان ہوئی ہیں جس میں مومنین اور کفار کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس آیت میں کیونکہ ایمان کو عمل صالح سے مشروط کیا ہے اور دوسری جانب بہت کم لوگوں کو ایمان کے ساتھ عمل صالح انجام دینے کی توفیق حاصل ہوتی ہے اور کوئی بھی عمل کے حوالے سے کوتاہی سے مبرا نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو تسلی دینے کے لیے ارشاد فرمایا ہے: ہم ہر شخص کو اس کی استطاعت کے مطابق تکلیف دیتے ہیں۔ لہٰذا جو بھی اپنی قدرت اور توانائی کے مطابق عمل صالح انجام دے گا اگرچہ اپنے آپ کو مشقت میں نہ بھی ڈالے تو پھر بھی وہ اس آیت کے مصادیق میں سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کے ایمان اور عمل کی پاداش میں اس کو بہشت میں داخل کرے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ ۚ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ہَدٰىنَا لِہٰذَا ۟ وَ مَا کُنَّا لِنَہۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ہَدٰىنَا اللّٰہُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡہَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم دور کر دیں گے جو کچھ ان کے دلوں میں خفگی ہوگی ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا اور ہم راہ نہ پاتے اگر اللہ ہماری راہنمائی نہ فرماتا، بے شک ہمارے رب کے رسول سچی بات لائے تھے، اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے وارث ہو گئے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت کا تذکرہ

"غِلٍّ" کینہ، دشمنی اور اندرونی غصہ کے معنی میں ہے۔ اندرونی غصہ اور کینہ و دشمنی انسان کی زندگی میں پیش آنے والے نامناسب حالات میں سے ایک ہے جو اس کے آرام و سکون کو تباہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس طرح قرار دے کہ وہ دوسروں کی باتوں اور رویوں سے تنگ نہ ہو اور اسے اس حوالے سے کوئی تکلیف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اسے بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے، کیونکہ یہ بات اس کی زندگی کے لئے آرام و سکون کا وسیلہ ہے۔

قیامت کے دن مومنوں کا مقام

"تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ" مومنوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ایمان لانے والے اور اعمال صالح انجام دینے والوں کو قیامت کے دن جنت الفردوس میں بہت ہی بلند و بالا اور عالیشان محلات میں سکونت دی جائے گی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ محلات کے اندر سے اس دلکش منظر کا نظارہ کرتے ہوئے لطف اندوز ہوں گے۔ جب مومنین اس منظر کو دیکھیں گے تو بہت ہی خوش ہوں گے اور خوشحالی کے عالم میں اللہ کی حمد بجالاتے ہوئے اس بات کا اعتراف کریں گے کہ یہ سب اللہ کی ہدایت کا بدلہ ہے۔ اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہرگز ان نعمات سے بہرہ ور نہ ہوتے۔ یہ عبارت اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے لئے خالص کیا ہے، یہ لوگ ایسے مقام پر ہیں جہاں کوئی بھی باطل اعتقاد اور برا عمل موجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ناپسندیدہ حرکت ہے۔

جیسا کہ سورۂ واقعہ، آیت: ۲۶۔۲۵ میں فرمایا:

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''وہاں وہ نہ بیہودہ کلام سنیں گے اور نہ ہی گناہ کی بات، ہاں! سلام سلام کہنا ہوگا''۔

جنت میں ہر شخص حوروں کیلئے دعائیہ کلمات کہتا نظر آئے گا، سب سکون سے ہوں گے، جب ایک دوسرے کے قریب سے گزریں گے تو سلامتی ہو، خیر ہو کے جملے کہیں گے۔ ایک دوسرے سے پیار و محبت کریں گے، امن ہوگا، سکون ہوگا، شور شرابا نہ ہوگا کسی قسم کی بے چینی نہ ہوگی۔

لہٰذا فقط ایسے لوگ ہی اللہ تعالیٰ کی حمد بجالانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ اللہ کی توصیف و تمجید و تحمید کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص انعام سے نوازا ہے اور انہیں اپنے لیے خالص بنایا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے ابلیس نے کہا تھا کہ تیرے خالص بندوں کو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ابلیس کے شر سے بچ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ صٰفّٰت، آیت: ۱۵۹۔۱۶۰ میں اس بارے ارشاد فرمایا:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: ''اللہ ان کے ہر اس بیان سے پاک ہے جسے وہ اللہ کے وصف میں بیان کرتے ہیں، سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے''۔

مومنین نے اپنی گفتگو میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ جو ہدایت انہیں ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، وہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ انسان کے پاس ہدایت پانے میں استقلال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اعمال پر جس کا افراد مرتکب ہوتے ہیں ان پر قائم ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی صداقت کا اعتراف کرتے ہوئے جو انبیاء کی زبان سے جاری ہوا ہے مومنین نے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہوئے کہا: بتحقیق اللہ کے رسول ہمارے پاس آئے جن کو برحق مبعوث کیا گیا، ان کی گفتگو برحق تھی۔ مومنین کا یہ اعتراف اور اس طرح کے

دوسرے اعترافات جو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومن اور کافر سے لے گا یہ سب اللہ کی قہاریت اور ربوبیت کی علامت ہیں۔ اسی طرح بہشتیوں کا اعتراف، اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا ہے، اور دوزخیوں کا اعتراف پروردگار کی جانب سے اتمام حجت کا اقرار کرنا ہے۔

آخر میں "تِلْکُمُ" جو کہ بعید کے لیے اسم اشارہ ہے کے ذریعے بہشت میں مومنین کے بلند مقام اور ان کی اعلیٰ شان کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ان کو یہ ندا اس وقت دی جائے گی جب وہ بہشت میں رہائش اختیار کرلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بہشت تمہاری میراث ہے ان اعمال کے بدلے میں جو تم نے دنیا میں انجام دئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میراث ایسی چیز کا مالک ہونے کو کہتے ہیں جو قابل منفعت ہو اور کوئی اور اس کا مالک ہو اور کسی وجہ سے اس کی ملکیت ختم ہو جائے اور اس چیز کی ملکیت دوسرے شخص کو منتقل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بہشت کو خلق کیا تاکہ اس کے تمام بندے عمل صالح کے سرمایہ کے وسیلہ سے اسے حاصل کرسکیں۔ لیکن کفار اور مشرکین نے شرک اور گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنے آپ کو اس کی ملکیت سے محروم کیا۔ جس کے نتیجے میں بہشت پر ان کی ملکیت زائل ہو گئی اور مومنین کی ملکیت میں آگئی۔ لہٰذا مومنین اپنے اعمال صالحہ کے ذریعے بہشت کے وارث بن گئے ہیں۔

اس بارے سورہ مومنون، آیت: ۱۱-۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝١٠ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ۔۔۔ ۝١١

ترجمہ: "یہی لوگ وارث ہوں گے، جو (جنت) فردوس کی میراث پائیں گے"۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ۝۴۴

''اور بہشت والے دوزخیوں کو پکاریں گے کہ ہم نے وعدہ سچا پایا جو ہمارے رب نے ہم سے کیا تھا، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا، وہ کہیں گے ہاں! پھر ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے''۔

جنتیوں کا جہنمیوں سے مکالمہ

یہ اس مکالمہ کی بات ہے جو بہشتی جہنمیوں سے کریں گے۔ حقیقت میں یہ ایک لحاظ سے دوزخیوں سے اقرار لینا ہے اور دوسری جہت سے بہشتیوں کی جانب سے جہنمیوں کا تمسخر بھی کرنا ہے کیونکہ جہنمی دُنیا میں مومنوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟ وہ جہنم کا سن کر مذاق اُڑاتے تھے اور بعد از مرگ کے بارے تمام واقعات و حالات کو جھٹلاتے تھے۔ کسی ثواب و عقاب کے قائل نہ تھے۔ مومنین کا کفار کا استھزاء و تمسخر، لغو و بے ہودہ نہیں ہوگا بلکہ بامقصد اور ایک ہدف کے تحت ہوگا کیونکہ یہ ان کے لیے ایک طرح کا عذاب ہے۔

دوسری طرف اہل بہشت اس بات کا اعلان کریں گے کہ دُنیا میں اللہ کی جانب سے آنے والے رسولوں اور انبیاء نے ہمیں جو وعدے دیے تھے ہم نے ان سب کو حق پایا اور جہنمیوں سے اس کا اعتراف لیں گے اور ان سے کہیں گے کہ اب تم بھی بتاؤ کہ جو کچھ امتیاز دُنیا میں بیان کیا کرتے تھے کیا وہ حق تھے یا باطل؟ اب تم بتاؤ کہ اللہ نے جو وعدہ دیا تھا کہ مرنے کے بعد سب کو قبروں سے اُٹھایا جائے گا اور گناہگاروں کو آتش جہنم میں ڈالا جائے گا جس کا تم دنیا میں اس کا انکار کرتے رہے اب بتاؤ کہ تم نے ان سب باتوں کو جان لیا ہے کہ وہ سب کچھ برحق تھا یا باطل؟ جہنمی کہیں گے الٰہی وعید اور گناہگاروں کو جہنم میں ڈالے جانے کی خبر برحق تھیں اور نیک عمل کرنے والے صاحبان ایمان کو ثواب ملے گا جس کو کافر قبول نہیں

کرتے تھے اب اس بارے اعلان ہو گا اور اس کا اعتراف جہنمی اس طرح کریں گے کہ جی ہاں! سب کچھ برحق تھا اب ہم نے اس پر یقین کرلیا ہے۔

خصوصی سزائیں

نیک اعمال انجام دینے والوں کو ان کے اعمال کا اجر دینا واجب ہے۔ لیکن نافرمانی پر خصوصی سزاؤں کے اعلان کو پورا کرنا واجب و لازم نہیں ہے۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور انبیاء کی دعوت کو جھٹلانے کی سزا کے بارے جو کچھ ڈرایا دھمکایا گیا اور جو سزا کا اعلان ہوا ہے اس کا پورا کرنا واجب اور لازم ہے کیونکہ اگر گناہ پر سزا کا قانون ہی ختم کر دیا جائے اور گناہ پر سزا کا دیا گیا وعدہ پورا نہ کیا جائے تو اس کا لازمہ یہ ہو گا کہ شرائع کا وجود ہی سرے سے باطل ہو اور عام انسانی نظام بھی درہم برہم ہو جائے۔

مومنین کی گفتگو کا انداز

بہشت میں جانے والے مومنین و صالحین نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ: "ما وعدنا ربنا" ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا۔" جبکہ کفار کے بیان میں آیا ہے: "ما وعد ربکم" جو وعدہ تمہارے رب نے دیا تھا" یہ دونوں عبارتیں مقام ربوبیت کے احترام و شرافت اور شان پر دلالت کرتی ہیں۔ پہلی عبارت اللہ کے تمام وعدوں کو شامل ہے جو اللہ نے اپنے تمام بندوں سے کیا ہے اور ان کو نیک اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر عقاب کا وعدہ دیا ہے۔ ان دو تعبیروں میں اختلاف کا سبب مومنین اور کفار کے اعتراف کے متعلق میں اختلاف ہے کیونکہ مومنین معاد اور اس کے بارے سب جزئیات کو تسلیم کرتے تھے جبکہ کفار اصل معاد اور مردوں کا دوبارہ زندہ کئے جانے کے ہی منکر تھے۔ قیامت نے آنا ہے اور مردوں کو قبروں سے اُٹھایا جائے گا یہ وعدہ اللہ کا کفار سے بھی تھا اور یہی وعدہ مومنین سے بھی تھا لیکن جو وعدہ کافروں کو دیا گیا تھا وہ قیامت کے دن عذاب کی خصوصیات سے متعلق تھا نہ اصل

قیامت کے بارے۔ انہیں کہا گیا تھا کہ جو اللہ کی آیات کا انکار کرے گا، رسولوں کو جھٹلائے گا اور اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھے گا تو اس کو جہنم میں داخل کیا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

آخر میں اس مکالمہ کے نتیجے کو بیان کیا ہے۔ ان کے درمیان منادی اعلان کرے گا کہ ستمگاروں پر اللہ کی لعنت ہو۔ لعنت کا معنی ستمگاروں کو اللہ کی رحمت سے دور کرنا ہے۔ یہ ایسا اعلان ہے جو دونوں گروہوں کے لئے ہے، مومنین کے لئے بھی اور کافروں کے لئے بھی۔ ستمگاروں سے مراد کون ہیں اس بارے بعد والی آیت میں تفصیل بیان ہو گی لیکن اجمالی طور پر ستمگاروں سے آخرت کا انکار کرنے والے، حق سے دشمنی کرنے والے، حق کی مسلسل مخالفت کرنے والے، راہ خدا سے منحرف رہنے والے اور دوسروں کو حق کے راستہ سے روکنے والے مراد ہیں۔ لہٰذا یہ وصف ان کو بھی شامل ہے جو حق کے منکر، بے دین اور بے عمل ہیں۔ مؤذن کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ یہ جنات یا فرشتوں سے ہو گا لیکن متعدد شیعہ روایات جو امام باقر علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہیں اسی طرح اہل سنت کی کچھ حدیثوں کی رو سے جسے حاکم نے ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے اعلان کرنے والا مؤذن انسان کی نوع سے ہو گا اور وہ حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ (حقیقت کا علم اللہ کے پاس ہے، واللہ اعلم)

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

”جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے، اور وہ آخرت کے منکر تھے“۔

فطری دین کا انکار

اللہ کا راستہ ہی دین فطرت ہے اور انسان کی سعادت اسی راستہ کو طے کرنے میں ہے۔ اگر کوئی اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو اس نے انحرافی راستہ اختیار کیا جو کہ بد بختی اور بربادی کا راستہ ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے انسان اللہ کو چھوڑ کر دوسرے جھوٹے خداؤں کی عبادت کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے جو کہ ظلم عظیم ہے۔ باطل پر مبنی آئین یا باطل دین کو اپناتا ہے یا مادہ پرستی میں گھر جاتا ہے تو گویا اس نے اللہ کی نعمات کو کفر میں بدل دیا۔ جو اللہ کی نعمات کا انکار کرتا ہے وہ اللہ کے راستہ کو چھوڑ کر انحراف کر لیتا ہے۔ دین الٰہی ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے جو صراط مستقیم ہے۔ اس کو چھوڑنا کفران نعمت ہے، جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اس پر عمل کریں اور فطرت سے انحراف نہ کریں۔ جو خلاف فطرت چلتا ہے وہ آخرت کا منکر ہوتا ہے اور حیات کو اس دنیوی زندگی میں منحصر قرار دیتا ہے۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

"اور ان دونوں کے درمیان ایک دیوار ہوگی، اور اعراف کے اوپر ایسے مرد ہوں گے کہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے، اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلام ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور اُمیدوار ہیں"۔

مقام اعراف

"حِجَابٌ" اس پردہ کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتا ہے جس کی وجہ سے دو طرف والے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ دوزخی اور جنتی ایک حجاب کے آنے سے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے۔

"الْاَعْرَافِ" ایسی بلند جگہ کو کہتے ہیں جس پر موجود لوگ اپنے ارد گرد اور نیچے والے لوگوں اور چیزوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ قیامت کے دن ایک بلند جگہ ہو گی جس کا نام اعراف ہوگا اس پر موجود لوگ دوزخیوں اور بہشتیوں کو دیکھ سکیں گے۔ یہ دونوں قسم کے لوگوں کو ان کے چہروں سے اچھی طرح پہچانیں گے۔ جو افراد اعراف پر موجود ہوں گے یہ لوگ دوزخیوں اور بہشتیوں سے ممتاز ہوں گے۔ اب یہ لوگ کون ہوں گے اس بارے میں چند احتمال دیے گئے ہیں:۔

۱۔ یہ انسانوں میں سے نہیں ہوں گے بلکہ جنات یا فرشتوں میں سے ہوں گے۔ لیکن یہ احتمال صحیح نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں لفظ "رجال" آیا ہے جو مردوں کے معنی میں آتا ہے اور یہ لفظ انسانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رجال نکرہ لفظ کے ساتھ آیا ہے جو احترام کے لئے ہے تو اس سے بعض محترم شخصیات مراد ہیں۔

۲۔ یہ ایسے مستضعف و کمزور ایمان والے لوگ ہوں گے جن پر حجت تمام نہ ہوئی ہو گی۔ یہ احتمال بھی مردود ہے کیونکہ مستضعفین کا لفظ عام طور پر بچوں، عورتوں اور بے عقل، دیوانہ مردوں پر بولا جاتا ہے تو "رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ" ایسے مرد جو انہیں پہچانتے ہیں۔ تو اس پر لفظ مستضعف نہیں بولا جا سکتا کیونکہ قرآن ان کی جلالت و بزرگی کو بیان کرتا۔

۳۔ ان سے ایسے افراد مراد ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں مساوی ہوں گے، ان میں نہ تو جہنم جانے کا استحقاق ہے اور نہ ہی جنت میں جا سکتے ہیں۔ یہ احتمال بھی مردود ہے۔ جیسا

کہ ہم نے بتایا ہے کہ "رِجَالٌ یَّعۡرِفُوۡنَ" کا جملہ بتارہا ہے کہ اعراف پر موجود لوگ محترم اور شان والے ہوں گے۔ اس طرح کہ ان کا بہشتیوں پر سلام بھیجنا ان کے واسطے برکت کا سبب ہو گا کہ ان کے فرمان سے وہ بہشت میں وارد ہوں گے۔ نیز اہل اعراف دین میں سستی دکھانے والے، کمزور اعمال والے اور اہل فترت (جس دور میں صاحب شریعت پیغمبر موجود نہ تھے) بھی نہیں ہیں۔

جو کچھ واضح ہے اور آیات سے استفادہ ہوتا ہے یہ ہے کہ یہ لوگ اہل فضل و اہل شرف ہیں، ایمان اور کمالات کے مالک ہیں اور زیادہ تر مرد ہیں۔ اگرچہ اعراف پر خواتین بھی موجود ہوں گی البتہ قانون تغلیب کے تحت "رجال" کہا گیا ہے۔ اس طرح لفظ "رجال" خواتین کو بھی شامل ہو گا۔ یہ ایسی شرافت و فضل کے مالک ہیں جو تمام لوگوں کے شرف و فضل سے برتر ہے۔ وہ ہر انسان کو اس کے چہرے سے پہچانتے ہیں، ان کی نفسانی خصوصیات پر ان کا احاطہ ہوتا ہے، ان کے اعمال کو تفصیل کے ساتھ جانتے ہیں۔ یہ امتیاز ان کی بلند شان پر دلالت کرتا ہے، یہ ایسی شان والے ہیں کہ بہشتیوں پر سلام بھیجیں گے، ان کے لئے سلامتی کی دعا دیں گے جو ان کی امنیت و میمنت کا سبب ہو گا۔ یہ حق پر مبنی بات کرنے کے مجاز ہوں گے، گواہی دے سکتے ہیں، شفاعت کریں گے، آرڈر دے سکتے ہیں، فیصلہ سنائیں گے، ان کی دعا قبول ہو گی، جہنمیوں کی سرزنش کریں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ افراد انبیاء ہوں گے یا شہداء ہوں گے یا علماء اور فقہاء ہوں گے یا حکماء و عارفان ہوں گے ایسے صاحبان معرفت ہوں گے جو اہل بہشت اور اہل جہنم دونوں گروہوں کے مقام اور ان کی حیثیت کو جانتے ہوں گے اور ان دونوں گروہوں پر مسلط ہوں گے۔ یہ قول مقام اعراف پر موجود افراد کے بارے میں معتبر ترین قول ہے۔

بہرحال اعراف پر موجود لوگ بہشتیوں کو ان کے بہشت میں داخل ہونے سے پہلے آواز دیں گے اور ان کے لئے سلامتی کا پیغام دیں گے۔ یہ سلام ان کو ہر ناپسندیدگی سے

محفوظ رہنے کا پیغام ہوگا۔ یہ دو جملے (لَمۡ یَدۡخُلُوۡهَا وَ هُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾) بہشتیوں کے لئے ہے کہ وہ ابھی تک جنت میں داخل نہیں ہوئے لیکن جنت میں داخل ہونے کے اُمیدوار ہیں۔ ان پر اعراف پر موجود لوگ سلام بھیجیں گے۔ لیکن اگر اس جملہ کو اعراف پر موجود افراد کے لئے قرار دیں تو اس کا یہ معنی اس طرح کریں گے کہ اعراف پر موجود لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ جنت میں جانے کی اُمید رکھتے ہیں۔ یہ معنی درست نہیں ہے کیونکہ مقام اعراف پر موجود افراد تو بڑی شان والے ہیں، وہ تو جہنمیوں سے پہلے اس بلند مقام پر موجود ہوں گے، سب کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ وہ جہنمیوں کو جہنم میں جاتے ہوئے اور جنتیوں کو بہشت میں داخل ہوتے دیکھ رہے ہوں گے اسی لئے وہ بہشت میں جانے کے لئے تیار افراد کو سلامتی اور امنیت کی دعا دیں گے۔

وَ اِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

”اور جب ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف پھرے گی تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کے ساتھ نہ ملا“۔

اصحاب اعراف کی دعا

اعراف پر موجود افراد کی نظر جہنمیوں پر پڑے گی تو انہیں دیکھ کر اللہ سے پناہ مانگیں گے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ محشور ہو کر جہنم میں نہ جائیں۔ یہ جو فرمایا ” وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ “ ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف پھرے گی۔ یہ جملہ اس انداز سے اس لئے بیان ہوا ہے کہ عام طور پر انسان ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اگر نظر پڑ جائے تو پھر اللہ کی پناہ مانگتا ہے۔ اس آیت کا انداز بیان بھی یہی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے ان کی نظر جہنمیوں

پر پڑ جائے گی اور وہ دوزخیوں کو عذاب میں جلتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اس کے باوجود جب ان کی نگاہیں ان کی جانب پھیر دی جائیں گی تو اس سے پریشان ہوں گے اور فوراً ان کو دیکھ کر اللہ سے پناہ مانگیں گے۔ اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنے والے اعراف پر موجود لوگ نہیں ہو سکتے، اگرچہ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے لیکن معنی پر دقت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اصحاب اعراف مراد نہیں ہیں کیونکہ اہل اعراف تو جنتی اور جہنمی سب کا نظارہ کر رہے ہوں گے یہ تو جنت میں جانے والے لوگ ہوں گے کہ جنت جاتے ہوئے ان کی نظر جہنمیوں پر پڑ جائے گی تو فوراً اللہ سے پناہ مانگیں گے کہ اللہ انہیں ظالموں سے قرار نہ دے۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

"اور اعراف والے پکاریں گے جنہیں وہ ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے، کہیں گے تمہاری جماعت تمہارے کسی کام نہ آئی اور نہ وہ جو تم تکبر کیا کرتے تھے"۔

دوزخیوں سے اصحاب اعراف کی گفتگو

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب اعراف دوزخیوں کو پہچانتے ہوں گے، ان کے چہروں سے جانتے ہوں گے لہٰذا انہیں دیکھتے ہی ان کی سرزنش کریں گے کہ تم تو دُنیا میں بڑے بنتے تھے اور اپنی متکبرانہ چالوں سے حق کا انکار کرتے تھے۔ لیکن اب نہ تو تمہاری کثرت اور نہ ہی تمہارا تکبر تمہارے کسی کام آئے گا۔ تم دنیا میں اہل حق سے کہتے تھے کہ تم تھوڑے ہو، بے حیثیت ہو، انہیں ذلیل و کمزور سمجھتے تھے، خود کو طاقتور قرار دیتے تھے۔ اصحاب اعراف ان سے کہیں گے کہ تمہارا تکبر تمہارا کام نہ آیا نہ تمہاری کثرت نے تمہیں فائدہ دیا اور حق پر نہ چلنے کی وجہ سے آج تم ذلیل و خوار ہو۔

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ‌ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾

"یہ وہی ہیں جن کے متعلق تم قسم کھاتے تھے کہ انہیں اللہ کی رحمت نہیں پہنچے گی، (جبکہ انہیں کہا گیا ہے کہ) جنت میں چلے جاؤ تم پر نہ ڈر ہے اور نہ تم غمگین ہو گے"۔

اہل جنت کی شان

اصحاب اعراف جہنمیوں سے کہیں گے کہ جن کے بارے میں تم کہتے تھے کہ وہ اللہ کی رحمت سے دُور ہیں، جن کے متعلق کہتے تھے کہ وہ ناکام ہیں تو آج وہی لوگ جنت الفردوس جا رہے ہیں اور جنت میں سلامتی سے رہیں گے۔ تم لوگ اپنے تکبر کی وجہ سے دوزخ میں جا رہے ہو کیونکہ جنت میں جانے والوں نے اللہ کا راستہ اختیار کیا، کافروں کی تمام اذیتوں اور طعنوں کو برداشت کیا، خوف کے عالم میں رہے؛ آج وہ باکرامت ہیں، بے خوف وخطر جنت الفردوس میں امن وسکون سے ہیں، انہیں خیر ملی اللہ کی رحمت کے سایہ تلے آ گئے۔ دوزخیوں سے یہ جملہ کہنے کے بعد اصحاب اعراف بہشتیوں سے کہیں گے تم اب جنت میں داخل ہو جاؤ، یہ ایسا بہترین مقام ہے جس میں کوئی خوف نہیں ہے اور اس جگہ تمہیں کسی قسم کا غم واندوہ نہیں ہو گا۔ بعض نے کہا ہے یہ خطاب بہشتیوں کے لئے اللہ کی جانب سے ہو گا لیکن یہ احتمال سیاق عبارت سے سازگار نہیں ہے۔ کیونکہ اصحاب اعراف کی جہنمیوں سے گفتگو کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس لیے بہشتیوں سے یہ خطاب اصحاب اعراف ہی کا ہے۔ وہ اہل بہشت سے کہیں گے کہ جنت میں داخل ہو جاو۔

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ‌ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَۙ ﴿۵۰﴾

''اور دوزخ والے بہشت والوں کو پکاریں گے کہ ہم پر تھوڑا سا پانی بہا دو یا اس چیز میں سے کچھ دو جو تمہیں اللہ نے رزق دیا ہے، کہیں گے بے شک اللہ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں پر حرام کیا ہے''۔

جہنمیوں کا بہشتیوں سے سوال

''اَفِیْضُوْا'' لبریز ہونے اور پانی انڈیلنے کے معنی میں ہے۔ اہل دوزخ بہشتیوں سے یہ اُمید وابستہ کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو پانی ہے اور جو کچھ دوسری نعمات بہشتی ہیں ان میں سے کچھ انہیں عنایت کر دیں، ان کی سب سے بڑی ضرورت دوزخ میں پانی ہوگا تاکہ اس پانی کے ذریعہ آگ کی گرمی کو کنٹرول کر سکیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بہشت کا مقام اہل دوزخ سے بلند تر ہوگا کہ وہ چاہیں گے کہ بہشتی اس بلندی سے پانی یا دوسری نعمات کو ان پر اوپر سے اُنڈیل دیں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ دوزخی بہشتیوں کو دیکھ رہے ہوں گے اور ان کے پاس پانی اور دوسری نعمات کی جو فراوانی ہو گی اسے بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے کا نظارہ کر رہے ہوں گے اور آپس میں بات بھی کر سکیں گے۔ بہشتی دوزخیوں کی خواہش اور ان کے سوال پر انہیں جواب دیں گے کہ جو کچھ ہمیں اللہ نے نعمات دی ہیں ان کو تمہارے اوپر حرام قرار دیا ہے، ہم ان نعمات سے کچھ بھی تمہیں نہیں دے سکتے۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿٥١﴾

''جنہوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنایا اور انہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا، سو آج ہم انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا، اور جیسا وہ ہماری آیتوں سے انکار کرتے تھے''۔

دین کو کھیل تماشا قرار دینے والے

''لَهْوًا'' اس کیفیت کو کہتے ہیں جس کے ہوتے ہوئے انسان اہم اور ضروری امور کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ''لَعِب'' ایسا کام جو خیال کی بنیاد پر انجام دیا جاتا ہے، جس میں خیالی ہدف اور خیالی نتیجہ مد نظر ہوتا ہے جو حقیقت سے دُور ہوتا ہے۔ ''غرور'' خیر خواہی کا اظہار جب کہ دل میں اس کے بارے برا ارادہ ہو، دھوکہ دہی۔ ''نسیان'' فراموشی کے معنی میں ہے اور اس کا متضاد کلمہ ''ذکر'' ہے جس کا معنی یاد رکھنا ہے۔ ''نسیان'' کسی چیز کو بے توجہی کرتے ہوئے ترک کرنے کے لیے استعارہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اس آیت میں نسیان اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''جَحَد'' انکار اور نفی کے معنی میں ہے۔

اس آیت میں کفار کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ کفر یہ ہے کہ انسان دین کو کھیل تماشا بنائے اور اسے بے مقصد چیز قرار دے اور دُنیاوی زندگی سے دھوکہ کھائے اور پروردگار کی ملاقات کا انکار کر دے، آیات الٰہی کو جھٹلائے اور انہیں تسلیم نہ کرے۔ اس سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے تمام احوال میں کسی بھی صورت میں دین سے بے نیاز نہیں ہے کیونکہ دین ایسا راستہ ہے جس کو انسان زندگی میں طے کرتا ہے جو کہ اس کی فطرت کے مطابق ہے لہٰذا اگر آدمی اس سے اعراض کرے گا، پہلو تہی کرے گا، لہو و لعب میں مصروف ہو جائے تو گویا اس نے دین کو کھیل تماشا قرار دیا ہے اور مادی زندگی سے دھوکہ کھایا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کفار دُنیا میں اللہ کی ملاقات اور قیامت کے دن کا انکار کرتے تھے اور انہوں نے قیامت کو بھلا دیا تھا، وہ الٰہی آیات کا انکار کرتے تھے تو قیامت کے دن ہم بھی انہیں

ان کے حال پر چھوڑ دیں گے اور انہیں بھلا دیں گے۔ اس طرح یہ کفار ہماری رحمت سے دُور ہو گئے اور یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جسے ہم نے اپنے علم کامل سے بہت ہی واضح کرکے بیان کر دیا ہے، وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے ہیں''۔

کتاب مبین کی حقانیت

اللہ کی کتاب کی حقانیت اس حوالے سے ہے کہ یہ کتاب اللہ نے بھیجی ہے اس کتاب کی اساس اور بنیاد علم پر ہے۔ علم الٰہی بے انتہاء ہے اس کی شرح اور تفصیل اس کتاب میں دی گئی ہے۔ اس کتاب میں تمام وہ مطالب موجود ہیں جن میں انسان کی ہدایت کا سامان ہے اور جو رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ کتاب تمام انسانوں کے لئے راہنمائی دینے والی ہے اور مومنین کے لئے رحمت ہے۔

درحقیقت آیت ۳۷ میں جس بحث کو شروع کیا گیا تھا اس کی روشنی میں اس کا معنی اس طرح کیا جائے گا: ان سے بڑھ کر ستمگار اور کون ہو سکتا ہے جن پر ہم نے اتمام حجت کر دیا، ان کے لئے بیان حق کیا، برہان اور دلیل سے ہر بات کو سمجھایا اور ان پر ایسی کتاب نازل کی جس کی اساس و بنیاد علم پر ہے جس میں ہدایت کا سامان ہے اور جو مومنین کے لئے سرمایہ رحمت ہے لیکن ستمگاروں نے اس سب کے باوجود دین کو بازیچہ اور کھیل تماشا سمجھا جس کا خمیازہ انہیں آخرت میں بھگتنا پڑے گا اور ان کا ٹھکانہ آتش جہنم ہو گا۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ
فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

''کیا انہیں صرف آخری نتیجہ کا انتظار ہے، جس دن اس کا آخری نتیجہ سامنے آئے گا اس دن جو اسے پہلے بھولے ہوئے تھے کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسول سچی باتیں لائے تھے، سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے جو ہماری سفارش کرے یا کیا ہم پھر واپس بھیجے جاسکتے ہیں تاکہ ہم ان اعمال کے خلاف دوسرے اعمال انجام دیں جو پہلے کرتے تھے، بے شک انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور جو باتیں بناتے تھے وہ سب گم ہو گئیں''۔

قرآن میں بیان شدہ مطالب کی تصدیق

قرآنی اصطلاح میں ''تَاْوِيْل'' ایسی حقیقت کو کہتے ہیں جس پر کوئی حکم یا خبر یا ظاہری امر اعتماد کرے جیسا ظاہر کا سہارا باطن ہے اور مثال کا اعتماد تمثیل پر ہوتا ہے۔ فلاں بات کی تاویل ظاہر ہو گئی یعنی اس بات سے جو مراد لیا گیا تھا وہ سامنے آگیا۔ اس اعتبار سے اس آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ یہ لوگ جو کہتے تھے کہ قرآن افتراء ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھا گیا ہے، اس طرح جو لوگ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے تھے جبکہ قرآن نے ان پر حجت اور دلیل کو پورا پورا بیان کر دیا تھا اور ہر بات کی وضاحت دلیل و منطق کے ساتھ بیان کی گئی تھی وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس حقیقت کے بیان کے لئے قرآن کے بیانات اُتارے اور اس کے

احکام و قوانین کو تفصیل سے بیان کیا ان میں خوف اور اُمید دلائی گئی وہ حقیقت جو ان سب بیانات کے پس پردہ مد نظر تھے وہ قیامت کے دن سب کے لئے عیاں وظاہر ہو جائیں گے۔

ان منکرین کو یہ انتظار ہے کہ اللہ نے جن اہداف کی خاطر اس کتاب کو اُتارا ہے وہ سب کچھ عیاں ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہر گز ان دستورات پر عمل کرنے اور ان کی پیروی کرنے سے سرپیچی نہ کرتے لیکن قیامت کے دن جب حقیقت روشن ہو جائے گی اور جو کچھ قرآن میں بیان ہوا تھا وہ سب سامنے آجائے گا تو اس وقت جنہوں نے قرآن کو تسلیم نہ کیا اور قرآنی دستورات سے انحراف کیا اور رسولوں کے بھیجے جانے کا انکار کرتے رہے، شرائع اور الٰہی قوانین کو جھٹلاتے رہے وہ سب اس منظر نامہ کو دیکھ کر اعتراف کرلیں گے۔ جب وہ اس وقت کو دیکھیں گے کہ ان کا دامن خالی ہے تو رسولوں کی تصدیق کریں گے اور کہہ اُٹھیں گے کہ رسول جو کچھ لے کر آئے تھے وہ برحق تھا۔ اس وقت ناچار ہو کر یہ آرزو کریں گے کہ کیا کوئی ایسا سفارش کرنے والا اور واسطہ موجود ہے جو انہیں اس عذاب سے نجات دلا دے یا ایسا ممکن ہے کہ ہم ایک دفعہ واپس لوٹا دیے جائیں تاکہ سابقہ فاسد اور باطل اعمال کی جگہ نیک اور صالح اعمال بجالائیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ میں ان کی اس آرزو کے بارے یہ کہا جائے گا:

(سورہ مومنون، آیت ۱) ترجمہ: ”یہ تو زبان پر ایک بات ہے جس کو وہ لا رہے ہیں اگر انہیں واپس لوٹا دیا جائے تو وہ دوبارہ ان ہی اعمال کا ارتکاب کریں گے جو برے اعمال پہلے کرتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ اس مقام پر فرماتا ہے کہ ان دو موارد سے کچھ بھی ان کو حاصل نہ ہو گا کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچادیا اتنا سرمایہ ہاتھ سے وہ دے بیٹھے اور قیامت کے دن خالی ہاتھ آئے، انہوں نے خیالی معبودوں اور اللہ کے مقابل بناوٹی شرکاء گھڑ لئے تھے اور اللہ پر ان کے سہارے کا افتراء اور تہمت باندھتے تھے۔ آج وہ دیکھ لیں کہ ان کے بیان کا کوئی اثر و نشان نہیں ہے تاکہ کوئی ان کی شفاعت کرے، ان کے باطل اعتقادات ہی سبب بنے کہ وہ دُنیا

میں سعادت اور فلاح و کامیابی کے راستہ سے انحراف کر گئے اور قیامت میں خالی ہاتھ اور بے سہارا آگئے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے خسارہ کے ان کو کچھ اور نصیب نہیں ہو گا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۫ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۴﴾

"بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر قرار پکڑا، رات سے دن کو ڈھانپ دیتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آتا ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے اپنے حکم کے تابعدار بنا کر پیدا کیے، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا، اللہ بڑی برکت والا ہے جو سارے جہان کا رب ہے"۔

خلقت کائنات اور اقتدار الٰہی

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ تمہارا رب وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں خلق کیا ہے۔[1] "یوم" سے مراد زمان کا ایک حصہ، اس سے مراد مشخص اور معین دورانیہ ہے لہٰذا آسمانوں اور زمین کی شکل گیری اور ان کی خلقت کے بارے منصوبہ بندی اور تیاری مختلف مراحل میں مکمل ہوئی جس کی تفصیل سورہ حم، سجدہ میں بیان ہو گی انشاء

---

[1] ۔ (بعض علماء نے کہا ہے کہ چھ ایام سے اللہ کی قدرت نمائی کے چھ مرحلے یا علم کے چھ مراتب مراد ہیں: عَلِمَ (جانا)، شَاءَ (چاہا)، اراد (ارادہ کیا)، قدر (منصوبہ بندی کی، جائزہ لیا)، قضیٰ (فیصلہ دیا) امضٰی (فیصلہ کو نافذ کر دیا، جاری کر دیا)۔

اللہ۔ ”اسْتَوٰی“ کسی چیز پر تسلط، غلبہ اور استقرار حاصل ہونے کے معنی میں ہے۔ ”عَرْش“ ایسا تخت جس کے اوپر چھت ہو جس پر بادشاہ بیٹھتا ہے لیکن عرش الٰہی ایک ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کے ادراک سے انسان عاجز ہے وہ فقط اس کے نام سے آگاہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عرش الٰہی سے اللہ کا اقتدار اعلیٰ، اللہ کی کرسی جو کہ اقتدار مطلق سے عبارت ہے یا کواکب کا فلک مراد ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ میں جزئی اعمال میں بہت زیادہ تنوع ہوتا ہے اور ہر ایک حصہ کی جزئیات کے لیے علیحدہ مدیر و سرپرست ہوتا ہے اور اس کے منصب اور اس کی کرسی کا خاص عنوان اور نام بھی ہوتا ہے۔ مدبر کے لئے بھی اس کے کام کی مناسبت سے الگ عنوان دیا جاتا ہے تاکہ اس کی دوسروں سے پہچان رہے، پھر ان جزئیات کے مجموعہ کا ایک مدیر اعلیٰ ہوتا ہے جس کے تحت اس حصہ میں آنے والی تمام جزئیات کے مدیران شامل ہوتے ہیں۔ ان سب کا ایک مدیر اعلیٰ ہوتا ہے اس کا منصب اور اس کی کرسی سب عہدوں پر اور تمام عناوین سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ آخر میں جا کر اختیارات کا یہ سلسلہ بادشاہ یا حاکم کل پر منتھیٰ ہوتا ہے۔

دُنیاوی اصطلاح میں تمام ادارہ جات کے سربراہ کو صدر، وزیر اعظم یا بادشاہ کہتے ہیں اور جو تمام اقوام پر مشتمل ادارہ ہے جسے اقوام متحدہ کہتے ہیں اس کے سربراہ کو سیکرٹری جنرل یا صدر کہتے ہیں۔ ہماری بحث میں ان تمام مخلوقات کا مدیر و مدبر وہ ذات باری تعالیٰ ہے جسے صاحبِ عرش کہا جاتا ہے۔ عین کثرت میں وحدت کا اثر اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سب امور ایک نظم کے تحت ادارہ ہوتے ہیں۔ دُنیا کا جو نظام اعتباری اور قراردادی ہے یہ تکوینی اور کائنات کے نظم و نظام سے لیا گیا ہے۔ عالم وجود میں تمام جزئیات حوادث جزئی علل و اسباب سے مربوط ہیں جو خود ان ہی تک جا کر منتھیٰ ہو جاتے ہیں۔ وہ اسباب خود کچھ اور اسباب پر جا کر رکتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آخر کار تمام اسباب و مسببات ذات مقدس حق تعالیٰ

رب العالمین تک جا پہنچتے ہیں اور وہ ذات سب پر محیط ہے اس کا اپنے ملک پر مکمل غلبہ اور تسلط ہے، وہ اپنی ذات میں خود ہی قائم ہے اور وہ ماسوی اللہ جو کچھ ہے ان سب کا قیوم ہے۔ عالم ہستی اسی کے تحت باقی ہے لہٰذا عرش حقیقت میں عالم وجود کے مراحل سے ایک مرحلہ ہے کہ تمام حوادث اور اسماء ان حوادث کے وجود کی علت و سبب ہیں، ان کی لگام اور باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ سارے اسباب اپنے تمام مراحل سے گزرتے ہوئے مسبّب الاسباب ذات تک جا پہنچتے ہیں جو ذات باری تعالیٰ ہے۔

اس اعتبار سے " ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ " کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کا اپنے ملک و مملکت پر مکمل تسلط و غلبہ ہے۔ ان سب امور کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی موجود چھوٹا ہو یا بڑا وہ اس کی تدبیر کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ ایک دقیق نظام کے تحت ان سب کو مرتب و منظّم کرتا ہے اور ہر موجود کو اس کی شان کے مطابق کمال تک پہنچاتا ہے۔ سورہ یونس، آیت: ۳ میں "استواء" کو ذکر کرنے کے بعد "یدبر الامر" کا جملہ ذکر ہوا ہے۔ اس آیت میں پہلے والے اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔

رات کو دن کے ذریعہ چھپاتا اور ڈھانپتا ہے اور دن تیزی سے رات کا پیچھا کر رہا ہے تاکہ وہ بھی رات کو ڈھانپ لے۔ اس جملہ میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ اصل تاریکی ہے اور دن کا نور ایک عارضی چیز ہے جو سورج کی شعاعوں سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا دن ہمیشہ رات پر عارض ہوتا ہے۔ ظلمت و تاریکی مخروطی شکل میں ہمیشہ کرۂ ارض کے آدھے حصے کو چھپا لیتی ہے کیونکہ سورج کا نور زمین کی سطح میں ہمیشہ حرکت کی حالت میں ہے۔ حتمی طور پر مخروطی شکل کی ظلمت و تاریکی بھی حرکت میں رہتی ہے گویا ہمیشہ دن کی تعقیب اور اس کا پیچھا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔

پھر فرمایا: سورج، چاند اور ستارے سب اللہ کی مخلوقات ہیں، سب اللہ کے امر کے تحت ہیں، اسی کے حکم کے مطابق رواں دواں ہیں، یہ سب "ثم استویٰ علی العرش" والے جملہ کی تفسیر ہے۔

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: " اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ" خلق کا معنی اندازہ گیری اور تشخیص کے ہیں، کسی چیز کو ترتیب سے تیار کرنا۔ اسی غرض سے کہ اس سے دوسری چیز کو تیار کیا جائے۔ اگرچہ دینی اصطلاح میں بغیر پہلے نمونہ کے تحت کسی چیز کو وجود میں لانے کو کہا جاتا ہے۔

امر شان کے معنی میں ہے اسی طرح دستور اور حکم دینے کے معنی میں بھی ہے۔ مامور کو اس پر آمادہ کرنا کہ جو اسے کہا گیا ہے اس کے مطابق وہ اسے انجام دے۔ امر نتیجہ پر بھی بولا گیا اس سے مراد وہ نظام ہے جو مامور کے تمام اعمال اور حیات کے تمام مظاہر میں موجود ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر چیز کے بارے امر و شان وہ حقیقت ہے جو اس کے وجود کی اصلاح اور اس کی حرکات و سکنات کو تنظیم کرتی ہے، نظم دیتی ہے، اور یہ بات کہ انسان کا امر اس کے رب کے ہاتھ میں ہے یعنی انسان کی زندگی کے تمام شئون و کیفیات کا مدبر رب تعالیٰ ہے اور تمام انبیاء کا ایجاد کرنے والا اور بھیجنے والا بھی اللہ ہے، سب کو وجود عطاء کیا ہے اس لئے سب کا مالک وہی ہے اور تمام دینی مخلوقات کا مدبر بھی خود ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے امر کے بارے اور اس کی کیفیت بارے سورۂ یٰس کی آیت ۸۲ میں بیان کیا ہے: اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۸۲ " جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اتنا ہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے "

اس آیت میں وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے افعال، آثار اور صفات کا مالک ہے۔ کلمہ "کُنْ" ایسا وجود ہے کہ جس چیز کے لیے ارادہ کرے تو وہ موجود ہو جاتی ہے

یعنی کلمہ "کُنْ" کہنے سے اس شئی کے لئے وجود سے ایک حصہ دے دیا جاتا ہے، اضافہ کر دیا جاتا ہے لہٰذا امر وہی ایجاد ہے چاہے وہ شئی اور چیز کی ذات سے تعلق پکڑے اور چاہے صفات و افعال سے تعلق پکڑے؛ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ جس طرح خود موجود کی ذات کے بارے امر اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کے وجود بارے نظام و ضابطہ کار بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ امر کا خلق سے فرق یہ ہے کہ امر میں تدریج اور مرحلہ وار ہونے کا تصور نہیں۔ امر عین وجود ہے جبکہ خلقت میں منصوبہ بندی ہے اندازہ گیری ہے، تدریج ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾

"اپنے رب کو عاجزی اور چپکے سے پکارو، اسے حد سے بڑھنے والے پسند نہیں آتے"۔

اللہ کو پکارنے کا طریقہ

"تضرع" ضراعۃ سے ہے اس کا معنی کمزوری اور ذلت کا اظہار ہے۔ "خفیۃ" کسی امر کو پوشیدہ اور مخفی رکھنا کیونکہ جو شخص متزلزل اور بے تاب ہے وہ ہمیشہ ذلت و خواری کے نتیجہ میں اپنے آپ کو چھپانے اور خفیہ رکھنے کے درپے رہتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت ان دو چیزوں کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ذلت و خواری کی حالت میں پکارو اور دعا کی حالت کو چھپاؤ۔ یہ آیت اور بعد والی آیت ربوبیت اور خالقیت میں اللہ کی توحید کو ثابت کر رہی ہے۔ اس کا معنی یہ بنتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خلقت اور تدبیر میں لاشریک ہے تو ہر بندہ پر لازم ہے کہ وہ فقط اللہ کو پکارے اور اللہ کی بندگی کرے۔ اور دستور دیا ہے کہ دعا والی عبادت کو تضرع و زاری سے انجام دے اور یہ دعا مانگنا آشکارا ہونے کی بجائے پوشیدہ اور خفیہ طریقہ سے ہو۔ آہستہ آہستہ پکارے، زور زور سے، شور مچا کر نہیں جو کہ عبودیت اور روش بندگی کے منافی ہے۔ بندہ اپنے مالک کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہوتا ہے اور

رو رہا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی خطاؤں کو ایک ایک کرکے یاد کرتے ہوئے معافی مانگ رہا ہوتا ہے۔ اللہ کے حضور اس سے بڑھ کر ادب و آداب کا لحاظ رکھا جائے۔

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

"اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو اور اسے ڈر اور طمع سے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے"۔

زمین میں فساد پھیلانے سے منع

اس آیت میں دو مطالب بیان ہوئے ہیں:۔

۱۔ لوگوں کا آپس کا رابطہ امن و آشتی اور اصلاح پر مبنی ہو تاکہ معاشرہ میں پیار و محبت اور ہم آہنگی کی فضاء برقرار رہے، کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے اور نہ ہی کسی پر ظلم کیا جائے۔ تقویٰ کو اپنائیں کیونکہ اسلامی سوسائٹی میں دین نے آپس کے حقوق کی بابت جو ہدایات دی ہیں اس میں انسانی زندگی کے بارے اصلاح اور درستگی کے سوائے اور کچھ بھی مد نظر نہیں۔

۲۔ دوسرا امر یہ ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، فتنہ اور انتشار نہ پھیلائے، فساد سے امن تباہ ہوتا ہے ہر شخص بے سکون ہوتا ہے۔ اسلام لوگوں کے لئے آسائش و سکون و امنیت چاہتا ہے۔

اللہ سے انسان کا رابطہ

اس آیت میں ایک اہم حکم یہ دیا ہے کہ سب اپنے مالک و خالق رب تعالیٰ سے رابطہ میں رہیں، اسی سے اُمید لگائیں، غیر خدا سے رابطہ نہ رکھیں۔ فقط اللہ تعالیٰ سے مانگیں،

لوگوں کا اللہ سے رابطہ خوف و رجاء پر مبنی ہو، ڈر اس بات کا ہو کہ اگر مجھ سے خطاء ہو گئی، معصیت کا ارتکاب کر لیا تو اس پر میری پکڑ ہو گی اور سزا ملے گی۔ اس طرح اللہ کے عذاب کا خوف اس پر ہمیشہ طاری رہے اور رجاء یہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے وہ کریم ہے، اپنی کریمی سے سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اس لئے مجھے بھی یہ اُمید ہے کہ وہ میری کوتاہیوں کو معاف کر دے گا، مجھ پر اپنا فضل و کرم فرمائے گا اور میرے گناہوں کی مجھے معافی دے گا اور میرا مواخذہ نہ کرے گا۔

اللہ رب الارباب ہے، عبادت فقط اسی کے لئے ہے، اگر عبادت عقاب کے خوف سے ہو گی تو نااُمیدی سے دوچار ہو گا، بالآخر یہ نااُمیدی عبادت چھوڑنے کا سبب بن جائے گی اور اگر عبات ثواب کے طمع و لالچ سے ہو گی تو انسان اس سے جری ہو جائے گا اور عبودیت کی روش سے نکل جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اللہ کو خوف اور رجاء کی حالت میں پکارو'' یعنی دعا والی عبادت خوف و رجاء کی حالت میں بجالائی جائے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خوف و رجاء کی حالت میں ہوتا ہے، اسے نافرمانی پر اللہ کے عذاب کا خوف رہتا ہے اور نیک اعمال بجالانے پر اللہ کے ثواب و مغفرت اور رحمت کی اُمید ہوتی ہے۔ یہ دو حالتیں دوسرے مفاسد کی تلافی کا سبب بنتی ہیں۔ اس قسم کی عبادت عدل پر مبنی ہے اور فساد سے دور ہے۔ اللہ کی رحمت کے متعلق سوال پر بتا دیا گیا کہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں اور صالحین کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عبادت میں اعتدال اور فساد سے دوری اختیار کرنے کو احسان قرار دیا ہے جو ان دستورات کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت کو قبول کرتے ہیں وہی نیکوکار ہیں اور اللہ نیکوکاروں کے قریب ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور وہی ہے جو مینہ سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالاتی ہیں تو ہم اس بادل کو مردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر ہم اس بادل سے پانی اتارتے ہیں پھر اس سے سب طرح کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو''۔

اللہ کی ربوبیت پر دلیل

یہ آیت خلائق کے مرنے کے بعد واپس پلٹنے کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی دلیل کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ جس طرح آیت ۵۲ میں آغاز آفرینش کو ربوبیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ''بُشْرًا'' بشیر کی جمع ہے جس کا معنی بشارت دینے والا ہے۔ اس جگہ رحمت سے بارش مراد ہے۔ (بین یدی رحمته) اللہ کی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے۔ اس کے آگے آگے، بارش اترنے سے پہلے۔ ''اقلال'' اٹھانے کے معنی میں ہے۔ '' سحاب'' بادل کو کہا جاتا ہے۔ بادل کا بھاری ہونا اس پانی کی وجہ سے جسے بادل نے اٹھا رکھا ہوتا ہے۔ ''بَلَدٍ مَّیِّت'' سے خشک اور ویران زمین مراد ہے جس پر کھیت موجود نہ ہو۔

اس آیت میں مردوں کو زندہ کرنے کے لئے ویران اور بے آب و گیاہ زمین کے بارش کے برسنے سے آباد اور سرسبز و شاداب ہونے کو دلیل بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

احیاء اموات، احیاء زمین کی مانند ہے کیونکہ مردہ انسان کی اصلیت ختم نہیں ہوتی تاکہ ایک محال امر کو زندہ کرنا لازم آئے اور یہ کہا جائے کہ معدوم کا اعادہ تو نہیں ہو سکتا بلکہ انسان جو مر چکا ہے تو اس کی روح زندہ اور موجود اور محفوظ ہے۔ فقط اس کے بدن کے اجزاء متلاشی ہوئے ہیں۔ کامل انسانوں کا تو جسم بھی صحیح و سالم حالت میں موجود رہتا ہے جیسا کہ بعض شہداء کے جسموں کا مشاہدہ ہمارے دور میں بھی ہوا ہے کہ ایران عراق جنگ میں شہید ہونے والے فوجیوں میں سے بعض کی جب لاشیں ملیں تو کئی سال گزرنے کے باوجود ان کا جسم اپنی اصلی حالت میں موجود تھا اور ان کے جسم پر فوجی وردی بھی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح موسم خزاں میں زراعت اور کھیت کے پودے خشک ہو جاتے ہیں اور بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن ان کی نباتاتی روح باقی ہوتی ہے اس لحاظ سے معاد کا مسئلہ فصل بہار میں نباتات کے زندہ ہو جانے کے ساتھ بالکل مشابہت رکھتا ہے۔ فقط یہ فرق ہے کہ قیامت کے دن بعث کلی ہو گی سب کو اٹھایا جائے گا لیکن نباتات کا دوبارہ زندہ ہونا، سرسبز و شاداب ہونا جزئی ہے جس کا ہر سال تکرار ہوتا ہے۔[1]

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

---

1 - عام انسان کے لیے نباتات کا خشک ہونے کے بعد دوبارہ تروتازہ ہونا ایک سادہ اور معمولی امر ہے جبکہ یہ امر بہت عظیم ہے اور خلقت کے معجزات سے ہے۔ (مترجم)

''اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ اس کے رب کے حکم سے نکلتا ہے، اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے وہ ناقص ہی ہوتا ہے، اسی طرح ہم شکر گزاروں کے لیے مختلف طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں''۔

زرخیز اور بنجر زمین میں فرق

'' نَكِدًا '' کم اور تھوڑا کے معنی میں ہے۔ اس آیت کا ایک ظاہری معنی ہے کہ زرخیز زمین اور بنجر زمین دونوں پر بارش کا پانی برستا ہے لیکن زرخیز زمین سے نباتات اُگتی ہیں، لہلہاتے کھیت تیار ہوتے ہیں جبکہ بنجر زمین سے فقط معمولی سی کچھ جھاڑیاں اُگتی ہیں، اس پر ویرانی باقی رہتی ہے۔ جو زمین زرخیز ہے اس میں مختلف انواع و اقسام کے گھاس، پھل، میوہ جات کے درخت اُگتے ہیں۔ اس ظاہری معنی کے علاوہ اس آیت کا ایک عمیق تر معنی اور وسیع تر مفہوم بھی ہے۔ آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پاکیزہ اور نیک اعمال اور ان کے پاکیزہ اثرات پاک گوہر اور پاکیزہ سرچشمہ سے صادر ہوتے ہیں اس کے برعکس پلید، نجس اور گھٹیا اعمال اور بے اثر اعمال خبیث باطن سے صادر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فیض کو قبول کرنے میں مختلف ہیں اور یہ اختلاف خود ان کی اپنی ذات کی طرف سے ہے ورنہ اللہ کی رحمت عام اور مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنی آیات کو اپنے شکرگذار اور کفرانِ نعمت نہ کرنے والے بندوں کو پیش کرتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

”بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا پس اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں“۔

حضرت نوحؑ کی دعوت

نوحؑ کی قوم مشرک اور بت پرست تھی اور نبوت کے انکاری تھے۔ حضرت نوحؑ نے کہا اے میری قوم! خود کو قوم کا حصہ قرار دیا تاکہ وہ ان کی بات کو بہتر انداز سے سنیں اور ان کی نصیحت اور خیر خواہی کو قبول کرلیں۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دی، بتوں کی پرستش سے روکا اور واضح کہا کہ اللہ کے سواء کوئی بھی دوسرا معبود نہیں ہے اور ہر شریک کو اللہ سے نفی کردیا۔ اس کے بعد ان کو ڈرایا اور دھمکایا کہ دیکھو اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا تو پھر قیامت کے دن عذاب میں جھونکے جاؤ گے۔ اس ایک ہی عبارت میں انہیں توحید کی دعوت بھی دی اور اسی کے ساتھ معاد اور قیامت کا بھی بتادیا اور قیامت کو قبول کرنے کی دعوت بھی دے دی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾

”اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے صریح گمراہی میں دیکھتے ہیں“۔

قومِ نوحؑ کے بڑوں کا جواب

”مَلَاء“ قوم کے بڑے، اشراف اور نامور لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے رعب، دبدبہ، زینت اور ظاہری نمود سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور قوم میں بڑے بن کر رہتے ہیں، لوگ ان کا خاص احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ اے نوحؑ! توں ہمیں اللہ واحد کی طرف دعوت دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو الٰہ

قرار نہ دیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اے نوحؑ! تو کھلی گمراہی میں ہو۔اس طبقہ والوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی آجائے گا جو ان کے معبودوں کو جھٹلائے گا اور ان کے بتوں سے ٹکرا جائے گا اور انہیں خطاء کار قرار دے گا۔ اس لئے انہوں نے بڑی قاطعیت کے ساتھ حضرت نوحؑ کی دعوت کو ٹھکرادیا۔

قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۱﴾

"فرمایا اے میری قوم! میں ہرگز گمراہ نہیں ہوں لیکن میں جہان کے پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں"۔

اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنۡصَحُ لَكُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

"تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

نوحؑ کا اپنی قوم کو جواب

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے بڑوں کی بات کی تردید کی اور فرمایا: میں تمہارے پاس اللہ کا رسول ہوں، اللہ کی طرف سے پیغامات لاتا ہوں، میرے اندر کچھ گمراہی نہیں ہے۔اس جگہ حضرت نے اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کے وصف سے پیش کیا ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ جھگڑا ربوبیت میں تھا اس دور کے لوگ اللہ کے سواء مختلف معبودوں کے لئے مختلف کاموں کی نسبت دیتے تھے اس طرح کئی معبود بنا رکھے تھے۔ سمندروں اور زمینوں کے لئے الگ الگ رب کے قائل تھے۔ آپؑ نے اپنے بیان کے بارے کوئی تائیدی جملہ پیش نہیں کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو یہ بات سمجھا دیں کہ ان کا گمراہ نہ ہونا اور ان کا رسول اللہ ہونا اتنا واضح ہے کہ اس پر نہ قسم اٹھانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی قسم کی تاکید کرنے کی

ضرورت ہے۔ بلکہ سادی سی بات ہے کہ میرے کلام میں، میرے رویوں میں کچھ بھی گمراہی نہیں ہے، سب کچھ ہدایت پر مبنی ہے۔

آپ نے اپنی بات کی تفصیل اس طرح بیان کر دی کہ:

پہلی بات یہ ہے کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پیغام رسانی کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اللہ کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں۔ ''رسالات'' جمع ''رسالۃ'' ہے اس جگہ جمع کا صیغہ لایا گیا تاکہ یہ سمجھا دیا جائے کہ اس کا پیغام فقط توحید اور معاد پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں احکام، قوانین اور شرائع بھی موجود ہیں۔ حضرت نوحؑ اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں اور صاحب شریعت ہیں۔

دوسری بات اپنی قوم سے یہ کہی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اس لئے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں اور تمہیں وعدہ اور وعید دیتا ہوں تاکہ فقط اللہ کی عبادت کرو۔

تیسری بات یہ کہی کہ میں اللہ کی جانب سے جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے ہو جیسے قیامت کے دن وقوع پذیر ہونے والے حالات، آغاز خلقت، خلقت کا انجام، اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے جس کا علم اللہ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾

''کیا تمہیں اس بات سے تعجب ہوا کہ تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کی زبانی تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ اور تاکہ تم رحم کیے جاؤ''۔

نوحؑ کا اپنی قوم کو بات سمجھانا

حضرت نوحؑ نے پہلے تو اپنا تعارف کروا دیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میرے پاس اللہ کے پیغامات ہیں، میں اللہ کے پیغامات کو پہنچاتا ہوں۔ میرے پاس اللہ کا دیا ہوا علم ہے۔ میں ایسے امور سے آگاہ ہوں جس سے تم آگاہ نہیں ہو۔ لہٰذا میں گمراہی پر نہیں ہوں میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہارے بارے مجھے خوف ہے کہ اگر تم نے اللہ کے سواء دوسروں کی پرستش کو ترک نہ کیا اور اللہ کو لاشریک نہ جانا تو قیامت کے دن تمہیں عذاب ہوگا۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی قوم سے ایک سوال کر ڈالا:

"کیا تم اس لئے حیرت میں ہو کہ تم میں سے ایک مرد پر اللہ کا پیغام اُترا ہے۔ سوال انکاری ہے یعنی یہ تو کوئی حیرت والی بات نہیں اس امر پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اللہ کا رسول خود تم ہی میں سے ایک ہے"۔

ذکر سے تمام وہ معارف مراد ہیں جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس بھیجے گئے۔

حضرت نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ اس حوالے سے تمہارا اعتراض بے جا ہے۔ اس کے بعد تین جملے ہیں جو سب "جَآءَكُمْ" سے متعلق ہیں۔

۱۔ " لِيُنْذِرَكُمْ " تمہارے پاس خود تم سے ایک عبد پر اللہ کا ذکر نازل ہوا تا کہ وہ تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈرائے۔

۲۔ " تَتَّقُوْا " اس لئے کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

۳۔ " لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ " اس پیغام کو سن لو اور مان لوگے تو اللہ کا آپ پر رحم و کرم ہوگا کیونکہ فقط تقویٰ اور خدا خوفی ہی اللہ کی رحمت انسان کو ملنے کا سبب بن سکتی ہے اور اس کی نجات کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ حضرت نوحؑ کا یہ بیان اللہ کے بلند معارف کا اجمال ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

''پھر انہوں نے اسے جھٹلایا پھر ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو کشتی میں بچالیا اور جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے انہیں غرق کر دیا، بے شک وہ لوگ اندھے تھے''۔

نوحؑ کی دعوت کو جھٹلانے کا انجام

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو بہترین طریقے سے اور مضبوط دلائل سے سمجھایا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں، اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہ بنائیں۔ لیکن نوحؑ کی قوم نے حضرت نوحؑ کی دعوت پر کان نہ دھرا، انہیں جھٹلایا، اللہ کی آیات کا انکار کر دیا۔ بار بار یاد دھانی کروانے کے باوجود انکار پر ڈٹے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو غرق کرنے کا فیصلہ کیا، پانی کا طوفان بھیج دیا اور حضرت نوحؑ کو ایک کشتی میں بیٹھنے کا حکم دیا اور اس کشتی میں ان کو بٹھانے کا حکم دیا جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا تھا اور ہر جاندار کا ایک جوڑا بھی اس کشتی میں سوار کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح بتا دیا ہے کہ ہم نے حضرت نوحؑ کو نجات دے دی اور اس کی قوم کو غرق آب کیا کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول نہ کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو اس کی سزا انہیں دی گئی۔ قوم نوحؑ کور دل تھی، آنکھیں رکھتے ہوئے اندھی تھی، حق کا ادراک نہ کر سکے اور نہ ہی حق بات پر کان دھرے تو پھر اللہ نے انہیں غرق کر دیا۔ مشرکین مکہ کو اس واقعہ سے خبر دار کیا کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ
غَیۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۵﴾

''اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، سو کیا تم ڈرتے نہیں''۔

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا
لَنَظُنُّكَ مِنَ الۡكٰذِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

''اس کی قوم کے کافر سردار بولے کہ ہم تو تمہیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ہم تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں''۔

ھودؑ کا اپنی قوم میں پیغام الٰہی پہنچانا

''اخ'' بھائی کے معنی میں ہے لیکن ایک قوم و قبیلہ کے افراد کو بھی بھائی بولا جاتا ہے جو کسی ایک ہدف و مقصد کے تحت کام کرتے ہیں۔ ایک شہر والوں کو بھی بھائی کہا جاتا ہے۔اس آیت میں اسی معنی میں ہے کہ ھود اسی قوم سے تھے اس لئے کہا گیا کہ ھود ان کے بھائی تھے یعنی ان کی قوم کے فرد تھے انہیں ان کے پاس پیغام دے کر بھیجا گیا۔ حضرت ھودؑ کی دعوت کا محور توحید اور شرک کی نفی تھا۔ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دینے کے بعد انہیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ تم فطرت کے تقاضوں کے مطابق کیوں نہیں چلتے ہو؟ خدا وحدہ لاشریک کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟ اور یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا صحیح نہیں ہے۔

ھودؑ کی دعوت کا جھٹلایا جانا

جس طرح حضرت نوحؑ کی قوم کے بڑوں نے آپ کو جھٹلایا اسی طرح حضرت ہود کی قوم کے بڑے جو کافر تھے انہوں نے حضرت ہود کی دعوت پر پہلے تو یہ کہا کہ تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، دیوانوں کی طرح ہو، تمہاری گفتگو عاقلانہ نہیں، سمجھداری سے دُور ہو۔ البتہ اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ ھود کی قوم کے وہ بڑے جو کافر ہو گئے اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت ھود پر ایمان لا چکے تھے لیکن انہوں نے اپنے ایمان کو مخفی رکھا ہوا تھا جبکہ حضرت نوحؑ کی قوم میں اکثریت کافر تھی اور بہت کم تعداد ایمان لائے تھے، وہاں پوری قوم کے متعلق کہا گیا۔

اس جگہ قوم کے بڑوں کی بات کی کہ قوم کے وہ بڑے جو کافر تھے اس کا مطلب ہے کچھ بڑے ایسے تھے جو مومن تھے۔ قوم کے بڑوں کی سرشت میں بت پرستی تھی ان کے نزدیک ان کے بت محترم تھے۔ ان کی تعظیم کرنا ہر ایک پر فرض تھا لہٰذا جو بتوں کے خلاف بات کرتا یا انہیں بت پرستی سے منع کرتا تو وہ انہیں برا لگتا، وہ اسے اپنی نگاہ میں بے وقوف اور بے عقل قرار دیتے۔ اس جگہ اُنہوں نے حضرت ھودؑ کی طرف دو باتوں کی نسبت دی، اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

۱۔ تم ایسی دعوت دے رہے ہو جس سے پتہ چلتا ہے کہ تم بے وقوف و بے عقل ہو، پاگلوں والی باتیں کر رہے ہو۔

۲۔ حضرت ہودؑ کی طرف جھوٹ کی نسبت دی کہ تم جو دعوت دے رہے ہو یہ جھوٹ پر مبنی اور غیر واقعی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾

''کہا اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں بلکہ میں پروردگار عالم کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں''۔

ھودؑ کا اپنی قوم کے بڑوں کو جواب

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم کے بڑوں کا جواب بہت ہی نرم لہجہ میں دیا اور قوم کی ہمدردیاں لینے کے لئے کہا اے میری قوم! میں دیوانہ نہیں ہوں، مجھے پاگل مت سمجھو، جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ میری اپنی جانب سے نہیں ہے بلکہ یہ تو رب العالمین کا پیغام ہے، مجھے رب العالمین نے اس پیغام کے لئے نمائندگی دی ہے۔ میں رب العالمین کی جانب سے پیغام رساں ہوں اور رسول ہوں جو تمہیں سنانے کے لئے آیا ہوں۔ حضرت ھودؑ نے نبوت کے وقار اور عظمت کا لحاظ رکھا اور قوم کے بڑوں نے آپ کی طرف جس طرح کم عقلی اور جھوٹ کی نسبت دی آپ نے ویسا نہیں کیا کہ انہیں برا کہتے؛ اس میں :۔

۱۔ آپ نے ان کی جانب سے جاہلانہ انداز اپنانے پر انہیں برا نہیں کہا نہ ہی ان کی مذمت کی۔ ان کی اس بات کا بہت ہی پیارے انداز سے جواب دیا کہ میں بے عقل نہیں ہوں بلکہ

۲۔ میں رب العالمین کا پیغام رساں ہوں۔

اس طرح آپ نے سمجھا دیا کہ اللہ رب العالمین ہے، ساری کائنات کا نظم اسی کے ہاتھ میں ہے، مجھے اس نے پیغام رسانی کی ذمہ داری دی ہے، وہی پیغام میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾

''تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں''۔

ھودؑ کا اپنی رسالت کا اعلان

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تو رب العالمین کا رسول ہوں، میرے پیغامات اللہ کی طرف سے ہیں۔ آپ نے واضح کیا کہ میرا کام سوائے پیغام رسانی کے اور کچھ نہیں۔ اپنے رب کے پیغامات کو لوگوں تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے جو کچھ تم میرے بارے کہہ رہے ہو میں ان باتوں سے مبرا ہوں۔ میں تمہیں دعوت دینے میں خائن نہیں ہوں۔ میرا مقصد تمہاری خیر خواہی کے سواء اور کچھ نہیں، جو کچھ میرے رب کے پیغامات ہیں میں انہیں بغیر کم و زیادہ کئے پوری امانت داری سے آپ تک پہنچاتا ہوں۔ قوم کے بڑوں نے آپ کو جھوٹا کہا تھا تو اس کے جواب میں کہا کہ میں امین ہوں، خائن اور جھوٹا نہیں ہوں۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

"کیا تمہیں تعجب ہوا کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں میں سے ایک مرد کی زبانی تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تاکہ تمہیں ڈرائے، اور یاد کرو جب کہ تمہیں قوم نوح کے بعد جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تمہیں زیادہ پھیلاؤ دیا، سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ"۔

ھودؑ کا اپنی قوم کی حیرانگی کا جواب

حضرت ھودؑ نے قوم کا اس بارے حیرت میں پڑنا کہ ان کے درمیان سے ایک آدمی کو کیوں رسول بنایا گیا ہے اور اس کے پاس اللہ کے پیغامات کیوں آتے ہیں، دو ایسی نعمات کا تذکرہ کیا ہے جو بہت ہی واضح اور روشن تھیں:۔

ا۔ حضرت نوحؑ کی قوم کو تباہ اور غرق آب کرنے کے بعد انہیں ان کا جانشین و وارث بنایا۔

۲۔ انہیں بدنی طور پر مضبوط اور قوی ہیکل بنایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ھودؑ کی قوم متمدن تھی، ان کا اپنا تمدن تھا اس لئے ان سے کہا کہ ”تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان سے ایک آدمی کو الٰہی معارف کی تعلیم اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے تمہارے پاس بھیجا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فراوان اور کثیر نعمات سے نوازا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تم ان نعمات کو یاد کرو تاکہ اس طرح تم کامیاب ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کا ذکر ہی تنہا کامیابی کا راستہ ہے۔ اس بیان میں ان کی جسمانی مضبوطی کا تذکرہ ہے اور کہا گیا ہے کہ تم اللہ کی نعمات کو یاد کرو۔“

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

”انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم ایک اللہ کی بندگی کریں اور ہمارے باپ دادا جنہیں پوجتے رہے انہیں چھوڑ دیں، پس وہ چیز لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے“۔

قومِ ھودؑ کا مطالبہ

حضرت ھودؑ کی دعوت سننے اور ان کی بات کو سمجھنے کے بعد ان کی قوم نے حضرت ھودؑ سے کہا کہ ہم نے تیری بات کو سمجھ لیا ہے کہ تم ہم سے یہ چاہ رہے ہو کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طریقہ کو چھوڑ دیں اور فقط ایک اللہ کی عبادت کریں تو ایسا تو ہم نہیں کر سکتے، باقی رہا یہ کہ اگر ہم تمہاری دعوت کو قبول نہ کریں گے تو ہمارے اوپر عذاب آئے گا، ہم ناکام ہوں گے تو پھر تم جس عذاب سے ہمیں ڈرا رہے ہو وہ عذاب ہمارے اوپر لے آؤ۔ اس طرح حضرت ھودؑ کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور چیلنج بھی کر دیا کہ اپنی سچائی ہمارے اوپر عذاب منگوا کر ثابت کرو۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

"فرمایا تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غصہ واقع ہو چکا، مجھ سے ان ناموں پر کیوں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے مقرر کیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری، سو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں"۔

اپنی قوم کے مطالبے پر ھودؑ کا جواب

"رجس" اور "رجز" ایسی چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کے ساتھ ٹکرائے تو اسے دُور پھینکنا پڑتا ہے۔ اس جگہ رجس سے عذاب الٰہی مراد ہے۔ جب قوم نے ھودؑ سے عذاب کا مطالبہ

کیا تو آپؑ نے ان سے کہا تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہارے اوپر اللہ کا عذاب حتمی ہو چکا ہے۔ تم نے پتھروں اور لکڑیوں سے جو بت بنا رکھے ہیں پھر خود تم اور تمہارے آباء نے ان میں سے ہر ایک کے لئے نام رکھ دیا ہے ایک کو جنگ کا خدا، دوسرے کو صلح کا خدا، ایک کو دریاؤں کا خدا، ایک کو خشکی کا خدا، پھر تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل و ثبوت موجود نہیں ہے کہ جس میں ان بتوں کی الوہیت اور شفاعت کا مالک قرار دیا ہو اور ان بتوں کی الگ الگ تاثیر قرار دی ہو۔ یہ بات خود ایک مضبوط اور محکم دلیل ہے کہ یہ سارے بت الوھیت کے لائق نہیں۔

آپ نے فرمایا: اے میری قوم! یہ سارے بت درحقیقت تمہارے اوہام و خیالات کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ آخر میں واضح کر دیا کہ عذاب نے تو آنا ہی ہے لیکن اس کے آنے کے وقت کا علم فقط اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ لہٰذا تم بھی اس وقت کا انتظار کرو میں بھی اس وقت کا انتظار کرتا ہوں، تمہیں عذاب کے آنے کی جلدی ہے لیکن عذاب کا وقت معین وہ ہے اسی وقت میں ہی آئے گا۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٢﴾

”پھر ہم نے بچا لیا اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے، اور جڑ کاٹ دی ان کی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، اور وہ مومن نہیں تھے“۔

قومِ ھودؑ پر عذاب الٰہی

اس آیت میں ”رحمة“ کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس رحمت سے مراد عام رحمت نہیں جو مومن و کافر سب کو شامل ہے بلکہ اس رحمت سے خاص

رحمت مراد ہے جو فقط مومنین کے لئے ہے اور یہ مومنین سے الٰہی وعدہ ہے کہ مومنوں کو کافروں پر غلبہ دیتا ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ (سورۂ مومن، آیت: ۲۱)

ترجمہ: ''ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی دنیاوی زندگی میں بھی مدد کرتے رہیں گے اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے''۔

''دابر'' کسی چیز کے پچھلے حصے کو کہا جاتا ہے، انسان کی نسل اس کی پشت سے ہوتی ہے اس لئے ان پر قوم کی دابر (نسل) بولا گیا ہے۔ ''قَطَعْ دَابِر'' کا مطلب ہے کہ انہیں اکٹھا ہلاک کیا گیا اور سب کے سب عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گئے۔ ان پر نجاست برسائی گئی، بدبو مسلط کی گئی، نہ خود بچے اور نہ ہی ان کی نسل بچی۔ ان پر عذاب کے نازل ہونے اور ان کی نسل کے منقطع ہونے کی وجہ ان کا آیات الٰہی کی تکذیب کرنا اور ایمان نہ لانا تھی۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

''اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہیں تمہارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے، سو اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین

میں کھائے، اور اسے بری طرح سے ہاتھ نہ لگاؤ ورنہ تمہیں دردناک عذاب پکڑے گا"۔

قومِ ثمود کا تذکرہ

ثمود عربوں میں ایک قدیمی قوم تھی جو یمن کے علاقے احقاف میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان حضرت صالحؑ کو مبعوث فرمایا۔ وہ لوگ بت پرست تھے۔ حضرت صالحؑ نے انہیں توحید پرستی کی دعوت دی، انہیں شرک سے روکا اور ان سے کہا میں تمہارے درمیان ایک واضح اور کھلا معجزہ اور مضبوط دلیل لے کر آیا ہوں۔ بعد والے جملے میں اس واضح ثبوت کو بیان کیا کہ وہ معجزہ اونٹنی ہے جو اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ہے، آپ نے اسے پہاڑ کے اندر سے نکالا۔ اسی وجہ سے اسے اللہ کی اونٹنی کہا گیا (طبیعی طریقہ سے پیدا ہونے والا اونٹ نہیں تھا بلکہ پہاڑ کی کوکھ سے حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کے اذن سے اسے نکالا تھا) اگلا جملہ کہ آپ اسے کھلا چھوڑ دیں اور اس کے چرنے کے مانع نہ ہوں۔ اللہ کی زمین وسیع ہے جہاں چاہے جائے اور چرے۔ اس سے لگتا ہے کہ قوم ثمود کو یہ بات پسند نہیں تھی ۔ پھر حضرت صالحؑ نے انہیں دھمکی دی کہ اگر تم نے اسے نقصان پہنچایا (یعنی کسی نے اگر اسے مار دیا) تو پھر تم دردناک عذاب میں مبتلاء ہوگے۔ یہ دھمکی اس لحاظ سے تھی کہ اگر تم نے اللہ کے فرمان کی مخالفت کی تو پھر عذاب الٰہی تمہارے اوپر ٹوٹ پڑے گا۔

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُہُوۡلِہَا قُصُوۡرًا وَّ تَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُیُوۡتًا ۚ فَاذۡکُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰہِ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۷۴﴾

"اور یاد کرو جب کہ تمہیں عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں جگہ دی کہ نرم زمین میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو، سو اللہ کے احسان کو یاد کرو اور زمین میں فساد مت مچاتے پھرو"۔

اپنی قوم کو صالحؑ کا تذکر

اس بیان میں حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو جو باتیں یاد دلائیں اور ان کا تذکرہ کیا ان نعمات میں سے پہلی نعمت یہ تھی کہ قوم عاد اور دیگر اقوام کا انہیں جانشین بنایا۔

دوسری بات انہیں ایک وسیع تر زمین میں سکونت دی۔

تیسری بات یہ تھی کہ انہوں نے اس ہموار اور مسطح زمین پر اپنے لئے بڑی بڑی رہائش گاہیں بنائیں، برج تیار کئے۔

چوتھی بات انہوں نے پہاڑ تراش کر ان میں گھر بنائے۔ پہاڑوں کی غاروں میں پناہ لیتے اور زندگی گزارتے تھے۔ پھر اللہ کی تمام نعمات کو ایک جملہ میں کہہ دیا: "فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ" "اللہ کی ساری نعمات کو یاد کرو"۔ اونٹنی کا ان کے لیے اللہ کی جانب سے بھیجنا؛ یہ بھی اللہ کی نعمات میں سے بڑی نعمت تھی۔ حضرت صالحؑ نے آخر میں فرمایا اللہ کی سرزمین پر فساد و فتنہ نہ کرو۔ "عثیٰ" ایسا فساد جو محسوس ہو، یا اس میں فساد میں زیادہ روی کی جانب اشارہ ہے۔ اللہ کی نعمات کو یاد کرنے والے اللہ کا خوف رکھتے ہیں تاکہ اللہ کی نافرمانی سے اللہ ان سے ان نعمات کو واپس نہ لے لے ۔ یہ بہترین طریقہ تھا جسے حضرت صالحؑ نے انہیں سمجھانے کے لئے اختیار کیا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اس قوم کے متکبر سرداروں نے غریبوں سے کہا جو ایمان لا چکے تھے کیا تمہیں یقین ہے کہ صالح کو اس کے رب نے بھیجا ہے، انہوں نے کہا جو وہ لے کر آیا ہے ہم اس پر ایمان لانے والے ہیں''۔

قوم کے بڑوں کی بات

اس جگہ صالحؑ کی قوم کے دو طبقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک طبقہ وہ تھا جو خود کو بڑا خیال کرتا تھا، مغرور تھا، کسی کو اپنے جیسا نہیں سمجھتے تھے، مال و دولت اور اقتدار کے نشہ میں تھے اور اپنے سے کمتر کو بے حیثیت قرار دیتے تھے۔ دوسرا طبقہ کمزور اور بے مال کا تھا جن کو بڑوں نے کمزور بنا رکھا ہوا تھا۔ دوسرے طبقے کے لوگ حضرت صالحؑ پر ایمان لائے تو اس قوم کے بڑے اور وڈیروں نے ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ تم کو کیسے معلوم کہ صالحؑ اللہ کی جانب سے آیا ہے؟ تم غلطی پر ہو۔ گویا کہ ان کی سرزنش کر رہے تھے لیکن اس کمزور طبقہ نے ان کو جواب دیا کہ ہم تو ان پر ایمان لائے ہیں ہم انہیں اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور وہ جو کچھ لائے ہیں اس پر ہمارا ایمان ہے۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

''متکبروں نے کہا جس پر تمہیں یقین ہے ہم اسے نہیں مانتے''۔

متکبروں کا کمزور طبقہ کو جواب

یہ سُن کران وڈیروں نے اعلان کیا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے اور جن باتوں پر تم ایمان لائے ہو ہم ان سب کے انکاری ہیں اور ہمیں یہ بات قبول نہیں۔ اس بیان سے انہوں نے حضرت صالحؑ کی رسالت کا انکار کیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ کا بھی انکار کر دیا اور خود کو کافر قرار دیا اور اس پر انہیں فخر تھا۔ یہ انکار ان کے تکبر اور مغرور ہونے کا نتیجہ تھا، وہ خود کو سب سے زیادہ سمجھدار خیال کرتے تھے اور بہت بڑے گھمنڈ میں تھے، اپنے سواء دوسروں کو حقیر، پست اور بے عقل خیال کرتے تھے۔ اسی بناء پر انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

”پھر اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالح! لے آ ہم پر جس سے تو ہمیں ڈراتا تھا اگر تو رسول ہے“۔

قوم صالحؑ کا الٰہی امر کی مخالفت

”عقر“ ہاتھ اور پاؤں کاٹنے کو کہتے ہیں، یہ لفظ اونٹ کے ذبح کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ”عتو“ سرکشی اور سرپیچی کرنے کے معنی میں ہے۔ عتو ”عن“ کے ساتھ لایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ استکبار اور غرور کی بنیاد پر انہوں نے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا، وہ سرکشی کرتے تھے۔ انہوں نے اللہ کی آیت کو مار ڈالا اور اس کے ساتھ ہی استہزاء اور ٹھٹھہ مذاق کرتے ہوئے حضرت صالحؑ سے کہا لو ہم نے تیری اونٹنی کو مار ڈالا ہے اب تم وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے۔ ان کا مطلب تھا کہ صالحؑ ان پر کسی بھی قسم کا

عذاب لانے سے عاجز و ناتواں ہیں، جس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ان کی پیغمبری کا انکار کیا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۷۸﴾

''پس انہیں زلزلہ نے آ پکڑا، پھر صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے''۔

مجرموں پر عذاب

آخرکار عذاب الٰہی نے ان نافرمانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور یہ ان کے کفر و ظلم اور استکباری حالت کا نتیجہ تھا لیکن عذاب کی کیفیت کیا تھی اس بارے اس آیت میں تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ اس میں تو فقط زلزلہ اور جھٹکا کا حوالہ ہے لیکن سورہ ھود آیت ۶۷ اور سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۱۷ میں اس عذاب کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ عذاب آسمانی بجلی گرنے اور زلزلہ سے دیا گیا'' فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ ''انہیں ذلیل اور رسوا کرنے والے عذاب اور بجلی کی کڑک نے آلیا''

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۷۹﴾

''پھر صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمایا اے میری قوم! میں تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے تھے''۔

قومِ صالحؑ پر عذاب کے وقت اعلان

جب نافرمانوں پر عذاب آگیا تو اس وقت حضرت صالحؑ وہاں سے چل دیے اور قوم کو آواز دے کر کہا اے میری قوم! میں جھوٹا نہیں تھا میں اپنے رب کا پیغام تمہارے پاس لایا اور میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچائے اور تمہیں بتا دیا تھا کہ اونٹنی اللہ کی طرف سے تمہارے لئے آیت اور نشانی ہے، اسے کچھ نہ کہنا ورنہ تمہارے اوپر عذاب الٰہی آئے گا۔ میں تمہارا خیر خواہ تھا میں نے تمہیں سمجھایا، تمہارے اوپر اللہ کی نعمات کو یاد دلایا لیکن تم نے میری باتوں پر کان نہ دھرا اور نہ ہی میری نصیحت کو قبول کیا۔ پس اب عذاب الٰہی آیا ہے اب اس سے بچنے کا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ تم ایسے ہو کہ اپنے خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۰﴾

''اور لوط کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو کہ تم سے پہلے اسے جہان میں کسی نے نہیں کیا''۔

لوطؑ کا اپنی قوم میں تبلیغ کرنا

پچھلی آیات میں اس طرح بیان کیا گیا کہ ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر بھیجا، ھود کو ان کی قوم کے پاس بھیجا اور صالحؑ کو ان کی قوم ثمود کے پاس بھیجا لیکن یہاں پر ایسا نہیں کہا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوط حضرت ابراہیمؑ کی شریعت پر تھے اور ان کی شریعت کے مبلغ تھے، آپ صاحب شریعت رسول نہیں تھے بلکہ تبلیغی نبی تھے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں رسول ۳۱۳ تھے یا اس سے کچھ زیادہ یا کم جبکہ باقی سب

اللہ کے نبی تھے ان کی ذمہ داری اپنے سے پہلے صاحب شریعت رسول کی شریعت ہی کی تبلیغ کرنا تھا بلکہ ان پر وحی بھی آتی تھی، صاحب معجزہ بھی ہوتے تھے۔ حضرت ھودؑ اور حضرت صالحؑ دونوں حضرت نوحؑ کی شریعت کے تابع تھے۔

حضرت لوط حضرت ابراہیمؑ کے قرابت داروں میں سے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اہل سدوم کی جانب تبلیغ کے لئے بھیجا اور ان کے قرب و جوار میں جو اقوام آباد تھیں ان کے درمیان تبلیغ کرنے کی ذمہ داری لگائی تھی۔ وہ لوگ بت پرست، گمراہ اور بدکردار تھے۔ آپ کے ذمہ تھا کہ انہیں دین توحید کی دعوت دیں، اس طرح لوط جن اقوام میں تبلیغ کے لئے گئے وہ بت پرست اور مشرک تھے اور لواطت جیسا قبیح اور برا عمل کرتے تھے۔ حضرت لوط ان کے درمیان گئے اور انہیں اس قبیح عمل سے منع کیا اور ان سے کہا کہ یہ عمل انتہائی قبیح اور برا ہے اور یہ بھی بتایا کہ ایسا برا عمل ان سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے اہل سدوم ہی پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے لواط جیسے انتہائی قبیح عمل کا ارتکاب کیا۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾

"بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، بلکہ تم حد سے بڑھنے والے ہو"۔

اہل سدوم کی برائی بارے تفصیل

پہلی آیت میں اجمال تھا کہ تم بہت ہی برا عمل انجام دیتے ہو، ایسا عمل جسے تم سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیا۔ اس آیت میں اس برے عمل کی وضاحت کی ہے۔ یہ عبارت اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ لواط کا عمل مردوں سے انجام دیتے تھے اور لفظ "شَهْوَةً" کے بعد

''مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے عورتوں کے پاس جانا چھوڑ دیا تھا اور مردوں پر اکتفاء کرتے تھے اور یہ قانون فطرت کے خلاف تھا۔ اس لئے اس عمل کے بارے فرمایا کہ تم بہت ہی اسراف اور زیادہ روی کرنے والے ہو۔

اس عبارت کے شروع میں ہمزہ استفہام مقدر ہے اصل میں ''ءَاِنَّكُمْ'' ہے، یعنی کیا تم ایسا عمل کرتے ہو؟ ان کا یہ برا عمل بے سابقہ تھا اس لئے حیرانگی اور تعجب کی حالت میں حضرت لوط نے ان سے سوال کیا کیونکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے نسل کے بڑھانے کا تصور اور سوچ کی نفی ہو جاتی ہے اس لحاظ سے یہ حیوانی عمل ہے اور اس میں تجاوز اور زیادہ روی ہے جس میں فقط شہوت رانی ہے اور کچھ نہیں۔ اس آیت کی عبارت سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ ہر عمل اور ہر معاملہ میں زیادہ روی، اسراف اور افراط کرنے والے تھے، شہوت کو سیراب کرنے کے لئے بھی معروف و مانوس طریقہ کو چھوڑ کر غیر فطری اور غیر مانوس عمل کا انتخاب کیا ہوا تھا۔ اس لئے انہیں ''مُسْرِفُوْنَ'' اسراف کرنے والوں سے قرار دیا۔ یہ عمل اتنا بڑا گناہ تھا کہ جس سے روکنے کے لئے باقاعدہ ایک نبی مامور ہوتے ہیں لیکن انہوں نے حضرت لوط کی بات کا مذاق اڑایا۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور اس کی قوم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر یہی کہا کہ انہیں اپنے شہر سے نکال دو، یہ لوگ بہت ہی پاک بننا چاہتے ہیں''۔

قومِ لوط کا جواب

حضرت لوط کی منطقی اور عقلمندی پر مبنی بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جفا اور ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے اور حضرت لوط اور ان کے پیروکاروں کو ان کے گھروں سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل کیا۔ یہ فیصلہ ان کی نادانی اور کم عقلی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے حضرت لوط کی بات کا جواب نہ دیا فقط یہ کہہ دیا کہ وہ اس شہر کے نہیں ہیں۔ اس لئے اسے کمتر قرار دیا اور ان کی گفتگو کو اہمیت نہ دی۔ الٹا ان کے بارے یہ کہا کہ یہ لوگ پاک و پاکیزہ بننا چاہتے ہیں، خود کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں ان کے پاس کوئی قدرت و طاقت نہیں ہے اور تعداد میں بھی ہم سے کم ہیں ان کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے اعمال پر تنقید کریں اور ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت کریں۔ اس طرح انہوں نے اپنے جرم پر قائم رہنے کا اعلان بھی کر دیا۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۸۳﴾

''پھر ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے بچا لیا کہ وہ وہاں رہنے والوں میں رہ گئی''

لوطؑ کے گھرانے کا عذاب سے محفوظ رہنا

حضرت لوط جس آبادی میں تبلیغ کے لئے آئے اس میں آپ پر ایمان لانے والے سوائے ایک گھرانہ کے کوئی بھی نہیں تھا جیسا کہ سورۂ ذٰریٰت آیت ۳۶ میں ہے: فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۶﴾، ترجمہ: ''وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی میں حضرت لوط کے گھرانہ کے سواء کوئی بھی مسلمان نہ ہوا، کوئی حضرت لوط پر ایمان نہ لایا۔ اس گھر سے لوط کی بیوی کو بھی نکال دیا

کیونکہ لوط کی بیوی ان پر ایمان نہ لائی، اسے ہلاک ہونے والوں میں سے قرار دیا وہ اس قوم میں باقی رہنے والوں میں سے تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بیوی بھی ہلاک ہونے والوں میں سے تھی۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۸۴﴾

"اور ہم نے ان پر مینہ برسایا، پھر دیکھو گناہگاروں کا کیا انجام ہوا"۔

قوم لوط پر عذاب الٰہی

عذاب کی کیفیت بارے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عجیب و غریب بارش ہوئی ایسی بارش جس میں پتھر اور مٹی کے ڈھیلوں کے ٹکڑے برسائے گئے۔ جیسا کہ سورۂ ھود، آیت: ۸۲ میں آیا ہے: " وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ " ترجمہ: "اور اس زمین پر کھنگر کے پتھر برسانا شروع کیے جو لگاتار گر رہے تھے۔" اس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ دیکھیں کہ جو مجرم ہیں ان کا انجام کیسا ہے۔ ظاہری خطاب تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھا لیکن درحقیقت اُمت مسلمہ کو خطاب ہے اور مشرکین کو بھی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا انکار کرے گا اور اللہ کے احکام کی نافرمانی کرے گا، خود خسارے میں ہوگا، جو جرائم کا ارتکاب کرے گا اس کا انجام بھی ویسا ہوگا جیسا کہ لوط کی قوم کا ہوا۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾

''اور مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل پہنچ چکی ہے، سو ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان دار ہو''۔

اہل مدین کے لیے شعیبؑ کی بعثت

یہ آیت حضرت نوحؑ کی داستان پر عطف ہے کہ شعیب کو اہل مدین کے لیے مبعوث کیا گیا۔ حضرت شعیبؑ نے اہل مدین کو

۱۔ توحید پرستی کی دعوت دی۔

۲۔ اللہ کا شریک نہ بنائیں۔

تمہارے پاس معجزہ اور برہان لے کر آیا ہوں۔

۳۔ وزن کرنے اور پیمائش میں انصاف کرو، کم مت تولو، پیمائش میں ڈنڈی نہ مارو جس کا جتنا حق ہے اتنا ہی اسے دیا جائے کم فروشی نہ کرو۔

اہل مدین میں کم فروشی عام تھی اور کاروباری معاملات، سودا سلف بیچنے اور خریدنے میں فساد اور خیانت کرتے تھے کیونکہ فساد خلاف فطرت ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا کیونکہ یہ کام فطرت کے خلاف تھا۔

۵۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی دُنیا کی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کے امور کو منظّم کرنے کی دعوت دے۔

اگرچہ اس آیت میں زمین میں فساد پھیلانے کو مطلق بولا گیا ہے جو تمام گناہوں خواہ حق اللہ ہوں یا حق الناس سب کو شامل ہے لیکن سیاق کے قرینہ سے استفادہ ہوتا ہے اس جگہ

فساد سے وہ گناہ مراد لئے گئے ہیں جو معاشرہ کے امن میں خلل ڈالنے کا سبب بنتے ہیں، جیسے اموال، آبرو اور نفوس میں فساد کرنا، مالی معاملات میں خیانت، دوسروں کی ہتک حرمت کرنا اور دوسروں کو جانی نقصان دینا کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔ ان گناہوں میں چوری، غارتگری، ناموس پر دست درازی، قتل اور ان جیسے گناہ شامل ہیں۔

حضرت شعیبؑ نے جو دو دعوتیں اہل مدین کو دیں ان کا فلسفہ و حکمت بھی بیان کیا اور کہا کم فروشی نہ کرنا اور زمین پر فساد نہ پھیلانا تو یہ تمہاری دُنیا کے لئے بہتر ہے۔ یہ چیزیں دُنیا میں امن کی ضمانت ہے کیونکہ اجتماعی زندگی کا دارومدار اصلاح اور امن پر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اس بات کی اجازت دے کہ وہ کم فروشی کرے، دوسرے سے خیانت کرے، چوری کرے تو گویا وہ دوسروں کو بھی اس کے ساتھ ایسے ہی اعمال انجام دینے کی اجازت دے رہا ہوتا ہے۔ معلوم رہے کہ اگر کسی معاشرہ میں ایسے اعمال رائج ہوں گے، خیانت ہو گی، کم فروشی ہو گی تو اس سے معاشرہ کا امن تباہ ہو جائے گا لہٰذا اگر تمہارا اللہ پر ایمان ہے تو پھر تم اس قسم کے دستورات کی تصدیق کرو اور جان لو کہ یہ سب تمہارے فائدہ میں ہے۔

وَ لَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَ تَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ کُنۡتُمۡ قَلِیۡلًا فَکَثَّرَکُمۡ ۪ وَ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۶﴾

”اور راستوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو اور اس میں ٹیڑھا پن تلاش کرو، اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا، اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا ہے“۔

شعیبؑ کا اپنی قوم کو برے اعمال سے روکنا

ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ راہ خدا سے دین خدا مراد ہے اس لئے حضرت شعیب نے ان سے کہا:

۱۔ اللہ کے دین پر حملہ نہ کرو۔

۲۔ لوگوں کو ایمان لانے کی وجہ سے مت ڈراؤ دھمکاؤ۔

۳۔ انہیں عبادات انجام دینے اور راہ خدا پر چلنے سے مت روکو۔

۴۔ راہزن مت بنو جو اپنی پوری توانائیاں اس پر صرف کرتے ہیں کہ ہر قسم کے حیلہ و مکاری اور سازش سے لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو نعمات تمہیں دی ہیں ان کو یاد کرو۔ ان نعمات سے ایک نعمت یہ ہے کہ تمہاری نسل کو بہت بڑھایا، تم تعداد میں کم تھے اب تمہاری تعداد بڑھ چکی ہے کیونکہ تعداد کا زیادہ ہونا کسی بھی معاشرہ کے لئے ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ جس کی تعداد زیادہ ہو گی وہ اجتماعی قوت، فکر، ارادہ اور عمل میں بھی مضبوط ہوں گے۔ اپنے معاشرہ کی کمزوریوں کو اس سے دُور کر سکتے ہیں، اپنی زیادہ طاقت سے طبیعت کو تسخیر کر سکتے ہیں اور معاشرہ کی کمزوریوں کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ نسل میں اضافہ انسان کے تکامل کی بنیاد ہے۔ اس طرح یہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

آخر میں فرمایا: سابقہ اقوام اور ان اقوام کے مفسدوں اور گناہگاروں کے انجام سے عبرت حاصل کرو۔ مفسدین وہی لوگ ہیں جو زمین پر سرکشی کرتے ہیں، فساد پھیلاتے ہیں، امن تباہ کرتے ہیں، دُنیاوی زندگی نے انہیں فریفتہ کر رکھا ہے اور دنیاوی شہوات میں گھرے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کا تازیانہ برسایا اور انہیں تباہ وہلاک کر دیا۔ تاریخ میں

بہت ساری اقوام کے نام ضبط شدہ ہیں جنہوں نے تکبر کیا، سرکشی کی، اللہ کے احکام کی نافرمانی کی، اللہ کی آیات کا انکار کیا تو ان پر اللہ کا عذاب اُترا اور آج ان کا نام و نشان تک نہیں۔[1]

سابقہ اُمتوں کا تذکرہ اور ان کے حالات بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ مشرکین مکہ کو متنبہ کیا جائے گا کہ اگر اُنہوں نے اللہ کی نعمات کا کفران کیا، نافرمانی کی، آیات کا انکار کیا، رسول کی دعوت کو رَد کر دیا تو وہ بھی اس قسم کے انجام کے منتظر رہیں۔

وَاِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآىِٕفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۸۷﴾

"اور اگر تم میں سے ایک جماعت اس پر ایمان لے آئی ہے جو میرے ذریعے سے بھیجا گیا ہے اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی پس صبر کرو جب تک اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔

شعیبؑ کا فیصلہ کن اعلان

اس آیت میں حضرت شعیبؑ کا چوتھا دستور بیان ہوا ہے جسے آپ نے اپنی قوم تک پہنچایا۔ آپ نے فرمایا: اس صورت میں جب تمہارے درمیان اختلاف ہو گا ایک تعداد کفر اختیار کرے اور ایک گروہ ایمان لائے، اگر تم نے اس روش کو نہ بدلا اور حق و حقیقت کو قبول نہ کیا اور کارستانیاں کرتے رہے تو جو لوگ ایمان لائے ہیں ان سے آپ نے فرمایا کہ تم اس پر قائم رہو اور کافروں کی تکالیف اور اذیتوں پر صبر کرو۔ حضرت شعیبؑ کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کی قوم کے بڑے، متکبرین، مالدار لوگ مومنوں کو تکلیف اور آزار دیں گے اور راہ خدا

[1] ۔ روم کے بادشاہ قیصر، مصری بادشاہان فرعون، ایران کے بادشاہان کسریٰ، چین کے بادشاہان فغفور کہلاتے تھے۔

سے انہیں روکیں گے؛ اس لئے آپ نے مومن اور کافر دونوں گروہوں کو صبر کا حکم دیا کہ اس وقت تک خاموش رہو یہاں تک کہ تمہارے درمیان اللہ اپنا فیصلہ و حکم صادر کرے کہ اللہ ہی بہترین فیصلہ دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بہترین احکم الحاکمین ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ صبر کا حکم دیتا ہے کیونکہ ایسا معاشرہ جو مومن اور کافر دونوں گروہوں پر مشتمل ہو تو اس میں بہترین رویہ صبر اور انتظار ہے تاکہ مومنین ناامیدی اور مایوسی اور اضطراب و پریشانی میں نہ ہوں اور کافر بھی ایسے کام نہ کریں جو پشیمانی اور شرمندگی کا سبب بنیں۔ اسی وجہ سے ایسے مناسب موقع پر اپنا حکم اور فیصلہ صادر کرے گا ایسا حکم جو تمام انسانوں کے لئے خیر اور بہتری کا ذریعہ ہو گا کیونکہ اللہ کے حکم اور فیصلہ میں کسی قسم کا ظلم و جور نہیں۔ اس لحاظ سے "فاصبروا" "تم سب صبر کرو" میں جو حکم ہے وہ کافروں کے لئے ارشادی اور مومنین کے لئے مولوی حکم ہے۔ دونوں گروہوں کو اس بات کی راہنمائی کی ہے جو ان کے لئے بہتر ہے لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کلام میں کافروں کے لئے عذاب کی دھمکی پوشیدہ ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۟ۚ ﴿۸۸﴾

"اس کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا اے شعیب! ہم تجھے اور انہیں جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے ضرور نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، شعیبؑ نے کہا کیا اگرچہ ہم اس دین کو ناپسند کرنے والے ہوں"۔

قومِ شعیبؑ کے بڑوں کا اعلان

حضرت شعیبؑ کی قوم کے مستکبرین نے حضرت شعیبؑ کی خیر خواہی، رشد و ہدایت اور راہنمائی کو قبول نہ کیا بلکہ اللہ کے عذاب کو جلدی مانگنے لگے؛ بجائے اس کے کہ وہ ہدایت قبول کرتے مومنوں کو خوفزدہ نہ کرتے اُنہوں نے ان سے کہا اگر تم ہمارے دین پر واپس نہ آئے اور توحید کی دعوت سے ہاتھ نہ اُٹھایا تو ہم تمہیں اپنی آبادی (دیہات) سے باہر نکال دیں گے۔ لیکن مومنین کے لئے شہر بدر ہونا آسان تر ہے اس بات سے کہ وہ توحیدی شریعت کو چھوڑ دیں اور مرتد ہوں کیونکہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ النساء، آیت: ۱۰۰) میں ارشاد فرمایا: "وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً" ترجمہ: "اللہ کی زمین وسیع قرار دی ہے تاکہ لوگ اس میں مہاجرت کر جائیں، جہاں چاہیں جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا یقیناً وہ وسعت اور گشائش پالے گا" کافروں کی گفتگو میں ڈرانا، دھمکانا تھا اس لئے حضرت شعیبؑ نے اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کی درخواست کی اور ان سے یہ کہا کہ اگر ہم تمہارے روش و طریقہ کو ناپسند کریں تو بھی تم زبردستی ہمیں اس میں پہنچاؤ گے۔ انہیں سمجھانا تھا کہ ہم جس توحیدی دین پر ہیں اسے ہم نے نہیں چھوڑنا، ہم اسی پر قائم رہیں گے۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

''ہم تو اللہ پر بہتان باندھنے والے ہو جائیں اگر تمہارے مذہب میں واپس آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی ہے، اور ہمیں یہ حق نہیں کہ تمہارے دین میں لوٹ کر آئیں مگر یہ کہ اللہ چاہے جو ہمارا رب ہے، ہمارے رب کا علم ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے، ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔

کفار کو مومنین کا جواب

ہمیں تمہارا دین پسند نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے دین سے نجات دی ہے۔ اگر ہم دوبارہ تمہارے دین میں آجائیں اور شرک اختیار کرلیں تو ایسی صورت میں ہم نے اللہ پر افتراء باندھا ہے۔ اس جملہ سے اپنی ناپسندیدگی کی وجہ کو بیان کر دیا۔

اس جگہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم کی نمائندگی میں گفتگو کرتے ہیں کیونکہ جو اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں انہوں نے پوری عمر اپنی زندگی میں کبھی بھی شرک اختیار نہیں کیا ہوتا، وہ گناہ سے معصوم ہوتے ہیں لہٰذا یہ جملہ کہ ہم جس شرک سے نکل کر آئے اس کی طرف دوبارہ جائیں تو یہ اللہ پر افتراء ہوگا۔ حضرت شعیبؑ نے یہ جملہ مومنین کی طرف سے کہا۔

کافروں نے حضرت شعیبؑ کو مخاطب کیا اور ان کے ساتھ ان کے پیروکاروں کو بھی اپنا مخاطب قرار دیا لہٰذا سب کی طرف سے حضرت شعیبؑ نے انہیں جواب دیا۔ اپنی اس بات کی اہمیت اور بلندی کو بیان کرنے کے لئے کہا کہ ہمیں تمہارا دین ناپسند ہے کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہم اللہ پر افتراء باندھیں بلکہ اصولی طور پر ایسا کرنا ہماری شان کے منافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نبوت کے مقام کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا کہ مگر یہ کہ اللہ ایسا چاہے (تو مشیت رب تعالیٰ سے پھر انکار نہیں کر سکتے) اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم سے اللہ اپنی اس

عنایت کو چھین لے جس کے نتیجہ میں ہم دین حق سے منحرف ہو جائیں (کہ اللہ ایسا وقت نہ لائے)۔

حضرت شعیبؑ نے اللہ کے نام کے ساتھ "رَبَّنَا" کا اضافہ اس لیے کیا تاکہ اس مطلب کی جانب اشارہ کیا جائے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے قبضۂ قدرت میں تمام امور ہیں اور وہی سارے امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے علم کی جانب اشارہ کیا اس لحاظ سے کہ ہمارے رب "اللہ" کا علم ہر چیز پر محیط ہے لہٰذا ایسا ممکن ہے کہ اس کی مشیت کسی ایسے امر سے متعلق ہو کہ جسے ہم نہیں جانتے۔

پھر فرمایا: ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں اپنے سارے امور کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں ہر احتمالی شر اور برائی سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد دشمن سے دُوری اور فتح و کامرانی کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ فتح سے مراد وہی دو گروہوں کے درمیان فیصلہ دینا ہے کیونکہ دو چیزوں میں "فتح" کا معنی ان دو کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کلام ایک طرح کی نفرین اور کفار کی ہلاکت اور تباہی کی دُعا ہے۔ اس کو واضح طور پر بیان نہ کرنے کی وجہ دو چیزیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ انہیں اپنے رب تعالیٰ پر اطمینان تھا کہ آخرکار اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد فرمائے گا اور جابروں، متکبروں کو ہلاک کرے گا اور دوسروں کو ان کا جانشین بنائے گا۔

۲۔ انہوں نے اللہ سے انصاف چاہا ہے اور اس امر کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے کہ وہی بہترین فاتح اور بہترین ناصر ہے اور مشکلات کی راہ کھولنے والا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

''اس کی قوم میں جو کافر سردار تھے انہوں نے کہا اگر تم شعیب کی تابعداری کروگے تو بے شک نقصان اٹھاؤ گے۔''

مومنین کو منکرین کی دھمکی

حضرت شعیبؑ کی قوم کے وہ افراد جو متکبر تھے اور شعیبؑ کو ٹھکرا چکے تھے اُنہوں نے ان مومنوں کو دھمکی دی جو حضرت شعیبؑ کے پیروکار تھے اس طرح انہوں نے اللہ کے راستہ (دین) کے سامنے رکاوٹ بننے کا فیصلہ کرلیا جس سے حضرت شعیبؑ نے انہیں منع کیا تھا لیکن انہوں نے حضرت شعیبؑ کے موعظہ اور نصیحت سے کچھ اثر نہ لیا۔ انہوں نے لوگوں کو حضرت شعیبؑ کی پیروی سے بڑی سختی سے منع کیا اور دوٹوک انداز میں کہا کہ اگر تم حضرت شعیبؑ کے پیرو بنے اور اپنی اس سرزمین سے ہجرت کر گئے تو تم لوگ نقصان اُٹھاؤ گے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت شعیبؑ کو ہجرت کرنے میں اکیلا چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ کوئی بھی نہ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شعیبؑ کے وجود سے آسودہ ہو جائیں گے کیونکہ ان کی اصل دشمنی حضرت شعیبؑ ہی سے تھی۔ اگر دوسرے لوگوں کے ساتھ دشمنی اس لئے تھی کہ وہ حضرت شعیبؑ کے پیروکار تھے وگرنہ ان لوگوں سے ان کی کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ بہرحال حضرت شعیبؑ پر ایمان نہ لانے والے اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ حضرت شعیبؑ کو اپنی آبادی سے نکال دیا اور جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لائے وہ بھی حضرت شعیبؑ کے ساتھ اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے گئے اور ان منکرین اور بڑوں اور دوسروں کی بات کو قبول نہ کیا۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۚۖ ﴿۹۱﴾

''پھر انہیں زلزلہ نے آ پکڑا پھر وہ صبح تک اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے''۔

شعیبؑ کو جھٹلانے والوں پر عذاب الٰہی

حضرت شعیبؑ کی قوم پر عذاب الٰہی زلزلہ اور ایک زوردار جھٹکے کی شکل میں آیا، ایسا زوردار جھٹکا تھا کہ وہ صبح اٹھ نہ سکے اور اپنی جگہ پر ہی سب ہلاک ہو گئے۔ ''کان لم یعنوا فیھا'' والے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے اس جگہ پر زیادہ دیر سکونت ہی اختیار نہیں کی تھی تاکہ وہ دوسری جگہ سے بے نیاز ہو جاتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا اس علاقے اور اس جگہ سے کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ انہوں نے کسی سرزمین کو وطن کے طور پر انتخاب نہیں کیا تھا۔ وہ بہت ہی کم مدت میں ایک جھٹکے اور شدید زلزلہ کے نتیجہ میں ہلاکت کے منہ میں چلے گئے۔ ان کا ہلاک کرنا اور ان کا خاتمہ اللہ کے لئے نہایت ہی آسان تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ شعیبؑ اور ان کے پیروکار خسارہ اور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوں گے جبکہ حقیقت میں وہ خود ہی نقصان اُٹھانے والے تھے کیونکہ :

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٩٢﴾

''جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہیں تھے، جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نقصان اٹھانے والے ہوئے''۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ (سورۂ آل عمران، آیت: ۵۴)

''انہوں نے سازش کی اور اللہ نے بھی ان کی سازش کے توڑ میں تدبیر کی اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں بہترین تدبیر کرنے والا ہے''۔

اللہ کی تدبیر اور منصوبہ بندی کے سامنے سب منصوبہ سازوں کے منصوبے اور سازشیوں کی سازشیں ناکام و نامراد ہیں۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

''پھر ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم! تحقیق میں نے تمہیں اپنے رب کے احکام پہنچا دیے اور میں نے تمہارے لیے خیر خواہی کی، پھر کافروں کی قوم پر میں کیونکر غم کھاؤں''۔

شعیبؑ کا کافروں کی ہلاکت پر تبصرہ

جب حضرت شعیبؑ کی قوم کے نافرمان کافر ہلاک ہو گئے تو حضرت شعیبؑ نے ان کی ہلاکت کے متعلق اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! میں تو تمہارا خیر خواہ تھا۔ میں تمہارے پاس اپنے رب کے پیغامات لے کر آیا، میں نے اپنے پیغامات تمہیں پہنچا دیے، میں نے تمہیں بہت سمجھایا، نصیحت کی۔ اس لئے آپ نے ہلاک ہونے والوں کے بارے فرمایا کہ تم اس عذاب اور ہلاکت کے خود ذمہ دار ہو اور مجھے اس پر افسوس ہے اور نہ ہی میں تمہاری ہلاکت پر رنجیدہ ہوں کیونکہ تمہارا یہی استحقاق تھا۔ آپ کا یہ خطاب اس لئے تھا کہ باقی لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور اس واقعہ سے سبق لیں کہ جو بھی اپنے رب کے پیغامات کو جھٹلائے گا اور اللہ کے رسول کی بات کو قبول نہ کرے گا تو اس کا انجام ان جیسا ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ ان کافروں کی ہلاکت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے تو خوشحال ہونا چاہیے کہ کافر جو اللہ کی دعوت کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ کہاں ہے تمہارا وعدہ؟ کیوں عذاب نہیں آتا تو اس سرکشی کا نتیجہ انہیں ملا اور ہر سرکش، منکر و کافر کا انجام ایسا ہی ہو گا۔

وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَہۡلَہَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں پکڑا تاکہ وہ عاجزی کریں''۔

الٰہی آزمائش کا قانون

''بَاۡسَآءِ'' مالی بدحالی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ''ضَرَّآءُ'' جانی نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس جگہ اللہ نے ایک قانون بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ ہمارا جو بھی نبی کسی آبادی میں آیا تو ہم نے اس آبادی والوں کو مالی اور جانی نقصانات سے آزمایا تاکہ وہ اس وسیلہ سے اپنے رب کے حضور تضرع و زاری کریں اور اللہ کی جانب رجوع کرنے والے بنیں اور پیغمبر کی دعوت تیزی سے ثمرآور ہو، نتیجہ خیز ہو کیونکہ جب تک انسان نعمتوں میں غرق ہوتا ہے ہر طرف خوشحالی ہوتی ہے تو وہ اپنے خالق و مالک کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب اس پر سختیاں آتی ہیں، مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو اس حالت میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، گریہ و زاری سے اپنے رب کو پکارتا ہے اور عمل صالح کے ذریعہ ان مصائب و آلام اور مشکلات سے چھٹکارا پالیتا ہے۔

ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الۡحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّ قَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹۵﴾

"پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی بدل دی یہاں تک کہ وہ زیادہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی کا وقت آیا تھا پھر ہم نے انہیں اچانک پکڑا اور ان کو خبر نہ ہوئی"۔

ظالموں کا اللہ کی گرفت آجانا

جب نیک عمل کے نتیجہ میں ان کو نعمات دی جاتی ہیں جس سے سابقہ نقصانات کی تلافی ہو جاتی ہے اور مصائب و آلام دُور ہو جاتے ہیں، مشکلات ختم ہو جاتی ہیں، سابقہ تکالیف باقی نہیں رہتیں اور وہ خوشحالی میں آجاتے ہیں، مال کی کثرت، اولاد کی کثرت سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو اس حالت میں اللہ کا شکر بجالانے کی بجائے وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ تو ایک طبیعی امر ہے کہ ہم سے پہلے جو ہمارے آباء و اجداد تھے ان پر بھی برے حالات آتے تھے اور پھر اچھے حالات آجاتے تھے اور یہ کوئی ایسا امتحان نہ تھا۔ کائنات میں جو حادثات و واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں یہ بھی اسی کا ایک سلسلہ ہے۔ اس طرح وہ اس تبدیلی کے بعد ناکامی کی طرف چلے جاتے ہیں وہ اس طرح کہتے ہیں کہ کل ہمارے آباء مشکلات میں گرفتار تھے، آج ہم ان کی جگہ پر، کامیاب و کامران ہیں۔ زمانہ کی روش بھی یہی ہے، یہ سب کچھ زمانہ میں جاری و ساری ہے، روزگار و زمانہ ہے جو عزت دیتا ہے اور زمانہ ہی ہے جو ذلت دیتا ہے۔ اس گفتگو سے وہ امتحان الٰہی کے انکاری ہو جاتے ہیں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ پھر اچانک ہماری گرفت میں آتے ہیں جبکہ وہ بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ جملہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسان الٰہی امور کے متعلق جاہل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اچانک عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ وہ

---

[1]۔ روزگار اس آنکہ گہ عزت دہد گہ خوار دراد   چرخ بازیگر ازاین بازیچہ ہا بسیار دارد

دعویدار تھے کہ پورے عالم کے اسباب سے آگاہ ہیں اور اپنی خوشحالی کو انہی اسباب کا نتیجہ خیال کرتے تھے اور اس چیز سے غافل تھے کہ یہ سب کچھ الٰہی نظام کے تحت ہو رہا ہے، پورا عالم اللہ کے ارادے کے تحت چل رہا ہے۔ ان کی غلط فہمی اور جہالت تھی جس بناء پر وہ ایسی بات کرتے تھے۔ آخر کار وہ اللہ کی گرفت و پکڑ میں آگئے اور خود کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے اور نہ ہی زمانہ ان کے کام آیا۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے نعمتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا پھر ہم نے ان کے اعمال کے سبب سے گرفت کی"۔

ایمان اور تقویٰ کے ثمرات

اس آیت میں واضح اعلان کیا گیا ہے کہ اگر لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ان کے لئے آسمانی اور زمینی برکات کے دروازے کھول دئے جاتے۔

برکات کا معنی

برکت ہر خیر کثیر کے معنی میں ہے جیسے امن، آسائش، سلامتی، عافیت، مال و دولت، اولاد، غرض ہر قسم کے فوائد جو انسان کی زندگی کو آسودہ بنا دیں۔ اس میں شرط یہ رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے عقائد کی اصلاح کریں اور عقائد کے مطابق اعمال صالحہ بجالائیں، تقویٰ اختیار کریں یعنی اجتماعی رویوں میں اچھائی اور نیکی اپنائیں تو اس صورت میں ان کے لئے برکات کے چشمے کھول دئے جائیں گے اور ہر قسم کی خیر و بہتری کے ذرائع ان کے اختیار میں دئے جائیں

گے۔ آسمانی برکات سے مراد بارش،ژالہ باری، برف باری، روشنی، سورج کی گرمی اور وہ کیفیات ہیں جو نافع و مفید ہوں۔ اور زمینی برکات سے کھیت، میوہ جات، اجناس، خوراک کے وسائل، نباتات، پانی، ہوا، امن وسکون کاان کے اختیار میں ہونا مراد ہے۔

اس اعتبار سے کہ تکوینی حوالے سے انسان کی نوع تکمیل یافتہ ہےاس میں اجتماعیت ہے لہٰذا انفرادی طور پر نیک بن جانے سے چند افراد کا صالح ہو جانا، با تقویٰ، با ایمان ہونا سبب نہیں بنے گا کہ پورا معاشرہ اور پوری سوسائٹی پر امن ہو اور اس میں آسائش ہو۔ اجتماعی فلاح کے لئے پوری سوسائٹی کا با ایمان اور با تقویٰ ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر کفر عمومی طور پر ہو گا، فسق عام ہو گا، ہر طرف فساد ہو گا تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے چند افراد کا باایمان اور با تقویٰ ہونا کافی نہیں، اس سے فساد کا سبب ختم نہ ہوگا، اس میں فقط یہ ہو گا کہ کچھ مقدار میں لوگ بیدار ہو نگے اور کفار کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں اُتریں اور ان سے اقتدار چھین لیں تو اس صورت میں پھر صالحین کی جماعت حاکم ہو جائے گی اور معاشرہ کی اصلاح پر توجہ دے گی تو پھر یہ سارے ثمرات ملیں گے، وگرنہ عمومی حالت ہی کے تحت اللہ کا قانون جاری رہے گا۔اس لئے فرمایا کہ ایسی جماعت پر جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہمارے نمائندوں کی دعوت کو رد کر دیا اور کفر اختیار کیا، زمین پر فساد پھیلایا تو ان کے اعمال کے نتیجہ میں ہم نے ان پر عذاب اُتارا اور یہ ہمارا قانون ہر اس معاشرہ کے لئے ہے جو ہماری آیات کی تکذیب کرے، فساد پھیلائے اور ہمارے نمائندوں کو جھٹلائے۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾

”کیا بستیوں والے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہماری طرف سے ان پر رات کو عذاب آئے جب وہ سو رہے ہوں“۔

عذاب الٰہی سے خود کو محفوظ سمجھنے والے

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آبادیوں میں خوش و خرم رہنے والوں سے سوالات کئے ہیں۔ یہ سوالات منکرین سے کئے ہیں کہ تم خود کو عذاب سے محفوظ خیال کیوں کرتے ہو" بیَات" شب خون مارنے کے معنی میں ہے، رات کے وقت دشمن پر اچانک حملہ کر دینا۔ ؟ان گروہوں اور کافر جماعتوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مادی نعمات میں غرق ہو جاتے ہیں اور ماوراء مادیات اور جو کچھ محسوسات و مشاہدات کے ماوراء ہے جس کا تعلق غائب سے ہے اسے بھول جاتے ہیں پھر ان پر اللہ کا عذاب اچانک آٹوٹتا ہے۔ اس جگہ ان سے سوال کیا ہے کہ کیا یہ لوگ ، یہ جماعتیں اچانک رات کے وقت جب وہ سو رہے ہوں اور عذاب الٰہی آٹوٹے، جبکہ وہ غفلت میں ہوں تو خود کو محفوظ خیال کر بیٹھے ہیں؟ ایسا نہیں ہے یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ (کہا جاتا ہے کہ ربیع بن ھیثم کی بیٹی نے اپنے باپ سے سوال کیا: بابا کیا وجہ ہے تم رات کو سوتے نہیں ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ بیٹا تیرا باپ شب خون مارے جانے سے خوفزدہ ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ حالت خواب میں ہوں اور عذاب الٰہی آجائے۔ اللہ کے عذاب کا خوف اسے سونے نہیں دیتا۔

اَوَ اَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۸﴾

"یا بستیوں والے اس بات سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آئے جب وہ کھیل رہے ہوں"۔

اللہ کے عذاب کا خوف

دوسری مثال دی ہے کہ جب لوگ دن کے وقت سرگرم ہوتے ہیں۔ "ضُحًی" سے مراد دن کی ابتداء، چاشت کا وقت، جب سورج کا نور پھیل رہا ہوتا ہے۔ اس جگہ "لعب" سے

مراد تنہا کھیل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روزمرہ کے معمول کے کام ہیں کہ انسان اپنی مادی اور دُنیاوی ضروریات کو پورا کرنے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے جن میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لئے لعب ان کاموں سے کنایہ ہے، جن میں مصروف ہو کر انسان حق تعالیٰ کی رضایت کی تلاش سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس جگہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں سے کہا جارہا ہے کہ اللہ کا عذاب ایسی حالت میں آسکتا ہے جیسے تم اپنے کام کاج میں مصروف ہوتے ہو کیونکہ اللہ کے عذاب نے کب آنا ہے تو اس کی کسی کو خبر نہیں، رات کو سوتے میں بھی آسکتا ہے تو روشن دن میں بھی آسکتا ہے جبکہ لوگ غفلت میں ہوں۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾

"کیا وہ اللہ کی اچانک پکڑ سے بے فکر ہو گئے، پس اللہ کی اچانک پکڑ سے بے فکر نہیں ہوتے مگر نقصان اٹھانے والے"۔

اللہ کی پکڑ سے خود کو محفوظ نہ سمجھو

"مَكْرَ" دوسرے کو غفلت میں رکھ کر اسے نقصان پہنچانے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ جب انسان کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے سازش مراد لی جاتی ہے۔ "ماکر" سازش کرنے والے کو کہتے ہیں۔ جب اللہ کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس سے مراد اللہ کی تدبیر ہے اور اللہ کا خائنوں سے انتقام لینا مراد ہوتا ہے، اللہ کا عذاب مراد ہوتا ہے۔ اس لئے سوال کیا ہے کہ لوگ خود کو اللہ کے عذاب سے محفوظ سمجھتے ہیں تو اللہ ایسی جگہ سے عذاب لے آتا ہے جس کی انہیں کوئی خبر تک نہیں ہوتی۔ جو لوگ خود کو اللہ کے عذاب سے محفوظ خیال کرتے ہوئے ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں تو وہ لوگ خسارہ میں ہیں کیونکہ وہ غلطی پر ہیں کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں عذاب الٰہی سے خود کو نہیں بچا سکتے۔

اَوَ لَمۡ یَهۡدِ لِلَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ ۚ وَ نَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

''کیا ان لوگوں پر جو زمین کے وارث ہوئے ہیں وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد یہ ظاہر نہیں ہوا کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کے گناہوں کے سبب سے پکڑ لیں، اور ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے پس وہ سنتے نہیں ہیں''۔

ہلاک ہونیوالوں کے جانشینوں کے لیے بیان

اس آیت میں کافروں سے کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے جن کو ہم نے ہلاک کیا اور تم ان کی زمینوں کے وارث بنے، تمہیں تو ہدایت پانا چاہیے تھا، تمہارے لئے تو یہ بات روشن اور واضح ہو چکی تھی کہ ہم کس طرح کافروں کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور گناہوں کے نتیجہ میں انہیں عذاب دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تا کہ وہ انبیاء کے مواعظ اور نصیحتوں کو نہ سمجھ سکیں، ان سے سننے کی صلاحیت ہی جاتی رہتی ہے۔ اس طرح وہ بے ہدایت رہتے ہیں اور ہلاک ہو جاتے ہیں لہٰذا بعد والوں کو ان سے سبق لینا چاہیے جو ان ہلاک شدگان کی آبادیوں کے وارث بنے ہیں۔

تِلۡكَ الۡقُرٰی نَقُصُّ عَلَیۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَ لَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۱﴾

"یہ بستیاں ہیں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں، بے شک ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے تھے پھر اس بات پر ہر گز ایمان نہ لائے جسے پہلے جھٹلا چکے تھے، کافروں کے دلوں پر اللہ اسی طرح مہر لگا دیتا ہے"۔

ہلاک شدگان کے حالات بیان کرنے کا فلسفہ

سابقہ آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کا خلاصہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جتنی اقوام کا ذکر کیا گیا ہے ان کے پاس ہمارے رسول ہماری روشن اور واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی دعوت کو قبول نہ کیا تو اس وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ مہر زدہ دل میں سمجھنے کی لیاقت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح وہ الٰہی امتحانات کے فلسفہ و حکمت کو سمجھنے سے عاری ہو گئے۔ اگر وہ اس سے نصیحت لیتے تو اللہ تعالیٰ آزمائشوں کو نعمات میں تبدیل کر دیتا اور مشکلات، مصائب و آلام کی جگہ ان کے لئے اچھے ایام لے آتا۔ انہوں نے اس حالت کو طبیعی اسباب کا نتیجہ قرار دیا اور کہا کہ ایسا تو زمانہ میں ہوتا رہتا ہے۔ جس وجہ سے وہ عذاب میں گرفتار ہوئے؛ یہ سب کچھ اس لئے بیان کیا جا رہا ہے کہ بعد والے ان واقعات سے عبرت حاصل کریں۔

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

"اور ہم نے ان کے اکثر لوگوں میں عہد کا نباہ نہیں پایا، اور ان میں سے اکثر کو نافرمان پایا"۔

عہد شکنی کرنے والے

لیکن حقیقت یہ رہی کہ انہوں نے پیمان کو توڑ دیا اور عہد کو وفا نہ کیا۔ اس پیمان اور عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کے ذریعہ ان سے باندھا یا وہ عہد جو ان

لوگوں نے اللہ سے باندھا کہ وہ اللہ سے ہی ڈریں گے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔ لیکن اللہ فرما رہا ہے کہ لوگوں کی اکثریت عہد شکن ہے اور عہد کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی بلکہ وہ لوگ نافرمان اور گناہگار تھے اسی بنا پر انہیں سزا دی گئی اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا پھر انہوں نے نشانیوں سے بے انصافی کی، پھر دیکھ مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔''

موسیٰؑ کی بعثت

حضرت موسیٰ علیہ السلام تیسرے اولوالعزم رسول ہیں جو صاحب کتاب اور صاحب شریعت ہیں۔ ان کے مبعوث ہونے کے ساتھ ہی توحید ایک جدید اور نئے مرحلے میں داخل ہوئی اور اس میں تفصیلی مطالب و معارف بیان ہوئے جو اس سے پہلے بیان نہیں ہوئے تھے۔ احکام بھی پہلے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے کیونکہ انسان اپنے تکاملی اور ارتقائی سفر میں اس مرحلہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس میں تفصیلی معارف الٰہی اور احکام الٰہی قبول کرنے کی صلاحیت آگئی تھی۔

''اٰيٰتِنَآ'' ہماری نشانیاں، سے معجزات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطاء فرمائے تھے جیسے عصا کا اژدھا بن جانا، ہاتھ کا روشن و نورانی ہو جانا، طوفان، ٹڈی دَل، جوئیں، مینڈک، خون برسنا، غرق آب ہونا، وغیرہ۔ قرآن مجید میں جتنے

معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان ہوئے ہیں اتنے کسی دوسرے پیامبر کے بیان نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن فرعون اور اس کی جماعت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ستم کیا، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات کا انکار کر دیا اور انہیں جھٹلایا۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ دیکھو جنہوں نے مومنوں کو کمزور بنائے رکھا، ان پر ظلم کیا، زمین میں فساد پھیلایا، اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو ان کا انجام کیسا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان پر اپنا غضب اُتارا۔ آخری جملہ اس لئے بیان کیا گیا تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ بات جان لیں کہ فرعون اور فرعونیوں کا دُنیا میں ملیا میٹ ہو جانا اور ان کی نسل کے خاتمہ کا سبب ان کا زمین پر فساد پھیلانا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾

"اور موسٰی نے کہا اے فرعون! بے شک میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں"۔

موسیٰؑ فرعون کے دربار میں

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور انہیں میرا پیغام پہنچائیں اور اس سے کہیں کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تو حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں آئے جیسا کہ دوسری آیات میں بیان ہوا ہے کہ اکیلے نہیں آئے بلکہ ان کے ہمراہ ان کے بھائی ہارونؑ بھی موجود تھے۔ آغاز میں جو بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہی وہ یہ تھی کہ اس کو بتایا کہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس لفظ میں ہی سمجھا دیا کہ اے فرعون! اللہ رب العالمین ہی پوری کائنات کا نظام چلانے والا ہے۔ اپنے اس اعلان کے ثبوت کے لئے یہ بھی بتا

دیا کہ میں ایک ایسی نشانی اپنے ساتھ لایا ہوں کہ سوائے اللہ کی ذات کے کوئی بھی ویسی نشانی نہیں دے سکتا۔ اس معجزہ سے عصاء کا اژدھا بن جانا اور ہاتھ کا نورانی ہو جانا مراد تھا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جو کچھ میں انجام دے رہا ہوں وہ طبیعی قوانین کے تحت نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا تعلق طبیعت کے خالق کے ساتھ ہے۔

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴿۱۰۵﴾

"میرے لیے یہی مناسب ہے کہ سوائے سچ کے کوئی بات خدا کی طرف منسوب نہ کروں، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک بڑی دلیل لایا ہوں پس بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے"۔

موسیٰؑ کا فرعون سے دوٹوک مطالبہ

ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ میں اللہ کے بارے کچھ جھوٹ نہیں بولوں گا اور مجھے حق بھی نہیں کہ میں غلط نسبت اللہ کی طرف دُوں۔ اے فرعون! تیرے لئے اللہ کا پیغام یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل کو آزاد کر دو، میری تائید میں معجزہ موجود ہے، بنی اسرائیل میرے حوالے کرو، ان پر عذاب دینا اور انہیں شکنجوں میں آزار پہنچانا بند کردو۔ اس دوٹوک مطالبہ کے ضمن میں اشارہ موجود ہے کہ اگر ایسا نہ کروگے تو اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

"کہا اگر تو کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو وہ لا، اگر تو سچا ہے"۔

فرعون کا موسیٰؑ سے معجزہ کا مطالبہ

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی صداقت کی دلیل مانگی اور کہا کہ اگر سچ بول رہے ہو اور یہ کہتے ہو کہ باقاعدہ نبوت تمہارے پاس ہے اور تمہیں رب العالمین نے میرے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے تو تم وہ نشانی پیش کرو۔ بعد والی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مطالبہ پر اللہ کی طرف سے عطاء کردہ معجزات دکھائے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾

"پھر اس نے اپنا عصا ڈال دیا تو وہ اسی وقت صریح اژدھا ہو گیا"۔

موسیٰؑ کا معجزہ عصاء

فرعون کے مطالبہ کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی نشانی اس طرح پیش کر دی کہ آپ کے ہاتھ میں جو عصاء تھا؛ آپ نے ان کے سامنے اسے زمین پر پھینکا تو جیسے ہی وہ زمین پر گرا تو وہ بڑا واضح چلتا ہوا اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی سچائی پر فرعون کو یقین نہ تھا اور اسے شک تھا کہ اس کے پاس اپنی بات کی صداقت کے لئے کوئی نشانی موجود ہے۔ اس لئے اس نے یہ مطالبہ کر دیا کہ دوسری نشانی پیش کرو۔ دوسری آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ عصاء "تیز چلتا ہوا بڑا سانپ بن گیا"، "كَاَنَّهَا جَآنٌّ" (سورۂ نمل آیت ۱۰) میں بھی اس معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَّ نَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

"اور اپنا ہاتھ نکالا تو اسی وقت دیکھنے والوں کے لیے سفید نظر آنے لگا"۔

ید بیضاء

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسرا معجزہ اور دوسری نشانی بھی دکھادی اس طرح کہ سب کے سامنے اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں لے گئے، جب اسے سب کے سامنے باہر نکالا تو ان کے ہاتھ کی انگلیوں سے آفتاب کی مانند نوری شعاعیں پھوٹنا شروع ہو گئیں، ان کی درخشندگی اور نورانیت اس حد تک تھی کہ دیکھنے والوں کو ایک غیر معمولی حالت نظر آئی اور سب مبہوت ہو کر رہ گئے۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۲۲ اور سورہ قصص، آیت ۳۲ میں بھی اس معجزہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾

"فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا بے شک یہ بڑا ماہر جادوگر ہے"۔

فرعون کے درباریوں کا ردعمل

"اَلْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ" سے فرعونیوں کے بڑے مراد ہیں جو فرعون کے ہمراہ موجود رہتے تھے، خاص وزراء۔ فرعون کی قوم کے بڑے کسی بھی اہم معاملہ پر خاص افراد کا مشاورتی اجلاس بلاتے اور باہمی مشارت سے اس معاملہ کے بارے رائے لیتے تھے پھر اس کے مطابق عمل کیا جاتا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے مطالبہ پر دو معجزے دکھادیئے تو اس بارے بڑوں جب باہمی مشورہ کیا گیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یقینی امر یہ ہے کہ یہ شخص جادوگر ہے اور بہت ہی ماہر ہے اور اس نے جو کچھ دکھایا ہے یہ جادو ہی ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

"تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے، پس تم کیا مشورہ دیتے ہو"۔

فرعونیوں کا موسیٰؑ کو جھٹلانا

فرعونیوں نے یہ دو معجزے دیکھ کر باہمی مشورہ کے بعد یہ رائے دی کہ موسیٰؑ کا یہ دعویٰ کہ وہ نبی ہے اور اللہ رب العالمین کا رسول ہے تو وہ جھوٹا ہے بلکہ وہ اس ذریعہ سے بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے معاملات میں مستقل ہو جائیں، یعنی بنی اسرائیل کی آزادی اور استقلال کا خواہاں ہے لہٰذا اس کے یہ اعمال معجزہ ہیں اور نہ اس کا ثبوت کہ وہ اللہ کی طرف سے نمائندہ ہے۔ مزید اس پر یہ بھی اضافہ کیا موسیٰ علیہ السلام کا ہدف پیغام رسانی نہیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے دستور کو ختم کر دے اور خود مصر کا بادشاہ بن جائے۔ لہٰذا اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا کیا جائے اور اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے؟

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

”انہوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں جمع کرنے والے بھیج دے“۔

موسیٰؑ کے متعلق فرعون کا فیصلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے بعد فرعون کے درباری ایک دوسرے کی طرف توجہ کرکے کہنے لگے اب تم اس پر غور کرو کہ اب ہم اس کے ساتھ کیا کریں۔ اوپر والی باتوں پر سب کا اتفاق ہو چکا تو اگلے مرحلہ کے بارے باہمی مشارت کا آغاز کر دیا کہ اب جب یہ طے ہو گیا کہ یہ ایک ماہر جادوگر ہے۔ بنی اسرائیل کی آزادی اور استقلال چاہتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ تمہارے آئین اور دستور کی جگہ نیا آئین اور دستور لانا چاہتا ہے اور خود مصر کا بادشاہ بننے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اللہ کا رسول نہیں ہے وہ اس حوالے سے جھوٹ بول رہا ہے اب بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ باہمی مشاورت کے بعد اپنی آخری رائے

فرعون کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ سورۂ شعراء، آیت ۳۷ میں یہی بات فرعون کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رائے کو سب سے پہلے فرعون نے بیان کیا اس کے بعد بزرگان قوم اور فرعون کی مجلس شوریٰ نے باہمی مشاورت کی آخر کار اسی رائے کو پاس کیا جو فرعون نے دی تھی۔

يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿۱۱۲﴾

"تاکہ تیرے پاس ماہر جادوگر کو لے آئیں"۔

مقابلے کے لیے جادوگر لانے کا مشورہ

ان کی آخری بات یہ تھی کہ انہوں نے فرعون سے کہا آپ اپنے ہر کارے تمام شہروں میں بھیج کر ہر جگہ سے جو بھی ساحر و جادوگر موجود ہے اسے بلا کر لے آئیں اور موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو فی الحال اپنی نگرانی میں اسی جگہ رکھو کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان کو تحت نظر اور سخت مراقبت میں رکھو اور ان کے قتل کرنے اور مارنے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسا کیا جائے تو پھر اُسے ظلم و ستمکار کہا جائے گا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مہلت دینے کی بات ہوئی اور ساحروں و جادوگروں کو اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ اس ماہر جادوگر کا توڑ خود جادوگروں کے ذریعہ کیا جائے اور اس کے بعد انہیں سزا دی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون نے اپنے پاس روک لیا اور جادوگروں کو بلانے کا فیصلہ ہوا تاکہ بقول ان کے حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں، ان کا توڑ جادوگروں سے ہی کیا جائے گا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوٓا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَٰلِبِينَ ﴿۱۱۳﴾

''اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، کہا اگر ہم غالب آئے تو ہمیں کچھ صلہ بھی ملے گا''۔

جادوگروں کا فرعون کے پاس آجانا

ہر شہر سے ماہر جادوگروں کو بلایا گیا۔ اس طرح کثیر تعداد میں مانے ہوئے معروف جادوگروں کی ایک بڑی جماعت فرعون کے پاس آن پہنچی۔ جب وہ فرعون کے پاس آئے تو انہیں ان کو بلانے کی غرض بارے آگاہ کیا گیا اور جو دو کرتب موسیٰؑ نے دکھائے تھے جو کہ در حقیقت الٰہی معجزات تھے اس کے متعلق بھی آگاہ کیا گیا۔ جادوگروں نے مل کر فرعون سے پورے اعتماد سے یہ سوال کیا کہ اگر ہم غالب آگئے اور موسیٰؑ کے جادو کا توڑ کر لیا تو پھر ہمیں اس کا عوض کیا دیا جائے گا۔ جادوگر چاہتے تھے کہ فرعون کی زبان سے سن لیں کہ ان کا انعام کیا ہوگا۔

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿١١٤﴾

''کہا ہاں اور بے شک تم مقرب ہو جاؤگے''۔

جادوگروں کے لیے کامیابی پر انعام کا اعلان

فرعون نے جادوگروں کے جواب میں کہا ہاں ہاں! تمہیں ضرور بڑا انعام ملے گا اور تم سب دربار کے خاصان اور مقربین سے قرار پاؤگے۔ فرعون کے دربار کا مقرب ہونا ایک بڑا منصب تھا جو ہر کس و ناکس کے لئے نہ تھا۔ اس طرح جادوگروں کو اطمینان ہو گیا اور وہ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿١١٥﴾

''کہا اے موسیٰ! یا تو (پہلے) ڈال یا ہم ڈالتے ہیں''۔

موسیٰؑ اور جادو گر مقابلے کے میدان میں

میدان سج گیا اور فرعونی جادو گر بڑے غرور اور پورے اعتماد سے سامنے آئے اور آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس طرح مخاطب ہوئے کہ اے موسیٰ پہلے تم اپنے عصاء کو میدان میں پھینکو، اگر پہلے تم نہیں اترتے تو پھر ہم اپنی رسیاں، ہاتھ میں اٹھائی جانے والی چھوٹی چھڑیاں میدان میں پھینکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ اپنے مخالف کو نیچا دکھائیں اور اسے کمزور ظاہر کریں۔ اس لئے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اپنی اس بات کو موسیٰ علیہ السلام کو یہ سمجھا دیں کہ ہمیں تو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے لہٰذا تم ہم سے پہلے اپنا کرتب دکھاؤ۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ پہلے تم میدان میں اُترو۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

”کہا تم ڈالو، پس جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور انہیں ڈرایا اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھایا“۔

جادو گروں کو میدان میں اُترنے کی دعوت

”سحر“ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حواس میں ایک طرح کا تصرف کیا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس کنٹرول میں آجاتے ہیں اور وہ ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوتا ہے یا سن رہا ہوتا ہے جو حقیقت نہیں رکھتیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا جو وہ دیکھ رہا ہوتا ہے یا سن رہا ہوتا ہے۔ ”اسْتِرْهَاب“ ڈرانے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جادوئی کرتب کے بارے میں فرمایا کہ ایک بہت بڑا کرتب تھا جس کا انہوں نے دھوکہ دینے کے لئے

مظاہرہ کیا۔ اس طرح انہوں نے ان تمام لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا جو اس جگہ موجود تھے۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ اس منظر سے ڈر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی جادوگروں سے کہا کہ پہلے وہ اپنے تمام وسائل میدان میں لے آئیں چنانچہ انہوں نے اپنی رسیاں، ہاتھ کی چھڑیاں زمین پر پھینک دیں اور وہ زمین پر تیزی سے ادھر سے اُدھر تیزی سے حرکت کرنے لگیں جس سے لوگ گھبرا گئے کہ کوئی چیز ان کی طرف نہ آجائے جبکہ ان کی کوئی حقیقت نہ تھی بلکہ ان کے حواس پر تصرف کیا گیا تھا وہ ایک غیر حقیقی چیز کو حقیقت تصور کر رہے تھے۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ ۚ فَاِذَا ہِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ۚ

''اور ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دے، سو وہ اسی وقت نگلنے لگا جو کھیل انہوں نے بنا رکھا تھا''۔

مقابلے کا انجام

فرعون کے دربار کو سجایا گیا، وزرا، خواص اور عوام سب موجود تھے۔ درمیان میں میدان ہے ایک طرف فرعونی جادوگر ہیں اور دوسری طرف موسیٰ اور ہارون علیہم السلام اللہ کے نمائندے ہیں۔ جب فرعونی جادوگر اپنا کرتب دکھا چکے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اب تم اپنے عصاء کو ان کی رسیوں اور چھڑیوں کے درمیان پھینک دو۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصاء پھینکا تو وہ ایک بڑا اژدھا بن گیا اور پورے مجمع کے سامنے جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں کو ایک ایک کرکے نگلنا شروع کر دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر پورا مجمع مبہوت ہو گیا اور اپنی ذلت و رسوائی اور شکست انہیں نظر آگئی۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''پھر حق ظاہر ہو گیا اور غلط ہو گیا جو انہوں نے بنایا تھا''۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''پھر وہ سب اس جگہ ہار گئے اور ذلیل ہو کر واپس پلٹے''۔

وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور جادو گر سجدہ میں گر پڑے''۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

''کہا ہم رب العالمین پر ایمان لائے''۔

رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے''۔

جادو گروں کا اللہ پر ایمان لانے کا اعلان

فرعون اور اس کے خواص بھی اس منظر کو دیکھ کر پریشان ہوئے لیکن تاثرات کو چھپائے ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں جادو گروں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے کیا اور ان کے ہاتھ سے یہ عصاء اژدھا بنتا ہے تو یہ کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نہیں، یہ معجزہ ہی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس منظر کو دیکھ کر حقیقت کا اعتراف کیا۔ حق غالب آچکا تھا اور فرعونی جادو گروں کا سحر باطل ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اس بھرے اجتماع میں اعلان کر دیا کہ ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر رب العالمین کی صفات بھی بیان

کردی کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ فرعون پر ایمان لانے کا اعلان کر رہے ہیں کیونکہ فرعون خود کو رب اعلیٰ کہتا تھا اس لئے انہوں نے کہا کہ وہ رب العالمین جو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون کے رب ہیں۔ اس طرح فرعونی ذلیل و خوار ہوگئے، حق غالب آگیا اور باطل شکست کھا گیا۔ اس پر فرعون کو جادوگروں پر بہت غصہ آیا اور اس قدر جادوگروں کو دھمکایا، ڈرایا اور جو کچھ فرعون اور جادوگروں کے درمیان مکالمہ ہے وہ اگلی آیات میں ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

”فرعون نے کہا تم اس پر میری اجازت سے پہلے ہی ایمان لے آئے، یہ تو مکر اور سازش ہے جو تم سب نے اس شہر میں بنایا ہے تاکہ اس شہر کے رہنے والوں کو نکال دو، سو اب تمہیں معلوم ہو جائے گا“۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

”میں ضرور تمہارے (ایک طرف کے) ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی چڑھا دوں گا“۔

جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کا ردعمل

فرعون کو جادوگروں کے ایمان لانے پر بہت غصہ چڑھا، اس نے اپنے غرور و تکبر کے انداز میں جادوگروں کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا تم میری اجازت کے بغیر ایمان کیوں لائے ہو کیونکہ فرعون خود کو ان کے جسم و جان کا مالک سمجھتا تھا اس کے بعد ان پر ایک بڑی تہمت لگا دیتا ہے کہ یہ سب تم نے بڑی منصوبہ بندی سے کھیل کھیلا اور بڑی سازش اس شہر والوں کے خلاف کی۔ تم اس طریقہ سے اس شہر کے باسیوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کا ارادہ

رکھتے ہو۔ اس بیان سے اس نے اعلان کیا کہ تم ملک میں فساد اور بدامنی پھیلانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ پھر دھمکی آمیز لہجے میں اجمالی طور پر انہیں سزا دینے کا فیصلہ سنایا کہ تم بہت جلد اپنے اس جرم کی سزا کو جان لوگے کہ تمہارا کیا حشر کیا جائے گا۔ اگلی عبارت میں اس سزا کی تفصیل بتا دی کہ تمہارا بایاں ہاتھ اور دایاں پیر پہلے کاٹ دیا جائے گا پھر تمہیں سولی پر لٹکایا جائے گا۔ پھانسی کے گھاٹ پر چڑھایا جائے گا تاکہ سارے لوگ اس سزا کا نظارہ کر سکیں۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾

"انہوں نے کہا ہمیں تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے"۔

وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾

"اور تمہیں ہم سے یہی دشمنی ہے کہ ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو مان لیا جب وہ ہمارے پاس آئیں، اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر ڈال اور ہمیں مسلمان کر کے موت دے"۔

مومن جادوگروں کا فرعون کی سزا پر رد عمل

فرعون نے بڑی رعونت اور تکبر کے ساتھ ان کے خلاف سخت سزا کا اعلان کیا لیکن انہوں نے اس کی اس سزا کو بہت ہی ہلکا کیا اور اس کے استدلال کو رد کر دیا اور کہا کہ ہم تو اپنے رب کے پاس منتقل ہو جائیں گے۔ تو ہمیں یہ سب سزا اس لئے دے رہا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ تو خیال کرتا ہے کہ اس سزا سے ہمیں اذیت و تکلیف اور درد ہو گا۔ نہیں ایسا نہیں ہے! یہ سب اللہ کی راہ میں ہے جو کہ ہمارے لئے آسان ہے، اللہ کی راہ میں مرنا شر اور

تکلیف نہیں کیونکہ ہم تو اپنے رب کے پاس اس طرح چلے جائیں گے اور رب کے پاس جانا تو خیر مطلق ہے کیونکہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی بھی ہے اور پائیدار بھی۔

"وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى" (سورۂ قصص، آیت: ٦٠)

"اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ (اس سے) زیادہ بہتر اور پائیدار ہے"۔

انہوں نے فرعون سے کہا کہ تم ہمیں اس وجہ سے سزا دے رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی آیات پر کیوں ایمان لے آئے۔ "تنقم" "تُنقم" سے ہے جس کے معنی کراہت اور غصہ کے ہیں۔ اس مرحلہ پر وہ تازہ ایمان لانے والے جادوگر پوری شجاعت اور دلیری سے فرعون جیسے جابر کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ عصاء والے معجزہ کو اُنہوں نے معجزات کا عنوان دیا تو یہ اس لئے تھا کہ اس ایک معجزہ میں کئی معجزات موجود تھے:۔

۱۔ عصاء اژدھا بن گیا۔

۲۔ تمام رسیوں اور دستی چھڑیوں کو نگل گیا۔

۳۔ اس کے بعد دوبارہ وہ پہلی شکل میں عصاء بن گیا۔

اس کے بعد پوری دلیری سے یہ دُعا مانگی:

"اے ہمارے رب ہمارے اوپر صبر کو اُتار دے، ہمارے دلوں کو صبر سے لبریز اور سرشار کر دے تاکہ فرعون کے عذاب کے وقت ہم کسی قسم کا جزع و فزع نہ کریں۔ اگر فرعون نے ہمیں قتل کر دیا تو ہمیں اسلام کی حالت میں اس دُنیا سے اُٹھانا"۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انہوں نے فرعون جیسے جابر و منکر شخص کے سامنے عجیب بہادری و دلیری کا مظاہرہ کیا۔ ذرا برابر خوف نہیں کھایا اس کی ظاہری قدرت و طاقت کو کچھ بھی نہیں سمجھا اور مطمئن دلوں کے ساتھ پختہ عزم اور مضبوط ایمان، دلیل و برھان کی طاقت کے ساتھ ساتھ گفتار میں بھی بہت پائیدار اور علم و یقین کے ساتھ اس جابر کے مدمقابل قیام کیا یہ سب کچھ ان کی اخلاقی و روحانی شرافت اور کرامت و بزرگواری پر دلیل ہے۔

وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَ قَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَیَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَ نَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَ اِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا توں موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوٹ دیتا ہے تاکہ وہ ملک میں فساد کریں اور (موسیٰ) تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے، (فرعون نے) کہا ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے، اور بے شک ہم ان پر غالب ہیں''۔

مشیروں کا فرعون کو اشتعال دلانا

فرعون کی قوم کے بڑوں نے فرعون کو خوب بھڑکایا اور اس سے کہا کہ اے فرعون کیا موسیٰ اور اس کی قوم اسی طرح آزاد رہیں گے اور ان کی جو مرضی میں آئے کرتے رہیں اور امن کو تباہ کریں، فساد پھیلائیں۔ اس کے ساتھ مزید اشتعال دلانے کے لئے فرعون سے کہا کہ وہ تو نہ تمہیں مانتے ہیں اور نہ ہی تیرے خداؤں کو قبول کرتے ہیں۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون خود کو ''اللہ'' بھی کہتا تھا اور اس نے اپنے لئے خاص بت بھی ''اللہ'' بنا رکھے تھے اور وہ ان کی عبادت کرتا تھا۔ سورہ نازعات آیت: ۲۴ میں فرعون کا قول نقل ہوا ہے جس میں اس نے کہا: ''انا ربکم الاعلیٰ'' ''میں تمہارا بزرگ ترین رب ہوں''۔ فرعون کے مشاورین اپنے اس بیان سے چاہتے تھے کہ فرعون کو موسیٰ اور اس کی قوم کے قتل کرنے پر آمادہ کریں، اسے سمجھایا کہ اگر موسیٰؑ اور اس کی قوم آزادی کے ساتھ مصر میں موجود رہے تو ان کا وجود اس کی حکومت کے لیے خطرناک ہوگا، وہ فرعون کی ذات کے حوالے سے بھی اور فرعونی حکومت کے لیے بھی خطرہ ہیں۔

فرعون نے ان کی دلجوئی اور انہیں مطمئن کرنے کے لئے اپنا واضح اعلان سنا دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم موسیٰؑ کو قتل کر دیں گے اور موسیٰؑ کی قوم کے جوانوں کو بھی مار ڈالیں گے جبکہ ان کی عورتوں کو بے حیائی کے لئے چھوڑ دیں گے اور وہ قبطی عورتوں کی خدمت کریں گی، انہیں اپنی باندیاں بنالیں گے۔ آخر میں اپنے باطنی اضطراب اور پریشانی کو دُور کرنے کے لئے اعلان کیا کہ ہم ہر حال میں ان پر غالب آئیں گے اور انہیں شکست دیں گے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

''موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے، اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے''۔

موسیٰؑ کا اپنی قوم سے خطاب

موسیٰؑ نے سامنے درپیش مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے قوم کو فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو فرعون کا مقابلہ کرنے اور اس کے ظلم و شر سے بچنے کے لئے اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے صبری سے کام نہ لو، گھبراؤ نہیں، فرعون کی دھمکیوں سے نہ ڈرو۔ جی ہاں! مشکلات اور مصائب کے سامنے صبر کرنا، خیر کے راستے کی راہنمائی اور نجات و کامیابی کا زینہ ہے۔ صبر کا معنی یہ ہے کہ ظالم کے ظلم پر غلبہ پانے کے لئے بیداری اور پوری ہوشیاری سے کام لیا جائے اور اس حوالے سے انسان میں خوف کا احساس نہ کرے۔ اس کا معنی ظالموں اور سرکشوں کے پاؤں تلے روندا جانا اور ان کی بندگی کو قبول کرنا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بات کی تائید کی یہ دلیل پیش کی کہ دیکھو یہ وسیع و عریض زمین اللہ کی ہے، اللہ جسے چاہے اس زمین کا اقتدار دے دیتا ہے یا اس سے واپس لے لیتا ہے، اس کا اپنا نظام ہے یہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو جاری و ساری سنت ہے وہ اسی طرح ہی ہے عاقبت اور نیک انجام اللہ کے ان بندگان کے لئے ہے جو صاحبان تقویٰ ہیں، خداترس ہیں، اللہ کے احکام کا پاس رکھتے ہیں یعنی اے بنی اسرائیل اگر خدا سے مدد مانگو، صبر کرو، ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لو اور فرعون کے ظلم سے نکلنے کے لئے آنے والی مشکلات کو برداشت کرو اور اہل تقویٰ بنو تو یہ زمین کا اقتدار آج فرعونیوں کے پاس ہے یہ اقتدار کل تمہارے ہاتھ آجائے گا۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۧ ﴿۱۲۹﴾

"انہوں نے کہا تیرے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تیرے آنے کے بعد بھی، کہا تمہارا رب بہت جلد تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور اس کی بجائے تمہیں اس سرزمین کا مالک بنا دے گا پھر دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو"۔

بنی اسرائیل کا موسیٰؑ کے پاس شکوہ

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنے حالات کا شکوہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے آنے سے پہلے اور آپ کے آنے کے بعد ہم مسلسل فرعون اور فرعونیوں کی اذیت اور تکلیف میں زندگی گزار رہے ہیں اور یہ مظالم اب بھی حسب سابق جاری ہیں، ان میں کوئی کمی نہیں آئی اور آپ نے ہمیں جس نجات کا وعدہ دیا ہے اس کے آثار تو نظر نہیں

آرہے۔ ان کی یہ گفتگو ان کے ایمان کی کمزوری پر دلیل ہے، وہ آرام طلب تھے اور بغیر کسی جدوجہد کے کامیابی چاہتے تھے جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ انقلاب اور تبدیلی اس وقت آتی ہے جب سارے افراد تبدیل ہو جائیں اور ان میں تحرک ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں انہیں تسلی دینے اور امیدوار بنانے کے لئے فرمایا: ''اللہ سے ہی اُمید رکھنی چاہیے، اللہ تمہارے دشمن کو نابود کر دے گا اور ان کی جگہ تمہیں اس سرزمین کا اقتدار دے دے گا۔ لیکن یہ اسی وقت ہی حاصل ہو گا جب تم اللہ سے مدد طلب کرو گے اور فرعونیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور ان کے خلاف قیام کی صورت میں جو تکالیف و مصائب آئیں گے ان کو برداشت کرو گے اور پوری ہوشیاری اور سمجھداری سے کام کرو گے۔ اللہ تعالیٰ تو کسی عمل کو بغیر وجہ کے وجود میں نہیں لاتا، اللہ کا ہر کام حکمت و فلسفہ پر مبنی ہے، ہدف دار ہوتا ہے اللہ تمہیں بغیر قید و شرط کے تو مکرم، محترم و معزز نہیں بنائے گا۔ اگر ظلم کے سامنے سر جھکائے رہو گے اور ان کے ظلم پر خاموشی اختیار کرو گے پھر تو اللہ کی مدد تمہارے لئے نہیں آئے گی۔ اللہ کی مدد اسی صورت میں آئے جب تم کچھ کرو گے۔ قیام کرنے کی صورت میں ہی اللہ مدد دے گا اور اللہ اس پر قادر ہے۔ اللہ تمہیں ان کی سرزمین پر اقتدار دے گا لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ تمہارے لئے ایک امتحان ہے اس امتحان سے تمہیں گزرنا ہو گا تاکہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھ لے کہ تمہارا رویہ ظالموں سے مقابلہ کرنے کے لئے کیسا ہے؟ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والے مجاہدین کو دوسروں سے ممتاز فرماتا ہے اور یہ امتیاز امتحان کے وسیلہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

وَ لَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَ الصّٰبِرِيۡنَ ۙ وَ نَبۡلُوَا۠ اَخۡبَارَكُمۡ ۝۳۱ (سورہ محمدؐ، آیت: ۳۱)

ترجمہ: ''اور ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کی شناخت کر لیں اور تمہارے حالات جانچ لیں''۔

وَ لَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور میوں کی کمی میں پکڑ لیا تاکہ وہ نصیحت مانیں''۔

فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوۡا بِمُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾

''جب ان پر خوشحالی آتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لیے ہونا ہی چاہیے، اور اگر انہیں کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

فرعونیوں کے لیے قحط کا عذاب

''سِنِیۡنَ'' ''سنة'' کی جمع ہے جس کا معنی قحط کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قسم کھا کر فرمایا ہے کہ ہم یقیناً فرعونیوں کو قحط اور خشک سالی کے عذاب سے دوچار کریں گے تاکہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی طرف رجوع کرلیں۔ مصر کی زمین بہت ہی زرخیز تھی، مصری ہمیشہ خوشحالی میں تھے، فصلیں بہت اچھی ہوتیں، محصولات بہت زیادہ ہوتے، غلات کی فراوانی رہتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے اُنہوں نے قحط و خشک سالی کو نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ کہتے تھے کہ غلات کی فراوانی اور محصولات کے حوالے سے خوشحالی ہماری اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے تھی۔ اور اب خشک سالی اور قحط سے دوچار ہوئے ہیں تو یہ

موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کی بد بختی کی وجہ سے ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے فرمایا کہ ان کی بد بختی اور بد شگونی اور بد حالی یہ سب اللہ کے پاس ہے۔ یہ عذاب اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے لیکن یہ لوگ غافل ہیں، وہ ان حالات سے تذکر اور یادآوری نہیں لیتے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی بد بختی اور بد حالی میں ان کے گناہوں کا کوئی اثر نہیں ہے جبکہ ان کے سارے اعمال اللہ کے پاس محفوظ اور درج شدہ ہیں۔

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور کہا جو کوئی نشانی بھی تو ہمارے پاس لے آئے کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرے، پھر بھی ہم تجھ پر ہر گز ایمان نہ لائیں گے"۔

فرعونیوں کا ایمان لانے سے انکار

فرعونیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متکبرانہ انداز سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اے موسیٰؑ! تم جتنے مرضی معجزات ہمارے سامنے دکھاؤ اور اپنے جادو کا اثر ہمارے اوپر چھوڑو لیکن ہم تیرے جادو سے متاثر نہیں ہوں گے اور تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ فرعونی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو سحر اور جادو قرار دیتے تھے اس طرح کے جملوں سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ٹھٹھہ مذاق اڑانا چاہتے تھے اور ان سے کہتے کہ تم بلاوجہ اپنے جادوگرانہ کرتبوں کو معجزات کا نام دے رہے ہو، یہ بھی وہی عام جادو کے سواء کچھ نہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''پھر ہم نے ان پر طوفان اور ٹدی اور جوئیں اور مینڈک اور خون یہ سب کھلے کھلے معجزے بھیجے، پھر بھی انہوں نے تکبر ہی کیا اور وہ لوگ گناہگار تھے''۔

فرعونیوں پر مختلف قسم کے عذاب

'' الطُّوْفَانَ '' ایسے حادثہ کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنے گھیرے میں لے لے لیکن عام طور پر شدید قسم کی آندھی، تباہ کن سیلاب پر بولا جاتا ہے۔ ایسا سیلاب جو زمین پر کھڑی فصلوں کو غرق کر دے، جس سے فصلیں تباہ ہو جائیں۔ '' جَرَادَ '' ٹڈی دَل چھوٹی سے مکڑی ہوتی ہے جو فصلات کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مصریوں پر اُتارے گئے مختلف قسم کے عذاب کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں ویران کن سیلاب جس سے ان کی فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں، ٹڈی دَل جو ان کی فصلات کو کھا گئیں اور قحط کا سبب بنیں۔ جوئیں جو ان کے جسم میں پیدا ہوتیں جن سے ان کا آرام و سکون تباہ ہو جاتا۔ مینڈکوں کے ذریعہ ان کے سکون و آرام کو تباہ کیا گیا۔ ان پر خون کی بارش ہوئی جس سے ان کی زندگی ماند پڑ گئی۔

'' مُّفَصَّلٰتٍ'' مفصل کی جمع ہے جس کا معنی ہے جدا جدا، اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں عذاب آنے سے پہلے اس کے بارے خبر دیتے تھے جب عذاب آجاتا تو وہ بجائے اس سے تذکر لیتے اور غفلت سے جاگتے، غفلت میں ہی پڑے رہتے۔ ان کو چاہیے تو تھا کہ ان چیزوں سے عبرت لیتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرتے؛ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنی ہٹ دھرمی پر باقی رہے۔

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۚ﴿۱۳۴﴾

''اور جب ان پر کوئی عذاب آتا تو کہتے اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جس کا اس نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اگر تو نے ہم سے یہ عذاب دور کر دیا تو بے شک ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے''۔

فرعونیوں کی موسیٰؑ سے مدد کی درخواست

''الرِّجْزُ'' عذاب کے معنی میں ہے۔ جیسے فرعونیوں پر عذاب الٰہی آجاتا اور وہ پریشان ہوتے تو اس پریشانی کے عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متوسل ہوتے اور ان سے کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تیرے لئے وعدہ دے رکھا ہے کہ وہ تیری دعا کو رد نہیں کرے گا لہٰذا آپ ہمارے لئے اللہ سے دُعا کرو اور یہ جو ہمارے اوپر عذاب آیا ہے اسے ہم سے ٹال دو، ختم کر دو تو ہم تم پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے اور تیرے ساتھ انہیں بھیج دیں گے۔ لیکن وہ عملی طور پر اس وعدہ پر عمل نہ کرتے، جیسے ہی عذاب ان سے اُٹھ جاتا اور مدت پوری ہو جاتی تو وہ اپنے سابقہ طور طریقوں کی طرف پلٹ جاتے تھے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾

''پھر جب ہم نے ان سے ایک مدت تک عذاب اٹھا لیا کہ انہیں اس مدت تک پہنچنا تھا اس وقت وہ عہد توڑ ڈالتے''۔

فرعونیوں کی پیمان شکنی

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ اور فرعونیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا کہ اگر ان سے عذاب اٹھ گیا تو وہ اتنے عرصہ میں ایمان لے آئیں گے اور اسرائیل کو آزاد کر دیں گے لیکن جب ان سے عذاب اُٹھ گیا اور جو وقت مقرر کیا گیا تھا وہ بھی گزر گیا تو وہ ایمان نہ

لائے اور اپنے وعدہ سے پھر گئے۔ فرعونی حقیقت میں پیمان شکن تھے اور عہد کو پورا نہیں کرتے تھے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا پھر ہم نے انہیں دریا میں ڈبو دیا اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے''۔

فرعونیوں کا غرقِ آب ہونا

فرعونی ہر معجزے کا انکار کرتے رہے، آخر کار ان کے لئے ہر قسم کی مہلت ختم ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرعون اور فرعونیوں کو سمندر میں غرق کر دیا اور ایسی حالت میں غرق ہوئے کہ وہ اس سے غافل تھے۔ ہر قوم جو اللہ کے معجزات کا انکار کرتی ہے اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلاتی ہے تو ان کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے جیسا فرعونیوں کا ہوا۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

''اور ہم نے ان لوگوں کو وارث کر دیا جو اس زمین کے مشرق و مغرب میں کمزور سمجھے جاتے تھے کہ جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور تیرے رب کا نیک وعدہ

بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کے باعث پورا ہو گیا، اور ہم نے تباہ کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کی قوم نے بنایا تھا اور جو اونچی عمارتیں وہ بناتے تھے"۔

بنی اسرائیل کی کامیابی اور فرعونیوں کی بربادی

بظاہر اس سرزمین سے شام اور فلسطین کی سرزمین مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فلسطین اور کعبہ کے اطراف کی زمیں کے علاوہ کسی اور کے بارے نہیں فرمایا کہ ہم نے اسے بابرکت بنایا ہے۔ قبطیوں نے بنی اسرائل کو کمزور بنا رکھا تھا، انہیں اپنا غلام بنایا ہوا تھا وہ انتہائی ذلت و خوارگی میں زندگی بسر کرتے تھے، فرعون ان پر بہت زیادہ ظلم کرتا تھا۔ اللہ فرما رہا ہے کہ ہم نے انہیں (ان کمزور بندوں کو) مشرق اور مغرب میں سے جو مقدس سرزمین تھی اس میں سکونت دے دی جیسا کہ سورۂ قصص، آیت ۵ میں فرمایا:

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (سورۂ قصص، آیت: ۵)

"اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ جنہیں زمین میں بے بس کر دیا گیا ہے ہم ان پر احسان کریں اور ہم انہیں پیشوا بنائیں اور ہم انہی کو وارث بنائیں"۔

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت نمائی کے لئے کمزور اور بے سہارا لوگوں کو اپنی زمین پر اقتدار دیتا ہے اور انہیں ہلاک شدگان کی زمینوں کا وارث قرار دے دیتا ہے۔ اور جو یہ فرمایا:

"وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى" (تیرے رب کا بہترین فرمان پورا ہوا) تو اس سے مراد یہ ہے کہ فرعون و فرعونیوں کا ہلاک ہونا اور بنی اسرائیل کے لئے اقتدار ملنا یہ اللہ کی حتمی قضاء و فیصلہ تھا کہ جس کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو دی رکھی تھی اور بتایا تھا کہ یہ الٰہی وعدہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ تم صبر کرو، جہاد کرو:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ۔۔۔

ترجمہ: ''ایسا ہی ہو گا کہ تمہارے صبر و جد وجہد کے نتیجہ میں تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین میں خلافت (حکومت) عطاء کرے گا۔۔۔''

آخر میں فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کے دشمن کو زیر و زبر کر دیا، مکمل طور پر انہیں ختم کر دیا، ان کے تمام محلات اور بڑی بڑی شاندار عمارتوں کو ویران کر دیا۔ نہ فقط فرعونیوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قدرت اور بالادستی کے جو مادی مظاہر تھے ان کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس طرح بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان فرمایا۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتارا تو ایک ایسی قوم پر پہنچے جو اپنے بتوں کے پوجنے میں لگے ہوئے تھے، کہا اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک ایسا معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں، فرمایا بے شک تم لوگ جاہل ہو''۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

''بے شک وہ چیز تباہ ہونے والی ہے یہ لوگ جس میں لگے ہوئے ہیں، اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں''۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

"موسیٰ نے کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لیے اور معبود بنا دوں حالانکہ اس نے تمہیں سارے جہاں پر فضیلت دی ہے"۔

بنی اسرائیل کی جاہلانہ خواہش کا جواب

اللہ تعالیٰ کی مدد سے بنی اسرائیل کا دشمن تباہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سمندر برد کر دیا اور یہ لوگ فلسطین کی سرزمین کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستہ میں انہوں نے ایک ایسی قوم دیکھی جو بت پرستی میں مشغول تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فوراً درخواست کر ڈالی کہ جس طرح ان کے بت ہیں اور وہ ان کی پرستش کرتے ہیں اسی طرح ہمارے لئے بھی بت بنا دیں تاکہ ہم بھی ان کی پرستش کریں۔ یہ کلام بنی اسرائیل کی انتہائی نادانی اور جہالت پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اتنے سارے معجزات کا مشاہدہ کیا اور یہ بھی دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے لیے سمندر کو دو نیم کیا اور انہیں اسے عبور کروا دیا اور فرعونیوں کو سمندر کے بیچ میں غرق کر دیا۔ اس سب کے باوجود ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر انہیں بھی بت پرستی کا شوق لاحق ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لو بہت ہی ناسمجھ، فکر و سوچ سے عاری، بہت ہی ساری اور سطحی سوچ رکھنے والے تھے، فکری پستی کا شکار تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ بت پرستی تو سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں۔ تم یہ کیسی جاہلانہ خواہش کر رہے ہو؟ بتوں نے تو نابود ہونا ہے اور یہ لوگ جو اعمال کر رہے ہیں سب باطل ہیں کوئی بھی عقلمند انسان اس قسم کے اعمال کو بجا لانے کی خواہش نہیں کر سکتا۔ مُتَبَّرٌ "تبار" سے ہے جس کا معنی ہلاکت کے ہیں۔ "مَّا هُمْ فِيْهِ" سے مراد جس حال میں وہ موجود ہیں یعنی بت پرستی، تو اس میں سوائے ہلاکت و بربادی کے اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ میں تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود بناؤں جبکہ اللہ کے سوا تو کوئی معبود والٰہ نہیں ہے۔ رب العالمین ہی تمہارا الٰہ ہے جس نے بڑی واضح نشانیاں تمہارے لئے بھیجیں، اپنی روشن آیات اور دین حق کے ذریعہ تمہیں فرعون اور ان کے اعمال سے نجات دلائی اور تمہیں سب پر برتری عطاء کی۔ کیا یہ سب نشانیاں کافی نہیں کہ الٰہ فقط اللہ ہے۔ اب تم ایک اور الٰہ کی تلاش و جستجو کر رہے ہو جو آسانی سے تمہارے بغل میں موجود ہو اور اسے سامنے رکھ کر پوجا پاٹ کرو۔ وہ اللہ وحدہ لاشریک ہے کہ جس نے تمہارے اوپر اتنا بڑا احسان کیا ہے، تمہیں دشمن سے نجات دلائی، تم کس طرح اس قادر مطلق الٰہ کی جگہ اپنے لئے خیالی اور بے حقیقت بتوں کو معبود والٰہ بنانے کے درپے ہو؟!

وَ اِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو تمہیں برا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کا بڑا احسان تھا"۔

بنی اسرائیل پر اللہ کا احسان

"یَسُوْمُوْنَكُمْ" کا مطلب ہے کہ فرعونی تمہیں ذلیل و خوار کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو احسان کیا اس کا تذکرہ ہے کہ تمہاری حالت یہ تھی کہ تم ذلیل و خوار تھے، تمہارے جوانوں کو مار دیا جاتا تھا اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنا دیا جاتا تھا، ہم نے تمہیں عزت دی ہے، فرعونیوں سے نجات دلائی ہے۔ تمہارا ایک بڑا امتحان تھا

جس سے تم گزر آئے ہو، اب نجات حاصل کرنے کے بعد اللہ کو اپنا اللہ و معبود بنانے کی بجائے بت پرستی کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتے ہو جو کہ ایک باطل روش ہے۔ اس طرح بنی اسرائیل کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اللہ کے انعامات کی ناشکری نہ کریں بلکہ ان نعمات کا شکر اللہ کی اطاعت کرکے بجالائیں۔

وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ۚ وَ قَالَ مُوۡسٰی لِاَخِیۡہِ ہٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَ اَصۡلِحۡ وَ لَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

"اور موسٰی سے ہم نے تیس رات کا وعدہ کیا اور انہیں مزید دس سے پورا کیا پھر تیرے رب کی مدت چالیس راتیں پوری ہوگئی، اور موسٰی نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرے جانشین رہو اور اصلاح کرتے رہو اور مفسدوں کی راہ پر مت چلو"۔

موسیٰؑ کا اللہ کی خاص عبادت میں مصروف رہنا

"مِیۡقَاتُ" معین وقت کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی خاص عمل انجام دینا ہوتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کرنے اور اپنے تقرب کے لئے جو وعدے دیے ہوئے تھے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے لئے تیس راتیں قرار دی گئیں پھر ان پر دس راتیں اور بڑھا دیں اس طرح مجموعی طور پر جو موسیٰؑ کو وعدے دیے گئے وہ چالیس رات ہوئے۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری چالیس راتیں اللہ سے کلام و مناجات کرتے رہے اور اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ اس پورے عرصہ میں

مناجات، راز و نیاز کرتے رہے، چالیس راتوں میں دن بھی شامل تھے۔ ان ایام کا مقصد رب تعالیٰ کی بارگاہ میں تقرب کرنا تھا جبکہ مناجات اور راز و نیاز عام طور پر رات کو ہی ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا خلیفہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ سے راز و نیاز اور مناجات کیلئے جا رہے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم میں اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے اور ان سے کہا کہ وہ ان کے امور کی اصلاح کریں۔ مفسدین کی حرکات پر نظر رکھیں اور ان کی باتیں نہ مانیں۔ مفسدوں کی پیروی نہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان مفسدوں میں ایسے افراد موجود تھے جو افتراق و انتشار پھیلاتے تھے اور آپ نے ہارونؑ کو ہدایت فرمائی کہ تفرقہ سے بچیں، ان کی سازشوں اور شرارتوں سے چوکنا رہیں، ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں۔ اس طرح قومی وحدت جو بڑی مشکل سے حاصل ہوئی ہے جس کے بارے بہت زیادہ مصائب جھیلے گئے ہیں یہ وحدت تفرقہ میں نہ بدل جائے۔

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

”اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے میرے رب مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں! فرمایا کہ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن تو پہاڑ کی طرف دیکھتا رہ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تو مجھے

دیکھ سکے گا، پھر جب اس کے رب نے پہاڑ کی طرف تجلی کی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کی کہ تیری ذات پاک ہے میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا یقین لانے والا ہوں"۔

رب تعالیٰ کے دیدار کی خواہش

"تَجَلّٰی" ظہور کو قبول کرنا، واضح اور روشن ہونا، جھلک کے معنی میں ہے۔ "دك" زور سے کوٹنا۔ "خر" خرور سے لیا گیا ہے جو سقوط اور گرنے کے معنی میں ہے۔ "صعقا "صعقة" سے ہے جس کا معنی موت اور بے ہوشی کے ہیں۔ "افاقة" بے ہوشی کے بعد سلامتی کی حالت میں واپس آجانا۔

جب موسیٰ علیہ السلام اس جگہ پہنچ گئے جہاں پر رب تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا کہ اس مقام پر آکر مجھ سے کلام کرو اور میری مناجات اور عبادت، راز و نیاز میں مصروف ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے تکلم فرمایا، جب موسیٰؑ نے اللہ کا کلام سُنا تو انہیں اشتیاق ہوا کہ وہ اللہ سے ملاقات کی درخواست بھی دے دیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا رب مجھے اپنا دیدار کروادے اور اپنے دیدار کے وسائل مہیا فرمادے تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں۔ کیونکہ نگاہ کرنا، دیکھنے کا نتیجہ ہے اور دیکھا اسے جاتا ہے جس میں دیکھے جانے کی صلاحیت موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ تو حسی اشارہ سے منزہ ہے، اس کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا، وہ آنکھوں کے مشاہدہ سے برتر ہے اس لئے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں فرمایا: تم مجھے کبھی بھی نہیں دیکھ سکو گے یہ ایک ایسی خواہش ہے جس کا عقلی امکان نہیں ہے کیونکہ جس کو دیکھا جاتا ہے وہ کسی جگہ پر ہو گا، اور جو کسی جگہ پر ہو گا وہ اس جگہ کا محتاج ہو گا جبکہ اللہ کسی لحاظ سے بھی کسی کا محتاج نہیں ہے۔

موسیٰؑ کو یہ مطلب سمجھانے کے لئے اللہ نے فرمایا یہ پہاڑ تمہارے سامنے ہے اس کو دیکھو میں خود کو اس پہاڑ کے لئے ظاہر کرتا ہوں، اگر تم نے دیکھا کہ اس میں میرے دیکھنے کی تاب و طاقت ہے تو، توں بھی مجھے دیکھ سکے گا۔ جب اللہ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ اس پہاڑ پر کیا تو اسے کوٹ کر رکھ دیا اور پہاڑ فضاء میں متلاشی ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام اس منظر کی ہیئت سے بے ہوش ہو گئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے اللہ! تو منزہ ہے، تیری ذات پاک ہے اس سے کہ وہ قابل رویئت ہو۔ تجھے ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا، دوسرے اسے اپنے حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ سوچ غلط ہے کہ اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اُنھوں نے غلط خواہش کی تھی اور یہ ان کی غلطی تھی اس لئے فوراً توبہ کرلی اور اللہ کی طرف پلٹ گئے اور یہ اعلان کیا کہ میں پہلا وہ شخص ہوں جو اس پر ایمان لایا ہوں کہ تو نظر آنے کے قابل نہیں ہے۔

موسیٰؑ کے نزدیک رویئت الٰہی کا معنی

یہ تو آیت کا ظاہری معنی ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں جو رویئت متبادر ہوئی تھی یا جس قسم کی رویئت کا اُنھوں نے تقاضا کیا تھا اس سے مراد وہ رویئت نہیں تھی جو عام لوگوں کے ذہن میں ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف حواس کا اشارہ نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے اسے حواس سے درک نہیں کر سکتے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے مد نظر اس ضروری علم کی طلب تھی جو کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ علم کے روشن تر مراحل اور ان کے ادراک سے نفسانی حجاب زائل اور گناہوں کی تاریکی سے نکلنے اور سارے حجاب کا خاتمہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ حجاب موجود نہ ہوں تو ارواح روشن ادراک اور دیدہ بصیرت سے رویئت کو پاتی ہیں۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تکلم کی طلب کے بجائے ایک بالاتر علمی مقام کی درخواست کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے اپنی آیات دکھانے کے ذریعہ علم نظری عطا فرمایا پھر اس سے تکلم کیا اور آواز ایجاد کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اپنی کلام کا اعزاز بخشا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک منزل آگے بڑھنا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تم مجھے ہر گز نہ دیکھ سکو گے" تو اس سے مراد دُنیاوی رویت ہے کہ انسان جب جسم و جسمانیات کی قید میں بند ہے تو وہ ایسے علم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا اور یہ جملہ کہ (و لکن انظر الی الجبل۔۔۔) یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اللہ کی رویت عقلاً محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنی قدرت کا اظہار فرمایا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کو سمجھانا تھا کہ اے موسیٰؑ! اس جسم کے ساتھ تم اس تجلی کو وصول کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہو۔

موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہو کر گر جانا اس وجہ سے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کے قہر و غلبہ کا مشاہدہ کیا تھا اور اس کے اثر سے پہاڑ کے وجود کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا تھا اس لئے وہ مدہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو پھر استغفار کیا اور اللہ سے رویت کی جو درخواست کی تھی اور عملی کمال کی تیسری منزل مانگی تھی تو اس پر شرمندہ ہوئے اور اللہ سے معافی مانگ لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام معصوم ہیں، معصوم کی توبہ گناہ کے عام معنی کے اعتبار سے نہیں ہوتی بلکہ ایسا معمولی سا عمل جس سے وہ اپنے رب تعالیٰ کے حضور میں موجود رہنے سے ایک طرف ہو جائیں تو وہ اس حالت کو بھی اپنے لئے گناہ سمجھتے ہیں اور اللہ سے معافی کے طالب ہوتے ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس تیرے مقام کی خواہش تھی وہ مقام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطاء نہ ہوا۔ شاید وہ مقام مراد ہو جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل اطہار علیہم السلام کیلئے تھا۔

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

''فرمایا اے موسیٰ! میں نے تجھے امتیاز دیا ہے دوسرے لوگوں پر پیغمبری اور ہم کلامی میں، پس لے لو جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ''۔

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور ہم نے اس کو تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، سو انہیں مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم کر کہ اس کی بہتر باتوں پر عمل کریں، عنقریب میں تمہیں نافرمانوں کا ٹھکانہ دکھاؤں گا''۔

موسیٰؑ کے لیے اللہ کا خصوصی انعام

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے جو انعام اور اعزاز بخشا ہے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے موسیٰؑ! میں نے تجھے مصطفیٰ بنایا، سب لوگوں پر تجھے چن لیا ہے تاکہ تم میری جانب سے، معارف، اوامر و نواہی، شرائع کو عوام تک پہنچاؤ تم میرے پیامبر ہو۔''

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے تجھے اپنی ہم کلامی کا شرف بخشا ہے۔ تکلم سے مخاطب اور عالم غیب کے درمیان رابطہ اور اتصال ایجاد کرنا مراد ہے، یہ رابطہ قوت شنوائی (سماعت کی قوت) میں تاثیر کے ذریعہ یا اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ہو سکتا ہے جس میں اللہ اور اللہ کے پیغامات کو اس کے رسول تک پہنچانے میں فرشتہ واسطہ نہ ہو۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے پیغامات براہ راست اللہ کی جانب سے فرشتے کے واسطہ کے بغیر موسیٰ علیہ السلام

وصول کرتے تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ (اللہ سے ہم کلام ہونے والے) ہے۔

ان اعزازات کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ تم اس پر شکر گذار بنو۔ اس کے ساتھ آپؑ کو ایک خبر دی گئی کہ بہت جلد تمہیں فسادی اور گناہگاروں کی تباہی اور ہلاکت کا نظارہ کرایا جائے گا۔

''اَلۡاَلۡوَاحِ'' ایسے صفحات (اوراق) کو کہتے ہیں جن پر لکھا ہوا مواد موجود ہو۔ الواح، لوح کی جمع ہے جس کا معنی ایسی چیز ہے جسے لکھنے کی غرض سے تیار کیا گیا ہو۔ اسے لوح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ جو کچھ اس پر لکھا جاتا ہے وہ دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ ''لاح'' ظاہر ہونے کے معنی میں ہے اور ''لوح'' لکھائی کو کہتے ہیں جو ظاہر ہو۔

موسیٰؑ کو دی جانے والی الواح

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح عطاء کیں یہ حقیقت میں لکھے ہوئے صفحات تھے جن میں مواعظ، قوانین اور قوم کی ضرورت کے تمام مسائل کا تذکرہ موجود تھا۔ ہر وہ عمل جو قوم کے مفاد میں تھا اس کا تذکرہ ان میں تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ تم ان الواح کو پوری سنجیدگی سے وصول کرلو اور ان کی حفاظت کرو اور ان میں درج شدہ مواد کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ ان میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ نیز حکم دیا کہ اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ گناہ نہ کریں، جھوٹ نہ بولیں، فسق و فجور سے بچیں، توریت میں جو کچھ اچھائیاں ان کے لئے بیان کی گئی ہیں ان پر عمل کریں، بے عملی سے بچیں!۔

فاسقان سے وہ لوگ مراد ہیں جو رسول کی پیروی کرنے کے بعد پھر برائیوں کی طرف مائل ہو جائیں، ہدایت سے گمراہی میں چلے جائیں تو آخر کار ان کا انجام برا ہو گا اور ان کا مقدر ہلاکت ہے جسے تم کو دکھلایا جائے گا۔

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِیَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَ اِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَیِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾

”پھر میں اپنی آیتوں سے انہیں پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اور اگر وہ ساری نشانیاں بھی دیکھ لیں تو بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اسے اپنی راہ نہیں بنائیں گے، اور گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنا راستہ بنائیں گے، یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے بے خبر رہے“۔

متکبرین کی سزا

تکبر کے ساتھ غیر حق کی قید لگائی ہے تو یہ اس کی توضیح دینے کیلئے ہے وگرنہ ایسا نہیں کہ زمین پر ایک تکبر برحق ہو اور دوسرا تکبر حق نہ ہو بلکہ تکبر ہوتا ہی ناحق ہے کیونکہ کبریائی فقط اللہ کی ذات کیلئے ہے۔ ناحق کی قید توضیحی قید ہے، احترازی قید نہیں ہے۔ ایسا تکبر جس کی تعریف کی گئی ہے وہ اللہ کے دشمنوں کے سامنے تکبر کرنا ہے، اللہ کے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لئے تکبر کرنا ہے لیکن اللہ کی زمین پر تکبر کرنا تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی زمین

پر اللہ کے بندوں کو کمزور بنا کر رکھنا، ان پر ستم کرنا تو اس تکبر کی ایک ہی قسم ہے جو ناجائز اور ناحق ہے۔

مستکبرین کے حالات

مستکبرین کے اوصاف کو اس آیات میں بیان کیا ہے:۔

۱۔ جو بھی معجزہ دیکھتے ہیں؛ اس پر ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ کفر پر اصرار کرتے ہیں۔

۳۔ آیات کو جھوٹا قرار دینے پر زور دیتے ہیں۔

۴۔ رشد و ہدایت کے راستہ سے انحراف کرتے ہیں۔

۵۔ گمراہی اور بے راہ روی کو اپناتے ہیں۔

مستکبرین کا انجام

مستکبرین کے ان رویوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی آیات اور نشانیوں کو دُور کر دیا ہے کہ وہ ان سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ اور سبب ان کا الٰہی آیات کو جھٹلانا اور ان آیات سے غفلت ہے۔ یہ لوگ اس غفلت اور بے توجہی کے انجام سے بے خبر تھے جبکہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی تاک میں ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ؕ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾

”اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہو گئے، انہیں وہی سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے“۔

عمل کی جزاء

ہر شخص کو اس کے عمل ہی کا بدلہ دیا جائے گا۔ "حبط عمل" عمل کے بغیر اجر کے ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی سزا ہے کیونکہ ہر نیک عمل کی جزاء خود وہی عمل ہے لہٰذا جب ان کا عمل ہی بے اجر اور باطل ہو جائے گا اور اس کی تاثیر بھی نہ رہے گی۔ نیکیوں کے بے اثر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جس کی نیکی بھی ہے اور برائی بھی ہے اس کی برائی کے بے اجر ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا اجر تھا ہی نہیں کہ اس کا اجر باطل ہوتا۔ حقیقت میں بے اجر ان کی نیکیاں ہوں گی کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا۔ اور اگر جزاء سے مراد نیک بدلہ لیا جائے تو اس کا معنی اس طرح ہو گا کہ ان کے کسی عمل کا انہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ ان کے اعمال کے حبط ہو جانے سے ان کا کوئی صالح اور نیک عمل باقی نہیں رہے گا۔

وَ اتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ حُلِیِّهِمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّهٗ لَا یُکَلِّمُهُمۡ وَ لَا یَهۡدِیۡهِمۡ سَبِیۡلًا ۘ اِتَّخَذُوۡهُ وَ کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۸﴾

"اور موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ کے جانے کے بعد اپنے زیوروں سے بچھڑا بنالیا جو ایک جسم تھا جس میں گائے کی آواز تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں راہ بتاتا ہے، اسے معبود بنالیا اور وہ ظالم تھے"۔

قوم موسیٰؑ کی گوسالہ پرستی کا واقعہ

"حُلِیّ" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی زینت کرتا ہے جیسے سونا اور چاندی۔

"عجل" گائے کا بچھڑا (گوسالہ)۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ کے حکم سے اللہ تعالیٰ سے ملاقات پر چلے گئے اور اپنے پیچھے بنی اسرائیل میں ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا گئے اور انہیں تاکید کی کہ ان میں اصلاح کرنا اور یہ بھی فرمایا کہ ان کے درمیان افتراق اور انتشار پھیلانے سے بچنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تیس دن کیلئے گئے تھے لیکن جب وہ واپس نہ آئے تو انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے شک و تردید ہونے لگا، سامری نے ان کے کمزور ایمان کو غنیمت جانا اور انہیں دھوکہ دیا اور ان کے زیورات کو اکٹھا کیا اور انہیں ڈھال کر ان سے ایک گوسالہ بنا دیا کہ اس کے اندر سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے گوسالہ کی ہوتی ہے۔ سامری نے ان سے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وہ مجسمہ نہ تو ان سے بات کرتا تھا اور نہ ہی ان کی کسی امر بارے راہنمائی کرتا تھا۔" اللہ تعالیٰ نے اس گوسالہ کے معبود ہونے کی نفی کرنے کیلئے ان دو صفات کا ذکر کیا ہے جن میں اس کا کلام کرنا اور ہدایت دینا ہے۔ یہ دونوں الوہیت کی روشن ترین صفات اور اس کا لازمہ ہیں۔ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی وحدانیت اور معبودیت کی طرف انہیں دعوت دیتے تھے تو یہ دونوں خصوصیات موجود تھیں۔

پہلی بات اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے تکلم فرمایا۔

دوسری بات یہ کہ راہ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

لہٰذا ان کو یہ بات سمجھ آجانی چاہیے کہ جب اس گوسالہ میں یہ دو خصوصیات نہیں تو وہ الٰہ و معبود نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اللہ فرما رہا ہے کہ انہوں نے ایسا کام کرکے اپنے اوپر ظلم کیا

ہے، وہ ستمگار تھے۔ اس بارے پوری تفصیل سورہ طہٰ میں بیان ہوئی ہے۔ اس جگہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ رَاَوۡا اَنَّہُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ یَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَ یَغۡفِرۡ لَنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾

"اور جب نادم ہوئے اور معلوم کیا کہ بے شک وہ گمراہ ہو گئے تھے، تو کہنے لگے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو بے شک ہم نقصان پانے والوں میں سے ہوں گے"۔

بنی اسرائیل کی پشیمانی

"سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡہِمۡ" یعنی مصیبت ان کے ہاتھوں سے انجام پائی۔ یہ تعبیر عام طور پر ان کے لئے استعمال ہوتی ہے جو اپنے برے عمل سے نادم و پشیمان ہوتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ابتلاء اور آزمائش غیر متوقع تھی۔[1] اس صورت میں ان کو سمجھ آگئی کہ ان سے غلطی ہوئی ہے اور وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس حالت میں انہوں نے اپنے ان اعمال سے ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر ہمارا رب ہمارے اوپر رحم نہ کرے اور ہمیں معافی نہ دے تو پھر قطعی طور پر ہم خسارے میں ہوں گے، ایسی خسارت کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور خسارہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کی بجائے اپنے ہاتھ سے تیار شدہ گوسالہ کی پرستش شروع کر دے۔

---

[1]۔ فارسی زبان کی ضرب المثل ہے "وقتیکہ سرشان بہ سنگ خورد، پیشمان شدند"۔ جب ان کا سر پتھر سے ٹکرا گیا تو نادم ہو گئے۔

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ٘ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

"اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے واپس آئے، تو کہا تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی، کیا تم نے اپنے رب کے حکم (کے آنے) سے پہلے ہی جلد بازی کرلی، اور (موسیٰ نے) تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑا اسے اپنی طرف کھینچنے لگا، اس نے کہا کہ اے میرے ماں جائے! لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے، سو مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسا اور مجھے گناہگار لوگوں میں نہ ملا"۔

گوسالہ پرستی پر موسیٰؑ کا ردعمل

"غَضَب" غصہ، انتقام لینے کے لئے یا کسی کو اپنے سے دُور کرنے کے لئے، انتقام کی حالت کو کہتے ہیں۔ "اَسِف" بہت ہی غم و اندوہ کے معنی میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ان کی حالت دیکھی کہ وہ گوسالہ پرستی پر جُت گئے ہیں، بہت ہی غصہ میں آگئے اور انہیں بہت زیادہ تکلیف ہوئی اور غمگین ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تم کس قدر برے میرے جانشین ثابت ہوئے۔ اب یا تو جب واپس آئے اور ان کو اس حالت میں دیکھ کر یہ اظہار فرمایا یا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم کی حالت

بارے آگاہ کر دیا۔ بہر حال غصہ اور غم کی حالت میں ان کے سامنے آئے اور فرمایا کہ تم اللہ کے اوامر سے آگے کیوں بڑھ گئے، وعدہ پورا ہونے سے پہلے اللہ کے حکم کو کیوں بھلا کر بیٹھے، جبکہ اللہ کا فرمان تمہاری خیر و فلاح کے لئے ہے۔ اللہ جو بھی کرتا ہے وہ بندوں کی بہتری کیلئے ہوتا ہے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہے اس کام میں تمہارا جلدی کرنا یا دیر کرنے کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔

بظاہر اس سے مراد تورایت کے نزول کی بات تھی جس کے بارے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو بتا چکے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ تم اس تاخیر سے کیوں پریشان ہو گئے؟ اس امر میں تم نے میری واپسی اور تورایت کے نزول میں جلد بازی کی ہے۔ سخت رد عمل ظاہر کیا، ہارونؑ کو سخت سست کہا جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں تفصیل موجود ہے کہ جب یہ گمراہ ہو رہے تھے تو ان کو کیوں نہ روکا۔ حضرت ہارونؑ کے سر کو پکڑا اور غصہ سے اپنی طرف کھینچا۔ حضرت ہارون نے بڑے پیارے انداز میں کہا ماں جائے! مجھ پر ناراض نہ ہوں، میرے بس میں کچھ نہ تھا۔ انہوں نے مجھے کمزور بنا دیا، مجھے ذلیل و خوار کیا، مجھے قتل کرنا چاہتے تھے لہٰذا مجھے ظالموں کے ساتھ نہ ملاؤ اور اس رویہ سے میرے دشمنوں کو خوش نہ کرو۔ سورہ طٰہٰ آیت ۹۴ میں ہے:

"میں ڈر گیا کہ کہیں تم مجھ سے یہ کہو کہ تم نے ان کو فرقوں میں بانٹ دیا اور میرا انتظار نہ کیا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صادر ہونے والے یہ کام ان کی عصمت کے منافی نہ تھے، کیونکہ عصمت کے منافی وہ چیزیں ہوتی ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔ عادی زندگی کے امور میں کی گئی مخالفت، عصمت کے منافی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صادر ہونے والا کام، ان کے اس خیال کا نتیجہ تھا جو آپؑ جناب ہارون کے بارے

میں سمجھتے تھے۔ اسی لیے آپؑ نے ان کو ادب سکھانے کے قصد سے یہ کام انجام دیا تھا۔ جس ایک امر ارشادی تھا نہ امر مولوی۔ تاکہ اس کی خلاف ورزی عصمت کے منافی ہو۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۟ؑ (۱۵۱)

''کہا اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر، اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے''۔

حضرت موسیٰؑ کی دعا

اس میں موسیٰ نے دعا میں اپنی قوم میں سے کسی کو شریک نہیں کیا اور فقط یہ کہا کہ اے اللہ مجھے اور میرے بھائی کو مغفرت عطا فرما اس میں طلب مغفرت گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ عمل جس میں ذرہ برابر بھی غفلت کا شبہ ہو تو انبیا اس کے لیے اللہ سے استغفار طلب کرتے ہیں طلب مغفرت طلب بخشش اور آخر میں اللہ کے ایک وصف کو بیان کیا ہے اور وہ اللہ کا وصف ''أَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ'' یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔

پیغام: اس میں پیغمبر نے اپنے لیے دعا کی ہے تو ہر شخص کو چاہیے اپنے انداز سے اپنے لیے دعا کرے اور کہے کہ (رَّبِ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ)

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ۟ (۱۵۲)

"بے شک جنھوں نے بچھڑے کو معبود بنایا انہیں ان کے رب کی طرف سے غضب اور دنیا کی زندگی میں ذلت پہنچے گی، اور ہم بہتان باندھنے والوں کو یہی سزا دیتے ہیں"۔

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کی سزا

بچھڑا کی پوجا کرنے والوں کے حوالے سے اس جگہ لفظ غضب کو نکرہ لایا گیا ہے اور ذلت کا لفظ بھی نکرہ ہے یہ عذاب میں اضافہ اور شدت کی طرف اشارہ ہے ذلت اور رسوائی کی انتہا یہ بتانے کے لیے کہ اللہ کا عذاب کس طرح کا ہوگا اور ذلت کس طرح کی ہو گی اس کو بیان نہیں کیا لیکن اشارہ ہے ان واقعات کی طرف جو بعد میں اس جرم کی وجہ سے پیش آئے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہوئی اس بچھڑے کو آگ لگائی گئی اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیا گیا۔

۲۔ دوسرا یہ کہ سامری اور اس کے پیروکاروں کو قتل کر دیا گیا۔

یہاں پر ذلت سے مراد ان کا اکھٹا قتل کیا جانا اور ان کا پہلا قیدی بننا اور غضب سے مراد آخرت کا عذاب ہے یا پھر ذلت سے مراد دنیا کی پستی اور دنیا کی گراوٹ جو ان کے حصے میں آئی وہ بھی ہو سکتی ہے اور آخر میں اشارہ ہے کہ جو غضب اور ذلت ہے وہ فقط قوم موسیٰ کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی سنت اور قانون ہے کہ جو بھی ملت اور قوم اللہ پر افتراء باندھ دے تو اس پر بھی یہی سزا آئے گی غضب بھی آئے گا اور ذلت بھی آئے گی۔

پیغام: اللہ پر کسی قسم کا افترا نہیں باندھنا چاہیے جب آپ کوئی بات خدا کی طرف نسبت دے کر کہتے ہیں تو اس کے بارے میں پہلے تحقیق کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کہا ہے یا نہیں کہا اسطرح اللہ کے نمائندے رسول ﷺ اور ان کے اہلبیت اطہار کی طرف بھی کوئی بات کی جائے تو پہلے تحقیق کرنی چاہیے کہ انہوں نے فرمایا ہے یا نہیں فرمایا کیونکہ اگر انہوں نے نہیں کہا ہوگا اور اللہ کا فرمان نہیں ہوگا مگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے فرمایا ہے یہ تو اللہ پر افتراء پردازی ہے

اور افتراء باندھنے والوں کی یہی سزا ہے جو یہاں پر بیان ہوئی آخرت کا عذاب ہے اور دنیا کی ذلت اور رسوائی ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۵۳﴾

"اور جنہوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لے آئے، تو بے شک تیرا رب توبہ کے بعد البتہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

گناہوں کے بعد توبہ کا اثر

اس جگہ اللہ فرمارہا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیان دیا جارہا ہے کہ اگر حقیقی توبہ ہو اور گناہوں کے بعد ایمان لے آئے تو ایسی توبہ اللہ قبول کر لیتا ہے اور توبہ کی قبولیت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

اللہ کا فرمان ہے:

وَ اِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اہۡتَدٰی ﴿۸۲﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت ۸۲)

ترجمہ: "اور بے شک میں بڑا بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے کام کرے پھر ہدایت پر قائم رہے"۔

یہ خطاب اس جگہ اگرچہ عمومی ہے لیکن جو پہلے بیان آچکا ہے اس کے ضمن میں دیکھا جائے تو جو بچھڑے کی پوجا کرنے والے تھے ان کو بھی شامل ہے اگر وہ حقیقی توبہ کر لیتے تو ان کی توبہ بھی قبول ہو جاتی ایمان لے آتے اور عمل صالح بجا لاتے خداوند بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

توبہ کی قبولیت

جو بھی انسان گناہ کرلیتا ہے تو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ یہ میرا گناہ بخشا نہیں جائے گا بلکہ اللہ کے اس بیان سے یہ پیغام ہے کہ گناہ کرلیا ہے تو اب توبہ کرلو۔ ایمان کا جو نور بے عملی کی وجہ سے نکل گیا ہے توبہ کرکے اسے بحال کرو اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی توبہ کی سچائی ثابت کرو تو اللہ بڑا مہربان ہے اور بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

''اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے تختیوں کو اٹھایا، اور ان میں جو لکھا ہوا تھا اس میں ان کے واسطے ہدایت اور رحمت تھی جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں''۔

موسیٰؑ کے پاس ہدایت کے نسخے

موسیٰ جب اپنی قوم کے پاس آئے اور قوم کو بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور جیسے کہ اوپر بیان ہوا ہے آپ نے اپنے بھائی ہارون کی داڑھی کو پکڑ لیا ہارون اور موسیٰ کی گفتگو بھی ہوئی حضرت ہارونؑ نے کہا کہ ماں جائے میرے ساتھ زیادتی مت کرو اس طرح میرے ساتھ غصہ نہ ہو میں تو ڈر گیا کہ اگر میں کوئی قدم اٹھاؤں تو کل آپ مجھے آکر کہتے کہ تم نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ بہرحال موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا یہ غصہ اس حوالے سے تھا کہ تم بت پرست کیوں بن گئے ان کو کیوں بننے دیا تو پھر وہ جو تختیاں حضرت موسیٰ پر آسمان سے لکھی ہوئی آئی تھیں جن میں اللہ کی طرف سے ہدایت درج تھی تاکہ اس کے ذریعہ ان کو ڈرائے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں جن کے دل میں اپنے رب کا خوف ہے ان کو ہدایت دے اور انکے دل میں رحمت تھی، ہدایت کی بات تھی۔

یہاں پر "رھبۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسا ڈر ہے جو احتیاط کے ساتھ ملا ہو اور غیض و غضب سے بچنا اس میں شامل ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب موسیٰ کا غصہ ختم ہوا تو تورات کی تختیوں کو اٹھایا اور جو ان الواح میں ان کے لئے اہل رہبت و خشیت ہیں اور اپنے رب سے دل میں خوف رکھنے والے اور تقویٰ و پرہیزگاری کے حامل ہیں، ہدایت اور رحمت کی باتیں تھیں۔

وَ اخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر مرد ہماری وعدہ گاہ پر لانے کے لیے چن لیے، پھر جب انہیں زلزلہ نے پکڑا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو پہلے ہی انہیں اور مجھے ہلاک کر دیتا، کیا توں ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو ہماری قوموں کے بے وقوفوں نے کیا، یہ سب تیری آزمائش ہے، جسے تو چاہے اس سے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھا رکھے، تو ہی ہمارا کارساز ہے سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے"۔

موسیٰؑ منتخب افراد کے ہمراہ وعدہ گاہ پر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی انتخاب کیے جہاں موسیٰؑ اللہ سے پیغامات وصول کرتے تھے کیونکہ بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ بھی حضرت کے ساتھ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے جگہ مقرر کی ہوئی تھی جہاں پر موسیٰ علیہ السلام جایا کرتے تھے اس کا نام میقات تھا تاکہ بڑے کام کے لیے اور بڑی بات کے لیے وہاں پر سب حاضر ہوں۔ بنی اسرائیل کی خواہش میں موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو لے کر جب اس مقام پر پہنچے تو بڑا ظلم جو انہوں نے کر رکھا تھا اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا جھٹکا لگا اور ایک بہت بڑے زلزلہ نے ان کو گھیر لیا اور وہ سارے لوگ زلزلہ کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ بجلی کڑک اور گرج کی وجہ سے سارے ہلاک ہو گئے۔ یہ زلزلہ اور گرج اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے بڑا عظیم ظلم کیا۔ وہ ظلم یہ تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ ہم ظاہر بظاہر سامنے رب کو دیکھیں یہ ان کی خواہش تھی اور یہ خواہش بہت بڑی زیادتی تھی جس کی طرف اللہ نے اشارہ دیا ہے۔

جب ستر منتخب افراد ہلاک ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی درگاہ میں دُعا کی اور کہا کہ اے اللہ! اگر تو چاہتا تو مجھے اور میری قوم کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور یہ کچھ نادان لوگ تھے، انہوں نے غلط کام انجام دیا جس کے وہ مرتکب ہوئے۔ کیا ان کی وجہ سے تو ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ اس بات کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے نافرمانی کی ہے اس سے پہلے تو کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ بات وہ اپنی زبان پر لائے تھے اور ان کے کم عقل، کم فہم اور ناسمجھ ہونے کی وجہ سے تھی۔

موسیٰ علیہ السلام جس انداز سے اللہ سے درخواست کر رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ڈر تھا کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہیں کے اے موسیٰ تیری دعوت جھوٹ پر مبنی تھی اور تم جو افراد لے گئے وہ سب ہلاک ہو گئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی

دعا کو قبول کرلی اور جو مر گئے تھے ان کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا مانگنے میں بہت ساری انکساری اور عاجزی کا اظہار کیا اور اس میں حیاء بھی شامل تھی۔ کہا کہ اے اللہ اے رب یہ تو تیری طرف سے ایک امتحان ہی تھا اور توں تو ایسا ہے جس کو چاہے ہدایت کرتا ہے جسے چاہے گمراہ کرتا ہے۔ اے رب تعالیٰ تیری رحمت تو تیرے غضب پر غالب اور مقدم ہے تیری سنت اور طریقہ تو ایسا نہیں ہے کہ توں بدکاروں کو سزا دینے میں جلدی کرے اور پھر دعا میں اپنی حاجت مانگنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دو صفات کو بیان کیا ہے۔

۱۔ ولی سرپرست ۲۔ غفور بہترین بخشنے والا ہے

ان دو صفات کو بیان کرکے موسیٰ نے اپنی حاجت پیش کر دی انہوں نے اللہ کی خدمت میں یہ نہیں کہا کہ ان ستر آدمیوں کو زندہ کر دے بلکہ یہ کہا کہ اے رب تو بہترین بخشنے والا ہے پس اس دعا میں یہی خواہش چھپی ہوئی تھی کہ میری شفاعت ان کے حق میں قبول کرلے اور ان کے گناہوں کو معاف کر دے انہیں دوبارہ زندہ کر دے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو معلوم تھا کہ اگر انہیں معافی مل جائے گی تو یہ سزا ان کے لیے نہیں رہے گی اور انہیں نئ زندگی مل جائے گی۔

پیغام : اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑا گناہ معاف کردیتا ہے کہ جب اللہ سے دعا مانگی جائے تو اللہ کی بہترین صفات کو درمیان میں لایا جائے اور دعا مانگتے ہوئے عاجزی وانکساری ہو شرم وحیا کا پہلو ہو تو خدا کی طرف سے دعا قبول ہوتی ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ﴿۱۵۶﴾

"اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی کہ ہم نے تیری طرف رجوع کیا، (اللہ نے) فرمایا میں اپنا عذاب جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور میری رحمت سب چیزوں سے وسیع ہے، پس وہ رحمت ان کے لیے لکھوں گا جو ڈرتے ہیں اور جو زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں"۔

بہترین اخروی مقام کی خواہش

اس آیت میں جو لفظ "ھُدْنَآ" ہے یہ مادہ "ھاد" سے ہے اس کا معنی واپس پلٹنا ہے۔ اس میں دعا کے مقام پر اپنے رب سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایک قسم کی اچھائی دنیا میں قرار دے اور دوسری ہمارے لیے آخرت میں اچھا مقام قرار دے، اپنے لیے بھی چاہا اور اپنی قوم کے لیے، اللہ دنیا اور آخرت کے معاملات میں اس کی اصلاح فرما دے اور پھر اس کی وجہ بتادی کہ ہم اس لیے اللہ سے درخواست کر رہے کہ ہمیں دنیا اور آخرت کا اچھا مقام دے کہ ہم تیری طرف پلٹ آئے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقہ کو اختیار کرنا یا اس راستے کی پیروی کرنا جو فطرت کا راستہ ہے جس پر اللہ نے انسان کو خلق کیا ہے اور یہ وہی دنیا اور آخرت کی اچھائی ہے۔

موسیٰ کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ ہماری رحمت نے ہر چیز کو گھیرے میں لیا ہوا ہے لیکن میرا عذاب بھی جس کو میں چاہوں اس کو عذاب میں ڈالتا ہوں عذاب گناہگاروں کے عمل کے نتیجے میں ہوتا ہے ورنہ اللہ کی طرف سے تو سوائے رحمت کے اور کچھ بھی نہیں اور سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۴۷۔ عذاب ربوبیت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ عذاب گناہگاروں کے کفر اور گناہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور عذاب درحقیقت رحمت کا فقدان اور رحمت کا نہ ہونا ہے۔ پھر فرمایا کہ میری رحمت پرہیزگاروں، تقویٰ اختیار کرنے والوں، زکوۃ دینے والوں کے لیے اور ان کے لیے ہے جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور متقین وہ ہیں جو

گناہوں سے دور رہتے ہیں اور جو شرعی تکالیف اور فرائض ہیں ان کو انجام دیتے ہیں یہاں پر زکوۃ سے مراد یا تو مالی حقوق ہیں یا تو ہر طرح کا انفاق ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو اس سے مال بڑھتا ہے اس کی اصلاح ہوتی ہے اور معاشرے کے کمزور افراد کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

آیات الٰہی پر ایمان

اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی آیات اور وہ معجزات جو اللہ نے اپنے پیغمبروں جیسے حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ کو عطا کیے ہیں ان سب کو تسلیم کرے اور ان کا انکار نہ کرے اور اس میں یہ بات ہے کہ آسمانی جتنے ادیان آئے ان سب کو تسلیم کرے کیونکہ حضور پاک ﷺ کی نشانیاں اہل کتاب کی کتابوں میں موجود تھیں اور بڑے لطیف اشارے سے اس آیت کو بعد والی آیت سے ربط دیا گیا ہے۔

پیغام: اللہ کی آیات پر ایمان لانا چاہیے معجزات کو تسلیم کرنا چاہیے سب انبیاء پر ایمان لانا چاہیے جو آسمانی کتابیں ہیں ان پر ایمان لانا چاہیے اور ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے زکوۃ دی جائے اور گناہوں سے دوری اختیار کی جائے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ؗ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو اُمّی نبی ہے جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو نیکی کا حکم کرتا ہے اور برے کام سے روکتا ہے اور ان کے لیے سب پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں اتارتا ہے جو ان پر پڑی ہوتی تھیں، سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی حمایت کی اور اسے مدد دی اور اس کے نور کے تابع ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، یہی لوگ تو نجات پانے والے ہیں"۔

آیات الٰہیہ کا بیان

اس آیت میں مومنوں کے لیے آیات الٰہی کا ذکر ہوا ہے جس کی طرف اشارہ پہلی آیت میں کیا گیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے وہ لوگ جو الٰہی آیات پر ایمان لانے ہیں، جو الٰہی پیغمبروں کو قبول کرتے ہیں پیغمبر امی یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جس کی نبوت کی نشانیاں تورات اور انجیل میں موجود ہیں ان کی تحریف نہیں ہوئی اس کو انہوں نے دیکھا ہے اور ان کے آنے سے پہلے وہ اپنے پیغمبروں سے یہ جان چکے ہیں اور ان کے پیغمبروں کی جو شریعتیں اور احکام تھے وہ ان کی

پیروی کرتے تھے پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ پیغمبر ﷺ انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیتا ہے۔ اور یہ بات تمام ادیان الٰہی میں موجود تھی لیکن اسلام نے ان دو بنیادوں کو پھر تازہ کر دیا اور دین میں ایک نئی روح پھونک دی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دو ایسے فریضے ہیں جن کو پیغمبر اکرم ﷺ نے تازہ کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے طیبات کو حلال کیا، خبائث اور پلید چیزوں کو ان پر حرام کیا۔ ہر چیز جو طیب اور پاکیزہ ہے وہ شریعت اور اسلام میں حلال ہے اور ہر چیز جو آلودہ ہے خبیث ہے پلید ہے انسان کے لیے نقصان دہ ہے وہ حرام ہے اور پھر فرماتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے تمھارے اوپر بہت مشقت والے فرائض تھے وہ ہٹا دیے اور جو حضرت عیسیٰ کی شریعت میں قیود اور پابندیاں تھیں وہ بھی ختم کر دیں اور آخر میں اللہ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو اس پیغمبر پر ایمان لے آئے اس کا احترام کیا ہے اس کی تعظیم کی ہے اور وہ نور جو پیغمبر اپنے ساتھ لائے ہیں قرآن جو ہم نے اتارا ہے جس میں انسان کی زندگی کو کمال کی جانب لے جانے والے راستے اور اس گمراہی کو ہدایت کی روشنی عطا کرتا ہے انسان کی کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے تو اس کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں کیونکہ ان کا ہدف اللہ کی رحمت واسعہ تک پہنچنا ہے دنیامیں بھی ااور آخرت میں بھی اور یہی ہے وہ جو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

رسول اللہؐ کی پیروی

حضور پاک ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے اور اس میں حضور پاک ﷺ نے اپنی امت پر جو احسان کیا کہ وہ جو سخت اور مشقت والی عبادتیں پچھلی شریعتوں میں تھیں ان کو اٹھا دیا گیا اور کامیابی ان کے لیے ہے جو حضور پاک ﷺ کی اتباع کریں۔ قرآن نور ہے، اس کو اللہ نے اپنے حبیبؐ پر اتارا ہے اور یہ ہدایت کا ذریعہ ہے اور کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ جَمِیۡعَاۨ الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوۡلِهِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ
تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

''کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول اُمّی نبی پر جو کہ اللہ پر اور اس کے سب کلمات پر یقین رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ''۔

رسول اسلامؐ کی عالمی رسالت

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے اور واضح ہو رہا ہے کہ اسلام دین کامل ہے اور اس میں تمام انسانوں کے لیے پاکیزہ زندگی کی ضمانت ہے۔ انسان جہاں بھی ہو جس زمانے میں بھی ہو اس کے لئے کامیابی اسی دین میں ہے۔ پھر حضور پاک ﷺ کو یہ حکم ہوا کہ آپ اس بات کا اعلان کریں اور یہ خطاب تمام انسانوں کے لیے ہے کہ میں کسی ایک قوم یا قبیلہ کے لیے نہیں ہوں یا کسی خاص علاقے والوں کے لیے نہیں بلکہ میں تمام انسانوں کے لیے ہوں۔

پھر اللہ کے وصف کو بیان کیا ہے جو خود خدا نے فرمایا کہ اللہ جس کی طرف تمہیں متوجہ کر رہا ہو اس پر ایمان لے آؤ اور جس کی طرف سے رسول بن کر تمہارے پاس آیا ہوں وہ آسمانوں کا مالک ہے، زمین کا مالک ہے اور رسالت و پیغمبری کا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسی نے مجھے نمائندگی دی ہے اور اسی نے محمد ﷺ کی رسالت کو عمومی اور پورے عالم کے

لیے قرار دیا ہے یہ اس لئے کہا تاکہ اس بارے کوئی تعجب نہ کرے اور بنی اسرائیل جو یہ توہم کرتے تھے یا شبہ ڈالتے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو یہود سے نہیں ہے اور وہ امی بھی ہے یعنی اس نے کسی سے پڑھا بھی نہیں ہے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے اس قسم کی نبوت ہو تو اس شبہ کو زائل کیا گیا ہے کہ اللہ نے ہی ان کو چنا ہے جو لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ اللہ کے چنے ہوئے ہیں، اللہ کے بیٹے ہیں، اللہ کے محبوب ہیں تو وہی یہ کہتے ہیں کہ ایک ناخواندہ شخص کو ہمارے اوپر مسلط کرنے کا اسے اختیار نہیں ہے تو اس طرح ان کو یہ تعجب تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اسی طرح غیر عرب میں یہ تعصب کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک عرب ہمارے اوپر نبی بن کر آجائے اس توہم کو زائل کیا گیا کہ وہ جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اسی نے مجھے سب کے لیے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔

پھر فرمایا کہ وہی اللہ ہے کہ معبود اس کے سوا کوئی نہیں ہے وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے اور وہی جو چاہے حکم جاری کرتا ہے کوئی اس کے حکم اور فیصلے کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتا اور نہ ہی کوئی مزاحمت کر سکتا ہے اسی کا ارادہ نافذ ہے اور وہ جس کو چاہے رسول بنا کر لوگوں کے پاس بھیجے اور وہی ہے جو انسانوں کے لیے سعادت بھری زندگی دیتا ہے پاکیزہ زندگی دیتا ہے۔ سعادت، ہدایت، حیات اسی کے ہاتھ میں ہے گمراہی اور ضلالت جو کہ موت ہی ہے وہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اس پیغمبر امیؐ پر یعنی پیغمبر ناخواندہ پر ایمان لے آؤ جس کی بشارت تورات اور انجیل میں دی گئی ہے یہ وہ پیغمبر ہے جس کو اللہ پر اور کلمات پر ایمان ہے یعنی جتنی بھی اللہ نے سابقہ انبیا پر احکام اور شریعتیں اتاری ہیں ان سب کا یہ عقیدہ رکھتا ہے لہٰذا تمھیں چاہیے کہ تم اس کی پیروی کرو تاکہ تمھیں سعادت ملے تاکہ کامیابی کی نعمت تمہارے نصیب ہو اور ہدایت پا سکو یہ سارے بیانات رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں کہ آپ کی جو دعوت ہے وہ تمام لوگوں کے لیے ہے دین اسلام سب کے لیے ہے۔

دین اسلام کی عمومیت

اس آیت میں رسول پاک ﷺ کی رسالت کی عمومیت اور شمولیت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ دین اسلام تمام ادیان سے وسیع تر اور کامل تر ہے اور اسی دین کی پیروی میں ہی کامیابی ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤی اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"اور موسٰی کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں"

بنی اسرائیل کے نیک لوگ

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو صالح اور نیک تھے اور یہ قرآن کی خاصیت ہے کہ جہاں وہ نافرمانوں کی برائیوں کو شمار کرتا ہے وہاں وہ لوگ جو فرمانبردار ہیں جو اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں ان کی تعریف کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے بنی اسرائیل، اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان میں سے کچھ لوگ جو ہدایت جانتے تھے اور فقط یہ نہیں تھا کہ خود ہدایت پالی تو اسی پر اکتفا کرتے بلکہ وہ دوسروں کو حق کی راہنمائی کرتے تھے اور لوگوں کے درمیان حق اور انصاف پر مبنی فیصلہ دیتے تھے بعید نہیں ہے یہ اس گروہ سے مراد وہ انبیاء اور آئمہ ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے بنی اسرائیل جو تھے جو لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے موسیٰ کے دین اور حق پر مبنی فیصلے دیتے تھے کیونکہ ہدایت حقیقی معنی میں دینا پیغمبروں اور پیغمبروں کے نائبین اماموں کا عمل ہے یہ ایک ایسا گروہ موجود تھا جو ہدایت دیتا تھا اس سے مراد شاید یہ ہی ہو۔

پیغام: بنی اسرائیل کے سب کو برا نہیں کہنا چاہیے اس بات کا عقیدہ ہونا چاہیے ان میں سے کچھ لوگ تھے جو حق کو تسلیم کرتے تھے اور حق کی پیروی کرتے تھے اور دوسروں کو

حق کی راہنمائی دیتے تھے اور انصاف پر مبنی فیصلے دیتے تھے یعنی کوئی اچھا ہو تو اس کی اچھائی کو بیان کرنا چاہیئے اگر کسی قوم میں کوئی برا ہے تو اس کی برائیاں اور اگر اس قوم کی کوئی اچھائیاں ہوں تو ان اچھائیوں کو بیان کرنا چاہیے۔

وَ قَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

''اور ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا بارہ کی اولاد جو بڑی بڑی جماعتیں تھیں، اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی طرف جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر قبیلہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، اور ہم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ہم نے ان پر مَن و سلویٰ اتارا، کہ ہم نے جو ستھری چیزیں تمہیں دی ہیں وہ کھاؤ، اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے''۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی

''سبط'' لغت میں پوتے کو کہتے ہیں یعنی بیٹے کا بیٹا یا نواسہ یعنی بیٹی کا بیٹا بنی اسرائیل میں اس کا معنی قوم یا قبیلہ تھا۔ ''انبجاس'' پھٹنے کے معنی میں ہے۔ ''امت'' لوگوں کی ایک ایسی جماعت جن کا ہدف اور مقصد ایک ہو۔ بہر حال یہاں پر اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے بنی

اسرائیل کو بارہ فرقوں میں تقسیم کیا کیونکہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا تھا تو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ پتھر پر اپنا عصاء مارے تو بارہ چشمے اس پتھر سے ابل پڑے، جوش مار کر پانی نکل آیا۔ اس طرح ہم نے ہر قبیلہ کے لیے ایک خاص پانی قرار دیا اور پھر اللہ نے واضح کیا کہ ہر ایک کے لیے الگ الگ چشمہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پانی کے مسئلہ پر آپس میں جھگڑا ہوتا تھا تو پھر اس جھگڑا کو مٹانے کے لیے الگ الگ پانی کا چشمہ قرار دیا نیز فرمایا کہ ان کو گرمی سے بچنے کے لیے آسمانی بادل کا سایہ ان پر قرار دیا بھنے ہوئے پرندے بھیجے انجیر ان پر نازل کی یعنی خاص قسم کے آسمان سے صبح کے وقت قطرے بھیجے جو میٹھے ہوتے تھے ان کو اکھٹا کر کے کھاتے تھے تو یہ اللہ نے ان کے لیے پاکیزہ روزی دی اور پھر ان کی نافرمانی سامنے آتی ہے اتنی بڑی نعمت کا شکر نہیں بجالائے۔

اللہ فرمارہا ہے کہ شکر نہ بجالا کر انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات جن کی تعداد پندرہ بنتی ہے لیکن ان تمام معجزات کے باوجود وہ منکر ہوئے، اللہ کے احکام کی نافرمانی کی۔[1] اگرچہ اللہ ان کے ایمان سے بے نیاز ہے اللہ کو ان کے ایمان کی ضرورت نہیں ہے جو انہوں نے ظلم وزیادتی کی ہے تو اپنے ساتھ کی کیونکہ حق سے انحراف ان کی دنیاوی سعادت کے آگے رکاوٹ بنا اخروی سعادت کا بھی مانع اور

[1] - ا۔ عصا کا اژدھا بننا ۲۔ ید بیضاء ۳۔ قحط ۴۔ ثمرات اور پھلوں کا کم ہونا ۵۔ طوفان ۶۔ پروں والی مکڑوں کا آنا ۷۔ بغیر پروں والی مکڑی کا آنا ۸۔ مینڈکوں کا آنا ۹۔ نیل کے پانی کا خون ہو جانا ۱۰۔ فرعون کا نیل میں غرق ہونا۔ ۱۱ ۔ حضرت کا موسیٰ کی قوم کے ستر بندے مرنے کے بعد زندہ کرنا ۱۲۔ پتھر سے بارہ چشمے نکلنا ۱۳۔ بادل کا سایہ ۱۴۔ من وسلوی بھیجا جانا ۱۵۔ پہاڑوں کا اپنی جگہوں سے اٹھنا اور ان کے سروں پر کھڑا رہنا اور اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ کے ساتھ بات کرنا اور بنی اسرائیل کا مسخ ہونا بندر کی شکل بننا اس کو بھی اگر ساتھ ملالو تو یہ سترہ معجزے بنتے ہیں۔ (مترجم)

رکاوٹ ہوا تو اس طرح انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اللہ بے نیاز ہے گناہگاروں کی معصیت اللہ کو کوئی نقصان نہیں دے سکتی۔[1]

پیغام: اللہ کی طرف سے واضح نشانیاں سامنے آنے کے بعد ان پر ایمان لانا چاہیے اور ان کا انکار نہیں کرنا چاہیے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ گناہ اللہ سے اس کو کچھ نقصان نہیں ہوتا ہے، گناہ کا نقصان خود گناہ کرنے والے پر ہوگا اور انسان گناہ کے ذریعہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر بجالانا چاہیے اور اللہ کی آیات کو تسلیم کرنا چاہیے۔

وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓــٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

"اور جب انہیں حکم دیا گیا کہ تم اس بستی میں جا کر رہو اور وہاں سے کھاؤ جہاں سے تم چاہو اور زبان سے یہ کہتے جاؤ کہ توبہ ہے اور دروازہ میں جھک کر داخل ہو تو ہم تمہاری غلطیاں معاف کر دیں گے، اور نیکو کاروں کو اور زیادہ اجر دیں گے"۔

1 ۔ "گر جملہ کائنات کافر گردند بر دامن کبریاش نشیند گرد"۔ اگر جملہ کائنات منکر ہو، اگر ساری کائنات کافر ہو جائے تو اللہ کی کبریائی کے دامن پر گرد نہیں آسکتی۔

سرزمین عمالقہ میں داخلے کا حکم

اس جگہ قریہ سے مراد بیت المقدس کی سرزمین ہے یعنی ایسی سرزمین، ایسی جگہ جو بیت المقدس کے اطراف میں تھی۔ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اس آبادی میں چلے جاؤ اور وہاں کے رہنے والوں سے جنگ کرنا، خدا نے فرمایا کہ ہم نے یہ زمین تمہارے لئے مباح کی ہے اور اس زمین میں پھیل جاؤ جہاں سے چاہو جو چاہو استفادہ کرو۔ جب اس میں داخل ہو تو سجدہ کرتے ہوئے خضوع کی حالت میں اللہ سے درخواست کرتے ہوئے، اے اللہ ہمارے گناہ معاف کر دے ہمارے گناہ ختم کر دے، ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور اللہ فرمارہا ہے ہم جو نیکوکار ہیں ان کو تو اور زیادہ دیتے ہیں۔ جو نیکوکاروں کو پہنچتا ہے تو وہ اس کی نیکی ہوتی ہے اس سے زیادہ اس کو مل رہا ہوتا ہے۔

لیکن بنی اسرائیل نے نافرمانی کی اور اس نافرمانی کے نتیجے میں سرگرداں رہے جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت: ۲۰ سے ۲۶ تک اس بارے میں توضیح دی گئی ہے۔ اس میں یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو جو حکم دیا گیا کہ اس شہر والوں کے ساتھ جنگ کرو اور فاتح ہو کر اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، فتح تمہارے لئے ہو گی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اگر چلے جاتے تو اللہ تعالیٰ نے ضمانت دے دی تھی اور فتح ان ہی کے لئے ہونی تھی۔ جب نافرمانی کی اور اللہ کا حکم نہیں مانا تو ذلت اور رسوائی ان کا مقدر ہوئی چالیس سال تک دربدر رہے صحرا میں گھومتے رہے۔ یہ دربدری ان کا اللہ کے وعدہ پر عدم اعتماد تھا اور یہ بہت بڑی گستاخی تھی جس کا اُنہوں نے ارتکاب کیا جس کی سزا انہیں دی گئی اور چالیس سال تک دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے رہے۔

پیغام: اللہ کے حکم کی نافرمانی کا نتیجہ اس دنیا میں ذلت، رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''سو ان میں سے ظالموں نے دوسرا کلمہ اس کی جگہ بدل دیا جو ان سے کہا گیا تھا، پھر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے''۔

کلمہ الٰہی کو بدل دینا

بنی اسرائیل کا ہمیشہ سے یہ طریقہ تھا کہ اللہ کی آیات میں تحریف کرتے تھے اور اس کا کفر اختیار کرتے، فسق کا ارتکاب کرتے اور اس وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے ظلم کی وجہ سے زیادتی کی وجہ سے آسمان سے ان پر عذاب اُتارا۔ عذاب کا اُترنا ان کے ظلم و زیادتی کے نتیجے میں تھا۔ اُنہوں نے اللہ کے کلمہ ''حطۃ'' کو بدل دیا جو اللہ نے فرمان جاری کیا اس پر عمل نہ کیا بلکہ اس کے برعکس کیا تو پھر اللہ نے اس جرم کی پاداش میں ان پر عذاب اُتار دیا۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

''اور ان سے اس بستی کا حال پوچھ جو دریا کے کنارے پر تھی، جب ہفتہ کے معاملہ میں حد سے بڑھنے لگے جب ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر آنے لگیں اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا تو (مچھلیاں) نہ آئیں، ہم نے انہیں اس طرح آزمایا اس لیے کہ وہ نافرمان تھے''۔

بنی اسرائیل کا امتحان

اس جگہ "حَاضِرَةَ الْبَحْرِ" سمندر کے کنارے کے قریب "یَعْدُوْنَ" تعدی سے ہے جس کا معنی ہے الٰہی حدود اور اوامر سے تجاوز کرنا۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہودیوں کے لئے ہفتہ کے دن کے واسطے کچھ حدود و قیود رکھی تھیں، انہوں نے اس کا احترام نہیں کیا۔ حکم یہ تھا کہ وہ ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ "شُرَّعًا" شارع کی جمع ہے جس کا معنی ظاہر اور آشکار ہے۔ ہفتہ کا دن جس میں شکار منع تھا مچھلیاں غول غول آتی تھیں، ظاہر ہوتی تھیں، پانی کے اوپر آجاتی تھیں ہفتے کے دن مچھلیاں سامنے نہیں آتی تھیں، پانی کے اوپر نہیں نکلتی تھیں۔ یہ ایک قسم کا امتحان تھا اللہ کی جانب سے کیونکہ بنی اسرائیل میں فسق و فجور عام ہو چکا تھا اور اُن میں حرص اور لالچ نے اُن کو اس بات پر ابھارا کہ وہ اللہ کے اس حکم کی بھی نافرمانی کریں اور ہفتے کے دن مچھلیوں کے شکار کے لئے اُنھوں نے منصوبہ سازی کی کہ ایک بڑا تالاب بنایا اور وہ مچھلیاں اس تالاب میں آجاتی تھیں اور وہ ہفتے کی شام سے پہلے اس تالاب کا راستہ بند کر دیتے تھے اور اتوار والے دن اس تالاب سے مچھلیاں پکڑ لیتے تھے۔ اس امتحان اور آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے وہ نکل گئے۔ انہوں نے اللہ کا تقویٰ اختیار نہ کیا کیونکہ اللہ کے تمام احکام اور جتنے بھی امور ہیں وہ ایک حکمت اور مصلحت کے تحت ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بغیر وجہ کے تو عذاب نہیں دیتا ہے تو ان پر جو عذاب آیا یہ ان کی اپنی وجہ سے تھا اور یہ حکم جو دیا گیا تھا کہ وہ ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں یہ ان سے آزمائش اور امتحان تھا لیکن وہ اس پر پورے نہ اُترے اور نافرمانی کر کے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

پیغام: اللہ کے احکام کا فلسفہ اگر معلوم نہ ہو تو بھی اللہ کے حکم کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ اللہ کا کوئی حکم بغیر مصلحت اور حکمت کے نہیں ہوتا۔ وہ حکیم ہے اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت کے تحت ہوتا ہے اگرچہ اس کا ظاہری فائدہ ہمیں نظر نہ آ رہا ہو۔

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے، انہوں نے کہا تمہارے رب کے روبرو عذر پیش کرنے کے لیے اور شاید کہ یہ ڈر جائیں''۔

وعظ و نصیحت کی بات

یہاں ایک اور گروہ تھا اس اُمت کا جو موعظہ اور نصیحت کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل تقویٰ تھے اور اس قوم کی فسق و فجور سے تنگ آ چکے تھے، انہیں وہ منکرات سے روکتے تھے اس کے باوجود ان کی جو نصیحتیں تھیں جو مواعظ تھے ان فاسق جماعت پر اثر نہیں کرتے تھے، یہ با تقویٰ لوگ پھر بھی موعظہ اور ان کو منع کرنے سے مایوس نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم یہ موعظہ اور نصیحت اسی لئے کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہاں معذور ہوں اور کہہ سکیں کہ ہم نے تو ان اعمال کی مخالفت کی اور انہیں روکتے رہے اس نیت سے کہ شاید یہ گناہ سے ہاتھ اُٹھا لیں اور تقویٰ کا راستہ اپنا لیں۔ تاکہ ہم تمہارے رب کے سامنے معذور ہوں۔ اس طرف اشارہ ہے کہ نہی از منکر یعنی منکرات سے روکنا، اس کا اختصاص ہمارے

ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ تمہاری ذمہ داری بھی ہے جب تم نے نہی عن المنکر نہیں کیا تو اس کے تم ذمہ دار ہو؛ لہٰذا اُمت میں جو گناہگار ہیں اُن کو نصیحت کرو۔

نہی عن المنکر کا فریضہ

اس آیت میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ انسان کو گناہگاروں کو گناہ سے روکنا چاہیے۔ اور اس لئے کہ وہ تمہاری بات نہیں مانتے تو تم انہیں گناہوں سے منع نہ کرو تو یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اگر فاسقوں، فاجروں اور گناہگاروں کو نصیحت نہیں کروگے، وعظ نہیں کروگے ان کو حرام سے اور گناہ سے نہیں روکو گے تو تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہو گا اللہ کے لئے پیش کرنے کے لئے۔ اور جب یہ کام تم کروگے تو تمہارے اوپر جو فریضہ آتا ہے وہ ادا ہو جائے گا اور وہ ان کی ذمہ داری رہ جائے گی کہ انہوں نے اس پر کیوں عمل نہیں کیا بلکہ ان کی بھی ذمہ داری تھی کہ وہ برے کام بھی نہ کریں اور دوسروں کو منکرات سے روکیں۔ انہوں نے اس فریضہ کو بھی انجام نہیں دیا۔ خود بھی نہیں رکے اور دوسروں کو بھی نہیں روکا۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

''پھر جب وہ بھول گئے اس چیز کو جو انہیں سمجھائی گئی تھی تو ہم نے انہیں نجات دی جو برے کام سے منع کرتے تھے، اور ظالموں کو ان کی نافرمانی کے باعث برے عذاب میں پکڑا''۔

نافرمانوں کے لئے عذاب

جب تذکرات اور یاددھانیاں بے اثر ہوئیں اور وہ نافرمانی میں غرق رہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کو معمولی سمجھا اس سے منہ موڑے رکھا جو اُنہیں برائی سے روکنے والے

تھے اُن کی بات نہیں مانی اور تذکر اور یاد دہانی نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا تو جنہوں نے اُنہیں سمجھایا تھا ان کو تو ہم نے نجات دی لیکن باقی جو مجرم تھے جنہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار کیا یا وہ لوگ جو ان کے جرم کے سامنے خاموش رہے اور ان کو اس برائی سے نہیں روکا بلکہ جو برائی سے روکنے والے تھے ان پر بھی اعتراض کرتے تھے کہ تم انہیں نصیحت کیوں کرتے ہو جبکہ تمہاری نصیحت کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تو وہ سب عذاب میں مبتلا ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اوامر الٰہی کی پرواہ نہیں کی، اوامر الٰہی کو چھوڑا یعنی اللہ نے ان پر جو واجب قرار دیا تھا اس کو پورا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں دیں ان کو اپنے لئے مشقت سمجھے اور اس وجہ سے انہوں نے نافرمانی جاری رکھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کا ایک عمومی قانون ہے وہ یہ ہے کہ اگر ظالموں کے ظلم کے سامنے رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے اور انہیں موعظہ اور نصیحت نہ کیا جائے اور ان سے رابطہ و تعلق نہ توڑا جائے تو پھر ان کے ظلم میں شریک ہو جاؤ گے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا عذاب ستمگروں اور ظالموں کی تاک میں ہے اور ان لوگوں کو بھی وہ عذاب شامل ہوگا جنہوں نے ظلم پر خاموشی اختیار کی اور انہیں موعظہ اور نصیحت نہیں کیا اور انہیں گناہ سے منع نہیں کیا۔

پیغام: جب ظالم کے ظلم کو دیکھو تو اس پر خاموشی اختیار نہیں کرو۔ گناہ گار کے گناہ پر خاموشی نہیں اختیار کرو چاہے آپ کی بات کا اثر نہ بھی لیں تو آپ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان سے نفرت بھی کرو اور ان کو روکو بھی، خاموش رہنا سبب بنے گا کہ آپ بھی ان کے جرم میں شریک ہو جاؤ گے۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

''پھر جب وہ اس کام میں حد سے آگے بڑھ گئے جس سے روکے گئے تھے تو ہم نے حکم دیا کہ ذلیل ہونے والے بندر ہو جاؤ''۔

نافرمانوں کا بندر ہو جانا

"عتو" کا معنی ہے گناہ اور معصیت میں زیادہ روی کرنا، حد سے بڑھ جانا، ترک گناہ نہ کرنے پر اصرار، یعنی گناہ نہ چھوڑنے پر اصرار اور اللہ کی نافرمانی اور معصیت میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے نافرمان بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو مسخ کیا اور وہ انسان سے بندر بن گئے اور یہ اُسی کا حکم ہے کہ ہم نے انہیں کہا کہ بندر ہو جاؤ تو وہ سارے بندر ہو گئے۔ دھتکارے ہوئے بندر کی شکل میں مسخ ہو گئے۔ البتہ یہ مراد نہیں ہے کہ جو اس وقت بندر ہے یہ وہی بنی اسرائیل والا بندر ہے۔ بندر پہلے ہی موجود تھا، اُن مجرموں کو کہا کہ تم بندر بن جاؤ یعنی ان کی شکلیں بھی بندر ہو گئیں۔ بندر انسانوں میں معروف حیوان موجود تھا، ان مجرموں کو سزا دیتے ہوئے کہا گیا کہ تم بندر ہو جاؤ تو وہ مسخ ہو گئے اور انسان سے بندر بن گئے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

"اور (یاد کر) جب تیرے رب نے خبر دی تھی کہ ان (یہود) پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو ضرور بھیجتا رہے گا جو انہیں برا عذاب دیتا رہے، بے شک تیرا رب جلدی عذاب دینے والا ہے، اور تحقیق وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سزائیں ایسی ہیں جو بڑی جلدی اُترتی ہیں اور سرکشوں کو سزا ملتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف بھی کرتا ہے اور اپنے بندگان پر مہربان بھی ہے لیکن یہ مہربانی اور بخشش اس امر کے مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سرکشوں کو اور نافرمانوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرے۔ یہ اس کا اختیار ہے سزا جلدی بھی

دیتا ہے، سزا میں تاخیر بھی کرتا ہے اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل کے لیے دربدر ہونا اور اللہ کی نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ کا غضب ان پر رہے گا اور آخرت کا عذاب بڑا دردناک ہے۔

پیغام: اللہ سریع العقاب ہے۔ اللہ کا وصف اس طرف اشارہ ہے کہ انسان یہ تصور نہ کرے کہ اللہ جب غفور ورحیم ہے تو شاید عذاب جلدی نہ آئے اور ڈھیل ملی رہے۔ لہٰذا واضح کیا گیا کہ کسی کو نہیں معلوم کہ اللہ کس بات پر زیادہ غضبناک ہو اور اللہ اس گناہ پر فوری سزا دے دے۔ لہٰذا اللہ کے غضب سے بچنا چاہیے، اللہ کی ناراضگی سے بچنا ضروری ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ جلدی عذاب نہیں دیتا، وہ جلدی بھی عذاب دے سکتا ہے اور ڈھیل ختم بھی کر سکتا ہے۔

وَ قَطَّعۡنٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾

''اور ہم نے انہیں ملک میں مختلف جماعتوں میں متفرق کر دیا، بعض ان میں سے نیک ہیں اور بعض اور طرح کے، اور ہم نے انہیں بھلائیوں اور برائیوں سے آزمایا تاکہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں''۔

نیک اور صالح افراد

اللہ فرما رہا ہے کہ ہم نے زمین میں مختلف فرقے بنائے ہیں۔ کچھ نیک ہیں، کچھ برے ہیں، کچھ سعادت کو پہنچیں گے کچھ بدبخت رہیں گے۔ جو اہل سعادت ہیں یہ وہی ہیں جو ہمارے امتحانات میں کامیاب ہوئے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو فلاح اور کامیابی کے راستے کو نہیں اپناتے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمات جو دُنیا میں اُن کو ملی ہیں اُن کی قدر نہیں کرتے، ناشکرے ہیں۔ تو یہ اُن کی آزمائش ہوتی ہے اور پروردگار ان سے چاہتا ہے کہ وہ اس کی نعمات کا شکر بجا لائیں

ناشکرے نہ بنیں اور سب نے اللہ کے پاس پلٹ کر جانا ہے اور جب اللہ کے پاس واپس جانا ہے تو وہاں اللہ کے حضور حساب دینا پڑے گا لہٰذا اپنا جائزہ لیں کہ وہ کس طرح خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

”پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث بنے اس ادنٰی زندگی کا مال و متاع لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر ایسا ہی مال ان کے سامنے پھر آئے تو اسے (دوبارہ) لے لیتے ہیں، کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لے لیا گیا تھا کہ اللہ پر سچ کے سوا اور کچھ نہ کہیں اور انہوں نے پڑھا ہے جو اس میں ہے، اور آخرت کا گھر ڈرنے والوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں“۔

بنی اسرائیل میں نیک لوگوں کے جانشین

”عرض“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ناپائیدار ہو اور جس کی کوئی اہمیت نہ ہو، حقیر چیز ہو۔ آیت میں بیان ہوا ہے کہ جو بنی اسرائیل کے سابقہ بڑے تھے اُن کی توصیف اُنہوں نے سنی ہوئی تھی جو باقی رہ گئے تھے کتاب اُن کو میراث میں ملی تھی لیکن کتاب میں جو حدود تھیں جو احکام بیان ہوئے تھے اُن کے نفاذ کا انہوں نے اقدام نہیں کیا، اس کے بیانات کو ترک

کر دیا اور دُنیا کی معمولی سرمایہ لینے میں مشغول ہو گئے اور گناہوں کی پرواہ نہیں کی اور بڑی جسارت کرتے ہوئے معافی کے وعدے دیتے تھے اور غرور کے تحت یہود کو اللہ کی جماعت قرار دیتے، اللہ کے بیٹے کہتے اور اللہ کے دوست قرار دیتے۔

ان کا عمل تو ایسا نہیں تھا کہ ہم کہیں کہ وہ چاہتے تھے کہ توبہ کا وعدہ اور رحمت کی اُمید انہیں دی جائے کیونکہ مغفرت کی اُمید ہمیشہ شر سے خوف کے ساتھ ملی ہوتی ہے خوف ایک اندرونی اضطراب کا سبب بھی ہوتا ہے اور صحیح اور سچی اُمیدواری یہ ہے کہ انسان کے اندر خوف اور رجاء ہو، اور ڈر ہو عذاب کا۔ لیکن یہ استکبار اور غرور میں اس قدر غرق تھے اور الٰہی حدود سے تجاوز کرنے والے اور گناہوں میں غرق اور انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی تو وہ ان امور پر قانع نہیں تھے بلکہ جو مادی فائدے ان کے پاس تھے اس سے بڑھ کر اور چاہتے تھے انہیں مل جائے اور مادی فائدوں کی طرف آگے بڑھتے تھے اور جو ان کے پاس تھا اس پر قناعت نہیں کرتے تھے اور جو بھی منکر تھا اور برائی تھی اس کی طرف لپکتے تھے اور برائی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے اور کسی کا روکنا ان پر مصر نہیں تھا جبکہ انہوں نے یہ سب کچھ توریت میں پڑھا تھا اور عہد اور میثاق الٰہی جو باندھا تھا اس کے پابند نہیں ہوئے اور نہ ہی الٰہی وعدہ جو امرزش اور بخشش کا تھا ناحق اسے اپنے لئے قرار دے رہے تھے اور اللہ پر افتراء باندھ رہے تھے اور جرأت کرتے تھے معصیتیں کرکے اور اس طرح دین کے ارکان کو برباد کیا ہوا تھا حالانکہ آخرت کا گھر اہل تقویٰ کے لئے ہے، جنہوں نے دُنیا سے تھوڑا فائدہ اٹھایا ہے، آخرت کا ثواب ہمیشہ ہے اور پائیدار ہے اور وہ جگہ متقین کا ٹھکانہ ہے اور وہ ہر قسم کی ناپسندیدہ عمل سے محفوظ ہوں گے پس کیوں نہیں اس بارے وہ سوچتے اور فکر کرتے؟

پیغام: انسان کو چاہیے کہ اللہ کے فرامین پر عمل پیرا ہو اور اللہ کی بخشش کی اُمید بغیر عمل کے نہیں کی جا سکتی اور اللہ پر افتراء نہیں باندھنا چاہیے اور اپنے آپ کو بغیر استحقاق کے بخشش کا مستحق نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ویسے تو کوئی استحقاق بھی نہیں ہے اللہ کا تفضل ہی چاہیے،

لیکن اس تفضل کے لئے عمل ضروری ہے۔ اگر گناہوں میں غرق رہے گا تو اللہ کی نعمت بخشش والی اور مغفرت والی اسے نصیب نہیں ہو گی۔

وَ الَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں، بے شک ہم نیکی کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں کریں گے''۔

کتاب کو تھامنا اور نماز قائم کرنا

''استمساک'' کسی چیز کو ہاتھ میں پکڑنا، کسی چیز کو سنبھالنا۔ تو یہاں پر کتاب کو سنبھالنے اور اس سے تمسک کرنے اور اس کو اپنے لئے اختیار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ دین کے اجزاء میں سے نماز کے قائم کرنے کا ذکر ہے تو اس وجہ سے کہ نماز اہم فرائض سے ہے، نماز دین کا اہم رکن ہے۔ نماز کے وسیلہ سے ذکر خدا ہوتا ہے اور اللہ کے حضور خضوع و خشوع کیا جاتا ہے۔ تمام دینی شریعتیں تمام ادیان کے جسد میں زندگی کی رُوح نماز ہے۔ تمام شرائع میں جس چیز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ ذکر خدا ہے اور نماز ایک ایسا عمل ہے جس میں ذکر خدا موجود ہے اور خشوع و خضوع بھی ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے؛ نماز دین کا ستون ہے، نماز قبول ہوئی تو باقی اعمال قبول ہوں گے، نماز کے بغیر شفاعت نصیب نہیں ہو گی، نماز قرب الٰہی کا بہترین وسیلہ ہے، نماز تمام انبیاء کی وصیت ہے۔ سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہو گا۔ اس کے بعد فرمایا جو اصلاح کرنے والے ہیں ہم انہیں تباہ نہیں کرتے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کو تھامنا اور کتاب سے وابستہ ہونا اللہ کی کتاب کو اپنے لئے انتخاب کرلینا اور نماز قائم کرنا؛ یہ اصلاح

کے زمرے میں آتا ہے اور اس کے مقابلے میں زمین میں فساد کرنا ہے۔ تو یہ انسانی فطرت کے مطابق ہے اور تمام ادیان فطرت کے طریقے پر ہیں اور ہر زمانے میں فطری احکام کی ایک مقدار پیش کی گئی۔ جتنی مقدار اس زمانے کے لوگوں میں قبول کرنے کی استطاعت اور صلاحیت تھی۔ کتاب خدا سے وابستہ ہونا سوسائٹی کی اصلاح کا سبب ہے اور معاشرے کی سعادت اس میں ہے۔ دین خدا لوگوں کو جس جانب دعوت دیتا ہے تو وہی شرائع اور قوانین ہیں جس میں دُنیا اور آخرت کی زندگی کی مصلحتوں کی ضمانت موجود ہے، مفادات کی ضمانت موجود ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ غیب پر ایمان لایا جائے اور پوری ہستی اور کائنات پر جو قوانین حاکم ہیں اُن کے سامنے خضوع کیا جائے ان کے سامنے تسلیم ہوا جائے اور دین حق الٰہی وہی اسلام ہے۔ یہ وہ دین ہے کہ جس نے انسان کے اوپر سے تمام قیود و پابندیوں کا خاتمہ کیا اور نفسانی خواہشات کے تحت اس نے جو اپنے لئے قیود و حدود بنا رکھے تھے اُن کو برطرف کر دیا اور انسان کی سعادت کے اسباب اس کے لئے مہیا کر دیے۔

پس دین الٰہی وہی احکام ہیں قوانین ہیں، سنتیں ہیں کہ بندگان اور انسانوں کے مفادات کے تحت یہ سب کچھ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کچھ قوانین اور معارف گھڑ لئے جائیں اور پھر یہ کہا جائے کہ ان قوانین کو انسان کے مفادات کے مطابق قرار دے دیا ہے۔ یہ اللہ ہے کہ جس نے انسان کے مفادات اور مصالح کے تحت قوانین بنائے ہیں۔ وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے انسان کو خلق کیا ہے وہ اس کی فطرت جو اس میں رکھی ہے اس کا خالق ہے اور وہ اس کی احتیاجات سے بھی آگاہ ہے۔ اس نے ایسے قوانین بنائے ہیں کہ جو اس کے تمام ضروریات کو پورا کریں اور اس کے لئے ترقی اور کمال کی منازل کی راہنمائی ہو اور ان کی طرف اسے مہمیز دی جائے چلا جائے۔

پیغام: اللہ کی کتاب سے وابستہ رہو، نماز قائم کرو، اصلاح کرنے والوں سے بنو، فسادی نہ بنو۔

وَ اِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ ۚ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّ اذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور جب ہم نے ان پر پہاڑ اٹھایا گویا کہ وہ سائبان ہے اور وہ ڈرے کہ ان پر گرے گا، (ہم نے کہا) جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو اس (کتاب) میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ''۔

بنی اسرائیل کے لیے پہاڑ کا اٹھ جانا

''نتق'' یعنی کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑنا، ''ظلہ'' سائبان کے معنی میں ہے۔ یہ اصل ایک واقعہ کی طرف آیت اشارہ کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں اُن کے لئے ایسا ہوا کہ کوہ طور اپنی جگہ سے اکھیڑا گیا اور وہ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کے سروں پر آکر کھڑا ہو گیا جس طرح ایک شامیانہ تان دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح اُن کو اپنی عظمت بیان کی اور اُن کو خوف دلایا اور کہا ہم نے تمہیں توریت دی ہے اس کو مضبوطی سے تھام لو پورے عزم کے ساتھ مضبوط عقیدے سے، قوی ارادے سے اس کے جو دستورات ہیں ان کی پابندی کرو اور جو الٰہی میثاق اور عہد ہے اس کے پابند رہو اور اس کے جو قوانین ہیں ان کے جو احکام ہیں ان پر عمل کرو تاکہ تم پرہیزگار اور متقی ہو جاؤ اور یہ عمل اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات جلالیہ کی تجلی کا عمل تھا اور یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کے غلبے کا اظہار تھا اور انہیں متوجہ کرنا تھا کہ وہ اللہ کی اطاعت میں رہیں۔

پیغام: اللہ کی عظمت کے سامنے سب کو سرنگوں ہونا چاہیے اور اللہ کی اطاعت یہ ہے اللہ کے حضور خاشع و خاضع ہوا جائے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۟ۙ ﴿۱۷۲﴾

"اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں، (یوں نہ ہو کہ) کہیں قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر نہ تھی"۔

روز الست کا میثاق

"اَخَذَ" کسی چیز کو لینا دوسری چیز سے کہ یہ مستلزم ہو کہ پہلی چیز دوسری چیز سے کسی بھی حوالے سے مستقل ہو، کسی چیز کو پکڑنا۔ تو اس جگہ قید جو کہا گیا مِنْ ظُهُوْرِهِمْ "یہ شرط لگائی گئی کہ ان کی پشتوں سے۔ تو یہ اس لئے ہیں کہ "مِنْ ظُهُوْرِهِمْ" کہہ کر یہ نشاندہی کی، پشتوں سے علیحدہ ہونا ہے اور یہ جو "اخذ" کا لفظ لایا گیا تو یہ بتانے کے لیے جو ان سے لیا گیا ہے تو اس طرح نہیں ہے اس سے مادی طور پر کچھ کم ہوا ہو اور ایسا بھی نہیں ہے اس کا استقلال اور اس کی انفرادیت ختم ہو گئی ہو جو کچھ ان سے لیا گیا ہے تو ان کا استقلال اپنی جگہ پر ہے اور اسی نوع سے لیا گیا ہے۔ تو فرزند جو باپ کی پشت سے ہوتا ہے اور وہ جب اس سے جدا ہوتا ہے تو مستقل موجود ہوتا ہے اور اس فرزند کی پشت سے پھر ایک اور فرزند ہوتا ہے اور اس طرح پورا انسانی سلسلہ ہے ایک کے پیچھے دوسرا ہے لیکن ہر ایک جدا ہے نا پہلا ناقص ہوا ہے نا آخری ناقص ہوا ہے۔ ایک سلسلہ ہے جو پشت در پشت چل رہا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ان سے ہم نے ان کی پشتوں سے جو اولاد ہونے والی تھی سب سے یہ عہد لیا کہ ہر چیز پر ان کو شاہد قرار دینا یعنی کسی کو گواہی کے لئے حاضر کرنا۔ اس کی حقیقت سامنے لانا تاکہ وہ اس کی گواہی دے سکے اور وہ اس کی حقیقت کو محسوس کر سکے۔ پس شاہد ایسا ہے کہ ان کی حقیقت خود انہیں دکھائی گئی اور پھر خود انہی سے گواہی مانگی گئی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے بارے میں گواہی دیں یعنی اپنی اصلیت کو سمجھ کر اور اپنی حقیقت کو پہچان کر کہ وہ کیا ہیں کیونکہ وہ احتیاج محض ہیں اس عالم میں سمجھتے ہیں کہ وہ خود سے تو کچھ بھی نہیں ہیں تو پھر ان سے اس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر گواہی لی گئی۔ انسان مادی لحاظ سے اور ظاہری سلطنت کے اعتبار سے جتنا توانگر ہو جتنے ان کے مادی اسباب اسے مغلوب کریں پھر بھی وہ اس مطلب کا منکر نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے وجود کا مالک نہیں ہے اور اپنے جسم کے امور کی تدبیر میں اسے استقلال نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی مجبور نہ ہوتا کہ طبیعی اسباب اور علل کے سامنے تسلیم ہو جائے اور ان کے آگے مغلوب ہو۔

پس انسان حقیقت میں مالک اور مدبر رب کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اس کی عین ذات ہے، اس سے احتیاج جدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی احتیاج محض ہے اور سارے انسان اسی مطلب کی گواہی دیتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ یکتا ہے پروردگار رب یکتا ہے، مدبر یکتا ہے تنہا مدبر ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ یہ عبارت بعد والی اس دلیل کو باطل کرتی ہے کہ اگر بندگان ایسا احتجاج کریں اور یہ کہیں کہ ان سے یہ عہد اور اعتراف لینا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا نہیں تھا اور نہ ہی اس لئے تھا کہ بندگان قیامت کے دن بہانہ بنائیں کہ ہمیں تو علم نہیں تھا ہم تو اس مسئلے سے آگاہ نہیں تھے ہم اس سے غافل تھے اور غافل پر تو کوئی تکلیف ہی نہیں ہوتی لہٰذا اس کا مؤاخذہ بھی نہیں ہوتا اس کی پکڑ بھی نہیں ہو سکتی اس طرح وہ اپنے آپ کو عذاب سے آزاد کرالیں؛ لیکن اللہ نے اس وسیلہ سے ان پر حجت تمام کر دی ہے کہ سب نے خلقت کے وقت عالم ذر میں جب وہ اپنی پشتوں پر تھے تو اس مقام پر سب نے اقرار کیا تھا کہ اللہ

ہی ان کا رب ہے اور قیامت کے دن جب غیب کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور اپنے پروردگار سے گفتگو کرنے کا ہر ایک کیلئے امکان ہو گا تو اس وقت وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکیں گے کہ ہم اس وقت متوجہ نہیں تھے اور ہم نہیں جانتے تھے۔ تو گویا کہ یہ جو عہد و اقرار اور پیمان لینے کی بات ہے یہ ربوبیت کا اعتراف ہے تو یہ ایک قسم کا اتمام حجت ہے تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہے کہ ہمیں تو پتہ نہیں تھا ہم تو غافل تھے۔

اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

"یا تم یہ کہنے لگو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے، تو کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو گمراہوں نے کیا"۔

اجداد کے عقائد اور عمل کا بہانہ

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر بندگان سے "یوم الست" میں گواہی لینا اللہ نہ ہوتا تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اپنے آباء و اجداد کے پیرو تھے اور انہوں نے شرک کیا تو اس وجہ سے ہم بھی مشرک ہوئے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ان کے آباء سے گواہی مانگتا تو اس صورت میں فرزندان یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں تو اس مسئلے کی کوئی خبر ہی نہیں تھی ہم بے اطلاع تھے، ہمارے آباء و اجداد مقصر ہیں تو اس طرح اُن پر حجت تمام نہ ہوتی بلکہ رب تعالیٰ اس کی بات کا جواب مل جاتا اور وہ اپنے آپ کو معذور سمجھتے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی اس بات کے جواب میں کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے آباء کو رب تعالیٰ کی ربوبیت کا علم ہو اور تمہیں نہ ہو۔ اور انہوں نے باطل عمل کیا اور شرک کیا تو تم بھی ان کی پیروی میں آگئے اور تمہیں پتہ چل سکا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کیا ہے اور نوع بشر کے ہر ہر فرد سے اپنی ربوبیت کی گواہی طلب کی

ہے اور ہر شخص اپنی ذات پر گواہ ہے اور وہ یہ گواہی دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ لہٰذا ان کا یہ بہانہ قبول نہیں ہو گا۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

''اور ہم اسی طرح کھول کر آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوٹ آئیں (اپنے رب کی طرف)''۔

آیات کی تفصیل کی غرض

اس جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ ہم آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ممتاز رکھتے ہیں اور ہر ایک کا مضمون دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور واضح ہوتا ہے تاکہ بات مخلوط و مشتبہ نہ ہو جائے اور یہ کہ لوگوں کو ان کی فطرت کی طرف متوجہ کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہوں نے جو عہد باندھا تھا اس سے انہیں آگاہ کرنا ہے جو انہوں نے اپنے اوپر گواہی دی تھی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی توحید ربوبی کا اعتراف کیا تھا تاکہ وہ باطل سے حق کی طرف پلٹ جائیں اس لئے ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تم یہ سب اقرار پہلے کر چکے ہو اور اب اسی اقرار کی طرف واپس پلٹ جاؤ اور حق کی طرف آجاؤ، باطل کی راہ کو چھوڑ دو۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

''اور انہیں اس شخص کا حال سنا دے جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں پھر وہ ان سے نکل گیا پھر اس کے پیچھے شیطان لگا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا''۔

بلعم باعور کا واقعہ

بلعم باعور یہودی علماء میں سے تھا۔ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی کچھ باطنی آیات تھیں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے راستے سے اس کے لیے چیزیں روشن ہوئی تھیں اور وہ کچھ کرامات تک پہنچا ہوا تھا لیکن اس نے فطرت سے انحراف کیا، عہد الٰہی کو توڑ دیا تو اس کی باطنی خباثت ظاہر ہو گئی اور وہ کرامات اور نشانیوں سے وہ باہر نکل آیا اور وہ شیطان سے وابستہ ہو گیا، شیطان کے راستے پر چل پڑا اور نتیجے میں گمراہ ہو گیا۔ جب اس نے مقصد کی حفاظت نہیں کی تو راستے سے دربدر ہو گیا اور اپنا راستہ گم کر بیٹھا اور اپنے نفس کو ہلاکت سے نہ بچا سکا۔ ظاہری اسباب کا موجود ہونا کامیابی کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اللہ کی مشیت اور توفیق الٰہی اس کے ساتھ ہو تو پھر انسان سعادت اور کامیابی کو پا سکتا ہے۔ بلعم باعور بہت بڑا عالم تھا صاحب کرامت تھا لیکن غرور اور تکبر میں آگیا اور رب تعالیٰ کی ربوبیت سے منحرف ہو گیا تو وہ ہلاکت میں جا پڑا اور پھر بچ نہ سکا۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی برکت سے اس کا رتبہ بلند کرتے لیکن وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا، اس کا تو ایسا حال ہے جیسے کتا، اس پر تو سختی کرے تو بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تو بھی ہانپے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے

جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو یہ حالات بیان کر دے شاید کہ وہ فکر کریں"۔

خواہشات کی پیروی کرنے والے

اللہ فرمارہا ہے کہ اگر ہم چاہتے توان آیات کے وسیلہ سے اُسے اپنی درگاہ کے قریب کر لیتے۔ انسان کا تکامل ان ذکر شدہ آیات کے وسیلے سے ہے جو کہ اللہ کی جانب سے ظاہری اسباب ہیں اور یہ انسان کی ہدایت کا باعث اور سبب بنتے ہیں لیکن انسان کے لیے حتمی سعادت کو قرار نہیں دیتے کیونکہ ان اسباب کی پوری تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے وابستہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سعادت سے متعلق اُس کے لئے نہیں ہے کہ جس نے ذکر خدا سے منہ موڑا ہے اور اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے اور مادی زندگی میں غرق ہوا ہے اس قسم کے افراد کے لیے اللہ کی مشیت نہیں ہے کہ وہ سعادت کو پہنچے۔

زمین میں خلود "اخلاد الی الارض" زمین میں گڑھ جانے اور اس سے چسپاں ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ کنایہ ہے کہ دُنیاوی لذات کی بہرہ برداری میں مگن ہو گیا اور اس طرح حلال اور حرام کی بھی اس نے پرواہ نہیں کی تو ایسا شخص جو اپنے نفس کی پیروی کرتا ہے اور دُنیاوی زیورات اور رنگینیوں سے مغرور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ کی ہدایت اس کے شامل حال نہیں ہوتی۔

اس کی مثال اس کتے کی ہے کہ جس کا مزاج ایسا ہے چاہے اسے تم روکو، ڈانٹو یا اسے اپنے حال پر چھوڑو، تب بھی وہ بھونکے گا اسی طرح ہے وہ شخص جو کہ مادی لذات میں غرق ہے؛ اس پر اللہ کی جتنی آیات پڑھو اور جتنے ظاہری اسباب اس کے شامل حال ہو جائیں پھر بھی وہ اپنی بد طینتی اور خبث باطن اس میں رہے گا اور وہ آیات الٰہی کو جھٹلائے گا تو اے پیغمبر اس

داستان کو اُن کے لئے بیان کرو تاکہ وہ سوچیں اور حق کے پیرو بنیں اور باطل سے باہر نکل آئیں باطل کے گرویدہ نہیں ہوں۔

پیغام: حق و باطل کی شناخت ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے لئے جو اسباب ہدایت کے واسطے رکھے ہیں انسان کو ان کا قدر شناس ہونا چاہیے اور ان اسباب سے استفادہ کرنا چاہیے اور مادی وسائل میں اپنے آپ کو غرق نہ کرے، عارضی لذات میں گم نہ ہو جائے اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے۔

سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

''جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کی بری مثال ہے اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے''۔

آیات کو جھٹلانے والے

وہ لوگ جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اُن کی مذمت کی گئی ہے ان کے لئے تاریک دن ہے ان کی حالت بری ہوتی ہے وہ ہدایت سے باہر نکل چکے ہیں، گمراہی ان کے لئے آگئی ہے۔ اس قسم کے اعمال اور آیات الٰہی کو جھٹلانا اس سے پروردگار کو کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ اُن کے اعمال کی گمراہی کے نتیجہ میں وہ خود سعادت کے راستے سے دُور جا پڑتے ہیں اور اس کا ضرر اور نقصان خود انہی کو ہوتا ہے اور یہ رویہ انہیں کبھی بھی سعادت اور رستگاری تک نہیں پہنچا سکتا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾

”جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی راہ پاتا ہے، اور جسے گمراہ کر دے پس وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں“۔[1]

ہدایت اور گمراہی اللہ کی جانب سے ہے

مقصد یہ ہے کہ حقیقی طور پر ہدایت اُس وقت ملتی ہے جب اللہ کی بتائی ہوئی نشانیوں سے اثر لیں اور وہ آثار اس پر مرتب ہوں جو اللہ تعالیٰ نے طے کئے ہوئے ہیں، خالی کسی راستے کو دیکھ لینا انسان کو فائدہ نہیں دیتا جب تک اس راستے پر چلا نہ جائے اور اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کا دستگیر نہ ہو تکامل کے راستے میں۔ اسی صورت میں اسے سعادت اور کامیابی ملتی ہے۔ جب ان کا باطنی رویہ پھر گیا تو پھر اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا“۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝١٧٩

”اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور آدمی پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں، اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں، اور کان ہیں کہ ان سے

---

[1]۔ سورہ صف کی آیت: ۵ میں آیا ہے کہ ” فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ“ اللہ رحیم ہے وہ بندے کو گمراہ نہیں کرتا مگر یہ کہ خود بندہ ہوتا ہے کہ جو اپنے باطنی رویہ، غیر صحیح رویہ اپنا لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔

سنتے نہیں، وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی گمراہی میں زیادہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں"۔

جن وانس کیلئے جہنم

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جب جن و انس اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق نہیں چلیں گے ، اللہ کی آیات کو جھٹلائیں گے تو پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تو جہنم کا ہدف اللہ تعالیٰ نے بہت سارے جن و انس کی پیدائش کو قرار دیا ہے۔ یہ طبعی اور ضروری ہے لیکن اصلی غرض جو جن وانس کی خلقت کی ہے وہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ (سورہ ذاریات، آیت ۵۶)

ترجمہ: "ہم نے جن وانس کو نہیں پیدا کیا سوائے اس کہ وہ میری عبادت کریں"۔

یہ اصل غرض ہے لیکن دوسری غرض کیا ہے؟

"وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿١٥﴾" (سورہ جن، آیت ۱۵)

ترجمہ: "عہد شکن اور ظالم جہنم کا ایندھن ہوئے۔ تو عہد شکنوں کے لئے جہنم ہے۔"

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مشیت اس سے متعلق ہے کہ زمین میں ایک ایسا انسان خلق کرے جو اس کا خلیفہ اور قائم مقام بنے اور بندگی کے واجبات کو بجالائے اور اس طرح اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا وسیلہ بنے لیکن یہ سلسلہ اس بات پر نہیں کہ سارے انسان عقائد اور اعمال میں اختلافات رکھنے کے باوجود سب کے سب اللہ کی رحمت میں آئیں اور سب سعادت ابدی کو پہنچیں بلکہ وہ جو اپنے رب کے ذکر سے غفلت کرتے ہیں دُنیاوی زندگی میں غرق ہیں اور اُن کے پاس محکم اعتقادی ٹھکانہ بھی نہیں ہے تو پھر ایسے لوگ قیامت کے دن نابینا محشور ہوں گے۔

ترجمہ: ”جس نے میرے ذکر سے منہ موڑ لیا تو اس کے لیے روزی کی تنگی ہے اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا محشور کرینگے“۔ (سورہ طٰہٰ، آیت ۱۲۴)

واضح ہے کہ برے اعمال اور نافرمانی کا نتیجہ شقاوت ہے، خسران ہے اور آتش جہنم میں داخل ہونا ہے۔ ان کی توصیف اور وصف بیان کرنے کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: دوزخیوں میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا جریان اُن کی طرف ہو کیونکہ اُن کے دلوں میں فہم اور درک نہیں ہے، اُن کی آنکھیں حق کو نہیں دیکھتیں، اُن کے کان انبیاء کے مواعظ و نصائح کو نہیں سنتے، ایسا لگتا ہے کہ اُن کے کان، آنکھ، دل ہیں ہی نہیں۔

آنکھ، کان اور دل کے اثر کا باطل ہونا اُن کے برے اعمال کی سزا کے حوالے سے ہے اور اسی وجہ سے وہ حیوانات کی مانند ہیں چوپائوں کی مانند ہیں ان سے بھی گمراہ تر ہیں کیونکہ حیوان اور انسان کا امتیاز یہ ہے کہ حیوان کے پاس عقل نہیں ہے، انسان کے پاس عقل ہے۔ انسان خیر و شر کی تمیز دے سکتا ہے حیوان کے پاس خیر و شر کی تمیز دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس طرح حیوانات میں گمراہی نسبی ہے غیر حقیقی ہے کیونکہ وہ جس چیز کے لیے خلق ہوئے ہیں وہ تو اسی پر قدم رکھ رہے ہیں لیکن دوزخی یا انسان اور جن؛ ان کے پاس سعادت کے تمام وسائل موجود تھے تکامل تک پہنچنے کے سارے راستے تھے لیکن انہوں نے ان تمام راستوں کو معطل کر دیا اور اپنے عمل سے اور اپنے ہاتھ سے گمراہی کے اسباب اپنے لئے بنا لئے، ان کا انتخاب کر لیا اور اس وجہ سے یہ حیوانات سے گمراہ تر ہیں۔ اب ان کی توجہ پیٹ اور شہوت کے سوا کچھ نہیں ہے اس وجہ سے یہ اہل غفلت ہیں، غافلوں سے ہیں اور خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور آنکھوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور اس طرح یہ جو غفلت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور غفلت ہر گمراہی اور ہر باطل کی جڑ اور بنیاد ہے۔

پیغام: انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی آنکھ، کان کے ذریعے شر اور خیر میں تمیز کرے، صحیح و باطل کی تشخیص کرے اور دل جو ہے اس سے فکر اور سمجھے حقائق کو۔ حقائق شناس بنے۔

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

"اور سب اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو اسے ان ہی ناموں سے پکارو، اور چھوڑ دو ان کو جو اللہ کے ناموں میں کجروی اختیار کرتے ہیں، وہ اپنے کیے کی سزا پا کر رہیں گے"۔

اللہ کے اسماء الحسنٰی

اسم لغت کے اعتبار سے اُس چیز کو کہتے ہیں جو ذات پر دلالت کرے یا معنی پر۔ اسماء الٰہی کی توصیف حسنیٰ کے ساتھ کرنا اس بات کی دلالت ہے کہ یہ اسماء ذات پر دلالت کرتے ہیں نا کہ فقط معنی پر۔ یعنی وہ اسماء ایسے ہیں کہ جن میں وصفی معنی کا لحاظ ہوا ہے اور وہ وصفی معنی نیک ہیں، اچھے ہیں اور اور یہ اللہ کے لئے نیک اس وقت ہوں گے جو کسی اور کے لیے بھی یہ نام اچھے ہوں۔ لہٰذا "اسماء الحسنیٰ" ایسا اسم ہے جو خدا تعالیٰ کا ہو تو یہ ایک معنی میں کمالی معنی پر دلالت کرتا ہو اور وہ بھی ایسا کمال کہ جو نقص یا عدم کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔ لہٰذا ایسے معنی جن میں جسمانی اور عدمی معنی کی خصوصیات کی ضرورت ہو یا جن میں احتیاج چھپی ہو تو وہ ذات باری تعالیٰ کے لائق نہیں ہے اور ان اچھے ناموں سے اللہ کو پکارو اور ان ہی ناموں سے اللہ کے حضور توجہ کرو کیونکہ ان ناموں سے پکارنا اور ان ناموں کو زبان پر لانا یہ عبادت کے ملحقات سے ہے۔

پھر فرمایا کہ جنہوں نے اللہ کے ناموں میں الحاد کیا ہے تو ان کو چھوڑ دو "الحاد" حد وسط سے ہٹ جانا، افراط یا تفریط۔

پھر فرمایا کہ بہت جلدی یہ اپنے اعمال کی سزا کو پائیں گے۔ اور یہ کہ کون ہے ستم کار ؟ سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو پکارتا ہے جیسے مادہ پرست اور بت پرست ہیں۔ خدا کی طرف ایسے نام اور اوصاف کی نسبت دیتے ہیں کہ خدا ان سے منزہ ہے۔ جیسے بعض اہل کتاب نے کیا۔

پیغام: اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو، اللہ کے سارے نام خوبصورت ہیں اور یہ نام اللہ کی ذات پر دلالت کر رہے ہوتے ہیں۔ وصفی معنی بھی ایسا ہوتا ہے جو اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام فرماتے ہیں اللہ کی قسم اللہ کے خوبصورت نام ہم ہیں۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اسم ذات پر دلالت کر رہا ہوتا ہے تو آئمہ اہل البیت علیہم السلام کا وجود اللہ کے وجود پر دلیل ہے اور اس کا ثبوت ہے۔ اس وجہ سے کہا گیا کہ ہم "اسماء الحسنیٰ" ہیں اللہ کے بہترین نام ہم ہیں کیونکہ جس طرح وہ ہستیاں اللہ کی معرفت کروا سکتی ہیں کوئی اور اس طرح اللہ کی معرفت نہیں کروا سکتا، ان ذوات میں اللہ کی پہچان ہیں۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾ ع

"اور ان لوگوں میں جنہیں ہم نے پیدا کیا ایک جماعت ہے جو سچی راہ بتاتی ہے اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں"۔

ہدایت دینے والی اُمت

اس آیت میں ہے کہ بعض افراد ایسے ہیں جو گمراہی سے معصوم ہیں کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن کی ہدایت کر دی ہے اور اُن کو گمراہی سے محفوظ کیا ہے اور اس صورت

میں یہ انبیاء اوصیاء کی جماعت مراد ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہدایت شدہ ہیں اور پھر وہ حق کی ہدایت کرتے ہیں، دوسروں کو حق کی بنیاد پر وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ دیتے ہیں اور خدا کو اس کے خوبصورت ناموں سے پکارتے ہیں اور ان کے فیصلے انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔[1]

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾

"اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں انہیں خبر بھی نہ ہوگی"۔

آیات کو جھٹلانے والے

"استدراج" کا لغوی معنی درجہ بدرجہ آگے بڑھنا ہے۔ سیڑھی کے پلے ہوتے ہیں ایک step سے دوسرا step۔ بتدریج ایک جگہ سے اوپر جانا اور اوپر سے نیچے کی طرف آنا۔ قرآن مجید میں استدراج تدریجی ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یا دُنیا میں یا آخرت میں وہ ہلاکت کے قریب ہوتے جاتے ہیں لیکن تدریجاً۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہلاکت کے قریب ہونا اُن کے لئے واضح نہیں ہے تاکہ وہ اس کو سمجھ لیں بلکہ اسی سرگرمی میں وہ اسی حالت میں سرگرم رہتے ہیں اور مادی زندگی کے جو ظواہر ہیں اس سے وہ لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں اور ان کے لئے یہ بات مخفی رہتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں اور اس طرح وہ معصیت میں اور زیادہ غرق ہو جاتے ہیں اور ہلاکت کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح استدراج یہ نعمت کی تجدید ایک نعمت کے بعد دوسری نعمت، دوسری نعمت کے بعد تیسری

---

[1] ۔ ان افراد میں سے جو سب سے بلند ترین ہیں وہ پیغمبر اکرم ﷺ، آپ کی دختر گرامی اور آپ کے بارہ جانشین ہیں۔ چودہ معصومین علیہم السلام اس شان کے ہیں۔ (مترجم)

نعمت۔ اس طرح وہ نعمات کی لذات میں غرق ہو جاتے ہیں اور غافل ہو جاتے ہیں اور اس طرح اپنے رب کے ذکر سے غافل ہو جاتے ہیں اور اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور وہ مطمئن ہوتے ہیں کہ سب ٹھیک چل رہا ہے وہ غیر خدا سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اپنے نفوس کے آرام کے درپئے رہتے ہیں اور مادیات اور شہوات میں غرق ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم تو بڑے آرام میں ہیں حالانکہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو آرام و اطمینان ملتا ہے نا کہ اللہ کی نافرمانی سے، اللہ کی نعمات کا کفران کرنے سے۔ اور یہ جو انہوں نے اپنے آپ کو دُنیا کا قیدی بنا لیا ہے تو حقیقی سعادت سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور روز بروز یہی اعمال ان کے عذاب میں اضافے کا سبب بنتے ہیں اور اخروی عذاب دائمی ہے، ذلیل و خوار کرنے والا ہے اور وہ اپنے لئے اسے ہی بنا رہے ہوتے ہیں۔

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

''اور میں انہیں مہلت دوں گا، بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے''۔

منکروں کو مہلت دینا

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی آیات کو جھٹلانے والوں کو مہلت دیتا ہے اور یہ مہلت سبب بنتی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوتے ہیں اور ہلاکت کی طرف جاتے ہیں۔ اس آیت میں ''اُمْلِیْ'' کہا گیا ہے میں مہلت دیتا ہوں، متکلم واحدہ آیا ہے اس میں یہ بتایا ہے کہ مہلت دینا اللہ کا اختیار ہے اور اس کی مدت معین ہے اور ایسا استدراج کا نتیجہ ہے جس سے مراد ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ہلاکت کی جانب جا رہے ہیں تو اسی میں یہ مہلت ہے۔ یہ مہلت دینا اور استدراج اللہ کی تدابیر میں سے ایک تدبیر ہے کہ گناہگار خواہشات نفسانی میں غرق ہو جاتے ہیں، وہ اس طرح خواہشات میں گم ہو جاتے ہیں کہ حق کو بھول جاتے ہیں ذکر الٰہی کو بھول

جاتے ہیں اور ہلاکت کی طرف جاتے ہیں اور رحمت حق تعالیٰ سے دور ہو جاتے ہیں اور یہ سب سے خطرناک چیز ہے جس سے یہ دوچار ہوتے ہیں۔

اَوَ لَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ۜ مَا بِصَاحِبِہِمۡ مِّنۡ جِنَّۃٍ ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۸۴﴾

''کیا انہوں نے غور نہیں کیا، ان کے ساتھی کو جنون تو نہیں ہے، وہ تو کھلم کھلا ڈرانے والا ہے''۔

ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں

کیا وہ فکر نہیں کرتے کہ ان کا ساتھی مجنون نہیں ہے وہ تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ کھلا ڈرانے والا ہے۔ یہاں ایک استفہام انکاری اور توبیخی ہے ایک قسم کی ڈانٹ بھی پلائی جارہی ہے اور سرزنش بھی کی جارہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی بات بھی ہے کہ یہ جو تمہارا ساتھی ہے یعنی پیغمبر جو تمہارے پاس ہے اس نے چالیس سال تمہارے درمیان گزارے ہیں وہ مجنون تو نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سایہ ہے اور نہ وہ سحر و جادو ہے۔ وہ تو پیغمبر ہے، تمہیں ڈرانے کے لئے آیا ہے، تمہاری ہدایت کے لئے آیا ہے، تمہیں اگلے جو خطرناک مراحل ہیں ان سے خوف دلانے کے لئے آیا ہے تمہیں بچانے کے لئے آیا ہے، تم ہو کہ ان کے بارے میں سوچتے نہیں ہو، غور نہیں کرتے ہو کہ وہ سچا ہے، امین ہے تمہارا ہمدرد ہے، اسکی بات کو مانو اور اپنے لئے صحیح راستے کا انتخاب کرو۔

اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّ اَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

''اور کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی سلطنت کو نہیں دیکھا اور دوسری چیزوں کو جو اللہ نے پیدا کی ہیں، اور یہ کہ ممکن ہے ان کی اجل قریب ہی ہو، پھر اس (قرآن) کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے''۔

آسمانوں اور زمین کے ملکوت

''مَلَکُوۡتِ'' ہر وہ چیز جس کا باطنی چہرہ رب تعالیٰ کی طرف ہے کہ اُن کو دیکھنے سے قلبی اعتقاد اور یقین آجاتا ہے۔ اس آیت میں توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ان اشیاء کی ملکوتی جہت کو کیوں نہیں دیکھتے تاکہ ان پر آشکار ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت برحق ہے۔ جس طرح قرآن لوگوں کو آفاقی آیات اور انفسی آیات میں تفکر اور غور کی دعوت دیتا ہے تاکہ یہ ان کے لئے آشکار ہو جائے کہ جتنی بھی مخلوقات ہیں اُن میں کوئی بھی اپنی ذات میں مستقل نہیں ہے، سب اپنے رب تعالیٰ سے وابستہ ہیں اور ان سب کی تدبیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی عالمین کا رب ہے۔

یہ ان کے بارے میں فکر کیوں نہیں کرتے، یہ نہیں سوچتے کہ ان کی موت کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ یہ احتمال کتنا زیادہ ہے اگر اس میں سوچیں تو گمراہی نفسانی خواہشات کی پیروی سے رک جائیں اور لمبی آرزوؤں سے بچ جائیں کیونکہ اگر انسان موت کو یاد کرے اور موت اس کے مد نظر ہو تو کبھی دُنیاوی لذات میں غرق نہیں ہوگا اور آخر میں فرمایا کہ قرآن رب تعالیٰ کی تجلی ہے اس میں دلائل ہیں، کیوں نہیں ان پر ایمان لے آتے۔ اگر اس پر ایمان

نہیں لائیں گے تو کون سی بات ان کے لئے لائی جائے جس پر وہ ایمان لے آئیں گے۔ قرآن کے بعد کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لا سکتے ہیں؟ قرآن سے بہتر تو کوئی اور چیز نہیں ہے۔ یہ بات اُن کے ایمان نہ لانے کے حوالے سے ہے کہ ناأمیدی اور مایوسی ہے کہ وہ ایمان لے آئیں قرآن جیسی کتاب آنے کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لا رہے تو اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟

مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ‌ ؕ وَيَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾

"جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں، اور انہیں اللہ چھوڑ دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں حیران پھیریں"۔

قرآن سے ہدایت نہ لینے کے بارے

جو قرآن سے ہدایت نہیں لیتا اور روشن آیات سے کچھ اسے سمجھ نہیں آتی اور اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل پر ایمان نہیں لاتا تو پھر اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے بڑھ کر اور کون سی ہدایت ہے قرآن سے بڑھ کر؟ قرآن ہدایت ہے، اللہ کی طرف سے ہدایت ہے اور جو اس سے ہدایت نہیں لیتے اور ان کو سمجھ نہیں ہے تو ان کو چھوڑ دو وہ اسی طرح گمراہی میں بھٹکے رہیں اور اللہ تعالیٰ کے دلائل کی معرفت نہ رکھیں اور سرگرداں رہیں، متحیر رہیں۔ یہ پہلی آیات کا تتمہ ہے اور وہ یہ کہ قرآن کے بعد کون سا اور کلام ان پر اثر کرے گا؛ ان پر تو ان کا اثر نہیں ہو رہا تو مایوسی ہے یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے، ان کے ایمان نہ لانے سے جو ناأمیدی ہے اس کی وجہ یہاں بیان کی گئی ہے کہ پھر اللہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

يَسۡـئَلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰٮهَا‌ ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ‌ ۚ لَا يُجَلِّيۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ‌ؔ‌ۘ ثَقُلَتۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ

لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''قیامت کے متعلق تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اس کی آمد کا کونسا وقت ہے، کہہ دو اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کر دکھائے گا، وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے، وہ تم پر محض اچانک آ جائے گی، تجھ سے پوچھتے ہیں گویا کہ تو اس کی تلاش میں لگا ہوا ہے، کہہ دو اس کی خبر خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے''۔

قیامت کا علم

''ساعت'' اٹھنے کی گھڑی، مخلوقات کے اللہ کے پاس واپس جانے کے وقت کو کہتے ہیں۔ ''ایان مرساھا'' قیامت کے واقع ہونے کا زمانہ اور اس کا ثبوت کہ کب ہو گی؟ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ قیامت کا علم رب تعالیٰ کے پاس ہے یہ غیبی حکم ہے کسی کے پاس اس کا علم نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شئے فنا ہو جائے گی اور کسی چیز میں توانائی نہیں ہے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں احاطہ رکھے۔ یہ خدا سبحانہ و تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت کو کسی کے لیے آشکار نہیں کیا اور کسی کے لئے ظاہر نہیں کیا۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ قیامت کا علم آسمانوں اور زمین سے بھی سنگین ہے اور علم کی سنگینی ان کے وجود کے بعینہٖ ہے۔

اس کے معنی میں مفسرین کا جو اختلاف ہے کہ یہ جو ثقل ہے یہ بوجھ آسمان اور زمین پر بھاری ہے۔ یہ علم کا بوجھ ہے یا یہ صفت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں رہنے والوں کے لئے یہ بات سخت ہے کہ حساب اور جزاء کا وقت ہو گا یا ثقل اس کے واقع ہونے کا بوجھ ہے کیونکہ جب

قیامت واقع ہو گی تو ہر شئے درہم برہم ہو جائے گی آسمان رہے گا نہ زمین اور ہر چیز حرکت میں آجائے گی، زلزلہ ہوگا، آسمان میں اس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے اور زمیں بھی برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ تو اس قسم کا جو اختلاف ہے کہ ثقل سے کیا مراد ہے اس کا عملی فائدہ نہیں ہے کیونکہ قیامت کا ثقل اور بوجھ ان تمام موارد میں آیا ہے کیونکہ اسکا ثبوت مستلزم ہے کہ ساری مخلوقات فنا ہو جائیں اور کوئی چیز اپنے فناء کے تحمل کی طاقت نہیں رکھتی۔ اسی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو ہے یکدم ہو گی، اچانک واقع ہو گی، ناگہانی ہو گی، اچانک ہر شئے ختم ہو جائے گی پس ہمیں چاہئے کہ واقعہ کے وقوع ہونے سے پہلے اس کا علاج کر لیں اور خود کو اُس کے ظہور کے لیے آمادہ کریں۔

''حفی'' کسی چیز کے بارے آگاہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تجھ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں گویا وہ سمجھتے ہیں کہ تجھے اس کے بارے آگاہی ہے ان کا جو تکرار ہے سوال کا۔ رسول اللہ ﷺ کے جو ہم عصر لوگ تھے وہ خیال کرتے تھے، پیغمبر فرماتے ہیں اسکا علم میرے پروردگار کے پاس ہے اور اس کے علاوہ کسی کے پاس اس کا علم نہیں ہے اور قیامت کی عظمت کا وصف تنہا اللہ ہی کے پاس ہے اور اس کا ارتباط اور تعلق وقت کے علم کے ساتھ نہیں ہے لہٰذا دوبارہ اپنے سوال کا تکرار کرتے کہ اگر جواب کوئی اور دیں یا اپنی جہالت کا تکرار کریں تو اللہ نے فرمایا کہ وہی پہلا جواب ہے تاکہ یہ سمجھ جائیں کہ پہلا جواب وہ ادب اور تعارف کے لئے نہیں تھا بلکہ حقیقت ہی یہ تھی کہ اس کا علم فقط اللہ کے پاس ہے لیکن بہت سارے لوگ اپنی ذہنی مانوسیت جو ان کے محسوسات سے ہے اور وہ محسوسات کے ذریعہ ہی تمام چیزوں کو ترتیب دیتے ہیں تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہر چیز کسی حد تک ان کے لئے توصیف ہو سکتی ہے اور وہ اس کے لئے علمی احاطہ پیدا کر سکتے ہیں لیکن ان کا یہ قیاس اور خیال باطل ہے کیونکہ کچھ امور ایسے ہیں من جملہ ان میں؛ قیامت کا امر ہے یہ غیبی امور سے بالاتر

امر ہے اس کا دائرہ محسوسات سے فراتر ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی اس کا احاطہ علمی نہیں رکھتا لہٰذا قیامت کے وقوع کا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''کہہ دو میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں غیب کی بات جان سکتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا، اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی، میں تو محض ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان دار ہیں''۔

رسول اللہؐ اور علم غیب

یہاں پر علم غیب ذاتی کی نفی کی گئی ہے کہ وہ علم فقط اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کا غیر انبیاء ہوں یا کوئی اور؛ کسی کے پاس غیب کا علم نہیں ہے۔ انبیاء کے پاس اتنا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے انہیں علم دیا ہے۔ غیب سے جو کچھ اللہ ان کو تعلیم دے دے تو وہ اس غیب کو جانتے ہیں اور جس کی تعلیم نہیں دی تو اس علم کو وہ نہیں جانتے۔ غیر خدا کا وجود محدود ہے اور جو محدود ہے وہ ممکن ہے اور جو ممکن ہے وہ عالم غیب پر کیسے احاطہ کر سکتا ہے۔ لیکن جو سوال کر رہے تھے رسول اللہ ﷺ سے وہ عام لوگ تھے وہ ان معانی کو درک نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے فہم اور سمجھ کے مطابق جواب دیا ہے کہ علم غیب آدمی کو ہر قسم کے شر اور خیر سے آگاہ کر دیتا ہے۔ پیغمبرؐ کے پاس علم غیب ہوتا تو اپنے لئے تمام خیرات طلب کرتا اور تمام شرور اپنے سے دُور کرتے۔ پھر پیغمبرؐ فرماتے ہیں میں تو بشیر اور نذیر ہوں، اس کے علاوہ کچھ نہیں

ہوں۔ میری حقیقت تو یہ ہے کہ میں ڈرانے والا اور بشارت دینے والا اہل ایمان کے لئے مبعوث ہوا ہوں اور میں تو رسالت کا دعویٰ رکھتا ہوں کہ اللہ کی نمائندگی اور اس کی پیغام رسانی میرے پاس ہے، علم غیب کا دعویٰ تو میں نے نہیں کیا ہے۔ [1]

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾

''وہ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے آرام پائے، پھر جب میاں نے بیوی سے ہم بستری کی تو اس کو ہلکا سا حمل ٹھہر گیا پھر وہ اسے لیے پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تب دونوں میاں بیوی نے اپنے مالک اللہ سے دعا کی کہ اگر آپ نے ہمیں صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے''۔

انسان کی خلقت

اس آیت میں بنی آدم کے لئے کہا گیا ہے کہ اے اولاد آدم تمہیں ایک آدم اور بشر سے خلق کیا گیا ہے اور اسی بشر سے زوج کو خلق کیا تاکہ آدم حوا کے حوالے سے آرام اور سکون پائے۔ جب آدم اور حوا نے آپس میں مجامعت کی، اکٹھے ہوئے تو نطفہ حوا کے رحم میں گیا تو اس نے ہلکا سا بوجھ محسوس کیا اور پھر یہ حمل اٹھائے رکھا اور اس طرح رحم مادر میں اس نطفے

---

[1] - (سورہ رعد، آیت: ۷)

نے رشد کیا اور جب جنین ہوا تو اس کی سنگینی محسوس ہوئی۔ آدم کی زوجہ نے احساس سنگینی کیا اور اس طرح آدم اور ان کی بیوی نے ہاتھ بلند کئے اور اللہ سے دعا مانگی، عہد و پیمان باندھا کہ اگر ہمیں صالح بیٹا دیا تو ہم شاکر ہوں گے تیری درگاہ میں اور تیری نعمت پر شکر بجالائیں گے اور ہر چیز سے منقطع ہوں گے اور تیرے سوا کسی سبب کو موئثر نہیں جانیں گے اور نہ ہی اس کی طرف رجحان ہوگا تیرے حضور خاضع ہوں گے اور شرط تھی کہ دعا قبول ہو تو شاکر ہوں گے اللہ کے آگے، اور اللہ کی نعمت کا کفران نہیں کریں گے۔ اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک لائق اور نیک بیٹا دے دیا تو انہوں نے اپنے لئے اس عطیہ میں شریک قرار دیے، خدا برتر ہے اس سے کہ اس کا کوئی شریک بنایا جائے۔

نیک اولاد

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی مرضی کے مطابق ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بیٹا عطا کر دیا تو پھر انہوں نے اللہ کا شریک قرار دے دیا اور اس سے محبت اور پیار شروع کر دیا اور بیٹا جو ہے وہ سبب بنتا ہے کہ اس سے ایک اُنس ہو جاتا ہے غیر خدا سے تمسک ہوا حالانکہ کہ شرط کی تھی کہ شاکر ہوں، نعمت خدا اور ربوبیت کا انکار نہ کریں لیکن اپنے عہد کو توڑ دیا، اپنی شرط کو نظر انداز کیا اور نوع بشر اس طرح ہے۔ فقط تھوڑے ہیں جن کے لیے لطف خاص ہے، باقی جو ہیں جب نعمت مل جاتی ہے تو وہ ناشکری کرتے ہیں اور خدا سے جو عہد باندھا ہے اس کی وفا نہیں کرتے۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ١٩٠

''پھر جب اللہ نے ان کو صحیح سالم اولاد دی تو اللہ کی دی ہوئی چیزوں میں وہ دونوں اللہ کا شریک بنانے لگے، سو اللہ ان کے شرک سے پاک ہے''۔

نوع انسانی کی کیفیت

اس آیت کا مقصد انسان کی نوع کی حالت کو بیان کرنا ہے کہ جب ان کی اولاد ہو جاتی ہے تو وہ ہر وسیلہ سے اپنی منفعت حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں اور اس سے ضرر دُور کرنے میں، یہ حضرت آدم یا حوا کے لئے نہیں ہے کہ انہوں نے شرک کیا ہے۔ نوع آدم کے لئے یہ بات ہو رہی ہے۔ آدم تو اللہ کا برگزیدہ اور ہدایت یافتہ تھے اور کسی نے ان کو ہدایت نہیں دی، خدا نے ان کو ہدایت دی وہ گمراہ نہیں ہوئے۔ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۲ اور سورہ اسراء کی آیت ۹۷ میں واضح ہے۔ لہٰذا یہ بات نوع بشر کے لئے ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے آخر میں صیغہ جمع آیا ہے ''یشرکون''، ''یشرکان'' نہیں ہے کیونکہ آدم اور حوا دو تھے۔ آدم اور حوا مراد ہوتے تو ''یشرکان'' کہتے بلکہ یہ کہا گیا وہ شریک بناتے ہیں۔ اس جگہ بات نوع بشر کی ہو رہی ہے کہ نوع بشر ایسی ہے کہ جب ان کو اولاد ہو جاتی ہے وہ پہلے تو دعائیں مانگتے ہیں جب اولاد ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کو بھلا دیتے ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت میں منظور اور مقصود یہ ہے کہ آدم اور حوا کی اولاد میں سے دو صنف مشرک ہوئیں اور انہوں نے خدا کا شریک قرار دیا۔ (واللہ العالم!)

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾

''کیا ایسوں کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی نہیں بنا سکتے اور وہ خود بنائے ہوئے ہیں''۔

اللہ کے شریک بنانے کی نفی

افراد بشر سے یہ سوال ہے کہ بتوں کی تم پوجا کرتے ہو اور اللہ کو چھوڑ کر انہیں اللہ کا شریک بناتے ہو، تم بہت برا کام کرتے ہو اور تم غیر معقول عمل بجالاتے ہو یہ بت تو کسی چیز کے مالک نہیں ہیں نہ نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔ نہ انہوں نے کسی کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں وہ تو کسی چیز کو خلق کر ہی نہیں سکتے اور بلکہ خود ان کو کسی اور نے بنایا ہے یہ تو مخلوق ہیں پھر کیسے ان کو اللہ کا شریک بنایا جا سکتا ہے؟ خدا کے علاوہ دیگر اسباب کے ساتھ تمسک کرنا اور ان کو اہمیت دینا جن کا اپنا استقلال ہے ہی نہیں، ان کی اپنی تاثیر ہے ہی نہیں۔ تو یہ ٹھیک نہیں ہے اور یہ تعجب کی بات ہے کہ کس طرح تم ان کو شریک ٹھہراتے ہو جن کے پاس اپنے لئے کچھ نہیں ہے تو وہ کس طرح اللہ کے شریک بن سکتے ہیں؟

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

"اور نہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔"

جھوٹے معبود

اللہ کو چھوڑ کر اُنہوں نے جو معبود بنائے ہیں یہ تو اس پر قادر نہیں کہ وہ کسی کو مدد دے سکیں، وہ تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ کوئی ان کو نقصان پہنچائے تو وہ خود کو اس نقصان سے بچا نہیں سکتے تو پھر تم ان کی عبادت کیسے کرتے ہو؟

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

"اور اگر تم انہیں راستہ کی طرف بلاؤ تو تمہاری تابعداری نہ کریں، برابر ہے کہ تم انہیں پکارو یا چپ رہو"۔

بتوں کی حالت

تم نے جو خیالی معبود بنا رکھے ہیں تمہارے یہ خیالی معبود اُن میں تو توانائی اور استطاعت ہے ہی نہیں کہ وہ کوئی چیز آپ کی سنیں اور اس کو قبول کریں، اُن میں نہ علم ہے نہ قدرت، نہ فہم ہے نہ وہ تمہاری دعا سن سکتے ہیں نہ اس کا جواب دے سکتے ہیں، تم بولو یا چپ رہو فرق نہیں پڑتا، وہ تو دعا سننے کے قابل ہی نہیں تو وہ جواب کیسے دیں گے ؟ تم کس طرح ان سے مدد مانگتے ہو؟

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

”بے شک جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں، پھر انہیں پکار کر دیکھو پس چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کو قبول کریں اگر تم سچے ہو“۔

اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی مثال

یہ معبود خود رب تعالیٰ کے محتاج ہیں ان کے پاس کوئی قدرت نہیں ہے، اگر سچ کہتے ہو تو کہ یہ اللہ کے شریک ہیں تو اُن کو پکارو تاکہ وہ تمہاری دعا کو قبول کریں۔ یہ امر تعجیزی ہے کہ وہ عاجز ہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس علم اور قدرت نہیں ہے۔ دعا قبول کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ان میں کوئی استقلال نہیں کسی میں وہ اپنی تاثیر نہیں چھوڑ سکتے، جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کسی اور کی طرف سے نہیں ہے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿١٩٥﴾

”کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنیں، کہہ دو کہ اپنے شریکوں کو پکارو پھر میری برائی کی تدبیر کرو پھر تم مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو“۔

بتوں کی حالت

یہ بت ناتواں ہیں، جامد ہیں، نہ چلنے پر قادر ہیں نہ کچھ پکڑنے پر قادر ہیں، نہ دیکھنے پر نہ سننے پر۔ بت پرستوں کی سوئی ہوئی فطرت کو جگانے کے لئے یہ سب باتیں کہی گئی ہیں کہ ایسے بت کس طرح عبادت کے لیے لائق ہو سکتے ہیں۔ ان کو چیلنج کیا گیا ہے کہ یہ تو عاجز ہیں، جب وہ عاجز ہیں تو تمہیں کیا دیں گے؟ تم نے اپنے لئے جو شرکاء بنا رکھے ہیں ان بتوں کو، ان کو مدد کے لئے پکارو اور انہیں کہو کہ میرے ساتھ دشمنی کریں، تم میرے مقابلے میں ان کو لے آؤ، مہلت بھی نہ دو۔ میرے رب نے تو میری مدد کی ہے اور تمہاری سازشوں کو ناکام کیا ہے۔ تم ان کو پکارو کہ وہ تمہاری مدد کریں۔ یہاں بھی یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ بت اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ کسی کی مدد کریں تو پھر کس طرح تم اُن کو پکارتے ہو یا ان کے آگے جھکتے ہو؟

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿١٩٦﴾

"بے شک میرا حمایتی اللہ ہے جس نے کتاب نازل فرمائی ہے اور وہ نیکو کاروں کی حمایت کرتا ہے"۔

پیغمبرؐ کی سرپرستی

پیغمبرؐ فرمارہے ہیں میرا سرپرست اللہ تعالیٰ ہے، میرے امور کی تدبیر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، قرآن اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے، قرآن لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اللہ صالحین کا سرپرست ہے وہی نیک لوگوں کے امور کا متولی ہے جو وہ وعدہ کرتا ہے تو وہ اسے پورا کرتا ہے وہ میرا مددگار ہے، وہ صالحین کو زمین کا وارث قرار دے گا۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو زمین کا اختیار دے گا۔ "ہم نے ذکر (توریت) کے بعد زبور میں یہ بات لکھ دی کہ بتحقیق میرے صالحین و نیکوکار تیری ہی زمین کے وارث (حاکم) بنیں گے"۔[1]

وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

"اور جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی ذات کی مدد کر سکتے ہیں"۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

---

1 - (سورہ الانبیاء، آیت: ۱۰۵)۔

”اور اگر تم انہیں راستہ کی طرف پکارو تو وہ کچھ نہیں سنیں گے، اور توں دیکھے گا کہ وہ تیری طرف دیکھتے ہیں حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے“۔

بتوں کی کیفیت

یہ بت ایسے جمادات ہیں جن میں قدرت نہیں ہے، عقل نہیں ہے، حس نہیں ہے، نہ وہ سنتے ہیں نہ وہ دیکھتے ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ کے شریک بنیں؟ یہ پتھر کے بنائے ہوئے مجسمے ہیں یا لکڑیوں کے بنائے ہو مجسمے ہیں خود انسان نے ان کو بنایا ہے یہ سننے، دیکھنے اور دعوت قبول کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتے تو پھر کس طرح ان کو تم عبادت کرتے ہو یا ان کو تم اپنا معبود بناتے ہو۔

یہ ساری آیات ان مشرکین اور بت پرستوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور جاگیں، ان بے جان چیزوں کو اللہ کے مدمقابل نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خالق کائنات ہے جو رب العالمین ہے وہی قادر ہے وہی سنتا ہے وہی دعائیں قبول کرتا ہے، وہی سب کچھ دیتا ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

”درگزر کر اور نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے الگ رہو“۔

عفو و درگزر اور نیکی کرنے کا حکم

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ہمیشہ ایسے رویے اپنائیں کہ خطاکاروں کی خطاء کو معاف کریں اور یہ عمل آپ کا جاری رہنا چاہیے اور جو شخص آپ کے ساتھ برا پیش آتا ہے تو آپ ان کے مثل ان کے ساتھ برائی والا رویہ نہ اپنائیں بلکہ اس کو نظرانداز کریں، درگزر کریں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل کیا اور جو آپ کے

ساتھ زیادتی کرتے تھے آپ نے ذاتی حوالے سے ان سے انتقام نہیں لیا۔ یہ اس معنی میں ہے کہ اگر ہم عفو کا معنی مغفرت اور معافی لیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ عفو کا معنی حد وسط بھی ہے۔ حد وسط والا معنی اس جگہ آیت کے مضمون کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور جامع تر ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کو فرمایا جارہا ہے کہ ہر معاملے میں حد وسط کا انتخاب کرو۔ اعتدال کی حالت میں رہوگے تو یہ آپ کے فائدے میں ہوگا اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ اچھائی کا حکم دو یعنی ایسی روایات جو عقلاء کے ہاں پسندیدہ ہیں اور ایسی عادات جن کو عقلاء اپناتے ہیں اُن کے عمل کی تلقین کرو اور جو منکر ہے ناپسندیدہ اعمال ہیں اُن سے منع کرو۔ جس کو انسان کی عقل نفرت سے دیکھتی ہے ایسے اعمال سے روک دو اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ جو نادان لوگ ہیں ان کے ساتھ آپ کا رویہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ان سے منہ موڑ لو بلکہ رواداری کے ساتھ پیش آؤ تاکہ ان کی نادانی کے اثرات اس طرح ختم ہو سکتے ہیں اور اُن کے جو انکار کرنے والے اعمال ہیں ان کا فساد کم کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی حرکتوں سے درگزر نہ کرنا اس سے جو جاہل اور نادان ہیں اُن کی کج روی اور گمراہی میں اور اضافہ ہوگا۔ تو جاہلوں کے رویہ سے بھی پہلو تہی کرو۔

پیغام: معاشرے کے اندر ہمیشہ انسان کو ایسے رویے اپنانے چاہئیں جس سے اُس کا اپنا مقام اور حیثیت برقرار رہے اور ذاتی حوالے سے اگر کوئی زیادتی کرتا ہے تو فوراً برائی کا جواب برائی سے نہ دو اور اعتدال کے رویے کو اپناؤ، نیک اعمال کی تلقین کرو اور جو جاہلوں کے ساتھ ہمیشہ پہلو تہی سے کام لیا کرو۔

وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۰۰﴾

"اور اگر تجھے کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کر، بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

شیطان سے پناہ

"نزغ" کسی کام کو خراب کرنے کے لیے اس میں دخل دینے کو کہتے ہیں۔ اور یہ ہلانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جگہ سے اکھیڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور دھوکہ دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ نزغ کا کمترین معنی شیطانی وسوسہ ہے۔ تو یہاں پر جو حکم دیا گیا ہے کہ جب شیطانی وسوسہ اور شیطان آپ کے کاموں میں مداخلت چاہے اور لوگوں کے جاہلانہ رویے سے آپ کو غضبناک نہ کریں اور آپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ جاہلوں کے رویوں پر آپ کے اندر جو انتقام کا عنصر ہے اس کو اُبھارے تو اس وقت تم اللہ کی پناہ میں آجاؤ اور اللہ سے حمایت مانگو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو بھی سنتا ہے اور تمہارے تمام امور سے آگاہ بھی ہے، اللہ سارے حالات سے بھی آگاہ ہے۔

یہ خ طاب بظاہ ہر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن اس سے مراد آپ کی اُ مت ہے کیونکہ آپؐ معصوم ہیں اور آپ پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں ہے اور نہ ہی شیطانی وسوسوں کا آپؐ پر اثر ہو، تا ہے لیکن یہ خ طاب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے تو اس لئے دستور د، یا گیا ہے کہ شیطانی وسوسے ج ب آپ میں آئیں تو ان وسوسوں میں اللہ کی پناہ میں آؤ، اللہ سے دُعا کرو کہ تمہیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ اسی لئے ہے کہ "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمْ" میں پناہ لیتا ہوں شیطان مردود کے شر سے۔

پیغام: پیغام یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں رکھے اور شیطان کے وسوسوں سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ میں آئے۔ اللہ سے دُعاء مانگے کہ اسے شیطان کے شر سے بچائے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۱﴾

"بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"۔

شیطان سے بچنے والے

"طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ" شیطانی وسوسہ جو انسان کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور اُس کے دل میں رخنہ ڈالتا ہے اور اُس کے دل میں وارد ہونے کے لئے راستہ نکالتا ہے تو ایسی صورت میں جو صاحب تقویٰ لوگ ہیں اور اللہ کے غضب سے خود کو بچا کر رکھتے ہیں تو ان کے لئے یاد دہانی انہیں بچا لیتی ہے۔ اس میں ایک تو اللہ سے پناہ مانگنے کا حکم ہوا اور یہ کہ اللہ کی پناہ میں ہیں تو بتایا گیا کہ اللہ کی پناہ اہل تقویٰ کی روش ہے جو اہل تقویٰ ہیں جب شیطانی وسوسہ ہوتا ہے تو وہ فوراً اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، اپنے مالک کو یاد کرتے ہیں۔ انسان کا مالک اور رب اور مربی رب تعالیٰ ہے اور سارے امور اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر جس کے ہاتھ میں سب امور ہیں اُس سے بہتر کون ہے کہ جس کی پناہ میں ہم جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اس طرح اللہ ان سے شیطان کے شر کو دُور کر دیتا ہے اور غفلت کا پردہ ان سے ہٹ جاتا ہے، یکدم وہ بینا اور بابصیرت ہو جاتا ہے اور شیطانی خیالات اس میں نفوذ پیدا نہیں کرتے۔

پیغام: اللہ کی عظمت کو یاد رکھنا شیطانی وسوسوں سے بچاؤ کا طریقہ ہے جو ہمیشہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں وہ شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

وَ اِخۡوَانُهُمۡ یَمُدُّوۡنَهُمۡ فِی الۡغَیِّ ثُمَّ لَا یُقۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾

''اور جو شیاطین کے تابع ہیں وہ انہیں گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ باز نہیں آتے''۔

گمراہ ساتھی

یہاں پر ''اِخْوَانُهُمْ'' سے مشرکین مراد ہیں۔ یہ انسانی شیاطین ہیں جو صاحبان تقویٰ ہیں اور اللہ کی عظمت و مالکیت کو یاد رکھتے ہیں تو وہ بابصیرت ہو جاتے ہیں لیکن مشرکین شیطانوں کی گرفت میں ہیں اور ان کے جو ساتھی ہیں جنی شیاطین وہ ہمیشہ انہیں گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اس گمراہی کے راستے میں جانے کیلئے ان کی مدد کرتے ہیں ایک لمحہ بھی وہ ان کو سوچنے کا موقع نہیں دیتے ان کے انحراف میں ان کے مددگار بنتے ہیں۔ یا اس کا معنی یوں بھی کر سکتے ہیں کہ شیاطین کی مدد سے مشرکین شرک اور گمراہی سے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ بات یہ سمجھائی جارہی ہے کہ انسانوں کی شکل میں بھی اور جنات کی شکل میں بھی ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے اور یہ شیطان اسے بھٹکاتا رہتا ہے۔ جو مشرکین ہیں پہلے سے شرک میں ہیں تو یہ شیاطین ان کو شرک پر باقی رکھتے ہیں اور انہیں انحراف سے نکلنے نہیں دیتے جبکہ جو صاحبان تقویٰ ہیں وہ اللہ کی عظمت کو یاد کرکے شیاطین کے عمل سے خود کو بچالیتے ہیں اور شیاطین کے اثر سے نکل آتے ہیں لیکن مشرکین پہلے ہی مشرک ہیں تو وہ شیاطین کے اثر سے نہیں نکلتے۔

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''اور جب تو ان کے پاس کوئی معجزہ نہیں لاتا تو کہتے ہیں کہ تو فلاں معجزہ کیوں نہیں لایا، کہہ دو میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے بہت سی دلیلیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں''۔

ہدایت کا انتظام

''اجتباہ'' کا معنی اکٹھا کرنا ہے۔ مشرکین حضور پاک ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس آیت میں اُن کی اسی حالت کو بیان کیا جارہا ہے کہ اگر کچھ وقت گزر جاتا ہے اور قرآن کی کوئی نئی آیت ان کے لئے نہیں آتی تو وہ کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا، آیت کیوں نہیں آئی؟ کہ ادھر اُدھر سے حروف کو اکٹھا کرکے اس کا نام آیت رکھ کر ہمارے پاس کوئی آیت کیوں نہیں لایا۔ نئی آیت کیوں نہیں بنا کرلے آیا وہ تو یہی کہتے تھے کہ یہ آیات خود پیغمبر بناتا ہے تو پھر پیغمبر کو حکم ہوا کہ ان سے کہہ دو کہ میرے پاس اپنی بنائی ہوئی آیت نہیں ہے۔ رب تعالیٰ کی طرف سے جو وحی ہوتی ہے میں تو اسی کے پیچھے چلتا ہوں۔ نہ تو آیات کے بارے میں میرا اختیار ہے اور نہ ہی آیات کے نازل ہونے کے بارے میں میرا اختیار ہے۔ یہ قرآن کی آیات تمہارے رب تعالیٰ کی جانب سے بصیرتیں ہیں، سمجھ کی باتیں ہیں اور یہ تمہیں بیناء کرتی ہیں، تمہارے لئے روشنی دیتی ہیں تاکہ عقلاء اس راستے سے ہدایت پائیں یہ قرآنی آیات صراط مستقیم کی طرف ہدایت ہیں اور یہ اہل ایمان کیلئے اللہ کی طرف سے فیضان اور رحمت ہے۔ ان کے ذریعے اور ان کے وسیلے سے حق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اہل ایمان ہدایت کی پیروی اس سے لیتے ہیں، حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں، قرآن معاشرہ کے اندر جو فساد تھے، معاشرے میں جو بیماریاں ہیں اُن کی اصلاح کے لئے ہے اور یہودی سازشوں اور صلیبی منصوبوں کے مفاسد کو

یہ قرآن زائل کرتا ہے۔ انسان کو ہزاروں معبودوں کی عبودیت اور پرستش سے نکالتا ہے اور فقط ایک خدا کی پرستش اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔

پیغام: قرآنی آیات سے استفادہ کیا جائے، ان سے راہنمائی لی جائے، ہدایت حاصل کی جائے۔ قرآنی آیات میں ہدایت ہے، رحمت ہے، ہلاکت سے بچاؤ ہے اور فساد سے بچاؤ ہے۔

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۲۰۴

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قرآن کو توجہ سے سننا

قرآن جب پڑھا جارہا ہو تو خاموشی سے سنا کرو۔ ''انصات'' ایسی خاموشی کو کہتے ہیں جس میں غور سے سنا جارہا ہو۔ خاموشی سے سننا ''انصات'' کہلاتا ہے۔ جس وقت قرآن کی آیات کی تلاوت ہو رہی ہو تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ خاموش ہو جائیں اور ان آیات میں غور کرنے کے لئے تدبر کرنے کے لئے غور سے سنیں اور توجہ دیں ان کو اپنے دل و دماغ میں بٹھائیں ان کے معنی پر غور کریں تاکہ اس طرح اُن پر رحمت اُترے۔[1] اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کو ہدایت اور رحمت کے لئے اُتارا ہے۔ (سورہ اسراء آیت ۸۲ میں ہے کہ ''ہم قرآن کو نازل کرتے ہیں جو شفاء ہے مومنین کے لئے اور ظالموں کو تو کچھ بھی اس سے نہیں ملتا مگر یہ کہ خسارہ اور گھاٹا ہی ہے''۔

[1]۔ چو قرآن بخوانند دیگر خموش به آیات قرآن فرادار گوش

قرآن سے استفادہ تب ہی ہو گا جب قرآن کی آیات کو توجہ سے پڑھا جائے گا اور اگر کوئی اور پڑھ رہا ہے تو توجہ سے ان کو سنا جائے گا جب تک سنو گے نہیں تو کیا پتہ چلے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے رحمت بنایا ہے اور ٹیڑھے دلوں کی شفاء قرار دیا ہے اور بیمار دلوں کی شفاء قرار دیا ہے۔ قرآن راہنمائی ہے، صحیح راستے کی صراط مستقیم کی، جو ظالم لوگ ہیں جو حد سے بڑھے ہوئے لوگ ہیں تو ان کے لئے خسارہ اور گھاٹا اور نقصان کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴿۲۰۵﴾

''اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے یاد کرتا رہ صبح اور شام بلند آواز کی بجائے ہلکی آواز سے، اور غافلوں سے نہ ہو''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدۃ ع

''بے شک جو تیرے رب کے ہاں (فرشتے) ہیں وہ اس کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاک ذات کو یاد کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں''۔

مقربین درگاہ رب تعالیٰ

مقربین درگاہ الٰہی سے مراد فرشتے نہیں ہیں بلکہ فرشتوں کے علاوہ جن وانس میں جو مقربین ہیں ان کے اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں۔ مقربین رب تعالیٰ وہ ہیں جو یاد خدا سے

غفلت نہیں کرتے اور اُن کے سامنے سے اللہ تعالیٰ نے پردے اٹھا لئے ہیں وہ اللہ کے درگاہ کا قرب حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ "عند ربك" درمیان سے وہ غائب نہیں ہیں کوئی پردہ نہیں ہے ان کے سامنے ہیں۔ یہ ایسے ہیں جو اللہ کی عبادت کرنے میں تکبر نہیں کرتے کیونکہ عبودیت اور بندگی تکبر اور غرور اور گردن کشی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ جو غلام ہوتا ہے وہ تکبر نہیں کرتا، عبودیت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ تکبر وہاں نہیں ہوتا۔ تکبر کرنے والے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دُور ہیں اور یہ اللہ کی تسبیح بجالاتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ہر نقص و عیب کو دُور کرتے ہیں اور اللہ غنی بالذات ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو نقص کو بیان کرے۔ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہیں۔

"تسبیح" سے مراد عام معنی مراد لیا گیا ہے۔ اس آیت میں "سجدہ" سے مراد یہ نہیں ہے کہ مخصوص اعضاء پیشانی دو ہتھیلیاں، گھٹنے اور پاؤں کے دو بڑے انگوٹھے زمین پر ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تمام اعضاء و جوارح اللہ کے حضور میں ہوں اور اللہ کی اطاعت میں ہوں اور اس کے سارے اعمال عبادات، معاملات اس کے کاروبار اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ کی اطاعت میں گزر رہا ہو، ذکر الٰہی میں ہو، تسبیح میں ہو، اللہ کی اطاعت میں ہو۔ سجدہ اطاعت کی اعلیٰ منزل ہوتی ہے اسی لئے اطاعت کی حالت کو لفظ سجدہ سے اظہار کیا گیا ہے۔ سورہ اسراء، آیت: ۴۴ میں ہے "کوئی بھی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ کی تعریف کے لئے تسبیح بجا لا رہی ہے"۔ ہر شئے اپنے وجود کے ساتھ اللہ کی عظمت کو بیان کر رہی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی اطاعت میں رہے۔ اس سے پہلی آیت میں حکم دیا گیا کہ "اللہ کو ہر حال میں پکارتے رہیں، عاجزی کیساتھ؛ شور شرابا کرنے کی بجائے خوف اور گھبراہٹ کی حالت میں اللہ کو پکاریں، صبح و شام اللہ سے دُعاء کرتے رہیں، غافلوں سے نہ ہوں"۔

پیغام: اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے تو اللہ کی عبادت کرنی چاہیے، اللہ کی تسبیح بجالانی چاہیے اللہ کی اطاعت میں رہنا چاہیے واجبات کو ادا کیا جائے، حرام کاموں سے بچا جائے اور ہر حال میں ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔

سورۃ الانفال

مدنی۔ کل آیات 75

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورہ کے مطالب

جنگ بدر کے حالات کا بیان، جہاد سے متعلق متفرق مسائل، جنگی غنائم کے احکام، انفال اور دوسرے امور کا ذکر، ہجرت سے متعلق حالات واحکام کا بیان۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

”تجھ سے غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمت کا مال اللہ اور رسول کا ہے، سو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اگر ایمان دار ہو“۔

انفال کے بارے میں

”نفل“ اضافہ کو کہتے ہیں یا ایسی چیز جس کا کوئی مالک نہ ہو اور ان اموال پر بھی بولا گیا ہے جن کے عام لوگ مالک ہوں جیسے پہاڑ، ندی نالے، صحراء یا وہ اموال جن کا کوئی وارث نہیں ہے، اسی طرح ایسے اموال جو اللہ اور اللہ کے رسول کے ہیں۔ جنگی غنائم پر بھی یہ لفظ انفال بولا گیا ہے، لوگوں کی طرف سے جو سوال آیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ انفال کے بارے ان میں آپس میں جھگڑا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ فرمارہا ہے کہ ایسے اموال جن کا کوئی مالک نہیں وہ اموال اللہ اور اللہ کے رسول کے ہیں۔

لہٰذا اللہ سے ڈرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور طے شدہ حدود سے تجاوز نہ کرو اور آپس میں صلح و صفائی رکھو اور آپس کے جھگڑے ختم کرو اور تمہارے آپس کے تعلقات خراب

نہیں ہونے چاہئیں اور آپس کے تعلقات کو خراب نہ کرو۔ اصلاح کرو، فساد نہ کرو۔ انفال کے مسئلے پر لوگوں کے درمیان جھگڑا تھا اسی لئے تو وہ پیغمبر سے سوال کر رہے تھے تو اس آیت میں اس کا حکم بیان کر دیا گیا کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اللہ کے رسول کا جو حکم ہے اس کے پابند رہو اور اسی کی پیروی کرو اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ عمل میں اطاعت کرو، زبانی اطاعت کا اظہار کر دینا کافی نہیں۔

پیغام: وہ اموال جن کا کوئی مالک نہیں یا جو اموال جن کا کوئی وارث نہیں وہ اموال اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ہیں، جس طرح ان کا حکم ہو اسی طرح ان اموال کا استعمال ہونا چاہیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾

"ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں"۔

مومن کا تعارف

اس آیت میں اور بعد والی آیات میں حقیقی مومنین کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور یہاں پر مومنین کی پانچ صفات ذکر ہوئی ہیں اور یہ ایسی صفات ہیں کہ یہ ہوتے ہوئے تمام اچھے اخلاق اور اچھی صفات آجاتی ہیں۔

پہلی بات: جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے ایمان میں اور چمک دمک آجاتی ہے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اللہ کا نام انہیں متاثر کرتا ہے، اللہ کی یاد سے ان میں خشیت اور خوف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔

دوسری بات: جب اللہ کی آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور اللہ کی آیات تقویٰ اور ایمان کے راستے میں ہدایت کا سبب بنتی ہیں یقین کے مرحلے کو پہنچنے میں مددگار ہوتی ہیں اور ایمان ان کے دلوں میں مستقر ہو جاتا ہے۔

تیسری بات: اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، اپنے امور اپنے رب کے سپرد کر دیتے ہیں اور انہوں نے اپنی بندگی کی جگہ کو جان رکھا ہے لہٰذا بندہ ہونے کے ناطے انہوں نے اپنے تمام امور کا وکیل اللہ کو قرار دیا ہوتا ہے اور اپنی پوری زندگی میں وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے جو مقدر کیا ہے اس پر راضی رہتے ہیں، اللہ کے قوانین اور احکام کے پابند ہوتے ہیں، اللہ کے اوامر کی مخالفت نہیں کرتے، اللہ نے جن کاموں سے روکا ہے ان سے رُک جاتے ہیں۔

چوتھی بات: وہ مومنین ایسے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔

پانچویں بات: جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے وہ اس سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ؕ۳

''مومنین وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ۴

''یہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے رب کے ہاں ان کے لیے درجات ہیں اور بخشش ہے اور عزت کا رزق ہے''۔

نماز اور انفاق

اس آیت میں مومنین کیلئے نماز قائم کرنے اور انفاق کی دو صفات کا تذکرہ اکٹھا کیا گیا ہے۔ پہلی صفت یہ ہے کہ نماز قائم کرتے ہیں۔ ان کے نفوس بندگی کے مقام پر اخلاص اور خضوع کی حالت میں رہتے ہیں اور بندگی کی اعلیٰ مثال وہ نماز ہی ہے۔ اس عبادت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ انفاق کرتے ہیں اور اس صفت کا تعلق سوسائٹی اور معاشرے سے ہے۔ مومنین لوگوں کی مشکلات حل کرنے میں ان کے مددگار بنتے ہیں۔ لوگوں میں مالی جو کمزوریاں رہ جاتی ہیں وہ ان کو دُور کرتے ہیں اور جو ان کی طاقت و بساط میں نہیں ہوتا وہ اسے پورا کرتے ہیں اور اللہ نے ان کو جو مال دیا ہے وہ اس سے کمزور افراد پر خرچ کرتے ہیں، مال بھی دیتے ہیں۔ اگر ان کے پاس علم ہے تو علم بھی دیتے ہیں اور اس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا عنوان عام ہے۔ جو کچھ مومنین کے پاس ہے چاہے وہ مال کی صورت میں ہو، علم کی صورت میں ہو؛ کسی عنوان و منصب اور صلاحیت و قابلیت کی صورت میں ہو وہ اس میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ مومنین کی یہ پانچ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان کی ہیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ۝۵

”جیسے تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے سچائی کے ساتھ نکالا، اور بے شک ایک جماعت مسلمانوں میں سے اسے ناپسند کرنے والی تھی“۔

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

''وہ حق بات میں تجھ سے جھگڑتے تھے حق کے ظاہر ہو چکنے کے بعد، گویا وہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں''۔

حق کا تعارف

حق ایک ایسا امر ہے جو ثابت ہے اس کے واقعی اور حقیقی آثار ہیں، اس کا مطلوب اس پر مرتب ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں باطل ہے۔ اللہ کے فعل کا حق ہونا مثلاً جہاد کی نیت سے گھر سے نکلنا؛ تو حق بات یہ ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہی عمل واجب ہے اور متعین ہے اسی کے مطابق ہی چلنا ہے۔ اللہ فرمارہا ہے: اے میرے رسول! حق کے بارے میں جو تجھ سے آکر مجادلہ کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، جبکہ اجمالی طور پر حق ان پر واضح وآشکار ہو چکا ہے تو پھر یہ ایسے ہی ہے کہ ان کی شباہت اس جماعت سے ہے کہ جن کے قتل کا حکم جاری ہو چکا ہو اور وہ موت کی طرف لے جائے جارہے ہوں اور وہ کھڑے ہوں اور اپنے قتل کے وسائل اور حالات کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ اس سے بہت ہی مضطرب اور پریشان ہوں اور ان کے لئے یہ حکم قبول کرنا دشوار ہو۔ بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو فیصلہ کرتا ہے وہی حق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اگر جہاد کا حکم دیا ہے تو برحق ہے اسکے مطابق چلنا چاہیے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس کے خلاف چلے۔ اس جگہ حق کے آنے کے بعد اس بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھگڑنا مومنین کی شان نہیں ہے۔

پیغام: جب حق واضح ہو جائے تو اسی کے مطابق چلنا چاہیے حق پر معترض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سارے فیصلے حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اللہ کے فیصلوں پر اعتراض جائز نہیں۔

وَ اِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی الطَّآئِفَتَیۡنِ اَنَّہَا لَکُمۡ وَ تَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَیۡرَ ذَاتِ الشَّوۡکَۃِ تَکُوۡنُ لَکُمۡ وَ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ﴿۷﴾

''اور جس وقت اللہ تم سے وعدہ کرتا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی، اور تم چاہتے تھے جس میں کانٹا نہ ہو وہ تمہیں ملے، اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے حکم سے حق کو ثابت کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''۔

قریش کے دو گروہوں کا جھگڑا

یہاں پر جو دو گروہ بیان ہوئے ہیں ایک کا نام ''عیر'' دوسرے کا نام ''نفیر'' تھا۔ ''عیر'' کا تجارتی قافلہ اور ان کے تجارتی اموال تھے جس پر انہوں نے چالیس آدمی نگران رکھے ہوئے تھے ان میں ابوسفیان بن حرب بھی تھا۔ ''نفیر'' قریش کا دوسرا گروہ تھا جس میں ایک ہزار افراد تھے اور سب وہ افراد تھے جو جنگ کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے مومنوں کو وعدہ دیا کہ ان دو گروہ میں سے ایک پر تم مسلط ہو جاؤ گے۔ اسلام کے لشکر نے مال تجارت حاصل نہ کیا اور ''نفیر'' قریش کی دوسری جماعت سے جنگ کرنے آگیا۔ بدر میں دوسرا گروہ ''نفیر'' آیا تھا اس سے لشکر اسلام کا آمنا سامنا ہوا اور وہ گروہ ''عیر'' جن کے پاس مال تجارت تھا اور ان کے پاس افراد کمتر تھے وہ کمزور تھے۔

اس وقت مومنوں میں ضعف تھا، کمزوری تھی جبکہ ''نفیر'' والا گروہ طاقت میں تھا، تعداد میں بھی مومنوں سے زیادہ تھے۔ مومنین اس بات کو جانتے تھے لہٰذا مومنین میں سے اکثریت کی خواہش یہ تھی کہ ''عیر'' پر قبضہ حاصل کرلیا جائے لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ

نے اس کے بر عکس چاہا۔ مومنین کی تعداد تو تھوڑی تھی اور قریش کی تعداد زیادہ تھی اور وہ زیادہ طاقتور تھے۔ اللہ چاہتا تھا کہ یہ کمتر طاقت والے بڑی طاقت والوں پر غلبہ حاصل کرلیں اور یہ اللہ کا فیصلہ تھا اور اس سے اللہ تعالیٰ حق کو مستحکم کرنا چاہتا تھا اور باطل کی بنیادیں ہلانا چاہتا تھا اور بہت زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اشتباہ کرتے ہیں اور خدا نے ان کے لئے جس راستہ کو چنا وہ اس کے انتخاب کی مخالف چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارادہ انسان کی صلاح، بہتری اور خیر کے لئے ہے اور اسی میں ہی خیر ہے۔

اس موضوع میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ اسلام کو شان و شوکت والے گروہ پر غلبہ دے اور اسلام قوت و قدرت میں آجائے اور باطل نابود ہو جائے، اس کی جڑیں ہلا دی جائیں۔ اللہ کا فیصلہ انبیاء کی مدد کرنا ہے، دین حق کی مدد کرنا ہے۔ "کلمات خدا" اللہ کے کلمات سے اللہ کا فیصلہ مراد ہے۔[1]

(حقیقت میں اس آیت میں جنگ بدر کا تذکرہ ہے جو "عیر" قریش کا گروہ تھا وہ چالیس آدمی تھے جن میں ابوسفیان بن حرب بھی تھا ان کے پاس مال و تجارت تھا اور وہ طاقت میں بھی نہیں تھے تو مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ اسی پر قبضہ کرلیں اور مال حاصل کریں۔ لیکن دوسرا گروہ "نفیر" تھا وہ ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا، وہ طاقت میں تھے، جنگجو تھے تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مد بھیڑ "نفیر" سے ہو اور اللہ مسلمانوں کو غلبہ اور باطل کو شکست دے۔ اللہ کا فیصلہ بر حق تھا اور اسی پر ہی چلنا چاہیے تھا اور یہی فیصلہ ہوا اگرچہ اس فیصلے پر بعض مسلمان خوش نہیں تھے لیکن اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ تھا وہ صحیح تھا لیکن انسان کو سمجھ

---

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔ مصطفیٰ شاکر کے ترجمہ میں آیا ہے کہ "کلمات خدا" سے وہ آیات مراد ہیں جو جنگ بدر میں نازل ہوئی۔

نہیں ہوتی وہ اللہ کی قضاء و قدر میں جو حکمت ہوتی ہے وہ اسے درک نہیں کر سکتا اور ظاہری جاہ وحشم کو دیکھ کر بھٹک جاتا ہے۔ جنگ بدر والا واقعہ اس کی مثال ہے۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ اللہ کا فیصلہ ہی صحیح ہے نہ کہ جو انسان سوچتا ہے۔ انسان کو چاہیے اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کرے)۔ (اردو مترجم)

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ۝۸

''تاکہ حق کو ثابت کر دیا جائے اور باطل کو مٹا دیا جائے اگرچہ جرائم پیشہ اس سے ناراض ہی کیوں نہ ہوں''

حق کا اثبات

اس جگہ سابقہ بات کی دلیل پیش کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ دیا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ حق کو ثابت و مستحکم کرے گا، حق کو مضبوط کرے گا اور باطل کو نابود بنائے گا اگرچہ مجرم، گناہگار اس سے ناخوش ہی کیوں نہ ہوں۔

ان دو باتوں میں کتنا فرق ہے کہ جو خیر اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں مسلمانوں کے لئے چاہی اور وہ خیر جو مسلمان خود اپنے بارے سوچ رہے تھے کہ مال مل جائے گا تجارتی قافلے سے؛ لہٰذا خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور خدا نے حق کو غلبہ دیا اسے استحکام بخشا اور باطل کو نابود کیا، حق کا لشکر باطل کے لشکر پر غالب آیا۔ جنگ بدر کا جو نتیجہ ہوا اس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ وقت جب آپ نے اپنے رب سے فریاد کی اور مدد مانگی تو اللہ نے آپ کی دُعا قبول کی اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ دیا کہ میں پشت در پشت ایک ہزار فرشتے جو منظم ہوں گے اور مرتب صف بندی ان کی ہو گی ان کے ذریعے تمہاری مدد کروں گا۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ
الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ ﴿۹﴾

”جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے اس نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں“۔

فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد

”استغاثہ“ کا مطلب فریاد رسی، مدد طلب کرنا، امداد مانگنا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کا جو استغاثہ تھا اس کو یہاں بیان کیا ہے کہ اے میرے پیارے جب تم یہ دُعا کر رہے تھے اور مجھ سے مدد مانگ رہے تھے کہ تمہاری تعداد تھوڑی ہے تو ں ہمیں مدد دے دے تو تمہاری اس دعا کو میں نے قبول کر لیا ہے اور جو میں نے وعدہ دیا تھا اس وعدے کو پورا کیا ہے کیونکہ رسول پاک ﷺ نے کہا تھا: اے میرے رب اگر یہ تھوڑے سے مومنین قتل ہو گئے تو روئے زمین پر تیری بندگی کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اللہ نے دعا کو قبول کیا اور کہا کہ میں ایک ہزار فرشتے جو آگے پیچھے ہوں گے منظّم ہوں گے صفیں ان کی بندھی ہوں گی وہ تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔ تو گویا جنگ بدر کا معرکہ مشیت الٰہی کے تحت ہی سر ہوا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی مدد آئی اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

پیغام: ہر مشکل امر میں اللہ سے فریاد کرنی چاہیے اور اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔ صدق دل سے دعا کو اللہ سنتا ہے اور حاجات کو پورا کرتا ہے۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

''اور یہ تو اللہ نے فقط خوش خبری دی تھی اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے، بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

مومنین کے لیے بشارت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومنین سے کہہ رہا ہے کہ یہ جو میں نے فرشتے بھیجے؛ اصل میں یہ تھا کہ تمہیں فتح کی بشارت دی جائے تمہارے دلوں کو مطمئن کیا جائے اور تمہارے اندر جو خوف کا عالم تھا کہ کہیں کافر ہمارے اوپر چڑھ نہ دوڑیں؛ وہ خوف تمہارے دلوں سے ختم کیا جائے۔ یہ اسی لئے نہیں تھا کہ فرشتوں کے لئے کافروں کو ہلاک کیا جائے اور فرشتوں نے کسی ایک کافر کو بھی قتل نہیں کیا۔ فرشتوں کے نزول اور اُترنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل مضبوط ہو جائیں اور ان کے اندر رعب ہو اور کافروں کے دلوں میں ان کا رعب بھر دیا جائے۔ جیسا کہ روایات میں ہے جتنے بھی مشرکین قتل ہوئے اُن کا 1/3 یا ½ حضرت علی علیہ السلام کے توسط سے قتل ہوئے اور باقی مقتول قریش کے ہلاک شدگان باقی مسلمانوں کے توسط سے قتل ہوئے۔ فرشتوں کی موجودگی مسلمانوں کے لشکر کی کثرت دکھانا اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنا اور کافروں کے دلوں میں رعب اور خوف قرار دینا تھا پھر فرمایا کہ مدد جو ہوتی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور جو کامیابی ہے اس کا دارومدار افراد کی کثرت یا ظاہری شان و شوکت پر نہیں وگرنہ یہ کافر مسلمانوں پر غالب آجاتے اور آخری جملہ میں جو بیان پہلے آیا ہے اس کی وجہ کو بیان کیا گیا ہے کہ تم نے جو غلبہ حاصل کیا ہے یہ اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ مقتدر ہے اور وہ باعزت و باوقار ہے اور اس کی حکمت بالغہ ہے۔ اللہ کے فیصلہ نے ہر صورت پورا ہونا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اسی کا ہے۔

اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمۡ بِہٖ وَ یُذۡہِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَ لِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَ یُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ ﴿ؕ۱۱﴾

”جس وقت اس نے تم پر اپنی طرف سے تسکین کے لیے اونگھ ڈال دی اور تم پر آسمان سے پانی اُتارا تاکہ اس سے تمہیں پاک کر دے اور شیطان کی نجاست تم سے دور کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدم جما دے“۔

اللہ کی مہربانیاں

”النُّعَاسَ“ ہلکی نیند کو کہتے ہیں، نیند کا آغاز۔ ”اغشاء“ سے مراد مسلط ہو جانا، گھیر لینا، چھا جانا۔ ”اَمَنَۃً“ امان سے ہے۔ ”رجس“ پلیدی، نجاست کو کہا جاتا ہے۔ ”رجس شیطان“ شیطانی وسوسے ایسی پلیدی ہے جو دل میں جا گھستی ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ اللہ کی مدد جو تمہارے دلوں کو سکون دینے کے لئے تھی اور تمہارے لئے ایک طرح کی بشارت تھی اور جب آپ کے دل مطمئن ہو گئے اور تم سب سو گئے اور معلوم ہوا کہ اگر ڈر اور خوف ہوتا اور تمہارے اوپر ڈر طاری رہتا تو پھر میدان جنگ میں تمہیں نیند آتی ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بارش کو تمہارے اوپر اتارا تاکہ تمہیں پاک بنائے اور شیطان کے وسوسوں کو تمہارے دلوں سے نکال باہر کرے تاکہ تمہارے دل مضبوط اور طاقتور ہوں۔

روایات میں ہے کہ کافر مسلمانوں سے پہلے بدر کے کنوئیں پر پہنچے تھے جب مسلمان اُترے تو وہاں سے کافر پانی لے چکے تھے اور مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ایک خشک جگہ اور ریگزار

میں اپنا پڑاؤ ڈالیں اور کچھ مسلمان جنب کی حالت میں بھی تھے، بے وضو تھے، انہیں غسل کی بھی ضرورت تھی وضو کی بھی ضرورت تھی، پیاس بھی بہت زیادہ تھی اور شیطان ان کے دلوں میں وسوسے ڈال رہا تھا تو ان شرائط میں انہیں کہہ رہا تھا تم شکست کھا جاؤ گے لیکن اللہ نے ان پر بارش برسا دی سب بارش کے پانی سے پاک ہو گئے اور مسلمان کی جو جگہ تھی جہاں انہوں نے پڑاؤ ڈالا تھا وہ ریگزار بارش کی وجہ سے وہ جگہ مضبوط ہو گئی اور کافروں کی جگہ میں پھسلن ہو گئی کیونکہ وہ پکی جگہ تھی تو وہاں ان کے لئے بارش تکلیف کا سبب ہوئی۔

جیسا کہ جنگ بدر کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ مسلمان پریشان تھے کہ ایسی جگہ اُترے تھے جہاں ریگزار تھا اور پکی جگہ پر کافر اُتر چکے تھے اور پانی والی جگہ بھی کافروں کے قبضہ میں تھی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کا بھی انتظام کر دیا، ان کی طہارت کا بھی انتظام کر دیا۔ ظاہر ہے ریت والی جگہ بارش آنے کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہے اور وہاں کوئی پھسلن بھی نہیں ہوتی لیکن جو پکی جگہ ہوتی ہے تو بارش کی وجہ سے وہاں پر کیچڑ ہو جاتا ہے اور پھسلن ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں اس مہربانی کا تذکرہ کیا ہے اور شیطان دلوں میں جو وسوسے ڈال رہا تھا ان وسوسوں کو دُور کرنے کا ذریعہ اللہ نے خود مہیا کر دیا۔

پیغام: شیطان کے وسوسوں سے ڈرنا چاہیے، اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہونا چاہیے اور اپنے دلوں کو اللہ کی یاد سے مضبوط کیا جائے اور جب اللہ کی راہ میں ہوں تو آپ کے قدم نہیں اکھڑنے چاہئیں بلکہ اللہ پر بھروسہ اور اعتماد رکھنا چاہیے۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ ﴿۱۲﴾

''جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کے دل ثابت رکھو، میں کافروں کے دلوں میں دہشت ڈال دوں گا سو گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور پر مارو''۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾

''یہ اس لیے ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہو تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

''یہ تو تم چکھ لو اور جان لو کہ بے شک کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے''۔

کافروں کی سزا

اس آیت میں کافروں کو خطاب ہے اور ان کو کہا جارہا ہے کہ یہ جو ذلت ورسوائی ہے اس کی وجہ اللہ کے رسول کی مخالفت ہے، اب اس مخالفت کا نتیجہ بھگتو، یہ دنیا کی ذلت ورسوائی ہے آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے اس کے لئے بھی آمادہ رہو، آخرت میں بھی تمہیں شدید ترین عذاب ہو گا اور وہاں بھی ذلت ورسوائی تمہارا مقدر ہو گی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۚ ﴿۱۵﴾

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو''۔

میدان جنگ سے بھاگنے سے منع

اس آیت میں مومنوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب تمہارا سامنا ہو کافروں کے ساتھ ہو اور تم جنگ میں ہو تو پھر بھاگنا نہیں اور پیچھے نہیں ہٹنا بلکہ چڑھائی کرکے کافروں کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنا ہے طریقے سے بڑھنا ہے اور اے ایمان والو! جب کفار حملے کی حالت میں تمہارے نزدیک ہوں تو تم ان سے منہ نہیں موڑنا بلکہ ان کا سامنا کرو اور ان کے اوپر حملہ آور ہو جاؤ۔ اس آیت میں مومنوں کو حملہ کرنے کی تربیت دی جارہی کہ اس طرح حملہ کرو۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑯

''اور جو کوئی اس دن ان سے پیٹھ پھیرے گا مگر یہ کہ لڑائی کا ہنر کرتا ہو یا فوج میں جاملتا ہو سو وہ اللہ کا غضب لے کر پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور بہت برا ٹھکانا ہے''۔

جنگ سے فرار کرنے کا نتیجہ

''تحرف'' اعتدال کی لائن سے ہٹنے کو کہتے ہیں۔ یہاں پر بتایا جا رہا ہے کہ جب تم جنگ کی حالت میں ہو تو میدان جنگ میں موجود رہو۔ ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دشمن کو غافل کرنے کے لئے تم تھوڑا پیچھے ہٹتے ہو یا اپنا ایک گروپ جو ایک طرف کھڑا ہے تم اس کے ساتھ جا کر ملحق ہوتے ہو اور پھر سنبل کر حملہ کرنا چاہتے ہو تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر محاذ جنگ سے ادھر اُدھر ہونا جنگی حکمت عملی کے تحت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں وگرنہ

جنگ سے اگر پیٹھ پھیرتے ہو تو پھر اس کی سزا ملے گی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنگ سے فرار کرنے والوں کی سزا جہنم رکھی ہے، جہنم بدترین ٹھکانہ ہے۔

"تحیز" کا مطلب اپنے لئے کوئی جگہ لینا "فئہ" کا مطلب جماعت و گروہ۔ "تحیز" اپنی جماعت کی طرف پلٹنا۔ جب کوئی جنگجو اکیلا آگے بڑھ رہا ہے اور بعد میں پیچھے ہٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس آتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ "بآءَ" بوا سے ہے۔ اس کا مطلب کسی جگہ سے پلٹنا۔ "نبوہ" اجزا کا ایک جیسا نہ ہونا اور اس میں رجوع اور پلٹنے کا معنی بھی موجود ہے۔

آیت کا معنی اس طرح ہے کہ جو ایمان لے آئے ہو۔ جب کفار کو حملے کی حالت میں دیکھتے ہو تو وہاں سے پیچھے نہ ہٹو، جنگی حکمت عملی میں کوئی حرج نہیں۔ اگر میدان جنگ سے واپس آتے ہو اور اپنے گروہ کے ساتھ ملحق ہوتے ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر اس کے علاوہ ہو تو اللہ کے غضب کا سامنا تمہیں کرنا پڑے گا اور تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور جہنم بدترین ٹھکانہ ہے۔ اس سے یہ حکم واضح ہوا کہ جنگ کے میدان سے فرار گناہان کبیرہ سے ہے اور یہ حکم عمومی ہے فقط جنگ بدر کے لئے نہیں ہے۔ مسلمانوں کی یہ پہلی جنگ تھی منظّم انداز سے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے جنگ کا طریقہ بھی بتایا حملے کا طریقہ بھی بتایا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ میدان میں جم کر لڑو اور جنگی تکنیک کے حوالے سے ادھر اُدھر ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ان کے حملے کی صورت میں ان کا سامنا کرو، ان کے آگے بڑھو اور مار پلاؤ، ایسا نہیں ہے کہ پچھے ہٹو اور فرار کرو، اگر فرار کروگے تو پھر اس فرار کی تمہیں سزا بھگتنا ہو گی۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

''سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا، اور تو نے مٹی نہیں پھینکی جبکہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی، اور تا کہ ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان کرے، بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

جنگ بدر میں اللہ کی مدد

بدر کا واقعہ جو ۱۷ ماہ رمضان کو واقع ہوا یہ کوئی عادی اور معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ غیر معمولی واقعہ تھا اور طبیعی اسباب اس میں اُن کو توڑا گیا اور اُن کی مخالفت ہوئی ورنہ ایک چھوٹی سے جماعت جن کے آدمیوں کی تعداد بھی کم ہو اور اسلحہ بھی ان کے پاس نہ ہو اور پیدل ہوں اور سواریاں ان کے پاس ۲ گھوڑے یا چند اونٹ ہوں تو ایک ایسی فوج پر غالب ہو جائے جو ہر حوالے سے آمادہ اور تیار ہو، تعداد میں بھی زیادہ ہوں اور اسلحہ بھی ان کے پاس زیادہ ہو اور سوار بھی پیدل بھی، تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ چھوٹی سے جماعت جن کے پاس ظاہری اسباب نہ ہوں تو کس طرح چھوٹی جماعت اس بڑی جماعت کو شکست دے دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ہاتھ درمیان میں تھا اور یہ اللہ ہی کا کام تھا کہ کافروں کو اللہ نے نابود کیا اور مومنوں کو کامیابی ملی اور اُن کے لئے اخروی اجر بھی نصیب ہوا۔ اس لئے مومنوں کو یہ خطاب کیا گیا ہے کہ تم جو کافروں کو قتل کر رہے تھے یہ تم نہیں کر رہے تھے بلکہ اللہ انہیں قتل کر رہا تھا اور اے پیغمبر جب آپ نے ایک مٹھی ریت کی لی اور کافروں کی طرف اسے پھینکا تو یہ آپ نہیں تھے کہ آپ نے وہ کنکر کافروں کی طرف پھینکے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تھا گویا

یہ اللہ ہی پھینک رہا تھا اور پھر اللہ نے فرشتے جو بھیجے وہ اس لئے بھیجے کہ مومنوں کے قدم مضبوط ہوں اور کافر ڈر جائیں۔ یہ سبب ہوا کہ کافروں نے شکست کھائی، وہ قتل ہوئے، قیدی بنے۔

پھر فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے لئے تھی تو یہ مومنوں کا اچھے انداز سے امتحان لیا گیا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ بلاء کا معنی ہم یہاں امتحان لیں اور اگر بلاء کا معنی ہم نعمت لیں تو اس کا اس طرح معنی ہوگا کہ اللہ کی نصرت اس لئے تھی کہ اللہ چاہتا تھا کہ مومنوں کو ایک اور اچھی نعمت سے نوازے اور وہ نعمت کیا تھی؟ وہ نعمت دشمنوں کی نابودی اور کلمہ توحید کی برتری تھی اور یہ کہ مومنین مال غنیمت وصول کرکے مالدار بن جائیں، بے نیاز ہو جائیں، ان کا فقر ختم ہو۔ تو بعد والا جملہ پہلے جملے کی وجہ بتا رہا ہے اور مومنوں کو اگر اللہ تعالیٰ نے نعمت دی ہے تو اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی فریاد کو پہنچا ہے، خدا سننے والا بھی ہے اور ان کے حالات سے واقف و آگاہ بھی ہے۔

پیغام: ہر شخص کو چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کرے اللہ کے کام ہر ایک کو سمجھ نہیں آتے اللہ کی نعمات کا شکر بجالانا چاہیے جنگ بدر کے جو واقعات ہیں ان کو تفصیلی مطالعہ کیا جائے اُن سے عبرت اور درس لیا جائے اور اُسی قسم کی مدد ہر دور میں آسکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ایمان خالص ہو اور اللہ پر ہی بھروسہ ہو، اللہ ہی سے فریاد کی جائے اللہ سے ہی مدد مانگی جائے وہ مدد دیتا ہے اور دعا کو بھی سنتا ہے۔

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

”یہ تو ہو چکا اور بے شک اللہ کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے“۔

کافروں کی ذلت

کافروں نے بڑی منصوبہ بندی کی تھی اور وہ بڑے زعم اور غرور میں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمانوں کا صفایا کرکے آئیں گے وہ تو مدینہ پر چڑھائی کرنے آئے تھے لیکن درمیان میں ہی ان کا ٹاکرا بدر کے مقام پر ہو گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے مکہ کا رُخ کیا اور آپ چاہتے تھے مدینہ کے باہر ہی کافروں کا سامنا کیا جائے اور اس میں آپ نے مشاورت کا عمل بھی کیا اور جیسا کہ پچھلی آیات میں یہ بات آچکی ہے کہ کچھ مسلمانوں کی یہ رائے تھی کہ ہم چالیس آدمیوں والے گروہ کا راستہ روکیں ان کے پاس بہت سارا مال تجارت ہے، ان پر حملہ آور ہو کر مال و متاع حاصل کرلیں۔ بہت تھوڑے مسلمانوں کا یہ مشورہ تھا کہ ہمیں ان کی طرف جانا چاہیے جو ہمارے خلاف مدینہ پر چڑھائی کرنے آرہے ہیں ہم اُن کے خلاف جنگ کریں، ہم اُن کے مقابلے میں نکلیں۔ اللہ کا فرمان بھی یہی تھا تو رسول اللہ ﷺ نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم نے مدینے سے باہر جا کر کافروں کے اس بڑے گروہ کا مقابلہ کرنا ہے ''نفیر'' کا مقابلہ کرنا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ منصوبہ کافروں کا تھا؛ اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے اُن کی تمام منصوبہ بندی کو ناکام بنا دیا اور مومنوں کے لئے فتح اور کامیابی کو یقینی بنا دیا۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

''اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو تمہارا فیصلہ آ چکا، اور اگر باز آؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر پھر یہی کروگے تو ہم بھی پھر یہی کریں گے، اور تمہاری جمعیت ذرا بھی کام

نہیں آئے گی اگرچہ وہ بہت زیادہ ہوں، اور بے شک اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے"۔

مشرکوں سے خطاب

یہ گفتگو مشرکین سے ہے اور اُن کا استہزاء کیا جارہا ہے اور اُن کی کمزوری کو بیان کیا جارہا ہے مشرکوں سے کہا گیا ہے او مشرکو! تم کامیابی کی تلاش میں ہو تو بتحقیق خداوند تبارک و تعالیٰ نے بدر میں تمہارے اوپر حق کو ظاہر کر دیا اور مومنوں کو فتح دی۔ کہا جاتا ہے کہ ابو جہل بدر کے دن اس کوشش میں تھا کہ اس کے لئے کامیابی ہو اور وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا رب ہمارا دین پرانا اور قدیمی ہے اور محمدؐ جو دین لے آئے ہیں وہ نیا دین ہے پس جو دین تیرے لئے محبوب تر ہے اور جس سے تو راضی ہے تو اُسی کی آج مدد کر دے۔ یہاں پر اس کی خواہش کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ بدر میں تمہاری شکست اور مومنوں کی فتح سے مسئلہ واضح ہو گیا کہ حق کس کے ساتھ ہے اور اگر اس جگہ جو کہا گیا ہے کہ مومنوں کے خلاف جو تم سازشیں کر رہے ہو تو ان سے ہاتھ اٹھا لو یہ تمہارے فائدے میں ہے، اگر تم باز نہ آئے اور سازش کرتے رہے اللہ کے خلاف اور اللہ کے رسولؐ کے خلاف منصوبہ بندی کرتے رہے تو پھر ہم بھی اسی طرح کریں گے اور تمہارے اوپر مصیبت اُتاریں گے، آج بھی تم نے دیکھا ہے کہ کس طرح ہم نے تمہارے اوپر تابڑ توڑ حملے کیے اور کس طرح تم رسواء ہوئے۔ تمہاری مکاریاں اور تمہاری سازشوں کو باطل کیا تمہاری شوکت اور تمہاری شان کو خاک میں ملا دیا، تمہارے اوپر ہم نے غلبہ حاصل کیا حالانکہ تمہاری تعداد زیادہ تھی، تمہارے پاس وسائل بھی زیادہ تھے لیکن کسی چیز نے تمہیں فائدہ نہیں دیا کیونکہ خدا مومنین کے ساتھ تھا لہٰذا مومنوں کی اللہ نے مدد کی اور وہ کامیاب ہوئے۔

پیغام: اللہ مومنوں کا مددگار ہے اور مومنوں کو چاہیے کہ وہ کبھی بھی کافروں کے رعب تلے نہ آئیں، کافروں کے لئے ہی شکست مقدر ہے، عزت، عظمت، حرمت اور کامیابی مومنوں کا مقدر ہی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿٢٠﴾

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور حکم کو سن کر اس سے مت پھرو۔" (جو حکم تمہیں ملا ہے اس پر عمل کرو!)۔

اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایمان کا لازمہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت ہے اور ایسا نہ ہو کہ تم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت نہ کرو۔ یہاں مومنوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد عمل ضروری ہے۔ اور اوامر و نواہی جو اللہ نے دیے ہیں جن اعمال کے کرنے کا حکم دیا ہے اور جن سے روکا ہے اسی کے مطابق آپ کو چلنا ہے اسی میں تمہاری دُنیا کی بہتری ہے اور آخرت کی بہتری ہے اور یہ بات غور سے سن لو اور اس میں یہ جو اوامر و نواہی کی بات ہو رہی ہے یہ اس جنگ سے متعلق ہے کہ جنگ کے بارے میں جو بھی حکم اللہ کے رسول کا ہو اسی کو تسلیم کرو، اسی کے مطابق چلو۔ اپنی رائے پر نہ چلو، لیکن اس میں عمومی حکم بھی ہے جو سب کے لئے بھی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا جو فیصلہ ہو مومنوں کو اس کے سامنے سر تسلیم ہونا چاہیے۔

پیغام: ہر مومن کو چاہیے کہ ایمان کا تقاضا پورا کرے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی مخالفت نہ کرے اور ان کے احکام پر عمل کرے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا جبکہ وہ سنتے نہیں''۔

مومنوں کے لئے خطاب

یہاں مومنین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرح تم نہیں بنو کہ جب کلام حق کہا جارہا تھا اور ان کے کانوں میں حق پہنچ گیا تھا تو وہ یہ کہتے تھے کہ ہم نے سن لیا ہے حالانکہ وہ سن نہیں رہے ہوتے تھے جھوٹ بول رہے ہوتے تھے کیونکہ سنتے تو قبول کر لیتے اور اس کے مطابق عمل کرتے، جب قبول نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ اُنھوں نہیں نہیں سنا ہی نہیں! یہاں پہلا معنی کہ ''سمعنا'' ہم نے سن لیا۔ تو یہ ابتداء میں کان میں جو بات آتی ہے تو انسان اسے سنتا ہے لیکن دوسرا جملہ کہ وہ سنتا نہیں ہے تو اس میں مراد یہ ہے کہ وہ تسلیم نہیں کرتے، کانوں میں بات پہنچی لیکن جو کانوں نے سنا اس کو قبول نہیں کیا۔ حق کلام کو قبول کرنے سے جب انکار کریں گے تو گویا کہ جو کچھ ان کے کانوں میں پہنچا ہے اس کو انہوں نے سنا ہی نہیں۔ یہ بھی مشرکین پر ایک قسم کی تعریض ہے یعنی مشرکین کی طرف یہ ہے کہ اہل مکہ کی ایک بڑی تعداد تھی جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے لیکن ان کے دل شرک سے خالی نہیں ہوئے تھے اور اسی لئے کہا گیا کہ جب وہ سنتے ہیں لیکن اطاعت نہیں کرتے تو ایسا ہے کہ انہوں نے سنا ہی نہیں ہے۔ ظاہری تصدیق کافی نہیں ہے، ایمان وہی کافی ہوگا جس میں اطاعت ہو۔ اگر ظاہری اقرار کرلیں اور ایمان لے آئیں لیکن اطاعت نہ کریں تو اس ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے یہ پھر سننا یا نہ سننا برابر ہے تصدیق کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔

پیغام: جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے اس پر ایمان لانے کا ثبوت عمل کے ساتھ دینا چاہیے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

"بے شک سب جانوروں میں سے بدتر (جانور) اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے"۔

کافروں کی مذمت

اس آیت میں بھی کافروں کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ کان تو رکھتے ہیں لیکن کانوں سے سنتے نہیں ہیں اور زبان تو رکھتے ہیں لیکن زبان سے حق کا اقرار نہیں کرتے تو یہ بدترین موجودات میں سے ہیں، جو چلنے پھرنے کی صلاحیت ان میں ہے لیکن گویا کہ وہ حق بات سننے کے لئے آمادہ نہیں گویا وہ بہرے ہیں اور حق کی زبان سے تصدیق نہیں کرتے گویا وہ گونگے ہیں یا ان کی زبانیں لال ہیں وہ بالکل سوچتے بھی نہیں ہیں وہ سوچ سے عاری ہیں۔ اسی وجہ سے جب سوچتے نہیں تو حق کو قبول ہی نہیں کرتے تو ان کے لئے کوئی خیر نہیں ہے اور یہ بدترین خلائق ہیں جو حق کو قبول نہیں کرتے۔

وَ لَوۡ عَلِمَ اللّٰہُ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا لَّاَسۡمَعَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ اَسۡمَعَہُمۡ لَتَوَلَّوۡا وَّ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾

"اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیتا، اور اگر اللہ ان کو سنا دے تو وہ منہ پھیر کر بھاگیں گے"۔

کافروں کی حالت

گزشتہ آیت میں کافروں کی بات ہو رہی تھی کہ وہ گونگے اور بہرے ہیں اور کلمہ حق کو سنتے بھی نہیں ہیں اور اُس کی تصدیق بھی نہیں کرتے؛ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں دیکھا ہے کہ ان میں کوئی خیر کی توقع ہے ہی نہیں، اگر قطعی طور پر ان میں خیر ہوتی تو اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کی خبر ہوتی اور وہ پھر کامیاب بھی ہوتے کہ حق کو سنتے

بھی اور حق کو قبول بھی کرتے اس کی تصدیق بھی کرتے۔ اگر اللہ نے ان کو سننے کی نعمت عطا کی ہے تو پھر بھی انہوں نے اس نعمت سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور حق کی دعوت کو نہیں سنا اور اس کی تصدیق نہیں کی اور اس سے منہ موڑ لیا ہے تو پھر یہ زمین پر چلنے والوں میں بدترین ہیں یا خیر سے مراد باطنی حسن و باطنی اچھائی ہے کہ جس کی وجہ سے انسان حق قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور کفار میں یہ صلاحیت اور یہ خوبی موجود نہیں تھی اس کی نفی یہاں پر کی گئی ہے۔

یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر ان میں کچھ بھی حق کو قبول کرنے کی آمادگی موجود ہوتی تو اللہ انہیں ضرور بات کو سنوا دیتا اور وہ خیر کو پا لیتے۔ اب جبکہ اللہ کو معلوم ہے کہ یہ حق کو قبول کرنے والے نہیں تو اللہ کو سنوا بھی دے تو یہ منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ یہ ان کی حالت ہے کہ یہ انحراف و باطل پر قائم ہو چکے ہیں اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۞۲۴

”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا حکم مانو جس وقت تمہیں اس کام کی طرف بلائے جس میں تمہاری زندگی ہے، اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جاتا ہے اور بے شک اسی کی طرف اکٹھے کر کے پلٹائے جاؤ گے“۔

مومنوں کو اطاعت کی دعوت

آیت: ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو تو یہ اسی دعوت کی تاکید ہے۔ مومنوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی

دعوت پر لبیک کہو اور یہ دعوت اللہ اور اللہ کے رسولؐ ایسی ہے کہ انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے، فناء سے نجات دیتی ہے اور اسے زندگی عطا کرتی ہے، دنیاوی اور اخروی بھی۔

حیات کا آخری مرحلہ اور نعمت کا کمال

حیات کاآخری مرحلہ نعمت کا کمال ہے اور زندگی کے ماوراء بطلان کے اور کچھ نہیں ہے، حیات کا اثر شعور و ارادہ ہے اور ہدایت الٰہی انسان کو سعادت اور اس کی خیر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے جس طرح اس کی فطرت بھی اسی کا رجحان رکھتی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ تکوینی ہدایت اور اس کے ساتھ تشریعی ہدایت کے ذریعے انسان کو خیر اور اس کے وجودی منافع کی طرف راہنمائی دیتا ہے اور جب کوئی گمراہ ہوتا ہے تو یہ خیال نہ کرے کہ انسانی فطرت اور ہدایت الٰہی گمراہی کی طرف کھینچ کر لے گئی ہے بلکہ وہ اپنی فطرت سے غافل ہوا اور اس نے اپنی عقل کو پاؤں تلے روندا اور نفسانی خواہش میں غرق ہوا اور شیطان کے لشکریوں نے ان کے لئے جو خوبصورتی بنا کر دُنیا کی رنگینیاں پیش کر دیں تو وہ اس کی پیروی میں چلا گیا اور اس طرح وہ گمراہ ہوا۔

حیات اور زندگی کیا ہے، یہ وہی دین حق کی دعوت ہے اور اس دنیاوی زندگی کے ماوراء کیا ہے اور دُنیاوی زندگی ہے کیا۔ مختصر سا مال ہے اور جو دھوکے دینا والا ہے تو اس کے پیچھے تو اخروی زندگی ہے اور اخروی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرار دیا ہے جو زمین میں فساد نہیں چاہتے، زمین میں بڑا نہیں بننا چاہتے۔

"جو آخرت کا گھر ہے ہم نے اسے ان لوگوں کے لئے تیار کر رکھا ہے جو ملک میں ظلم و فساد کا ارادہ نہیں رکھتے اور انجام نیک تو پرہیزگاروں ہی کا ہے" (سورہ قصص کی آیت: ۸۳)

یہ جو کہا گیا کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اس حلول سے کیا مراد ہے؟ یہ کسی چیز کے درمیان میں خلل ڈالنا ہوتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کے وجود کو بنانے والا ہے اور اُس کے اجزاء پر محیط ہے اور اُس میں پورے تصرف کی قدرت

اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو انسان کے درمیان اور اس کے وجود کا ہر ہر جزو اس میں اللہ حائل ہے یعنی اس کے درمیان اور دل کے درمیان اور اس کے درمیان اور اس کی آنکھ کے درمیان، اس کے نفس کے درمیان، اس کے کان کے درمیان۔ خدا ہر جگہ موجود ہے، ہر جگہ اللہ کے دائرہ قدرت کے تحت ہے۔ اس کی جو بھی تاثیر ہے وہ اللہ کی عطاء کردہ ہے۔ یہ سب اس طرح ہے کہ اس کا تصرف اللہ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہی ان سب چیزوں کی ایجاد کرنے والا ہے، وہی سب کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مالک بنایا ہے جیسے وہ چاہے ان کو استعمال میں لے آئے لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ ان سب کا حقیقی مالک ہے۔ خدا انسان اور اس کی ذات کے درمیان انسان اور اس کی ذات کے توابع جتنے بھی اس کے آثار ہیں ان سب میں حائل ہے اور فرمایا کہ

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾ (سورہ قٓ، آیت: ١٦)

"ہم رگ حیات سے بھی زیادہ قریب ہیں"۔

تو یہ نزدیکی اور حائل ہونا ہم معنی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا تصرف ہر جگہ موجود ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا مکمل احاطہ ہے انسان کے پورے وجود پر اللہ کا تصرف ہے اس لئے کہا جا رہا ہے کہ خدا اور اللہ کے رسولؐ کی جو دعوت ہے اُس کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ رہے اور اس کا ہر عذر اس کی بیخ کنی ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ جان لو کہ سب لوگوں نے اللہ کی طرف محشور ہونا ہے لہٰذا ہوشیار رہو اور عمل کرو، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، جانو کہ جب حشر ہوگا، بعث ہوگا سارے مردے اُٹھیں گے تو اس وقت ملک تنہا اللہ کا ہوگا اس کا کوئی شریک نہیں ہوگا۔

"جس روز وہ نکل پڑیں گے ان کی کوئی چیز خدا سے مخفی نہ رہے گی آج کس کی بادشاہت ہے؟ خدا کی ہے جو اکیلا اور غالب ہے" (سورہ غافر، آیت: ١٦)

تو اس بات کو انسان یاد رکھے، وہ دن جہاں ساری شکلی اور ظاہری ملکیتیں باطل ہو جائیں، سارے علل و اسباب ختم ہو جائیں گے اور تمام وسائل منقطع ہو جائیں گے اور ان وسائل کا جو خالق ہے جو مالک ہے وہ خود ان سب کو ختم کر دے گا، کوئی چیز بھی اس دن انسان کو اپنے رب سے بے نیاز نہیں کر سکتی، اس کے تمام اعمال و افعال، انسان کے نفسانی حالات جیسے ایمان، منافقت، توحید، شرک؛ ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو آگاہی ہے اور یہ جو دو جملے ہیں یہ استجیبوا للہ، اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی دعوت کو قبول کرو پھر اس کی علت اور وجہ بیان کی جا رہی ہے حالانکہ اللہ انسان کے دل میں اور اس کے اصل میں حائل ہے یعنی موجود ہے اور انسان نے آخرت میں خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ جب ایسا ہے تو وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی دعوت کو قبول کرے اور اسے رد نہیں کرے، اسی میں اس کی حیات ہے۔

پیغام: اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی دعوت حق ہے اسے قبول کرنا چاہیے اور قبولیت کی دلیل عمل سے دینی چاہیے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾

"اور تم اس فتنہ سے بچتے رہو جو تم میں سے خاص ظالموں پر ہی نہ پڑے گا، اور جان لو کہ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

ظالموں کا انجام

اس آیت میں سارے مومنوں کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ فتنہ وہ آزمائش جو ستمگاروں کے لئے ہے، ظالموں کے لئے ہے، کافروں اور مشرکوں کے ساتھ مربوط نہیں۔ اس سے ڈرایا جا رہا ہے کہ یہ فتنہ تم سب کو نا اپنے گھیرے میں لے لے، پس واجب ہے کہ سب امر

بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دیں اور اس فتنہ کو جڑ سے اکھیڑ پھینکیں اور اندرونی اختلافات کو وحدت میں تبدیل کردیں۔ اس آیت میں مومنوں کو خبردار کیا جارہا ہے کہ فرقہ فرقہ ہونا تمہیں ختم کرکے رکھ دے گا اور اگر ایک ہوگے تو تم غالب رہوگے اور تمام امور کی بھاگ ڈور تمہارے ہاتھ میں آجائے گی اور یہ بات طے شدہ ہے کہ ایسا غلبہ فساد پر غلبہ ہے نہ اس جگہ کلمہ حق کے باطل پر غالب آجانا مراد نہیں ہے۔

دین حنیف جو اللہ کا دین ہے، اللہ تعالیٰ نے دین حنیف میں سارے مسلمان شریک ہیں لہٰذا اس فتنے سے مراد اختلاف اور تفرقہ اور اُمت کے درمیان اختلاف ہے اور اس کے اثرات تمام لوگوں تک پہنچیں گے۔ اختلاف ایسے امر کے بارے میں کہ جس کی حقیقت سے پوری اُمت آگاہ ہے۔ اُمت سمجھتی ہے اس کا فائدہ کیا ہے اور نقصان کیا ہے۔ جب ایک گروہ اس کو قبول نہیں کرتا، انحراف کرتا ہے تو وہ آگاہ کے ہوتے ہوئے ظلم کرتا ہے اور منکر کو بجالاتا ہے۔ ایک ایسے ناپسندیدہ عمل کو انجام دیتا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ یہ تو ایسی جماعت ہیں جس نے حق قبول کیا اور اُس کی حقیقت سے بھی واقف ہے، دوسرے کو منکر سے روکتے نہیں تو اس کے جو برے اثرات ہیں سب کو پہنچیں گے کچھ تو وہ ہیں کہ جو حق کو قبول ہی نہیں کرتے اور منکرات بجالاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو حقیقت کو سمجھ رہے ہیں لیکن منکرات اور برائیاں انجام دیتے ہیں، دوسروں کو برائیوں سے روکتے نہیں تو ایسا رویہ بڑا ظلم ہے کہ کوئی اسلامی حکومت کے آئین کو توڑ دے یا ناحق طور پر مملکتی امور کی باگ ڈور سنبھالنا چاہے اور قرآن و سنت سے جو قطعی احکام ثابت ہیں اُن کو پامال کرے، ایسا کرنا سب سے بڑا ظلم ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو، ایک گروہ اُٹھے اور اس حکومت کو پامال کردے۔ ایسی صورت میں اُمت کا فریضہ تو یہ بنتا ہے کہ وہ اس ظلم کے مقابلے میں کھڑی ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے اُمت اسلامی جب ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھے اور اُس ظالم کا ہاتھ نہ روکے تو اللہ کا عذاب انہیں شامل ہوگا۔

خداوند تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ بات سمجھ لو کہ اللہ شدید العقاب ہے، فقط عذاب ان کو نہیں ملے گا جنہوں نے حق قبول نہیں کیا اور ظلم کر کے غلبہ حاصل کیا ہے بلکہ ان کو بھی عذاب گھیرے میں لے لے گا اور اس ظلم کے اثرات ان پر بھی آئیں گے جنہوں نے ظلم کرنے والوں کے سامنے رکاوٹ کھڑی نہیں کی اور انہیں ظلم سے نہیں روکا اور اس کے منفی اثرات تمام مومنین اور پوری اُمت کو بھگتنا پڑیں گے لہٰذا مومنوں پر واجب ہے کہ وہ چوکنے رہیں اور صدر اسلام میں جو بہت سارے فتنے اٹھے اور اس کا نقصان ہوا وہ بھی کسی فتنے میں نہ جا پڑیں اور اس قسم کے فتنے اُمت میں مکرر اور بار بار ہو رہے ہیں۔ اس بات سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ایک گروہ ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور ظلم کے ذریعے غلبہ حاصل کر لیا۔ ایک گروہ وہ ہے جو ان کے ظلم پر خاموش رہا تو اس کو بھی سزا ملے گی کیونکہ انہوں نے ظالموں کے سامنے رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ فتنے سے بچنے کا مطلب ہے ظلم کرنے والے ہیں ان کا ظلم کا ہاتھ کاٹو، ان کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ اور تنبیہ کرو اور منکرات سے انہیں روکو۔ اگر تم ظالموں کا مقابلہ نہیں کرو گے وت پھر اس ظلم کے جو برے اثرات ہیں وہ سب کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے اور اس کے برے نتایج سب کو بھگتنا پڑیں گے لہٰذا خود کو اس سے بچاؤ۔

اس آیت میں دو باتیں ہیں:

(۱) افتراق سے بچنے کے لئے اشارہ کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا ظلم سے نفرت اور ظالموں کے مقابلے میں آواز بلند کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ وضاحت بھی دے دی ہے کہ اللہ کا عذاب فقط ان کے لئے نہیں ہے جنہوں نے حق کو قبول نہیں کیا یا جنہوں نے ظلم سے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ اللہ کا عذاب ان کے لئے بھی ہے جو اس ظلم پر چپ رہے اور ان ظالموں کو ظلم سے روکا نہیں۔

پیغام: حق کے پیرو بنو، حق کا ساتھ دو ظالموں کا ساتھ نہ دو۔ ظلم سے بچو، خود ظلم نہ کرو اور دوسروں کو ظلم نہ کرنے دو۔

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶

''اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے تم زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک لیں پھر اس نے تمہیں ٹھکانا بنا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت دی اور تمہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم شکر گذار بنو''۔

اللہ کے احسان کا شکر

اس آیت میں اللہ نے اپنی نعمات اور احسانات کو بیان کیا ہے۔ ''استضعاف'' کمزور ہونا، کسی کو کمزور قرار دینا، کسی کو ذلیل قرار دینا، کسی کی توہین کرنا، کسی سے بے توجہی، کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا۔ مومنین جب کمزور تھے اور ہجرت سے پہلے کے حالات تھے مسلمان مکہ میں محصور تھے اور عرب مشرکوں کے بڑے بڑے سردار موجود تھے ان سے مومنین خوفزدہ تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں انہیں جگہ دی اور مہاجر مسلمان، انصار کے ساتھ مل کر تعداد میں بڑھ گئے پھر جنگ بدر میں بظاہر ان گروہ تو چھوٹا تھا لیکن اللہ نے مدد دی اور ان کو کافروں کی بڑی جماعت پر جو ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی ان پر غلبہ دے دیا اور جنگی غنائم بھی انہیں نصیب ہوئے جس سے ان کی مالی مشکلات حل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے طیب اور اچھی چیزیں حلال کیں تاکہ وہ شکر گزار بنیں۔

یہ اللہ کے مومنین پر احسانات ہیں جو زیادہ تر مہاجرین کے لئے تھے لیکن اللہ نے مہاجرین اور انصار دونوں پر یہ احسان قرار دیا کیونکہ اُمت مسلمہ اُمت واحدہ ہے، جنگ بدر میں جو کامیابی کی نعمت تھی وہ دونوں کے لئے تھی۔ بہرحال اس آیت میں خصوصی طور پر

اسلام کے آغاز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی حالت کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی نعمات کو یاد کر کے ان کا شکر بجالاؤ، ناشکری نہ کرو۔

پیغام: انسان ہمیشہ متوجہ رہے کہ اللہ نے اس پر کون کون سے انعامات کئے ہیں اور اسے اللہ کی نعمات پر شاکر ہونا چاہئے، اللہ کی نعمات کا کفران نہیں کرنا چاہیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۷﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں بھی خیانت نہ کیا کرو جبکہ تم جانتے ہو''۔

امانت داری

اس آیت میں امانت داری کی اہمیت بتائی جا رہی ہے، خیانت سے روکا جا رہا ہے۔ امانت، کسی کا مال آپ کے پاس ہے یا کسی کا راز آپ کے پاس ہے یا کسی نے کوئی وصیت کی ہے تو یہ ایک قسم کا حق ہے۔ اس حق کی حفاظت ہونی چاہیے اور اس میں خیانت نہیں ہونی چاہیے، اسی طرح سے پیمان اور عہد کو توڑنا بھی خیانت میں شمار ہوتا ہے یہ منافقت کے معنی میں بھی ہے۔ اس خیانت سے منع کیا گیا ہے کہ تم اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے ساتھ خیانت کیا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے جو احکام بتائے ہیں اور تم سے جو عہد و پیمان لیا گیا ہے اُن کی اطاعت کرو، اگر اطاعت نہیں کروگے تو تم خیانت کار ہو جاؤ گے۔

سوال: اللہ کی امانت لوگوں کے پاس کیا ہے؟ اس سے مراد شرعی احکام و فرائض ہیں اور رسول اللہؐ کی امانت آپ کی سیرت اور سنت ہے اس کی خیانت ان کو چھوڑ دینا، سنت

رسولؐ کو چھوڑ دینا اور اموال اور اسرار جو لوگوں کے ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں ان میں بھی خیانت نہیں کرنی چاہیے۔ بعض امانتوں میں اللہ، اللہ کا رسولؐ اور مومنین شریک ہیں یہ وہ امور ہیں جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور رسول اللہؐ نے انکو نافذ کیا ہے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے جیسے سیاسی دستورات ہیں اور جہاد سے مربوط اوامر ہیں، جنگی اسرار ہیں، اگر ان کو فاش کروگے تو حکومت اسلامی کو اس کا نقصان ہوگا، مومنین کا نقصان ہوگا اور کچھ موارد خیانت کرنے کے وہ ہیں جیسے اُمت اسلامی شرعی ذمہ داریوں سے فرار کرے اور اُمت اسلام پر واجب ہے کہ اپنی جان و مال اور اولاد سمیت سب کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے جو مقاصد قرار دیے ہیں اس کی خاطر جہاد کریں اور اُن میں خیانت نہ کریں، یعنی ان کو عملی جامہ پہنائیں اور اگر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی امانت خود اپنی امانت ہے اس میں خیانت اپنے ساتھ خیانت ہے عقل اور فطرت سلیم خیانت کو قبول نہیں کرتی۔

یہ جملہ "و انتم تعلمون" انسان کی فطرت کو بیدار کرنے کے لئے ہے۔ مسلمانوں کے وجدان کو جگانے کرنے کے لئے ہے کہ انسانی فطرت خیانت کو پسند نہیں کرتی، عقل بھی خیانت کو پسند نہیں کرتا لہٰذا کسی بھی حوالے سے خیانت نہیں ہونی چاہیے۔ اس آیت میں واضح کر دیا گیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے جو دستورات ہیں اُن کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اگر عمل نہیں کروگے تو اللہ کے ساتھ خیانت کر رہے ہو۔ رسول اللہؐ کی سیرت بہترین اسوہ ہے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے، اگر عمل نہیں کریں گے تو گویا ہم نے رسول اللہؐ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ مومنین کے لیے جہاد کا حکم ہے اگر جہاد میں نہیں جاتے تو گویا اس حکم کے حوالے سے خیانت کی ہے۔ مومنین آپس میں ایک دوسرے کے پاس مال رکھتے ہیں تو اس مال کو واپس کر دینا چاہیے۔ کسی کی ناموس میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔ جنگی اسرار میں خیانت نہ کی جائے۔ کسی نے راز کی بات آپ سے کہی ہے اور آپ نے عہد کیا ہے کہ کسی کو

وہ راز نہیں بتاؤ گا تو پھر وہ راز کسی کو نہیں بتانا چاہیے۔ یہ سب امور اس آیت کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں۔

پیغام: اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل پیرا ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ مومنین وفادار رہیں اور اگر کسی سے کوئی عہد و پیمان باندھیں تو اس کی مخالفت نہ کریں اور اللہ سے جو عہد و پیمان باندھا ہے اور ایمان لائے ہیں تو اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل کریں بے عملی کرکے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کریں۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾

''اور یہ جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے، اور بے شک اللہ کے ہاں تو بڑا اجر ہے''۔

اموال اور اولاد کی بات

ایسے لگتا ہے کہ یہ آیت پچھلی آیت کے مطلب کا تتمہ ہے۔ کچھ مسلمان ایسے تھے جو سیاسی اور جنگی اسرار مشرکوں کے پاس جاکر بیان کر دیتے تھے۔ اللہ نے ان کو اس کام سے منع کیا کیونکہ جو مسلمان مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آگئے تھے مکہ میں اپنے اموال اور اولادیں چھوڑ آئے تھے انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں وہ مشرکین ان کو نقصان نہ پہنچائیں تو اس کی خاطر مشرکین کو راز کی باتیں بتا دیتے تھے تاکہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو اللہ فرما رہا ہے یاد رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد فتنے کے سواء کچھ نہیں۔ یہ آزمائش ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ

کے پاس بڑا اجر ہے اور وہ اجر تمہارے اموال اور اولاد سے بڑا ہے۔ لہٰذا اپنی اولاد اور مال کے ضائع ہونے سے پریشان نہ ہو اور نہ ہی اس کا اپنے دل میں کوئی رنج اور ملال رکھیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہوگے تو اللہ تمہیں فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

حق و باطل میں امتیاز کی قوت

''تقویٰ'' کا معنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی پابندی کرنا۔ ''فرقان'' حق و باطل میں جدائی ڈالنا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے مومنین کو خطاب کیا ہے کہ تقویٰ تمہارے اندر ہونا چاہیے۔ اللہ کے تمام احکامات کی پابندی کرو ایسا کروگے تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں اس بات کی قوت، ہمت دے دے گا کہ تم حق اور باطل میں جدائی ڈال سکو اور حق و باطل میں تمیز کرنا، عقیدے کے مرحلے میں ہو یا ہدایت اور گمراہی کے حوالے سے ہو یا عمل کے مرحلے میں ہو تم اطاعت اور معصیت میں جدائی ڈال سکو۔ کیا اطاعت ہے اور کیا معصیت ہے، رائے دینے کے حوالے سے کیا صحیح سوچ ہے یا کیا غلط سوچ، تمام موارد میں حق و باطل میں تمیز کرنا شجرہ تقویٰ کے ثمرات ہیں۔ اللہ فرمارہا ہے اے مومنو! تم تقویٰ کی کیفیت اپنے اندر پیدا کرو تو یہ سب کچھ تمہیں حاصل ہوگا۔

پھر فرمایا کہ فقط یہ ہی نہیں ہے بلکہ اللہ تمہیں صلاحیت، ہمت اور قوت دے گا کہ حق و باطل میں امتیاز کر سکو۔ اللہ تمہاری برائیاں محو کر دے گا اور تمہارے گناہوں پر پردہ ڈال

دے گا۔ اللہ تمہیں مغفرت عطا کرے گا، یہ اللہ کا بڑا فضل ہے، اللہ اہل تقویٰ کے لیے آسمانی اور زمینی برکات عطاء کرتا ہے۔

پیغام: تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور تقویٰ کے ثمرات پر نظر رہنی چاہیے کیونکہ اگر تقویٰ اختیار کروگے تو گناہوں سے معافی مل جائے گی اور آسمانی اور زمینی برکات نصیب ہوں گی۔

وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

''اور جب کافر تیرے متعلق تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تمہیں قید کردیں یا تمہیں قتل کردیں یا تمہیں دیس بدر کردیں، وہ اپنی تدابیر کررہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے''۔

کافروں کی سازشیں

اس آیت میں کافروں کی سازشوں کی جانب اشارہ ہے۔ مکر کا معنی حیلہ، چکر بازی اور سازش تیار کرنا کہ کسی دوسرے کو اس کے ہدف سے پھیرنا ہے۔ ''اثبات'' کا معنی کسی کو محبوس کرنا، پکڑ کر رکھنا۔ قریش مکہ نے سازش تیاز کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو قیدی بنائیں گے یا انہیں قتل کردیں گے۔ حضور پاک ﷺ کو اللہ تعالیٰ بتارہا ہے کہ انہوں نے سازش تیار کی ہے کہ تیری دعوت کو باطل کردیں اور اپنی سازشوں کے ذریعے چاہ رہے ہیں کہ تجھے قیدی بنادیں، تجھے قتل کردیں یا تجھے شہر مکہ سے باہر نکال دیں۔ اس طرح وہ تیری دعوت پر غالب آجائیں اور تجھے شکست دے دیں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے پیچھے تھا، اللہ ان سب پر

محیط ہے اور ان کے اعمال پر اللہ کی نظر ہے۔ اللہ نے ان کی سازشوں کو باطل کیا اس طرح وہ اپنے ہدف میں کامیاب نہیں ہوئے۔[1]

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾

"اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور اگر ہم چاہیں تو اس کے برابر (ایسی باتیں) ہم بھی کہہ دیں کہ اس میں پہلوں کے قصے کے سوا اور کچھ نہیں"۔

آیات الٰہی کی تلاوت پر کافروں کا رد عمل

آیات الٰہی کو کافر سنتے تھے لیکن اس پر ان کا جو رد عمل ہوتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ باتیں خرافات ہیں،۔ ماضی کے قصے اور افسانے ہیں۔ "اساطیر" سیطرہ کی جمع ہے جو خرافات اور افسانہ کو کہتے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اللہ فرما رہا ہے یہ لوگ جب ہماری آیات "جن میں کوئی شک نہیں" کو سنتے تو بڑی بے توجہی اور اہانت آمیز لہجے کے ساتھ کہتے کہ ٹھیک ہے ہم نے یہ سب باتیں سن لی ہیں یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں، یہ وہی پرانے قصے

[1] ۔ اس آیت کے شان نزول بارے بتایا گیا ہے کہ یہ شب ہجرت نبی اکرم ﷺ مکے سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے اور مکہ کو چھوڑ دیا۔ اس حوالے سے حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اپنے بستر پر لٹا دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جان کا فدیہ آپ کے لئے دیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مشرکین مکہ کی سازش سے آپ کو محفوظ رکھا اور وہ آپؐ کی جان کو نقصان نہیں پہنچا سکے اور نہ ہی وہ آپؐ کو قیدی بنا سکے۔ اس طرح وہ آپ کی دعوت کو باطل بھی نہیں کر سکے۔ مشرکین ناکام ہوئے، ان کی ساری تدبیریں ناکارہ ہوئیں۔ (مترجم)

کہانیاں ہیں۔ اگر ہم بھی چاہیں تو ہم بھی اس قسم کے قصے کہانیاں گھڑ سکتے ہیں۔ مشرکین اس طرح ان آیات کا مذاق اڑاتے تھے۔

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ دین تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ''۔

عذاب اُتارنے کی درخواست

کافروں کی ایسی حالت تھی کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سنتے وہ اسے قبول کرنے کی بجائے یہ کہتے کہ اگر یہ جو دین تم لائے ہو اللہ کی طرف سے ہے اور حق ہے، اس کے علاوہ کوئی اور حق نہیں تو پھر وہ آسمان کی طرف رخ کرکے کہتے اے اللہ اگر یہی دین ہے تو پھر آسمان سے ہمارے اوپر پتھر برسیں یا ہمیں دردناک عذاب ہو، ان سے ہمیں مطلع کر دے۔ احتمال ہے کہ مشرکین یا بت پرستوں کی جانب سے ایسی بات نہ ہو کیونکہ مشرکین اللہ اور آسمانی آیات کے نزول کا عقیدہ رکھتے تھے لہٰذا ایسی بات کہنے والے یا تو مرد ہیں جو اسلام سے پھر گئے یا وہ اہل کتاب ہیں جو ایک آسمانی دین کے حق کا عقیدہ رکھتے تھے لیکن دین اسلام کو نہیں مانتے تھے لہٰذا وہ یہ کہتے تھے کہ اگر یہ دین برحق ہے اور جس دین پر ہم تھے وہ حق نہیں تو آسمان سے کوئی پتھر ہمارے اوپر برسے۔

روایات میں حارث بن نوفل فہری کے حوالے سے آیا ہے کہ جب مولا علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان ہو گیا اور اُس نے اس بارے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر دیا ہے اور اُن کی ولایت کا اعلان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ

کے بعد علی علیہ السلام مومنین کے ولی ہیں اور ان کی دوستی فرض ہے اور اُن کی ولایت کو نہ ماننے والے نقصان میں ہوں گے تو وہ اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر مدینہ آیا اور اس نے مسجد میں آکر رسول اللہ ﷺ سے یہ جملے کہے کہ جو بات آپ نے کہی ہے اور ہمارے اوپر حضرت علی علیہ السلام کو حاکم اور ولی بنایا ہے، اگر یہ بات سچ ہے اور حق ہے تو پھر آسمان سے ایک پتھر آئے یا کوئی اور عذاب آئے۔ تو جیسے ہی وہ مسجد سے باہر جاتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کے سر پر پتھر آکر گرتا ہے اور وہ فی النار اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ آیت اس واقعہ کی مناسبت سے آئی ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳

"اور اللہ ایسا نہ کرے گا کہ انہیں تیرے ہوتے ہوئے عذاب دے، اور اللہ عذاب کرنے والا نہیں جبکہ وہ استغفار کرتے ہوں"۔

عذاب الٰہی کے بارے

اس آیت میں ایک بات تو یہ بتائی جا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ شان ہے۔ اللہ کا اپنے حبیب ﷺ کو خطاب ہے کہ اے میرے پیارے، جب تک تو ان کے درمیان موجود ہے تو تیری موجودگی میں میں انہیں عذاب میں مبتلا نہیں کروں گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب توں اس دُنیا سے ہمارے پاس آجائے گا تو تیرے بعد اگر یہ لوگ استغفار کا عمل جاری رکھیں گے تو اس استغفار کی وجہ سے میں ان پر عذاب نہیں اُتاروں گا جیسا کہ پچھلی اُمتوں پر عذاب آتا رہا اور وہ اُمتیں بالکل ختم ہوتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی اُمت کو یہ شرف دیا ہے حضور پاک ﷺ کی وجہ

سے اور حضور پاک ﷺ کی یہ عظمت یہاں بیان ہوئی ہے کہ دُنیاوی عذاب جیسے پچھلی اُمتوں کے لئے تھا تو آپ کی موجودگی میں یہ نا تو مسخ ہوں گے نا ان پر کوئی اور عذاب آئے گا کہ جس وجہ سے یہ نابود ہو جائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے لئے تیری خاطر استغفار کا عمل قرار دیا ہے، اگر یہ استغفار کریں گے اور اپنے گناہوں کے لئے طلب مغفرت کرتے رہیں گے تو بھی ان پر عذاب نہیں آئے گا۔ اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اگر یہ لوگ تیرے بعد طلب مغفرت نہیں کریں گے اور گناہوں میں اس طرح غرق ہو جائیں گے کہ اللہ کو بالکل بھلا دیں گے تو ان پر عذاب آجائے گا۔

پیغام: ہمیں اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیے، استغفار کا عمل جاری رکھنا چاہیے، استغفار بہت بڑی عبادت ہے، خود حضور پاک ﷺ بھی نماز عصر کے بعد ستر مرتبہ استغفار کرتے تھے صبح کو بھی کرتے تھے ستر کا عدد وارد ہوا ہے اور استغفار کے بارے میں بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ استغفار کا عمل جاری رکھنا چاہیے اور استغفار کیلئے بہت ساری عبارتیں ہیں جو دعاؤں کی کتابوں میں موجود ہیں، کسی بھی عبارت سے استغفار کیا جا سکتا ہے۔ عام جملہ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ ہے، تنہا استغفر اللہ بھی ہے۔ بہر حال استغفار کے عمل کی بہت زیادہ اہمیت ہے، اسے ہر صورت انجام دیا جائے۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٣٤

"اور اللہ انہیں عذاب کیوں نہ دے جبکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس کے اہل نہیں ہیں، اس کے اہل تو پرہیزگار ہی ہیں لیکن ان میں سے اکثر نہیں سمجھتے"۔

مسجد الحرام سے روکنا

اس جگہ تعجب اور حیرت کے ساتھ سوال کیا جارہا ہے کہ کون سی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے خدا کا عذاب ان پر نہیں آیا جبکہ وہ مسجد الحرام کی زیارت سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اجازت نہیں دیتے کہ مومنین مسجد الحرام میں داخل ہوں جبکہ وہ مسجد کے متولی نہیں اور نہ ہی مسجد الحرام کا اختیار ان کے پاس ہے کیونکہ مسجد الحرام کی بنیاد تقویٰ پر ہوئی ہے اور متقین ہی مسجد کے متولی اور وارث ہیں۔ یہ جملہ ایک قسم کی خبر ہے، جملہ انشائی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد فرمایا کہ ان میں سے زیادہ لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ مسجد الحرام کی ولایت اور تولیت اور نگہداری متقین کے پاس ہے کیونکہ دین اور عقیدہ کی بنیاد پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ یہ رشتہ داریوں کی بنیاد نہیں ہوا ہے اور نہ ہی خاندانی وراثت ہے۔ مگر ایسا ہو کہ خونی اور عقیدتی نسبتیں دونوں اکٹھی ہو جائیں یعنی ایمان بھی ہو اور خونی سلسلہ بھی ہو تو اس وقت تولیت کا مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن فقط رشتے داریوں والی بات تولیف کا سبب نہیں ہے۔ عذاب اس جگہ یا تو اس سے مراد مارا جانا ہے یا اس سے بھی عام معنی مراد ہے تو کلی طور پر یہ بات ہے کہ عذاب نہ آنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی ہے؛ جواب پہلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے۔

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۵

”اور کعبہ کے پاس ان کی نماز سوائے سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے اور کچھ نہیں تھی، سو عذاب چکھو اس سبب سے کہ تم کفر کرتے تھے“۔

بیت اللہ کے سامنے کفار کی نماز

''مُکَآءً'' کا معنی سیٹی بجانا، آواز کسنا، ''تَصۡدِیَۃً'' کا معنی تالی بجانا۔ مشرکین اللہ کے گھر میں مومنین کے آنے کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور مومنین کو وہاں پر نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ خود ان کی خود اپنی نماز کیا تھی؟ وہ نماز تو نہیں تھی تو وہ جو دعا کرتے تھے وہ کیا تھی؟ اللہ کے گھر کے گرد گھومنا، سیٹیاں بجانا، تالیاں بجانا۔ ابھی جب ایسا ہے کہ ایک تو وہ ایمان نہیں لائے اور پھر مومنین کو کعبۃ اللہ میں آکر عبادت بھی نہیں کرنے دیتے اور خود کعبۃ اللہ کی توہین کرتے ہیں۔ پہلے غیب کی ضمیر سے بات ہو رہی تھی کہ وہ جو ایسا کرتے ہیں ان کی صلوٰۃ دعا کے معنی میں ہے۔ ان کی دعا کرنا یا پکار کعبہ کے گرد سیٹی بجانا اور تالیاں بجانا تھا۔ پھر غیبت سے خطاب کی طرف بات کو پلٹا کر کہا ہے کہ اب تم اس عمل کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔ وہ طریقہ تخاطب اس بات کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس وقت بھی اللہ کے گھر میں داخل ہونے کیلئے رکاوٹ کھڑی کر دی جائے کہ وہاں عبادت نہ کر سکے اور اللہ کا گھر متروک ہو جائے تو اللہ اس جرم پر پکڑے گا اور ان کے لئے عذاب الٰہی آئے گا۔

حضرت علی علیہ السلام کی وصیتوں میں ہے کہ ''خبردار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ کی عظمت کو سامنے رکھو، اپنے رب کے گھر کے بارے میں کہ یہ گھر اگر متروک ہو گیا اور وہاں عبادت بند ہو گئی تو پھر تمہارے لئے مہلت نہیں دی جائے گی'' یعنی پھر عذاب تمہارا مقدر ہوگا۔

پیغام: پیغام کعبۃ اللہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے، کعبۃ اللہ میں جانا چاہیے وہاں عبادت کرنی چاہیے اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کعبۃ اللہ کی زیارت سے دوسروں کو روکے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ﴿۳۶﴾

"بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے روکیں، سو ابھی اور بھی خرچ کریں گے پھر وہ ان کے لیے حسرت ہو گا پھر مغلوب کیے جائیں گے، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے"۔

کافروں کا انجام

اس جگہ مشرکین کا کفر بیان کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون کے تحت تمام معاملات اسباب کے تابع ہیں۔ مشرکین جنہوں نے کفر اختیار کیا اور دعوت حقہ کا انکار کیا وہ خود کفر اختیار نہیں کرتے بلکہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو دعوت حق سے روکیں۔ وہ مال خرچ کرکے اللہ کے راستے کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرکے اپنے منحوس مقاصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں ظلم اور فسق کے راتے میں مال خرچ کرتے ہیں لیکن انہیں کوئی دنیاوی کامیابی حاصل ہو گی نہ سعادت کو پہنچیں گے اور جس مقصد کے لئے انہوں نے اموال خرچ کیۓ ہیں حاصل نہیں ہو گا، ان کے اموال ضائع جائیں گے جس بناء پر انہیں بڑی حسرت ہو گی کہ ان کے اموال نے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ یہ لوگ بڑی تیزی سے جہنم کی طر جائیں گے وہاں پر ان کا حشر و نشر ہو گا تو ان آیات میں "ثم یغلبون" کہ وہ مغلوب ہوں گے اور شکست کھائیں گے اس میں فتح مکہ کی خبر دی گئی ہے اور بعد والی عبارت میں قریش کے بعض افراد جو دین اسلام لانے میں موفق نہیں ہوں گے ان کے متعلق بتایا گیا ہے۔

پیغام: اموال حق کے راستے میں خرچ ہونے چاہئیں، حق کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے کے لئے اموال کو خرچ نہ کیا جائے جو باطل کے راستہ میں اموال خرچ کرتے ہیں تو وہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور ایک ناپاک کو دوسرے پر دھر کر ڈھیر بنائے پھر اسے دوزخ میں ڈال دے، وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

خبیث اور طیب کی جدائی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ خبیث اور طیب دونوں الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے موافق نہیں؛ دونوں الگ الگ ہیں۔ یہ آیت پچھلی آیت کے مضمون کی وجہ کو بیان کر رہی ہے۔ کافروں نے کہا کہ ہم اپنے تمام امکانات اور مالی وسائل خرچ کر دیں گے اور اللہ کے نور کو بجھا دیں گے اللہ کے پیغام کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے تو اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ انہیں پتہ ہی نہیں کہ وہ اس امر میں شکست کھائیں گے کیونکہ اللہ کی سنت اور قانون ہے اور تکوینی نظام میں ایسا ہی ہے، خیر اور شر، خبیث اور طیب دونوں ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے علیحدہ علیحدہ بھی ہیں۔[1]

---

[1]۔ مولوی کے مطابق: ''ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش   باز جوید روزگار وصل خویش
جو بھی اپنی اصلی حقیقت سے دور ہو جائے، زمانہ اسے اس کی اصلی حقیقت کی جانب لوٹا دے گا۔ (مترجم)

اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے الگ کرتا ہے اور طیب کو خبیث سے جدا کرتا ہے، ایک جیسے ایک جگہ پر اکٹھے ہوتے ہیں کیونکہ ہر شئے اپنی اصل کی جانب پلٹتی ہے جب خبیثوں کا مجموعہ اکٹھا ہو جائے اور سارے ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر یہ سب اکٹھے جہنم میں جا پہنچیں گے شر کے قافلہ کا انجام جہنم ہے، اور یہی نقصان اٹھانے والے ہیں، ان کے سارے اموال خرچ کرنا ہے، تمام امکانات اور تمام قدرات کو اس راستے میں لگانا کہ نور حق کو بجھا دیں تو وہ ہر گز کامیاب نہیں ہوئے ان کی ساری سازشیں ناکام ہوئیں انہیں حسرت و پشیمانی کے سواء کچھ بھی نہیں ملا دوزخ کا عذاب اور برباد کرنے والا گھر ان کو نصیب ہوا۔

پیغام: ہمیشہ طیبوں سے بنو۔ طیب وہی ہوتے ہیں جو حق کو سمجھتے ہیں اور حق پر چلتے ہیں۔ تو تم حق پر چلو، حق والے بنو، حق کی دعوت دو، حق پر مر مٹو، حق کہو، حق کا ساتھ دو اور حق والے بنو!

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

''کافروں سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ گزر چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر واپس پلٹیں گے تو پہلے کافروں کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے''۔

کفر سے نہ رُکنے والوں کا انجام

اس آیت میں پیغمبر سے خطاب ہے کہ کافروں سے کہہ دو کہ وہ اپنی سرکشی سے ہاتھ روک لے کفر چھوڑ دیں تو پھر اللہ تعالیٰ انکے پچھلے گناہ معاف کردے گا کہ انہوں نے مومنوں کو اذیت دی، مومنوں کو قتل کیا وہ سب گناہ اللہ معاف کردے گا۔ یہ دعوت دی گئی ہے کہ تم

جنگ نہ کرو، فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ۔ انہیں لالچ بھی دی گئی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے جرائم کی سزا نہیں دی جائے گی، تمہاری ساری غلطیاں معاف کر دی جائیں گی اور اگر تم ایسا نہیں کرو گی۔ پھر اللہ نے خود ہی بتا دیا کہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے کہ جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ہے تم ان سے نہیں رکو گے تو پھر اللہ کی سنت اور اللہ کا جو قانون ہے وہ تم پر لاگو ہو گا جیسا کہ پچھلی اقوام پر لاگو ہوتا رہا ہے کہ گذشتہ اقوام میں انکار کرنے والوں کو ہلاک کیا گیا اسی طرح تمہیں بھی ہلاک کر دیا جائے گا جس طرح ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا اسی طرح تمہارا بھی نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ اس طرح تم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو گے۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

"اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ شرک کا غلبہ نہ رہنے پائے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے، پھر اگر یہ باز آجائیں تو اللہ ان کے اعمال دیکھنے والا ہے"۔

جنگ کا حکم

اس آیت میں مومنین کی شرعی ذمہ داری کو بیان کیا گیا کہ دین کو قائم کرنے، دین کی حفاظت اور معاشرے میں دینی غلبہ کے لیے احکام دین کے نفاذ میں سستی نہ کریں۔ اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ کافروں اور مشرکین کے ساتھ جنگ کرو۔ انہیں کمزور کرو تا کہ وہ اپنے کفر کا پرچار نہ کر سکیں۔ مشرکین جو فتنے اور شرارتیں مومنین کے خلاف کر رہے ہیں ان کا خاتمہ ہو جائے اور ہر جگہ اللہ کا دین ہو اور اللہ کے دین کے خلاف دعوت دینے والے ظالم کا خاتمہ ہو، عدل الٰہی کا نفاذ ہو، رب تعالیٰ کی عبادت ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ مومنوں کی جماعت اپنے امام کے امر کے تحت ہدایت پائے اور یہ طے کرے کہ دوسروں کو اندھیروں

سے نکالے اور انہیں الٰہی احکام اور قوانین میں لے آئیں اور انہیں قرآن اور وحی کے تابع بنائے۔

پھر فرمایا: اگر کافر جنگ سے ہاتھ اٹھالے اور جھگڑا ختم کر دے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے جیسے بھی اعمال ہیں ان کی مناسبت سے فیصلہ دے گا کیونکہ اللہ ان کے اعمال کے بارے میں خوب بینا اور آگاہ ہے، اللہ ان کی نیتوں سے بھی آگاہ ہے۔ اگر وہ اپنی صحیح حالت پلٹ آتے ہیں جنگ اور فتنہ سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی عادل ہے ان کے ساتھ عدل پر مبنی اقدام کرے گا۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

"اور اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا دوست ہے، اور بہت اچھا دوست اور بہت اچھا مددگار ہے"۔

اللہ کی ولایت

یہاں پر مومنین کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر کافر اپنی سازشوں سے باز نہ آئے اور وہ شرارتیں کرتے رہے تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا سرپرست، ولی، یاور و مددگار اللہ تعالیٰ ہے، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور مکمل اطمینان رکھو کہ اللہ کی نصرت تمہارے لئے ہے تم جنگ کرو، خدا ہی تمہاری مدد کرے گا، سرپرستی کرے گا اور تمہیں غلبہ دے گا۔

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوۡلِ وَ لِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴۱﴾

”اور یہ بات جانو لو کہ جو کچھ تم کسب کرو اور کماؤ تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تمہیں اللہ پر یقین ہے اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن اتاری جس دن دونوں جماعتیں ملیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

خمس کا حکم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فریض خمس کے قانون کو بیان کیا ہے۔[1]

غنیمت دو طرح کی ہے:

ا۔ ایک مال غنیمت وہ ہے جو تجارت، کاروبار یا محنت مزدوری سے انسان کو ملتا ہے، دوسرا مال وہ ہے جو جنگ کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ عام طور جنگی اموال کو مال غنیمت کہا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ شیعہ امامیہ کے عقیدے کے مطابق خمس، زکوۃ کی مانند مالی واجب ہے۔ اس کا آدھا اللہ، رسولؐ اور ذوی القرباء جو رسولؐ کے قرابت دار ہیں ان کے لئے اور آدھا سادات کے لئے ہے۔ آئمہ معصومین علیہ السلام سے منقول روایات کے مطابق خمس شیعوں کے لیے مباح ہے۔ البتہ احتیاط کے طور پر خمس لینے کا مستحق سید اسے لے کر بے سہارا شیعہ کو دے تو بہتر ہے۔ اس بارے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

ذوی القرباء سے رسول اللہ ﷺ کے قریبی مراد ہیں اور قطعی روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد اہل البیت علیہم السلام ہیں اور یتیم وہ ہے جس کا باپ مر جائے اور وہ نابالغ ہو۔

خمس یعنی حاصل شدہ مال کا پانچواں حصہ دینا واجب ہے۔ اس کا مصرف بیان کیا گیا ہے کہ خمس ادا کرو اللہ کے لئے اور اللہ کے رسولؐ کے لیے اور قرابت داروں کے لئے، یتامیٰ کیلئے، مساکین کیلئے اور ابن سبیل کیلئے۔ اس طرح آیت میں خمس کے مصرف بارے چھ عناوین بیان ہوئے ہیں۔ پہلے تین عنوان اللہ، رسولؐ اور قرابت دار۔ یہ تینوں حصے امام معصومؑ کیلئے ہیں۔ جب بعد والے تین عناوین یتامیٰ و مساکین اور ابن سبیل ؛ یہ وہ افراد ہیں جو خاندان بنی ہاشم میں سب سے زیادہ حقدار اور اولاد رسول ﷺ امام حسن و امام حسین علیہم السلام کی اولاد (سادات) ہیں۔ ان کے احکام کی تفصیل فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

یوم الفرقان سے مراد جنگ بدر ہے۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ دو گروہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس دن کو حق پر باطل پر غلبہ دیا۔

آخری بات اس غلبہ کی وجہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں حق کو باطل پر غلبہ دیا ہے، حق اور باطل کو جدا جدا کر دیا۔ بدر والے دن ہی رسول پاک ﷺ پر سورہ انفال کی یہ آیات نازل ہوئیں جن میں جنگی غنائم کے بارے حکم بیان ہوا اور اس طرح خمس کے متعلق بھی قانون بیان ہوا۔

قرآن میں جو بھی قوانین بیان ہوئے ہیں یہ ابدی اور دائمی ہیں۔ خمس کے مصارف انہی موارد میں منحصر ہیں جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ ان موارد میں سے ہر ایک کا مستقل حصہ ہے البتہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا حصہ امام معصومؑ کے لئے ہوتا ہے اور جو یتامیٰ اور ابن سبیل ہیں اس سے مراد سادات بنی ہاشم ہیں، ان میں مقدم فاطمیؑ (حسنیؑ حسینیؑ)

سادات ہیں۔ ویسے تو سارے بنی ہاشم سادات ہی ہیں۔ اگر ان کا صحیح نسب معلوم ہو تو انہیں سادات والے حصے سے دیا جا سکتا ہے۔

پیغام: خمس ایک الٰہی فریضہ ہے جو اللہ کی جانب سے طے شدہ ہے۔ یہ زکوۃ سے علیحدہ مالی فریضہ ہے؛ اس کی ادائیگی اسی ترتیب سے کرنی چاہیے جو ترتیب اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡیَا وَ هُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰی وَ الرَّکۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ ؕ وَ لَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ ۙ وَ لٰکِنۡ لِّیَقۡضِیَ اللّٰهُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ۬ۙ لِّیَهۡلِکَ مَنۡ هَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۴۲﴾

"جس وقت تم اِس کنارے پر تھے اور وہ اُس کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے اتر گیا تھا، اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو ایک ساتھ وعدہ پر نہ پہنچتے، لیکن اللہ کو ایک کام کرنا تھا جو مقرر ہو چکا تھا، تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے تو وہ بھی اتمام حجت کے بعد زندہ رہے، اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

اللہ کی مشیت اور اس کا فیصلہ

"عُدۡوَة" بیابان کی اوپر کی جگہ، ٹیلہ کو کہتے ہیں۔ "الرکب" تجارتی قافلہ جو ابوسفیان کا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ قریش کے جو دو گروہ تھے ایک تجارتی گروہ، دوسرا جنگجو گروہ۔ دوسرے کے ساتھ تمہارا ٹکراؤ ہونا تھا جو کچھ ہوا یہ مشیت ایزدی تھی۔ اس طرح نہیں ہوا جس کا

پروگرام تم نے خود بنالیا تھا، طرفین کے توافق اور باہمی مشاورت کی بنیاد پر جو کچھ طے ہوا اسی میں اللہ کی مشیت تھی۔ مشرکین کا جنگجو گروہ اس لحاظ سے کہ اُن کا ظاہری رعب تھا تعداد بھی زیادہ تھی، بیابان کا جو بلند حصہ تھا وہاں پر وہ موجود تھے پانی بھی ان کے پاس تھا اور جو اُن کے نیچے والی زمین تھی وہ پکی زمین تھی اور مومنین کی تعداد کم تھی ان کی ظاہری طاقت بھی کمزور تھی، وہ بیابان کی نچلی جگہ پر موجود تھے زمین ریتلی تھی پانی بھی نہیں تھا جبکہ ابوسفیان کا جو پڑاؤ تھا وہ ایک نچلی سطح پر تھا، مومنین اس قافلے پر مسلط ہو سکتے تھے لیکن اللہ کی مشیت کے تحت مومنین ابوسفیان کے تجارتی گروہ کی طرف نہ گئے، جنگجوؤں کی جانب آ گئے۔

اس میں ظاہری حالات مشرکین کے حق میں تھے لیکن یہ ایک معمولی امر نہیں تھا اور نہ ہی طبیعی اسباب کے تحت ایسا ہوا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص مشیت تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہوا تھا تاکہ اللہ اپنے امر اور فیصلے کو نافذ کرے اور مومنین کی نصرت کرے اور انہیں کافروں پر غلبہ دے۔

اس مطلب کی وجہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنا حکم جاری فرمایا اور تمہاری تائید کی تو یہ سب اس لئے تھا کہ حق کی حقانیت سب پر واضح اور روشن ہو اور باطل کے بطلان پر واضح ثبوت ہو تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے تو وہ دلیل و ثبوت سے ہلاک ہو تو وہ ہلاکت کے راستے کی تشخیص دے کر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے اور جو زندہ رہتا ہے تو دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ پس ہلاکت اور زندہ ہونا دونوں چیزیں ہدایت اور گمراہی ہر شخص دلیل کے تحت اور واضح ثبوت کے ساتھ ہو اور پھر فرمایا اللہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے، تم جو اللہ سے درخواست کر رہے تھے گڑگڑا کر اللہ تمہاری مدد کرے تو اللہ نے یہ تمہاری مدد مانگنے کی فریاد کو سنا ہے اور تمہارے دلوں میں جو پریشانی تھی اس سے بھی اللہ آگاہ ہے۔

اس آیت میں مشرکین اور مومنین کی جو کیفیت ہے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ بتایا گیا کہ مشرکین مکہ سے آئے، انہوں نے جنگی حوالے سے جس جگہ کا انتخاب کیا وہ اس جگہ سے بہتر تھی جو جگہ مومنوں کے ہاتھ میں آئی تھی۔ مشرکین کے دو گروہ تھے ایک گروہ جس کو "نفیر" کہا گیا جس میں ہزار جنگجو تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی تھا، ہر طرح کے جنگی وسائل موجود تھے، ظاہری رعب و دبدبہ بھی ان کے پاس تھا اور دوسرا گروہ جو تھا وہ چالیس افراد پر مشتمل تھا ابوسفیان کی قیادت میں۔ وہ اس جگہ سے فاصلے پر تھے ان تک جانا بھی مومنوں کے لئے آسان نہ تھا بظاہر تو مومنین جنگی حکمت عملی کے حوالے سے ظاہری طور پر ایسی پوزیشن پر نہیں تھے کہ ان پر چڑھائی کر کے غلبہ حاصل کر لیں۔ نہ تو "عیر" والے کاروان جو چالیس افراد پر مشتمل تھا غلبہ پا سکتے تھے اور نہ "نفیر" والے کاروان پر غلبہ پا سکتے تھے لیکن یہ سارا کیسے ہو گیا کہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، مشرکین ذلیل و خوار ہوئے تو یہ سب اللہ کی مشیت کے تحت ہوا اور یہ مومنین کو سمجھایا جا رہا ہے کہ یہ اس لئے ہوا کہ حق کا ثبوت اور دلیل واضح ہو اور باطل کے بطلان کا ثبوت بھی واضح موجود ہو اور جو شخص اپنے لئے حیات ابدی چاہتا ہے تو وہ بھی کسی بنیاد پر ہو اور جو ہلاکت میں جاتا ہے وہ بھی دلیل اور ثبوت کے تحت۔

پیغام: انسان کو اپنے وسائل اور امکانات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ کی مدد اور اللہ کی نصرت پر اس کا بھروسہ ہونا چاہیے اسے اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ ان کے لئے آسانیاں پیدا کرے جہاں بھی کوئی مشکل ہو تو اس مشکل کا حل خداوند تبارک و تعالیٰ کے حضور دعا اور فریاد کے ذریعہ درخواست کرے اور اللہ کی مدد سے ہی ہر جگہ کامیابی ہو سکتی ہے۔

اِذۡ يُرِيۡكَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَنَامِكَ قَلِيۡلًا ؕ وَ لَوۡ اَرٰىكَهُمۡ كَثِيۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ وَ لَتَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾

"جس وقت اللہ نے تمہیں کافروں کو تھوڑا کرکے دکھلایا اور اگر اللہ تمہیں ان (کافروں) کی تعداد کو زیادہ دکھلاتا تو تم سست پڑ جاتے (بزدلی دکھاتے)، مہم کام (جنگ) بارے آپس میں جھگڑا (باہمی اختلاف) کرتے اور جھگڑا اڈالتے لیکن اللہ نے (اس سب سے) بچا لیا۔ بتحقیق بلاشک ایسا ہے کہ اللہ دلوں کے حالات کو جانتا ہے"۔

پیغمبرؐ کے لیے حوصلہ افزائی

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ جب خواب میں اللہ تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ کے دشمنوں کو اس طرح دیکھایا کہ وہ تعداد میں تھوڑے نظر آئے اور اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے یہ اس لیے تھا تاکہ تمہارے دل مضبوط رہیں اور تم میں اطمینان میں رہیں۔ اگر خواب میں ان کی تعداد زیادہ نظر آتی اور تم مومنین کو اس کی خبر دے دیتے تو مومنین میں کمزوری آجاتی، وہ اپنی تعداد کی کمی کی وجہ سے کمزور اور سست پڑ جاتے، جنگ کے متعلق فیصلہ کرنے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس فیصلے سے تمہیں سستی اور کاہلی نجات دی کیونکہ اللہ سینوں کے اندر جو بات ہے سے آگاہ ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ دلوں میں کیا ہے اور دلوں کی استقامت اور اطمنیان کے لیے جو بہتر ہے خدا تعالیٰ اسے جانتا ہے اور وہ اسی کو انجام دیتا ہے۔

اس آیت میں حضور پاک ﷺ کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ ''فشلتم'' ایسی کمزوری جس میں اضطراب ہو اور ''تنازعة'' باہمی اختلاف اور ''تسلیم'' نجات دینے کے معنی میں ہے۔ یہ ساری باتیں جنگ بدر کے حوالے سے ہو رہی ہیں اور اس دوران اللہ تعالیٰ نے جو جو مہربانیاں مومنین پر کیں ان کا تذکرہ مختلف انداز سے کیا جا رہا ہے۔

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴۴

''اور جب تمہیں مقابلہ کے وقت انہیں (مخالف فوج کی تعداد) تمہاری آنکھوں میں تھوڑی کرکے دکھائی اور تمہاری آنکھوں میں وہ تھوڑے نظر آئے تاکہ اللہ کا کام مقرر ہو چکا تھا پورا ہو اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے''۔

مومنین کی امداد کا انداز

جب مومنوں کا ٹاکرا کفار سے ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں کی نگاہ میں کم تر جلوہ دیا تاکہ وہ مغرور ہو جائیں۔ ان پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔ کافر خیال کریں کہ یہ تو بس ایک حملہ کی مار ہیں اور اس طرح وہ دلیر ہو کر جنگ میں کود پڑیں اور جیسے ہی انہوں نے جنگ شروع کی تو خداوند تبارک وتعالیٰ نے مومنوں کو ان کی نگاہ میں دوبرابر دکھادیا اور یہ سبب بنا کہ ان مشرکین کے حواس جواب دے گئے اور وہ سست پڑ گئے جس سے وہ شکست کھا گئے۔ یہ معنی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳ سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک طرف سے اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مومنوں کی نگاہ میں تھوڑا جلوہ دیا کہ مومنوں کو ایسا نظر آیا کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ یہ اس لیے تاکہ مومنین کافروں کو حقیر اور معمولی سمجھیں اور ان کے دل

مضبوط ہو جائیں وہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ جنگ کریں، ان پر تابڑ توڑ حملے کریں۔ خدا نے یہ سارے امور انجام دیے اور ان امور کی ترتیب دی تاکہ مومنوں کا غلبہ مشرکین پر حتمیٰ ہو خداوند سارے اسباب کا خالق ہے پورے عالم کا مدبر اور تدبیر کرنے والا ہے تمام امور کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ۴۵

''اے ایمان والو! جب کسی فوج سے تمہارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ''۔

دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ہدایات

''ثبات'' زوال کا ضد ہے اور اس میں دشمن کے مقابلے میں ثابت رہنا، محکم رہنا، استوار رہنا، مضبوط رہنا مراد لیا گیا ہے۔ مومنوں کو کہا جارہا ہے کہ جب دشمن کی جماعت کے ساتھ تمہارا آمنا سامنا ہو تو اس وقت تم ثابت قدم رہو اور ڈٹ جاؤ فرار نہ کرو اور اس حالت تمہاری زبان پر اللہ کی یاد اور اللہ کا ذکر ہو۔ تمہاری باطنی حالت اللہ کی یاد میں ہو، کیونکہ اللہ ہی معبود ہے، وہی تمہارا رب ہے زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایسا امر جو تقویٰ کے رُوح کی تجدید کا سبب ہے اور دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کا ذریعہ ہے، شیطانی وسوسوں کو ٹالنے کا وسیلہ بھی ہے کیونکہ تمہارے اس عمل کا اختتام جنگ میں دو کامیابیوں میں سے ایک ہے یا دشمن پر غلبہ ہوگا یہ بھی تمھارے لیے اچھائی ہے یا پھر شہادت ہوگی اللہ کی بہشت میں تمہارا بڑا مقام ہے اور رحمت حق کی ہمسائیگی تمہارے نصیب ہوگی تو دونوں صورتوں میں

کامیابی اور فلاح تمہارے لئے رہے، ناکامی کہیں بھی نہیں اور اللہ تعالیٰ نیک عمل انجام دینے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

"اور جو ایمان لائے اور کام بھی نیک اور اچھے کرتے رہے تو ہر نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے" (سورۂ کہف، آیت: ۳۰)

پیغام: مومن کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرے جب ذمہ داری کو ادا کرے گا تو اس کے لیے کہیں بھی ناکامی نہیں ہو گی اور اس کے ذہن میں رہے خاص کر جب کوئی مومن دشمن کے مقابلے میں اُترتا ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو ظاہری کامیابی ہو گی یا شہادت نصیب ہو گی۔ ظاہری کامیابی ہو تو وہ بھی مومن کے لئے اچھائی ہے اور اگر شہادت نصیب ہو تو بھی اس کے لئے اجر و ثواب اور رحمت حق کی ہمسائیگی ہے۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۚ﴿۴۶﴾

"اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

اوامر الٰہی کی اطاعت

اس آیت میں مومنوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ جو دستورات اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جہاد کے بارے میں دیے گئے ہیں، دین کی حرمت، اسلامی وقار، اسلامی حکومت کو محفوظ رکھنے کے لیے جو دستورات ہیں ان پر عمل کرو، مخالفین کیساتھ جنگ کرنے سے پہلے اتمام حجت کی جائے۔ دلیل سے ان کو حق پر آنے کی دعوت دی جائے جب وہ قبول نہ

کریں تو پھر جنگ کی طرف جایا جائے لیکن جنگ میں عورتوں اور دشمنوں کے بچے مضطرب نہ ہوں بغیر اطلاع کے شب خون نہ ماریں اور جو ہدایات اور تفصیلات جہاد کے سلسلے میں بیان ہوئی ہیں ان سب کا خیال رکھا جائے۔

پھر فرمایا تمہارے اپنے درمیان جھگڑا، کشمکش اور اختلاف کا ہونا ٹھیک نہیں کیونکہ اگر آپس میں جھگڑوگے اور اختلاف کروگے تو تم کمزور پڑ جاؤگے اور تمہارا رعب اور وقار جاتا رہے گا دشمن تم پر غلبہ پالے گا۔ اختلاف اور تفرقہ وحدت کو ضائع کردیتا ہے اور افتراق و اختلاف تمہاری قدرت اور شوکت کو پامال کردیتا ہے۔ جنگ کے دوران دشمن کی طرف سے جو تمہارے اوپر سختیاں آرہی ہوتی ہیں اور حملہ کے دوران جو تمہارا نقصان ہوتا ہے اس راستے میں جو تکالیف آرہی ہوتی ہیں ان میں صبر کرو اور اللہ کے ذکر کو نہ بھولو، ذکر الٰہی جاری رہے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت میں رہو۔ تمہاری اسی اطاعت کی سنگینی تمہیں حادثات اور مشکلات کا سامنا کرتے وقت تمہارے قدموں کو اُکھڑنے سے محفوظ رکھے گی۔ کہیں اطاعت کی سنگینی اور معصیت کی لذت، خود پسندی اور تکبر تمہیں گمراہ نہ کردے۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور صبر کرنا انسان کو کمزوری سے بچاتا ہے، صبر انسان کا بہترین یاور و مددگار ہے۔ ارادے اور فیصلے پر قائم رہنے کے لئے صبر محکم ترین بنیاد ہے لہٰذا صبر کے ہتھیار کی مدد سے دشمن کی طرف سے آنے والی سختیاں برداشت کروگے تو اللہ کی مدد بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔

پیغام: ہر حال میں اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو بالخصوص جہاد کے بارے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں ان کی پابندی کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ افتراق اور فرقہ بندی سے بچا جائے کیونکہ افتراق اور انتشار کا نتیجہ کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوگا اور وحدت ٹوٹ جائے گی نیز نامناسب حالات اور سختیوں میں صبر کا دامن تھامے رکھو اور اللہ کی اطاعت میں آنے والی سختیوں پر صبر کرو۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۴۷﴾

''اور ان لوگوں جیسا نہ ہونا جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے گھروں سے نکل آئے جبکہ اللہ کی راہ سے روکتے تھے، اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس سب کا احاطہ کرنے والا ہے (سب کچھ اللہ کے علم میں ہے) ''۔

عمل میں دکھاوا اور غرور کا نقصان

''بطر'' خود نمائی کے معنی میں ہے۔ انسان کو جو نعمت ملی ہوئی ہے وہ اسے ایسی جگہ خرچ کرے جس کا کوئی مورد نہیں۔ اس نعمت کا جو حق بنتا ہے اسے پورا نہ کرے اور اسے برے طریقے سے استعمال میں لے آئے۔ ''ریا'' عمل کرنے میں لوگوں کا لحاظ رکھنا۔ اس جگہ پر مومنوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ تم کفار قریش کی مانند مت بنو کہ وہ جنگ کے لیے جب گھر سے نکل رہے تھے تو بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے نکل رہے تھے، خود نمائی کر رہے تھے، بڑے فخر اور غرور میں تھے تاکہ اللہ کے راستے میں بند باندھیں اور لوگوں کو دین حق پر ایمان لانے سے روکیں اور جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اللہ ان کے تمام حالات پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تم ان جیسا عمل نہ کرو۔ ان تین آیات میں ۶ جنگی دستور دیے گئے ہیں؛ مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان دستورات کا لحاظ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے جنگ کیلئے ان پر لازم قرار دیے ہیں:۔

جنگی دستورات

۱۔جب دشمن کے ساتھ ٹاکرا ہو تو ثابت قدم رہو، میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔

۲۔اللہ کو بہت یاد کرو، دل سے بھی اور زبان سے بھی۔

۳۔اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا جو دستور جہاد کے سلسلے میں ہے اس کی اطاعت کرو۔

۴۔آپس میں جنگی معاملات و منصوبہ بندی میں اختلاف نہ کرو، اپنی وحدت کو نہ توڑے، باہمی مشاورت کرو، آپس میں جھگڑا مت کرو۔

۵۔غرور، خود نمائی، خود سری کے ساتھ جنگ میں نہ جاؤ بلکہ اللہ سے مدد مانگتے ہوئے آگے بڑھو۔

۶۔اللہ کے راستے کے لیے رکاوٹ مت بنو جبکہ اللہ کے راستہ میں موجود ہر رکاوٹ کو دُور کردو۔

پیغام: آپ کا عمل دکھاوا کے لیے نہیں ہونا چاہیے آپ میں غرور نہیں ہونا چاہیے اللہ کی طرف ہمیشہ رجوع ہونا چاہیے اور خدا کی مدد، اتحاد و یکجہتی کو قائم رکھو، افتراق و انتشار سے بچو!

وَ اِذۡ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الۡیَوۡمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّیۡ جَارٌ لَّکُمۡ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الۡفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیۡهِ وَ قَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکُمۡ اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۴۸﴾

”اور جس وقت شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں خوشنما کر دیا اور کہا کہ آج کے دن لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہ ہوگا اور میں تمہارا حمایتی ہوں، پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ اپنی ایڑیوں پر الٹا پھرا اور کہا

میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں ایسی چیز دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے''۔

شیطان کی کارروائی

شیطان اعمال کو خوبصورت بنا کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے اور آدمی کے اندرونی جذبات کو بھڑکاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اس عمل کو کرو اور اس میں انسان کو عقل استعمال نہیں کرنے دیتا اس کے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے۔ ''جَارٌ'' پناہ کے معنی میں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایسا ہوتا تھا کہ کوئی کسی کے پناہ میں آجاتا تو جو پناہ دینے والا ہوتا تھا تو دشمن اسے نقصان پہنچانا چاہتا تھا تو پناہ دینے والا اس کی مدد کرتا تھا۔

شیطان نے کافروں کو بھڑکایا اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کیا اور ان کے برے اعمال کو ان سے خوبصورت بنا کر پیش کیا اور انہیں کہا کہ تمہارا اسلحہ بھی بہت زیادہ ہے تمہاری تعداد بھی زیادہ ہے اور بڑے شور کے ساتھ اور شراب کی محفلیں لگاتے ہوئے جنگ کی طرف بڑھو اور شیطان نے انکے برے اعمال کو خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کیا۔ اور شیطان کا اصرار تھا کہ وہ گمراہی اور فسق میں باقی رہیں اور اللہ اور اللہ کے رسول کی بات میں نہ آئیں۔

شیطان نے ان سے کہا میں تمہارا مددگار ہوں اور کہا کہ آج کوئی بھی طاقت تمہارے اوپر غالب نہیں آسکے گی میں تمہاری پناہ ہوں اور تم میری پناہ میں ہو میں تمہاری مدد کروں گا میں تمہیں کامیاب کراؤں گا۔ مسلمانوں پر تمہارا غلبہ ہونا ظاہری طور پر شیطان انسان کی شکل میں آیا اس نے ساری باتیں ان کافروں سے قریش مکہ کے بڑوں سے کہی تھیں لیکن جب مشرکین کی جماعت مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑی ہوئی تو شیطان پیچھے ہٹ گیا اور پیچھے ہٹ کر بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے کہا میرا تمھارا کوئی تعلق نہیں میں تم سے بیزار ہوں

کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ مومنوں کی مدد کے لیے فرشتے اتر رہے ہیں، شیطان فرشتوں کو دیکھتا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ یا تو فرشتے کوئی عذاب لے کر آ رہے ہیں یا پھر مشرکین کو شکست دینے کیلئے آ رہے ہیں۔ اس نے یہ دیکھ کر مشرکین سے کہا جو میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ رہے میں تو اللہ کے عذاب سے ہراساں ہوں، میں اللہ کا عذاب برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا میں جا رہا ہو ں تم جانو اور تمہارا کام جانے اور اللہ گناہگاروں کو سخت سزا دیتا ہے۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾

''اس وقت منافق اور جن کے دلوں میں مرض تھا وہ کہتے تھے کہ انہیں ان کے دین نے مغرور کر رکھا ہے، اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے''۔

منافقوں کی چال

یہاں پر منافقین کے بارے بات کی جا رہی ہے جو ایمان کا اظہار کرتے تھے لیکن باطن میں کافر تھے اور ان کے دل شرک میں مبتلا تھے، ایمان ان کا کمزور اور شک و شبہ ان کے نفوس میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ مومنین کو ذلیل اور کمزور سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کے دین نے ان کو مغرور کیا ہوا ہے یہ تھوڑی تعداد میں کس طرح اتنے بڑے خطرے کو مول لے رہے ہیں اور اس طرح ایک ایسی جماعت یا ایسا گروہ جس کی تعداد بڑی ہے یہ لوگ اس کے مقابلے میں آگے بڑھ رہے یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں یہ گروہ پست و ذلیل ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے جواب میں فرمایا کہ تم خود دھوکہ میں ہو فریب خوردہ ہو، تم نہیں جانتے کہ جس نے اللہ پر توکل کیا، اپنے معاملات میں اللہ کو اپنا وکیل بنایا تو خدا پورے

عالم میں تنہاء موئثر طاقت ہے تو پھر اس صورت میں اس فرد کی طاقت حق تعالیٰ کے ساتھ جڑ جاتی ہے اور خدا جس کی مدد کرتا ہے اس کی مدد خطا نہیں جاتی ہے وہ حکیم ہے ہر امر کو اس کی اپنی جگہ پر رکھتا ہے۔

اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت جنگ بدر میں موجود تھی جن کا ایمان کمزور تھا وہ مومنین میں موجود تھے کمزور ایمان والوں کے باپ رشتہ دار مشرکین میں موجود تھے، وہ ان کو روکتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ملحق نہ ہوں لیکن جنگ بدر میں وہ مجبور ہوئے کہ مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کے لیے مومنوں کے ساتھ آئیں لیکن جنگ بدر میں مسلمانوں کی مقدار کو کم دیکھا اور مشرکین کی مقدار کو بہت زیادہ دیکھا تو وہاں پر وہ کہنے لگے کہ جو مسلمان ہیں ان کے دین نے انہیں مغرور کیا ہوا ہے، بھلا یہ کس طرح اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور کس طرح کامیاب ہوں گے؟ یہ لوگ کامیاب نہیں ہوں گے جبکہ اللہ تعالیٰ تمام حالات سے آگاہ ہے اور خدا کو ہی معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور وہی ہے جو مدد دینے میں قادر ہے، اس نے مومنین کے لئے مدد فراہم کی۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۵۰﴾

''اور اگر تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں، اور (کہتے ہیں) بھڑکتی آگ کا عذاب چکھو''۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾ۙ

''یہ اسی کا بدلہ ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا''۔

فرشتوں کا کافروں پر قہر

"توفی" کا معنی پورا حق وصول کر لینا ہے۔ یہ لفظ روح قبض کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اس آیت میں روح قبض کرنے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ روح قبض کرنے کی نسبت خود اللہ کی طرف بھی ہے یا ملک الموت کی طرف نسبت بھی دی گئی ہے تو اس کا آپس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ ایک دوسرے کے طول میں ہے لیکن اصل میں یہ حق اللہ کے پاس ہے اور اللہ کا حکم ملک الموت کے پاس ہے ملک الموت کے آگے فرشتے، کارندے ہیں یہ سب ایک ترتیب سے ہے تو فرشتے کافروں کے آمنے سامنے، آگے پیچھے تھے اور انکو خوب مار رہے تھے ان کی روحیں نکال رہے تھے ان پر تسلط ان کا تھا ان کو ذلیل وخوار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جلانے والی آگ کا مزا چکھو کیونکہ تم اسی آگ کے مستحق ہو جس میں تمھیں ڈالا جائے گا۔ یہ سب کچھ وہ ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے، اللہ ظالم نہیں ہے۔ فرشتے مشرکین سے کہہ رہے ہیں کہ تمہارا عمل ایسا تھا جو تم نے انجام دیا؛ اسی کا نتیجہ یہاں تم بھگت رہے ہو ورنہ اللہ اپنے بندے پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کا ہر فعل عین حق ہے اور اس میں تخلف بھی نہیں ہے اختلاف بھی نہیں ہے۔ جو شئے طے ہے اس سے پیچھے نہیں ہوتا، اگر ایک آدمی نے ظلم کیا تو گویا کہ اس نے سب پر ظلم کیا ہے اگر ظالم ہے تو پھر بہت ظلم کرنے والا بھی ہوگا خدا سے یہ ظلم دور ہے اور ان آیات سے یہ نظر آرہا ہے کہ کافر جن کا وصف بیان کیا جارہا ہے عذاب دینے والے فرشتے اس طرح بات کریں گے تو یہ وہی مشرکین ہیں جو جنگ بدر میں ہلاک ہوئے تھے اور انہی کو فرشتے ان کی روحین قبض کر رہے تھے تو ظاہر ہے ان کو عذاب الہیٰ نظر آرہا تھا فرشتے انکے ساتھ بات کر رہے تھے اور اب تم مزا چکھو جلنے والی آگ کا یہ آگ تمہارے لیے ہے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾

''جیسا فرعونیوں کا اور ان سے پہلے لوگوں کا حال ہوا تھا، انہوں نے اللہ کی آیتوں سے انکار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی سزا میں انہیں پکڑ لیا، بے شک اللہ زبردست اور سخت عذاب دینے والا ہے''۔

آل فرعون کی مثال

یہاں پر اللہ نے مکہ والوں کے کفر کو قوم فرعون سے تشبیہ دیا ہے اور قوم فرعون سے پہلے جو کافر گزرے ہیں یہ بھی انہی کی مانند تھے فرعون کا خاندان اور جو کافر اقوام ان سے پہلے گذری ہیں سب کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کیا تھا خدا طاقت والا ہے قدرت والا ہے اسی لیے ان کے گناہوں کی پاداش میں خدا نے ان کو پکڑا اور ان کو پکڑ نے سے عاجز نہیں ہوا۔ اللہ شدید العقاب ہے جب کسی کو سزا دینے کا ارادہ کرے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور ان کو سزا اس لیے دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے اللہ کے انبیاء کی بات کو ٹھکراتے تھے تو انکو سخت عذاب میں ڈالا گیا اور انہیں ہلاکت میں جانا پڑا تو اے مکہ کے کافرو! تمہارے ساتھ بھی وہی ہو رہا ہے جو پہلے ہوا ہے کہ تم پہلے نہیں ہو تم سے پہلے جو گذرے ہیں ان کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔

پیغام: انسان کو چاہیے کہ سابقہ اقوام کے حالات کا مطالعہ کرے اور اس بات کو یاد رکھے کہ جنہوں نے اللہ کے احکام کی پامالی کی ان کو اللہ نے کس طرح سزا دی۔ لہٰذا وہ اپنے اوپر لازم قرار دے کہ اللہ کے احکام کی پیروی کرے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی نہیں کریں۔ بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اللہ جب کوئی نعمت دیتا ہے کسی قوم

کے لیے اس نعمت کو تبدیل نہیں کرتا ہے یہاں تک کہ قوم والے خود اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں تو اللہ بلا شک و شبہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔

نعمت الٰہی کی برقراری اور تبدیلی

اس آیت میں قانون کلی بتایا جارہا ہے کہ اللہ کی نعمت کسی قوم پر جب آتی ہے تو پھر وہ نعمت تبدیل نہیں ہوتی، وہ برقرار رہتی ہے ان سے وہ نعمت چھینی نہیں جاتی یہاں تک وہ قوم خود اپنے لیے ایسے حالات بنالیتی ہے کہ اللہ نے جو نعمت اسے دی ہے وہ اپنے بندوں سے اس نعمت کو واپس لے لے اور کیونکہ ان میں آمادگی نہیں رہتی کہ وہ اس نعمت کو سنبھال سکے جب کفران نعمت ہوتا ہے وہ نعمت کو اللہ کی معصیت میں استعمال کرتے ہیں اصلاح کی بجائے فساد کرتے ہیں اللہ کے ذکر کی بجائے لغو لغویات میں مشغول رہتے ہیں اور ایسے امور جو معاشرے کے لیے مفید ہو ان کو انجام دینے کی بجائے بیہودہ امور کو انجام دیتے ہیں، جہاد کے امر میں سستی کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو زائل کرتا ہے وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ اُن پر ہلاکت آئے اور ان پر بدبختی چھا جائے اور یہ ایک کلی ضابطہ ہے کہ نعمت کی تبدیلی اور نعمت کی جگہ نقمت اور عذاب کا آنا بغیر وجہ کے نہیں ہوتا۔ خدا تمہاری دعا کو سنتا ہے، وہ تمہاری حاجات سے آگاہ ہے اور تمہاری دُعا کو قبول بھی کرتا ہے اور کافروں کو عذاب دیتا ہے کیونکہ اُن کی بات کو سن رہا ہوتا ہے اور اُن کے کاموں سے بھی آگاہ ہے لہٰذا اُن کے اعمال کے نتیجے میں ان کو عذاب دیتا ہے۔ جو آخری بات ہے وہ پہلی بات کی دلیل اور اُس کا سبب ہے کہ کیوں جب نعمت بدلی ہے تو نعمت بدلنے کا سبب بھی ہے کہ اُن کے اعمال ایسے ہو گئے کہ اُنھوں نے خود ہی ناشکری سے نعمت کے تبدیلی کے اسباب مہیا کر دیے۔

فرعون کے خاندان کی روش کی مانند اور وہ جو فرعون سے پہلے تھے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے اُن کو ہلاک کیا ان کے گناہوں کی وجہ سے اور آل فرعون کو ہم

نے غرق کیا اور یہ سب کے سب ظالم لوگ تھے اور اب بھی جو ان کی روش اپنائیں گے ان پر بھی عذاب آئے گا اور نعمت نقمت میں بدل جائے گی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

''اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہر گز اس نعمت کو نہیں بدلتا جو اس نے کسی قوم کو دی تھی جب تک وہ خود اپنے دلوں کی حالت نہ بدلیں، اور اس لیے کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

''جیسے فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں کا حال ہوا تھا، انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر ڈالا اور فرعونیوں کو ڈبو دیا، اور وہ سب ظالم تھے''۔

فرعونیوں کی ہلاکت

یہ آیت پچھلی آیت کی مانند ہے فقط اس میں فرق یہ ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے صیغہ متکلم کو لایا ہے ہم نے یہ ایسا کیا، ہم نے انہیں ہلاک کیا۔ ہلاکت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا مگر اس وجہ سے کہ جب وہ ظلم کرتے ہیں کفر اختیار کرتے ہیں تو اپنے آپ کو عذاب کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ متکلم جمع کا صیغہ لایا گیا ہے تاکہ اللہ

تعالیٰ کے مقام کی عظمت اور جلالت اور بلند شانی واضح ہو کہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ درمیان میں کوئی واسطے نہیں ہوتے۔ اللہ کی مشیت ہی نافذ ہوتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ہم نے فرعون اس کے قبیلہ اور خاندان کو اور اس سے پہلے جو اقوام گزری ہیں ان کو ہلاک کیا اور ان کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ وہ سارے ستمگر اور ظالم تھے اور اللہ بزرگ و برتر کا کفر انہوں نے اختیار کیا اور اس طرح ظلم کیا اور ظلم کی بنیاد پر وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

پیغام: ظلم نہیں کرنا چاہیے، ظلم کے نتیجہ میں اللہ کی ناراضگی ہو گی اور ظلم سخت ترین عذاب کا سبب بنتا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۵﴾

”اور اللہ کے ہاں سب جانداروں میں سے بدتر وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے“۔

بدترین جانور

اس آیت میں یہودیوں کے اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں جو موجودات زندہ ہیں زمین پر چلتے پھرتے ہیں ان سب موجودات میں جماعت یہود اپنے کفر اور شر انگیزی و مکارانہ سرشت کی وجہ سے سب سے بدترین ہیں۔ ان سے کوئی خیر کی امید نہیں ہے کیونکہ کفر ان کی رگ و پے میں پھیلا ہوا ہے اور ان سے کوئی اُمید نہیں ہے کہ کفر ان سے زائل ہو۔ یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت اور بعد والی آیات میں مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے اور انہیں چوکنا رکھنا ہے کہ یہودیوں کے شر سے خود کو محفوظ رکھیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی معاہدہ کرو گے تو وہ اُس معاہدے کو توڑ دیں گے، وہ ہر بار ایسا کریں گے اور جب ایسا ہے تو پھر تم خود کو ان سے بچاتے رہو۔

اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

"وہ لوگ جن سے تم نے عہد و پیمان باندھا پھر وہ اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں، ایسا ہر دفعہ کرتے ہیں اور وہ ایسا کرنے سے ڈرتے نہیں"۔

معاہدہ شکن لوگ

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کافروں کے درمیان وہ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہو، "کل مرۃ" ہر دفعہ۔ رسول اللہ ﷺ نے کئی بار یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا لیکن ہر بار انہوں اس معاہدے کو توڑا اور یہ عہد شکنی اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا سے بے پرواہ ہیں، خداخوفی ان میں نہیں ہے عہد شکنی سے ڈرتے بھی نہیں ہیں یہ بار بار عہد توڑ چکے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے نہ ہی اُن سے دوستی کرنی چاہیے جیسے اور جگہ بھی فرمایا گیا ہے۔

پیغام: یہود بدترین خلائق ہیں ان سے بچ کر رہو، ان کی سازشوں کا شکار نہ بنو۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

"سو اگر کبھی تو انہیں لڑائی کے دوران موجود میں پائے تو انہیں ایسی سزا دو کہ ان کے پچھلے دیکھ کر وہاں سے بھاگ جائیں تا کہ انہیں عبرت ہو"۔

یہودیوں کے ساتھ رویہ

یہاں بتایا گیا ہے کہ یہ یہودی عہد شکن ہیں اگر ان پر تمہارا غلبہ ہو جائے، یہ تمہارے ہتھے چڑھ جائیں تو ان کو ایسا تار مار کرو اور ان کو ایسا بکھیرو کہ ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دو۔ بعد والے لوگ اُن کے انجام سے عبرت لیں اور ان کے دلوں پر تمہارا رعب غالب رہے ان کا اتحاد مسلمانوں کے خلاف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے یہ اس وجہ سے کہ عہد شکنی کے جو برے آثار ہیں وہ انہیں ملیں اور اُن کی زمین پر جو فساد انگیزی ہے وہ اس کا نتیجہ بھگتیں۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ان کی جو دشمنی ہے اس بات کو یاد میں لے آئیں کہ اس دشمنی کا نتیجہ کیا ہوا ہے اور متوجہ ہوں کہ خدا تباہ کاروں اور فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا اور ان کے منصوبوں، خیانت کاروں کی جو سازشیں ہیں اللہ ان کو پورا نہیں ہونے دیتا اور ان کو ناکام و نامراد کرتا ہے۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۢۡبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾

”اور اگر تمہیں کسی قوم سے دغا بازی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو اس طرح کہ تم اور وہ برابر ہو جاؤ، بے شک اللہ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا“۔

عہد شکنوں کے ساتھ رویہ

”خیانت“ عہد توڑنے کو کہتے ہیں۔ جب انسان کسی کو کسی کام کے لیے امین سمجھتا ہے اور وہ اس کام کو پورا نہیں کرتا یا جو قرارداد آپس میں باندھی گئی ہے وہ اس قرارداد کو توڑتا ہے۔ اللہ اس کے بارے فرمارہا ہے کہ دیکھیں جب آپ کو کسی قوم کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ وہ خیانت کریں گے تو اس صورت میں جو معاہدہ کیا گیا ہے اسے ان کے سامنے پھینک دو اور

معاہدے کو توڑ ڈالو اور اعلان کر دو کہ عہد توڑنے میں ہم برابر ہو گئے کیونکہ تم نے عہد توڑا ہے تو ہم نے بھی توڑا ہے اور یہ عدالت اور برابری خود عین عدالت ہے خدا خیانت کاروں کو پسند نہیں کرتا اگر پہلے سے اعلان کئے بغیر پیمان و معاہدہ کو توڑنے کا اعلان کئے بغیر اُن کے ساتھ جنگ کروگے تو یہ خیانت ہو گی لہٰذا جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی ان کو بتا دو کیونکہ تم نے عہد و پیمان توڑا ہے تو ہم نے بھی جو تمہارے ساتھ عہد و پیمان باندھا تھا اس کو توڑ رہے ہیں اور اس مسئلے میں ہم اور تم برابری کی بنیاد پر ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور کافر یہ خیال نہ کریں کہ وہ بھاگ نکلے ہیں، بے شک وہ ہمیں ہر گز عاجز نہ کر سکیں گے''۔

کافروں کا رویہ

کافر جو معاہدے توڑتے تھے پھر عذر اور بہانے تراشتے تھے، خیانت کرتے تھے، عہد شکنی کرتے پھر اُس کے لئے عذر تراشتے تھے تو ان کے بارے میں یہ خیال نہ کرو کہ ہم سے وہ سبقت لے گئے ہیں ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا کو کوئی بھی عاجز نہیں کر سکتا جبکہ سب طاقت و قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔ ''تحسبنا'' پڑھیں تو یہ رسولؐ کو خطاب ہے اور اگر ''یحسبنا'' پڑھیں تو کافروں کو خطاب ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کافر یہ خیال نہ کریں کہ وہ عہد شکنی میں آگے بڑھے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ دھوکہ دے سکتے ہیں اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اللہ کے فیصلوں کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا نہ ہی اللہ کو کوئی عاجز کر سکتا ہے۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰

''اور ان سے لڑنے کے لیے جو کچھ قوت سے اور صحت مند گھوڑوں سے جمع کر سکو سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر رعب پڑے گا، جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے، اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کروگے تمہیں (اس کا ثواب) پورا ملے گا اور تم سے بے انصافی نہیں ہوگی''۔

دشمن کے خلاف جنگ کی تیاری

اس آیت میں اس دور کے مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے اور کلی طور پر بھی مسلمانوں کے لئے یہ دستور دیا گیا ہے کہ اپنے جنگی وسائل کو اکٹھا کرنے میں اپنی انتہاء درجے کی کوشش میں لگے رہو۔ دشمن کو کمزور نہ سمجھو، معاشرے کے اندر جو افراد ہیں، مزاج کے حوالے سے، سوچوں کے حوالے سے مختلف ہیں اور ہر مجمع، ہر سوسائٹی اپنے طریقوں کی اور اپنے منافع کی حفاظت کے لئے جمع ہوتی ہیں، ان کا اجتماع اکٹھا نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ان کے منافع کو خطرہ ہو اور ان کے مخالف ان پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے ہوں تو جب دو گروہوں میں جنگ ہوتی ہے، لڑائی ہوتی ہے تو پھر ظاہر ہے جھگڑا جنگ تک جا پہنچتا ہے اور ضروری ہے کہ ایک سوسائٹی جو صالح ہے، خداپرست ہے اور دوسرا گروہ جو خدا کے دشمن ہیں، خداپرست نہیں ہیں ان کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو جو نیک اور توحید پرست ہیں ان کو اس

مرحلہ کیلئے پوری طرح آمادہ ہونا چاہیے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام وسائل اس کے پاس موجود ہونے چاہئیں۔

اسلام کی تعلیمات بہت ہی بلند اور عالی شان ہیں اسلام اقدار کا دین ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اسے انسان کے لئے بھیجا ہے اور ایسی حکومت انسان کے لئے انتخاب کی گئی ہے جس کو ہم انسانی حکومت کہہ سکتے ہیں اور اس حکومت میں افراد اور سوسائٹی کے تمام حقوق محفوظ ہیں۔ نجی حقوق بھی اور اجتماعی حقوق بھی۔ جو انفرادی حکومتیں ہوتی ہیں اس میں استبداد ہوتا ہے، شہنشاہیت میں ایک فرد حاکم ہوتا ہے وہ اپنی مرضی کے قانون جاری کرتا ہے اپنی مرضی کی حکومت چلاتا ہے اور لوگوں کے مال اور آبرو سے کھیلتا ہے، بیت المال کو اپنی طاقت کے زور پر تصرف میں لاتا ہے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتا ہے، مومنین کے ساتھ جنگ میں آتا ہے ستمگر اپنی جماعت تشکیل دیتے ہیں اور جو حکومتیں اکثریت کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہیں پارلیمانی ہوتی ہے، لوگوں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق چل رہی ہوتی ہیں 51 فیصد افراد کی بنیاد پر؛ تو وہ ایسی حکومتوں کو ختم کرکے اپنی خودسر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اسلامی حکومت میں ایسا نہیں ہے، اسلامی حکومت انسانی اور الٰہی حکومت ہے، ایک ایک فرد کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا ہے اللہ کے حکم کے علاوہ کون سا حکم بہتر ہو سکتا ہے؟

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (سورہ المائدہ، آیت: ۵۰)

ترجمہ: "تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے ہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔"۔

حکومت اسلامی کی حفاظت کی ذمہ داری سب پر عائد ہوتی ہے معاشرے کے تمام افراد کوشش کریں کہ اسلامی حکومت کی حفاظت ہو۔ پچھلی بات کی وجہ بتانے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ جنگی امکانات اور وسائل کو تیار رکھو۔ یہ اس لئے ہے کہ جو خدا کا دشمن ہے وہ خود تمہارا اپنا

بھی دشمن ہے اس کو اپنے اسلحے سے اور اپنی تیاری سے ڈراؤتا کہ اور وہ اپنی جگہ بیٹھیں، ان کے ذہن فتور نہ کریں کہ وہ تمہارے ساتھ آکر جنگ کریں ان پر تمہارا رعب چھایا رہے اور وہ دشمن جن کو تم ابھی نہیں جانتے ہو لیکن خدا ان کو جانتا ہے ان کو بھی ڈراؤ اور اس سے مراد منافقوں کا گروہ ہے دوسرے وہ کافر ہیں کہ جن کی دشمنی سے ابھی تک مسلمان آگاہ نہیں ہیں۔

اس بات کی مزید توضیح دیتے ہوئے کہا ہے کہ دشمن کو خوفزدہ کرو، جنگی وسائل مہیا کرکے،اس عمل سے اصل ہدف یہ ہے کہ مسلمان اپنی توانائی کی قدر کو جانیں دشمن کو اپنے سے دُور کریں اپنی سوسائٹی کو محفوظ بنائیں ان کی جان، ان کا مال ان کے ناموس کو جہاں سے خطرہ ہو اس خطرے کو دُور کریں اور ان کی جان اور مال اور آبرو کی حفاظت کریں اس طرح کلمہ حق محکم ہو، دین قائم ہو اور کافر نابود ہوں ان کے مذموم مقاصد ناکام ہوں۔ پس راہ خدا میں جو تم خرچ کروگے جو صلاحیتیں خرچ کروگے جو مال دوگے تو اس کا فائدہ خود تمہیں ہی ہوگا کسی اور کو نہیں ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ دین حق قائم رہے اور اس میں کشور کشائی نہیں کہ مملکتوں کو فتح کرنا ہو یا کوئی شخصی دفاع مراد ہو یا قومی و طبقاتی دفاع مراد ہو، یہ چیزیں اسلام میں نہیں ہیں، جب ہدف عظیم ہے اور سب کے لئے ہے تو اس صورت میں اگر تم اس راستے میں مال خرچ کرتے ہو تو یہ تمہارا مال ضائع نہیں جائے گا خدا اس کے دُنیاوی منافع بھی تمہیں دے گا اور اخروی منافع بھی تمہیں ملیں گے۔ اگر اس راستے میں تمہاری جان چلی جاتی ہے تو راہ خدا میں شہید ہوئے ہو اور اس شہادت کے حوالے سے تمہیں زندگانی جاودانہ ملے گی جو ہمیشہ کی بقاء ہے، رحمتِ حق کی ہمسائیگی میں رہوگے، جہاد سوسائٹی کے احیاء اور زندہ کرنے کا سبب ہے۔ جب سوسائٹی کا احیاء ہوتا ہے تو معاشرے کے ایک ایک فرد کی زندگی کی ضمانت ملتی ہے لہٰذا اس راہ میں جو خرچ کیا جائے گا اس کی منفعت دُنیا میں اور آخرت میں خود اس خرچ کرنے والے شخص کو پلٹے گی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس حوالے سے تمہارے

اوپر کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہو گی جو تم نے خرچ کیا ہے وہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس کا فائدہ براہ راست دُنیا و آخرت میں تمہیں لوٹے گا۔

پیغام: دشمن شناس بنو، دشمن کے خلاف اپنے آپ کو تیار رکھو، جنگ میں جانے کے لئے اس انداز سے تیاری کرو کہ دُشمن تمہاری تیاری کو دیکھ کر خوفزدہ ہو اور تمہارے اوپر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾

"اور اگر وہ صلح کے لیے مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

معاشرے میں صلح کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اگر دُشمن صلح کرنے پر آمادہ ہو جائے اور جنگ کا راستہ چھوڑے تو پھر آپ بھی صلح کی خواہش کو قبول کر لو اور اللہ پر توکل رکھو۔ اس بات سے کہ کہیں پس پردہ کوئی ایسے امور نہ ہوں کہ جس کی وجہ سے صلح کا بہانہ بنا کر آپ کو غفلت میں ڈالنا چاہتے ہوں اور آپ کے پاس دفاعی آمادگی بھی نہ ہو کہ اُن کا مقابلہ کر سکو۔ اللہ فرما رہا ہے کہ اس اندیشے میں ڈرو نہیں خدا سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ اللہ کو کسی امر نے نہ غافل کیا ہے اور نہ ہی کسی کا نقشہ اور منصوبہ اللہ کو عاجز کر سکتا ہے۔ اللہ تیری مدد کرے گا اور اللہ ہی تمہاری مدد کے لئے کافی ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ توکل یہ نہیں کہ انسان خدا پر بھروسہ کرے اور تمام ظاہری اسباب کو ایک طرف رکھ دے اور یہ سمجھے کہ ظاہری اسباب کی کوئی حیثیت نہیں۔ بلکہ

توکل کا معنی یہ ہے کہ پورا اعتماد اور حتمی اعتماد اور بھروسہ ظاہری اسباب پر نہ کیا جائے، ظاہری اسباب انسان کے لئے ایک واضح سبب ہے اس کا ایک نمونہ ہے، ہو سکتا ہے وہاں پر کچھ اور اسباب بھی ہوں جن کے بارے میں انسان کو اطلاع نہ ہو اور وہ ان سے آگاہ نہ ہو لیکن انسان جب اپنے امور اللہ کے سپرد کرتا ہے اس مطلب کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے کہ مکمل اور آخری سبب کی تاثیر کا پہلو ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارادہ ہے کیونکہ اللہ کے ارادے کے بغیر کوئی سبب اپنی تاثیر بھی نہیں کرسکتا اور کوئی سبب مکمل بھی نہیں ہو سکتا۔ انسان بہت سارے ظاہری اسباب مہیا کرتا ہے لیکن جب تک اس کی پشت پر اللہ کی مدد نہ آئے اور اللہ کا ارادہ نہ ہو تو وہ ان اسباب کے استعمال میں جو کامیابی اسے چاہیے وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ ظاہری اسباب پر توجہ دینی چاہیے جیسا کہ پچھلی آیت میں حکم ہوا ہے کہ جنگی وسائل بھرپور طریقے سے تیار رکھو اور اس طرح اپنے دشمن کو خوفزدہ کرو کہ تم طاقت میں ہو کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتا۔

پیغام: اگر دشمن صلح کی بات کرے تو تم بھی صلح کے لئے تیار ہو جاؤ اور اللہ پر توکل رکھو ظاہری اسباب کو سب کچھ نہیں سمجھو، ظاہری اسباب کے ہوتے ہوئے نتیجہ اللہ کے سپرد کرو کہ ممکن ہے کوئی ایسا سبب ہو جس کی ہمیں خبر نہ ہو تو اللہ ہی اس کو مہیا کرے گا اور ہر سبب کی تاثیر اللہ کے ارادے اور مشیت سے ہے۔ جب اللہ پر توکل ہو گا تو اللہ آپ کے لئے راہیں بھی کھولے گا اور آپ کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آپ کے اسباب کی تاثیر بھی ہو گی۔

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْۤا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۙ﴿۶۲﴾

"اور اگر وہ چاہیں کہ تمہیں دھوکہ دیں تو تجھے اللہ کافی ہے، جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مسلمانوں سے قوت بخشی"۔

اللہ کی مدد کافی ہے

یہاں پر اللہ نے ایک پوشیدہ سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر اللہ پر توکل کروگے اور انہوں نے جو صلح کی خواہش کی تو آپ بھی صلح کے لئے آمادہ ہو جاؤ تو ممکن ہے کہ صلح کی بات جو دشمن کی طرف سے کی گئی ہے یہ دھوکہ ہو، ایک سازش ہو اور دشمن چاہ رہا ہوں کہ اس طریقے سے مومنوں کو گمراہ کرے اور مناسب موقع دیکھ کر ان پر شب خون مارے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ ہم نے جب تجھے حکم دیا ہے کہ اللہ پر توکل کرو تو یہ اس لئے ہے کہ اگر دشمن صلح کا اعلان کرکے کوئی سازش کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تمہارا نگہبان اور محافظ ہے اور جو بھی اللہ پر توکل کرتا ہے تو اللہ اس کے کام آتا ہے اور اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (سورۃ الطلاق، آیت: ۳)

ترجمہ: "اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے سو وہی اس کو کافی ہے۔"

اللہ کی تائید و نصرت

وہی رب ہے کہ جس نے اپنی نصرت تیرے لئے اور مومنین کے لئے دی ہے اور تمہاری تائید کی ہے۔ اور یہ سابقہ سوال اور احتجاج کی دلیل ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی حمایت و کفایت کے اثبات کے لئے شواہد بھی پیش کر رہا ہے کہ جس طرح پہلے ہم نے تمہاری مدد کی ہے۔ جنگ بدر کا حوالہ دیکھ لیں تو مومنین کی مدد اللہ کرے گا اور نصرت اللہ کی طرف سے جاری رہے گی لہٰذا دشمن کے دھوکے کے اندیشے سے آپ صلح کا انکار نہ کریں، دشمن اگر سازش

کرے گا تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی اپنی تدبیر ہے، اللہ ان کی سازشوں کو ناکام بنادے گا اور اللہ کی مہربانی تمہارے شامل حال ہو گی۔

پیغام: تمام معاملات میں اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہونا چاہیے اور اللہ کی مدد مومنوں کے لئے ہے اللہ کبھی اپنے مومنوں کو اپنے بندگان کو اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرتا۔

وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۳﴾

''اور ان کے دلوں میں اُلفت ڈال دی، جو کچھ زمین میں ہے اگر سارا تو خرچ کر دیتا ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتا لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں اُلفت ڈال دی، بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

اللہ کا مومنوں کے دلوں کو جوڑنا

یہاں ''اُلفت'' جو اُلف کی اصل سے ہے۔اس کا معنی اجتماع، اکٹھا کرنا، جوڑنا ہے۔ اللہ کافی ہے تمہارے لئے تو اس کے لئے ایک مثال دی گئی ہے کہ مومنوں کے دلوں میں جو اُلفت پیدا کی گئی ہے ان کے دلوں کو جوڑا ہے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا ہے، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈالی ہے تو یہ اللہ کی طرف سے خصوصی عنایت ہے جبکہ اسلام سے پہلے اُن کے درمیان دشمنیاں تھیں اور ہمیشہ لمبی جنگیں لڑتے رہے تھے لیکن ایمان کی برکت سے اُن کے دلوں میں محبت اور دوستی آگئی۔ یہاں انسان کی فطرت نعمات کی چاہت پر قائم ہے۔ ہر انسان کسی چیز کو پسند اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے،

چاہے براہ راست فائدہ اٹھارہا ہو یا دوسرے کو فائدہ پہنچا کر اپنے لئے فائدہ اٹھارہا ہو کہ وہ کل اسے کام آئے گا۔

بہر حال انسان اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ اس کے پاس کچھ ہونا چاہیے، وہ دشمن کو نادار دیکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے دشمن کے پاس کچھ نہ ہو، سب کچھ اسی کے پاس ہو۔ انسان ایک خود پسند ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انسان کو اجتماعی زندگی کی بنیاد پر خلق کیا ہے کہ وہ اجتماع پسند ہے وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، ہر فرد جس کے پاس مال ہے، عزت ہے، خوشحالی کے اسباب ہیں، حسن و جمال ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے پاس مال نہیں ہے اس کے پاس خاص عنوان اور منصب بھی نہیں ہے ایک مالدار ہے ایک بے مال ہے۔ ایک کے پاس عزت اور مقام ہے ایک کے پاس وہ عزت و مقام نہیں ہے۔ ایک کے پاس خوشحالی کے اسباب ہیں دوسرے کے پاس نہیں ہیں تو اس وجہ سے ان کے درمیان دشمنی اور عداوت ان کے دلوں میں آجاتی ہے اور ان کے دلوں میں بخل اور کنجوسی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس سے جان بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے، آبرو بھی، مال بھی اور وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور اگر ایک کے پاس مال زیادہ ہے ایک کے پاس کم ہے، جس کے پاس کم ہے تو وہ کہتا ہے کہ جس کے پاس زیادہ ہے میں اس کا مال چھین لوں۔ ایک کے پاس بہت غلام اور نوکر چاکر ہیں، دوسرے کے پاس نہیں ہیں تو وہ کہتا ہے میرے پاس بھی ہوں تو اس لئے وہ اس کے ساتھ دشمنی شروع کر دیتا ہے۔ یہ رویہ ایسے ہی رہے گا جب تک ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ ایک سوسائٹی کسی ایک فکر پر مشتمل ہو چاہے وہ مادی ہوں یا غیر مادی ہوں کہ وہ ایک نظریہ پر جمع ہوں اگر ایسا نہ ہو تو پھر فساد کی جڑ کو اکھیڑا نہیں جا سکتا۔ دُنیا ٹکراؤ کا گھر ہے، منافع ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے ہیں، دنیاوی مفادات آپس میں لڑائی کا سبب بنتے ہیں، اس وجہ سے آپس کی بغض اور دشمنی ایجاد ہوتی ہے۔ اگرچہ جزئی موارد میں ایک دوسرے کے ساتھ مانوسیت بھی موجود ہو

لیکن بعض اضافی چیزیں ایسی ہیں جس وجہ سے ایک جیسی برابری نہیں آسکتی تو خاص افراد کے لئے وہ چیزیں موجود ہوتی ہیں جیسے سلطنت ہے حکمرانی ہے، وزارت ہے، افسری ہے۔ یہ چیزیں بغض اور نفرت کا سبب بنتی ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے کرم کیا اُمت اسلامی پر، اُن کے دلوں سے بخل اور کنجوسی کی جو گھٹیا اور پست صفت تھی اُس کو نکال دیا اور اُن کے درمیان اُلفت کو ایجاد کر دیا ایسی اُمت کو وجود دینے کے لئے پہلے اُنہیں الٰہی معارف سے آشنا کیا اور ان کو یہ تعلیم دی کہ انسانی زندگی ایک زندگی جاوید ہے، یہ چند روزہ زندگی میں منحصر نہیں ہے، حقیقی سعادت ان مادی لذات اور پست گھٹیا مادی چراہ گاہوں میں مست رہنے میں نہیں بلکہ حقیقی حیات اور زندگی اللہ تعالیٰ کی عبودیت کی کرامت میں ہے اور وہ نعمتیں ہیں جو قرب خداوندی سے بہرہ ور ہوں جو دُنیا کے بارے ایسی سوچ رکھتا ہے کہ دُنیا کو دوام نہیں ہے، دُنیا کی مادی نعمات زائل ہونے والی ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ پسند کرتا ہے تو اس لئے کہ وہ حلال طریقے سے حاصل ہوتی ہیں اور جائز طریقے سے وہ روزگار کی تلاش کرتا ہے اُسے طمع و لالچ دوسرے کے اموال پر نہیں ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ خیر اور باقی رہنے والی چیز ہے، محنت کا ثمر لینا چاہتا ہے۔

”اے لوگو! جو مال و متاع تمہیں دیا گیا ہے وہ دُنیاوی زندگی کا ناپائیدار فائدہ ہے اور جو کچھ خداوند کے ہاں ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے یہ ان لوگوں کیلئے ہے جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کیا“ (سورہ الشوریٰ، آیت: ۳۶)

لہٰذا اس کے اندر مومنین کے ساتھ ہمدردی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ چیز پیغمبر اکرم ﷺ الٰہی تائید کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے اور خود سے لوگوں کے درمیان ایسی ہم آہنگی ایجاد کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے، یہ خداوند جو مقتدر ہے جو حکیم ہے اس نے الٰہی معارف کے ذریعہ مومنین کے درمیان یہ الفت اور مہربانی اور محبت کا عنصر ایجاد کر دیا ہے۔ یہ ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے کہ اس نے اپنے نظام کے ذریعہ

مومنوں کے دلوں کو جوڑا ہے اور ان کے دلوں میں بخل اور کنجوسی کو ختم کرنے کے احکام جاری کئے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا، ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے کی حیثیت کو تسلیم کرنا اور سب کے ذہن میں یہ ہو کہ ہم سب اللہ کے عبد ہیں کسی اور کے عبد نہیں ہیں۔ بڑا اور چھوٹا پھر ان کی تمیز ختم ہو جاتی ہے کہ بڑا چھوٹے سے پیار کرتا ہے چھوٹا بڑے کا احترام کرتا ہے یہ چیز اسلامی معارف میں سمجھائی گئی ہے اسلام سے پہلے ایسا نہیں تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبی لمبی جنگیں ہوتی تھیں۔ اللہ فرمارہا ہے کہ اے میرے پیارے یہ تو میں نے مومنوں کے دلوں کو جوڑا ہے ورنہ زمین میں جو کچھ ہے آپ اسے خرچ بھی کر دیتے تو ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے یہ الٰہی معارف کی وجہ سے ہوا ہے اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے بکھرے ہوئے افراد کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾

"اے نبی! اللہ کافی ہے تجھے اور ان مومنوں کیلئے جو تیرے تابعدار ہیں"۔

پیغمبرؐ کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی

اس مقام میں پیغمبر اکرم ﷺ کے دل کو اطمینان دلانے کے لئے انہیں تسلی دی گئی ہے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے میرے رسول! تیری مدد کے لیے اللہ تعالیٰ اور وہ مومنین جو تیری پیروی میں ہیں، کافی ہیں۔ وہ تمہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھیں گے۔ اگرچہ تیری پیروی کرنے والے مومنوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو لیکن اللہ کی مدد اور مومنین کی مدد تیرے لئے اور مومنوں کے لئے کافی ہے۔ اللہ کی مدد اور وہ مومنین جو رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہیں ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مدد کافی

ہے لیکن یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں کیونکہ مومنین اس حوالے سے ان کا استقلال توحید کے منافی نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ خدا تیرے لئے کافی ہے اور مومنین میں سے وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں اُن کے لئے خدا کافی ہے۔ یہ جملہ "وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾" اس کو (کاف) پر عطف کیا گیا ہے۔ اگر اس طرح ہو تو معنی یہ ہے کہ اللہ کافی ہے اور جو مومنین تیری پیروی کرنے والے ہیں اللہ ان کے لئے بھی کافی ہے لیکن دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کافی ہے تیرے لئے اور جو مومنین تیری پیروی میں ہیں وہ مومنین تیری مدد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مومنین کی رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنا یہ مدد اللہ کی حمایت کے بغیر تو نہیں ہے یہ ایک ظاہری سبب ہے کہ مومنوں کی جماعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے مددگار بھی اور ناصران بھی ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

"اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو، اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ سو پر غالب آئیں گے، اور اگر تم میں سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے اس لیے کہ وہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے"۔

جہاد کی تشویق

اس آیت میں مومنین کو جہاد کا شوق دلایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مومنوں کو جہاد پر آمادہ رکھو۔ راہ خدا میں جہاد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والے بیس مومنین دو سو کفار

پر غالب آئیں گے۔ اور دو سو مومنین، ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔ یہ اس لیے ہے کہ کفار بات کو صحیح درک نہیں کرتے اور سمجھتے نہیں۔ اس مسئلے کا راز یہ ہے کہ کافر اس بات کو نہیں جانتے کہ مومن اپنی جان اللہ کی راہ میں دینے کے لیے آمادہ ہے، اس کا اللہ پر ایمان ہے۔ یہ ایسی طاقت ہے جس کا مقابلہ کوئی دوسری طاقت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ایمان کی طاقت صحیح درک و فہم پر قائم ہے۔ اسی صحیح درک و فہم ہی کی وجہ سے مومن میں پسندیدہ خُلق و عادات جیسے شجاعت، جرات، استقامت اور اطمنیان قلب موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مومن کا اللہ پر اعتماد اور توکل ہے اور اسے یقین ہے کہ خواہ وہ قتل ہو جائے یا دشمن کو شکست دے دونوں صورتوں میں وہ کامیاب ہے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں اس کے لیے بہشت جاودانی اور رضوان الہٰی ہے۔ اس کے نزدیک موت فنا اور نابودی نہیں جس طرح کفار موت کو نابودی اور فنا سمجھتے ہیں۔

کفار کا بھروسہ نفسانی خواہشات اور ان ظاہری چیزوں پر ہے جن کو شیطان نے ان کی نگاہ میں مزیّن کیا ہوا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ ایسی صورت میں ان کے درمیان حقیقی اتحاد اور اتفاق ہو ہی نہیں سکتا، ان کے درمیان وقتی طور پر اتفاق ہو جاتا ہے تاکہ کسی ایک کامیابی کو پا سکیں لیکن یہ اتفاق ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا کیونکہ اس اتحاد کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ مادی عقائد و نظریات اور نفسانی خواہشات انسان کو موت کے خطرہ کے وقت ثابت قدم نہیں رکھ سکتے۔ یہی چیز کفار کے درمیان اختلاف اور تفرقہ کے سبب بنتی ہے۔ جبکہ کافروں کے برعکس مومنین کے ہاں وحدت اور یکجہتی کے امکانات واضح اور روشن ہیں کیونکہ مومنین ایک نظریہ پر قائم ہوتے ہیں۔ وہ حیات ابدی کے قائل ہیں اور موت کو فنا نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک موت ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے۔ اسی لیے مومن ہر قدم اللہ کی رضا کے لیے اٹھاتا ہے اور یہ چیز کافروں کے پاس نہیں ہے۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ ۚ وَ اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ اَلۡفٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَيۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۶۶﴾

" اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور معلوم کر لیا کہ تم میں کس قدر کمزوری ہے، پس اگر تم سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے، اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

صبر کرنے والوں کے بارے میں

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ میں تمہاری روحانی صفات اور ایمان کی کمزوری سے آگاہ ہوں لہٰذا تمہارے لیے تخفیف دے دی ہے اور پہلی والی آیت میں جو کہا تھا کہ تمہارا ایک آدمی دشمن کے دس افراد کے برابر ہوگا تو اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمہارا ایک آدمی دشمن کے دو افراد کے برابر ہوگا۔ یہاں پر بتایا گیا ہے کہ حق پر یقین تمام پسندیدہ صفات جیسے شجاعت اور صبر کا سرچشمہ ہے جو فتح اور کامیابی کا سبب ہے۔ اگر ایمان کمزور ہو اور حق پر یقین نہ ہو تو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہاں پر کمزوری سے جنگی وسائل کی کمی مراد نہیں ہے کیونکہ واضح ہے کہ رسول ﷺ کے زمانے میں افراد کی تعداد اور کثرت کے لحاظ سے مومنین کی قوت ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔

"بِاِذۡنِ اللّٰهِ" کا معنی یہ ہے کہ خدا جانتا ہے کہ تم صبر کرنے والے ہو اور ایمان بھی رکھتے ہو لہٰذا وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا کہ تمہیں دشمن پر غلبہ دے۔ اگر تم صبر کرو گے تو خدا تمہارے ساتھ ہے۔ ان دو آیات کو آپس میں ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے

ابتدائی ایام کے بر عکس جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی ان کی روحانی قوت کم ہوتی گئی، کیونکہ صدر اسلام میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے تو کم تھے لیکن ان میں روحانی قوت زیادہ تھی لیکن جب ان کی تعداد بڑھی تو ان کی روحانی اور ایمانی طاقت کمزور ہوئی۔ بظاہر اس آیت میں بیان شدہ حکم تکلیفی ہے یعنی شروع شروع میں مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ ان کا ایک فرد کفار کے دس افراد کا مقابلہ کرے۔ لیکن جب مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری ظاہر ہونے لگی جس کا فتح و کامیابی پر براہ راست اثر تھا تو پھر مسلمانوں کے ایک فرد کو دشمن کے دو افراد کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

ان دونوں آیتوں کے نزول کا زمانہ ایک نہیں ہے لہٰذا یہ مومنوں کی دو حالتوں کو بیان کر رہی ہیں۔ ایک آیت میں بتایا جارہا ہے کہ صبر برتری کا باعث ہے۔ اگر مومنین میں روحانی طاقت ہو گی تو ان کا ایک فرد دشمن کے دو افراد کے برابر ہو گا۔ سمجھ اور صحیح ادراک ایک فرد کے پانچ افراد پر غالب آنے کا سبب بن سکتا ہے۔ سمجھ اور درک جب ایک فرد میں اکھٹے ہو جائیں تو اس کے اندر دس افراد کے برابر طاقت آجاتی ہے۔ البتہ سنجیدگی کے بغیر صبر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بر عکس ممکن ہے جنگ میں سمجھ اور سنجیدگی ہو لیکن صبر نہ ہو۔ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ جہاد اور جنگ میں صبر بہت ضروری ہے۔ جنگ بدر اور جنگ حنین میں مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے سے انسان کو تعجب ہوتا ہے کیونکہ جنگ بدر میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے کم تھے لیکن ان میں روحانی اور ایمانی طاقت زیادہ تھی تو کثرت پر غالب آئے۔ لیکن جنگ حنین میں وہ تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے لیکن ان کا ایمان کمزور تھا تو وہاں پر صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ایمان کے مراتب و درجات کے لحاظ سے مسلمان کس قدر زوال کا شکار ہوئے۔ اس طرح اس سلسلے کو آگے بڑھاتے جائیں اور اس دور کے مسلمانوں کا تقابل عصر حاضر کے مسلمانوں سے کیا جائے تو اب مسلمان تعداد کے

لحاظ سے ڈیڑھ ارب ہیں۔ لیکن ذلت اور خواری ان کا مقدر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایمان کمزور ہے۔ لیکن دوسری طرف حزب اللہ کے چند ہزار افراد اسرائیل اور اسرائیل کے ساتھ دنیا کی بہت بڑی طاقتوں کے مقابلے میں دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے اور دشمن کو ذلیل و خوار کیا۔ کیونکہ ان میں ایمانی طاقت مضبوط تھی۔ لہٰذا ایمانی طاقت انسان کو ظاہری طاقت کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ طاقت فراہم کرتی ہے۔ اس سے انسان میں ہمت بڑھتی ہے اور اس کی وجہ سے ایک فرد دس افراد کا مقابلہ کرسکتا ہے بلکہ ایک فرد سو کا بھی مقابلہ کرسکتا ہے۔ اصل میں انسان کا ایمان مضبوط ہونا چاہیے اور ایمان کی طاقت سے ہی انسان دشمن کا مقابلہ کرسکتا ہے اور دشمن کی کثرت اور اس کا جدید ترین اسلحہ مومن کے ایمان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷

"نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے یہاں تک کہ ملک میں خوب خونریزی کرلے، تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو، اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

دنیا اور آخرت کا تقابل

"عَرَض" کسی چیز کو دوسری چیز پر پیش کرنے کے معنی میں ہے جو جلدی زائل ہوجانے والی ہو۔ اس آیت کے اصلی مخاطب وہ مسلمان ہیں جو جنگ بدر میں شریک تھے جو کافروں کو قیدی بنا کر لے آئے تھے اور پھر رسول ﷺ سے یہ درخواست کی کہ ان کافروں کو

قتل نہ کرے بلکہ ان کے بدلے میں ان سے فدیہ اور خون بہا لے لیں اور انہیں رہا کر دے۔
اس آیت میں ان کی مذمت اور سرزنش کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرر مارہا ہے کہ سنت الٰہی اور الٰہی قانون جو پیغمبروں کے درمیان جاری رہا اس میں کسی پیغمبر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دشمن کے قیدی پکڑے اور ان کو رہا کر کے مال حاصل کرے مگر یہ کہ اس کا آئین اور دین اس زمین پر مستحکم اور مستقر ہو جائے۔ سابقہ انبیاء جب دشمن پر غلبہ حاصل کر لیتے تھے تو ان کو قتل کر کے سزا دیتے تھے تاکہ وہ دوسروں کے لیے عبرت کا سبق بنیں۔ اور دوسرے لوگ بھی خدا اور پیغمبر کے خلاف جنگ سے باز آئیں۔

یہاں پر مسلمانوں کو خطاب کیا جارہا ہے تم دنیا کا ناپائیدار اور معمولی مال چاہتے ہو اور اس لیے قیدی بنا کے لائے ہو اور کہتے ہو کہ ان کے بدلے فدیہ لیا جائے اور اس بات پر اصرار کر رہے ہو حالانکہ خدا کی نظر میں آخرت مہم تر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی لیے تمہارے لیے دین تشریع کیا اور تمہیں کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی وہ ایسا غالب آنے والا اور مقتدر ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ حکیم ہے اور اس کا ہر فیصلہ درست اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اس کا کوئی فیصلہ بے ہودہ نہیں ہوتا۔ مفسرین کے درمیان اس بارے اختلاف ہے کہ یہ سرزنش مومنین پیغمبر دونوں کے لیے ہے یا فقط بعض مومنین کے لیے ہے اور پیغمبر کو شامل نہیں ہے۔ معلوم رہے کہ پیغمبر کی شان اس سے بلند تر ہے کہ اللہ اس قسم کا عتاب اور سرزنش پیغمبر کو کرے کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہ دی ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ عتاب صرف مشرکین سے فدیہ لینے کے حوالے سے ہے۔ یعنی جنگ بدر میں جب دشمن کے جنگجوں کو قیدی بنا کر لایا گیا تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان قیدیوں میں سے اتنی تعداد سے بدلہ لیا جائے جتنے ہمارے مسلمان شہید ہوئے ہیں اور باقی کو چھوڑ دیا جائے اور ان سے فدیہ لیا جائے۔ ان کی اس

خواہش کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا اور فرمایا کہ ایسی سنت اور ایسا طریقہ سابقہ انبیاء میں نہیں تھا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾

''اگر اللہ کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو تم نے لیا اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب ہوتا''۔

اللہ کا فیصلہ

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ کا فیصلہ نہ ہوتا کہ وہ تمہیں عذاب دے کر ہلاک کرے تو یقینی امر تھا کہ تمہارے قیدی بنانے، غنیمت اور فدیہ لینے پر تمہیں بڑا عذاب ملتا، کیونکہ یہ بڑا گناہ تھا کہ آیات کے نزول سے پہلے تم نے اس کا ارتکاب کیا۔ یہاں پر اللہ کے فیصلہ کو مبہم طور بیان کیا ہے یہ اس لیے ہے کہ سننے والے کا ذہن ہر قسم کے خطرے کا احتمال دے۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

''پس جو مال تمہیں غنیمت میں حلال اور طیب ملا ہے اسے کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

جنگی غنائم اور فدیہ

اس کے بعد اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مشرکین سے تم نے جو اموال اور جنگی غنائم لیے ہیں اب وہ تمہارے لیے مباح ہیں اور خدا نے انہیں تمہارے لیے حلال اور پاکیزہ قرار دے دیا ہے اب تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ اللہ نے تمہارے لیے سب کچھ حلال قرار دیا ہے اور تمہیں عذاب نہیں دیا۔ خدا مہربان اور بخشنے والا ہے اور تمہارے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾

''اے نبی! جو قیدی تمہارے ہاتھ میں ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی معلوم کرے گا تو تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخشے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

کافر اسیروں کے بارے میں

اسیر کا تمہارے ہاتھوں میں ہونا اس بات سے کنایہ ہے کہ ان پر تمہارا کنٹرول اور غلبہ ہے اور وہ تمہاری غلامی میں آگئے ہیں۔ اس آیت میں خیر سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا''

تمہارے دلوں میں خیر پائے تو تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخشے گا، اس خیر سے مراد ایمان یا حق کی پیروی مراد ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ گے تو اللہ تمہیں معاف کردے گا۔ کیونکہ کفر کی حالت میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت نہیں مل سکتی۔ (سورۃ نساء آیت: 48)

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ''

''اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے''۔

جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے مراد وہ تاوان ہے جو مشرکین سے لیا گیا تھا۔ اس آیت میں رسول ﷺ کو کہا گیا کہ ان اسیروں کو بتا دو اگر تمہارے دلوں میں اللہ کا ایمان ہوتا تو اللہ تمہیں وہ کچھ دیتا جو مسلمانوں نے تم سے لے لیا ہے بلکہ اللہ تمہیں اس سے زیادہ اور بہتر دیتا اور تمہاری غلطیاں بھی معاف کر دیتا تمہارے گناہوں کو بخش دیتا کیونکہ وہ مہربان اور بخشنے والا اور رحیم ہے۔

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۷۱﴾

”اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں گے سو یہ تو پہلے ہی اللہ سے دغا کر چکے ہیں پھر اللہ نے انہیں گرفتار کرا دیا، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے“۔

اسیروں کی خیانت

یہاں پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ اسیر جن کو تم نے پکڑا ہے اگر وہ تمہارے ساتھ خیانت کریں اور تمہارے ساتھ جنگ کریں اور فساد پر اتر آئیں اور اپنی پچھلی حالت میں جائیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کفر میں رہے ہیں، کفر کو قائم کیا اور نور حق کو بجھانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ انہوں نے تو خدا کے ساتھ بھی خیانت کی۔ خدا نے ان پر تمہیں غلبہ دیا۔ وہی ذات اب بھی قادر ہے کہ تمہیں ان پر غلبہ دے۔ خدا ان کی خیانت سے آگاہ ہے اور تمہیں ان پر غلبہ اور برتری دینے پر قادر بھی۔ خدا کا ہر فیصلہ صحیح اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِیْنَ

اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَايَتِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا‌ۚ وَاِنِ اسۡتَـنۡصَرُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ فَعَلَيۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۷۲﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا تمہیں ان کی وراثت سے کوئی تعلق نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں، اور اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد چاہیں تو تمہیں ان کی مدد کرنی لازم ہے مگر سوائے ان لوگوں کے مقابلہ میں کہ ان میں اور تم میں عہد ہو، اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے"۔

مومنین کی ایک دوسرے پر ولایت

اس آیت میں مہاجرین سے مراد مہاجرین کا وہ پہلا گروہ ہے جو ان آیات کے نزول سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔ کیونکہ آیت 75 میں دوسرا گروہ جو بعد میں ہجرت کرنے والا ہے اس کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی ان سے انصار مراد ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں مسلمانون کے دو ہی گرہ تھے ایک انصار اور دوسرا گروہ مہاجرین۔ مسلمانوں کی تھوڑی تعداد وہ تھی جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی۔ اللہ تعالی نے ان دو گرہوں کے درمیان ولایت، دوستی اور باہمی ارتباط اور تعلق کو بحال کیا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے اولیاء سرپرست ہیں یہ ولایت اور سرپرستی، وراثت کی ولایت، مدد کرنے کی ولایت، امن کی ولایت سب کو شامل ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو امان دیتا ہے تو باقی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس کو امان دیں کیونکہ

اس کا امان دینا سارے مسلمانوں کا امان دینا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے وارثت لیں گے۔ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اگر کوئی ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو باقی سب اس کے ساتھ ہونگے۔ لیکن ولایتِ ارث، وراثت کے باقی قوانین آنے سے نسخ ہو گئی ہے۔ لہٰذا سارے مسلمان ایک دوسرے پر ولایت رکھتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ وہ مومنین جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تمہارے درمیان سوائے نصرت کے کوئی ولایت نہیں ہے۔ اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد مانگیں تو تم ان کی مدد کرو۔ یہ ولایتِ نصرت ہے۔ باقی ولایتیں تمہارے درمیان نہیں ہیں۔ فقط یہ کہ اگر وہ کسی قوم کے ساتھ جنگ کرنا چاہیں اور تمہیں اس قوم کے خلاف مدد کو بلائیں تو ان کے درمیان اور آپ کے درمیان کوئی معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کا پاس کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اللہ سے تمہارا کوئی بھی عمل مخفی نہیں ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

"اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کروگے تو ملک میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد ہوگا"۔

کافروں کی ایک دوسرے پر ولایت

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کافر ایک دوسرے کے دوست ہیں ایک دوسرے کے سرپرست ہیں۔ وہ مومنین کے دوست نہیں۔ پس مومنین ان کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اپنا ولی بنا سکتے ہیں۔ یہ جملہ انشائیہ اور امری ہے جو خبر کی شکل میں بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کفار کو اپنا ولی دوست اور سرپرست نہیں بنا سکتے۔ بعد والے جملے

میں اس حکم کی قانونی حیثیت کی مصلحت کو بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ولایت اور دوستی ایسا امر ہے جس سے کوئی بھی سوسائٹی بے نیاز نہیں ہے اور اس کا وجود سوسائٹی کے افراد کے درمیان ہم آہنگی اور عدالت کو رواج دینے کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے اگر کافروں سے دوستی ہو اور کافروں سے اٹھنا بیٹھنا ہوگا تو اس کے فاسد اعتقادات مسلمانوں کے صحیح اعتقادات سے مخلوط ہو جائیں گے اور مومنین بھی کفار کی طرح حق کی پیروی کرنے کی بجائے نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائیں گے۔ اور اللہ کی عبادت، شیطانی عبادت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اسلامی تاریخ میں دیکھا جائے تو ایسا ہی ہوا ہے کہ جیسے ہی مسلمانوں نے کفار سے دوستی کی اور ان کے ساتھ میل جول رکھا ان کی یہ دوستی اور میل جول بڑے فساد کا سبب بنا۔

پیغام: کفار کو اپنا دوست نہ سمجھو۔ کفار اللہ کے دشمن ہیں جب وہ اللہ کے دشمن ہیں تو مومنین بھی انہیں اپنا دشمن سمجھیں۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٤﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی سچے مسلمان ہیں، ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے"۔

مہاجرین اور انصار کے بارے میں

اس آیت میں مہاجرین کے پہلے گروہ اور انصار کے ایمان کی حقیقت اور ان کے ایمان کے آثار بیان کئے گئے ہیں اور ان کے لئے بخشش اور بہترین روزی کا وعدہ دیا گیا ہے۔ دین کی

اساس اسی بات پر ہے کہ ایک مومن سوسائٹی تشکیل پائے جس میں معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں اور اللہ کا عادلانہ نظام نافذ ہو۔[1]

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷۵

"اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور گھر چھوڑے اور تمہارے ساتھ ہو کر لڑے سو وہ لوگ بھی تمہیں میں سے ہیں، اور رشتہ دار آپس میں اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز سے خبر دار ہے"۔

پہلے مہاجرین کے بعد والے مہاجر

اس جملہ میں ان مومنین کی حالت بیان ہوئی ہے جو بعد میں مدینہ ہجرت کرکے آئے اور مسلمانوں کے پہلے گروہ سے آکے متصل ہوئے۔ ان کو بھی مومنین کے گروہ سے شمار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے درمیان رشتہ داری کی ولایت قرار دی گئی ہے، یہ وہی ولایتِ ارث ہے جس کی بنا پر ایک فرد دوسرے سے وراثت پاتا ہے۔ یہ آیت ارث کو فقط رشتہ داروں کے درمیان قرار دے رہی ہے اور ایمانی بھائیوں کے درمیان عقدِ اخوت کی وجہ سے جو ولایتِ ارث وجود میں آئی تھی اس کو نسخ کر رہی ہے۔ ولایت کی باقی اقسام رشتہ داروں میں

---

[1] ۔ ایسی سوسائٹی اسلام کے ابتدائی ایام میں مدینہ کے اندر محقق ہوئی اور انشاء اللہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بعد ایسی سوسائٹی دوبارہ تشکیل پائے گی اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل پائے گا جہاں عدل و انصاف ہو گا، ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور پیار کا رابطہ ہو گا۔

نہیں آتیں بلکہ وہ سارے مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں جن میں ایک دوسرے کی نصرت کرنا، ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ باندھے گئے عہد و پیمان کا پاس رکھنا۔ ان احکام اور قوانین کو وضع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر چیز سے آگاہ ہے اور جانتا ہے کہ کونسا حکم انسان کے فائدہ میں ہے اور کونسا حکم انسان کے فائدے میں نہیں ہے۔